سہ ماہی

شمارہ خصوصی بیاد غالب

جلد ۔ ۴۵ حصہ اول شمارہ ۔ ۱

جنوری ، فروری ، مارچ
۱۹۶۹ء

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

انجمن ترقی اردو بابائے اردو روڈ
کراچی ۔ ۱

MAK

اس شمارے کے مصنفین

مولانا امتیاز علی عرشی	رضا لائبریری ، رام پور ۔
قاضی عبدالودود	بیرسٹر ، پٹنہ ۔
مولانا غلام رسول مہر	لاہور ۔
ڈاکٹر شوکت سبزواری	مدیر اول ، ترقی اردو بورڈ ، کراچی ۔
ڈاکٹر وحید قریشی	استاد شعبۂ اردو ، اورینٹل کالج ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔
ڈاکٹر وزیر آغا	مدیر ' اوراق ' لاہور ۔
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	لاہور ۔
پروفیسر ممتاز حسین	صدر شعبۂ اردو ، اردو کالج ، کراچی ۔
پروفیسر عبدالقوی دیسنوی	صدر شعبۂ اردو ، سیفیہ کالج ، بھوپال ۔
سید محمد تقی	مدیر روزنامہ ' جنگ ' کراچی ۔
جمیل جالبی	انکم ٹیکس آفیسر ، کراچی ۔
ڈاکٹر سہیل بخاری	پی اے ایف پبلک اسکول ، سرگودھا ۔
ڈاکٹر فرمان فتح پوری	استاد شعبۂ اردو ، کراچی یونیورسٹی ، کراچی ۔
نثار احمد فاروقی	استاد شعبۂ عربی ، دہلی کالج ، دہلی ۔
ڈاکٹر عبدالغنی	شعبۂ تاریخ ادبیات ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	استاد شعبۂ اردو ، اورینٹل کالج ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔
مخمور اکبر آبادی	کراچی ۔
نادم سیتاپوری	سیتاپور ۔
کلب علی خاں فائق	مجلس ترقی ادب ، لاہور ۔
سید مرتضیٰ حسین فاضل	لاہور ۔
محمد علی صدیقی	کراچی ۔
مسلم ضیائی	کراچی ۔
لطیف اللہ	استاد شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج ، کراچی ۔
سید صمد حسین رضوی	ایگزیکٹو انجینیر ، ایم ای ایس ، حکومت پاکستان ، کراچی ۔
سید معین الرحمان	استاد شعبۂ اردو ، ایف سی کالج ، لاہور ۔
جلیل قدوائی	انجمن ترقی اردو ، کراچی ۔
شمیم احمد	انجمن ترقی اردو ، کراچی ۔

فہرست مضامین

طابع : انجمن پریس ، لارنس روڈ کراچی

ناشر : انجمن ترقی اردو ، بابائے اردو روڈ کراچی

خطاطی سرورق : محمد اقبال ابن پروین رقم (تمغۂ خدمت)

قیمت فی پرچہ : تین روپے پچاس پیسے

قیمت سالانہ : چودہ روپے

اس شمارے کی قیمت :

L. LTD. 12/- REVISED
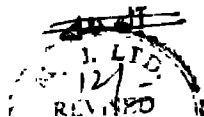
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

حرفے چند

غالب کی صد سالہ برسی تمام دنیا میں منائی جا رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ برصغیر کے کسی فن کار کو برصغیر سے باہر بھی اتنے بڑے پیمانے پر یاد کیا گیا ہو۔ بڑا فن کار زمان و مکان کی حدود توڑ کر اپنی عظمت کا لوہا منواتا ہے، آج غالب بھی انھی معنوں میں ایک بڑا فن کار ہے۔

غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اردو میں اقبال کے بعد کسی فنکار کے بارے میں اتنا کچھ نہیں لکھا گیا، لیکن ابھی غالب پر لکھنے کی بہت کچھ گنجائش ہے، کیوں کہ ہر عہد بڑے شاعر کی تفسیر و تعبیر خود اپنے جداگانہ انداز سے کرتا ہے۔ غالب کی شاعری ہر عہد میں زندہ رہی ہے اور رہے گی اور اسی لیے اس کے بارے میں ہر عہد کے سوچنے والے اپنا اپنا زاویۂ نظر پیش کرتے رہیں گے۔ غالب کے فن کی طرح اس کے حالات زندگی بھی ہمارے محققین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ آئے دن غالب کے بارے میں بہت سی نئی باتیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں، یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہماری تحقیق اور تنقید کا سب سے بڑا موضوع غالب ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی پر انجمن نے جو اشاعتی منصوبہ بنایا ہے، اردو کا زیر نظر شمارہ اس کا ایک حصہ ہے۔ اس شمارے میں غالب کی شخصیت اور فن کے بارے میں بعض نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ توقع ہے کہ یہ مجموعہ علمی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔ ہم اپنے لکھنے والوں کے بے حد ممنون ہیں کہ ان کے تعاون سے بہت کم وقت میں یہ خاص اشاعت منظر عام پر آ رہی ہے۔ ان میں سے بعض اہل قلم نے اپنے پسندیدہ موضوعات پر لکھا ہے اور بعض نے ہمارے پیش کردہ عنوانات کے تحت اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تمام موصولہ مقالات اس شمارے میں شایع نہیں کیے جا سکے۔ ڈاک کی بد نظمی کی وجہ سے بعض مقالات بہت تاخیر سے موصول

ہوئے ، اگر انھیں بھی شامل کیا جاتا تو یہ شمارہ وقت پر شایع نہیں ہوسکتا تھا - اب یہ طے کیا گیا ہے کہ ' اردو ' کا آیندہ شمارہ بھی غالب ہی کے بارے میں ہو -

' اردو ' کے زیر نظر شمارے کے علاوہ ماہ نامہ ' قومی زبان ' کی جنوری سے مارچ تک کی اشاعتیں بھی غالب ہی سے منسوب ہیں - نیز مندرجہ ذیل پانچ کتابیں بھی جو غالب سے متعلق ہیں ، شائع کی گئی ہیں -

۱- فلسفۂ کلام غالب	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۲- غالب ، ایک مطالعہ	پروفیسر ممتاز حسین
۳- غالب نام آور	سہ ماہی ' اردو ' میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کا انتخاب
۴- ہنگامۂ دل آشوب	مرتبہ سید قدرت نقوی
۵- سبد نیم روز (اردو ترجمہ)	پروفیسر عبدالرشید فاضل

ان کے علاوہ عام اردو ادب سے متعلق چند کتابیں بھی اس موقعے پر شائع کی جا رہی ہیں -

سرورق کی تصویر

یہ تصویر ۱۲۸۲ھ کی بنی ہوئی ہے اور صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی مرحوم کے کتب خانے میں محفوظ ہے - یہ تصویر اصل رنگوں میں شائع کی جا رہی ہے ، جس کے لیے ادارہ مولانا خیر بھوروی کا ممنون ہے -

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

غالب کی صحیح تاریخ پیدائش

سید صمد حسین رضوی

عام طور پر یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ عیسوی بروز چہار شنبہ ہے ۔ یہاں تک کہ مولانا غلام رسول مہر نے بھی اپنی کتاب ” غالب “ میں یہی تاریخ پیدائش لکھی ہے اور جناب مالک رام صاحب نے بھی ” ذکر غالب “ میں اسی تاریخ پیدائش کو صحیح بتایا ہے ۔ لیکن یہ معلوم کر کے اہل علم و ادب حضرات کو حیرت ہو گی کہ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش وہ نہیں ہے جو عام طور پر مشہور ہو گئی ہے ، بلکہ جیسا کہ ذیل کے صفحات میں ثابت کیا جائے گا ، اُن کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ ہے ۔ غالب یک شنبے کے دن اکبر آباد یعنی آگرے کے مقام پر علی الصباح طلوع آفتاب سے چار گھڑی قبل یعنی انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق صبح پانچ بج کر ۳۶ منٹ پر پیدا ہوئے تھے ۔

اگر چہ اہل اسلام ، اہل یونان اور اہل مغرب کے اصول کے مطابق غالب کی پیدائش اتوار کے دن ہی ہوئی تھی ، کیونکہ اہل اسلام کا دن ایک غروب آفتاب سے دوسرے غروب آفتاب تک سمجھا جاتا ہے ، اور اہل یونان و اہل مغرب کا دن ایک نصف شب سے دوسری نصف شب تک مانا جاتا ہے ۔ لیکن ہندوؤں کی تقویم کے مطابق غالب کی پیدائش سنیچر کے دن کی سمجھی جائے گی کیونکہ ہندوستان کے تمام جیوتشی عام طور پر دن کا شمار ایک طلوع آفتاب سے دوسرے طلوع آفتاب تک کرتے ہیں ۔ چونکہ غالب اتوار کا سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے پیدا ہوئے تھے اس لیے اُن کی پیدائش اتوار کے دن

میں شمار نہیں کی جائے گی بلکہ اس سے پچھلے دن یعنی سنیچر کے دن میں شمار ہوگی ۔ ہندو جیوتشیوں کے مطابق نئے دن کی ابتدا طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔ ایک دن رات کی مدت کو ساٹھ برابر کے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر حصے کو ایک گھڑی کہتے ہیں ۔ ہر گھڑی کے بھی ساٹھ حصے کئے جاتے ہیں اور ہر حصے کو ایک پل کہتے ہیں ۔ طلوع آفتاب سے پیدائش کے وقت تک جتنی مدت گھڑی پل میں گزر جاتی ہے اسے ''اشٹ کال'' کہتے ہیں ۔ لہذا ہندو جیوتش کے مطابق غالب کی پیدائش سنیچر کے دن ، ۵۶ گھڑی صفر پل اشٹ کال پر ہوئی تھی ، اور پیدائش کے وقت سمبت ۱۸۵۴ بکرمی تھا ، شاکا ۱۷۱۸ شالباہن تھا ، پوس کا مہینہ تھا ، شدی پا کھ تھا ، دشمی تتھی تھی ، بھرنی نکشتر تھا ، سادھیہ یوگ تھا ، تیتل کرن تھا ، اور دھن راس کی لگن تھی ۔

مندرجہ بالا تمام تفصیلات میں نے غالب کے اس زائچے کی مدد سے حساب لگا کر حاصل کی ہیں جو غالب کے ''کلیات فارسی'' کے نولکشوری ایڈیشن میں شائع ہوا تھا اور جس کا عکس اس مضمون کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے ۔ اس زائچے کے ساتھ ہی غالب کا وہ عظیم‌الشان قصیدہ بھی ہے جو اُنھوں نے سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ‌السلام کی شان میں کہا ہے ۔ اس قصیدے کا ایک ایک لفظ پڑھنے ، سمجھنے اور غور کرنے کے قابل ہے ۔ اس قصیدے کی تشبیب میں غالب نے اپنے اسی زائچے پر سیر حاصل تبصرہ اپنے خاص انداز میں کیا ہے ، اور بڑے عالمانہ و شاعرانہ پیرائے میں زائچے کے مختلف سیاروں کے سعد و نحس اثرات کا ذکر کیا ہے جس سے بلا شک و شبہ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب علم نجوم پر کامل عبور رکھتے تھے ۔ اس زائچے کی تفصیل اور متعلقہ قصیدے کی تشبیب پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ عام پڑھنے والوں کی سہولت اور دلچسپی کے لیے علم نجوم کی وہ چند ابتدائی باتیں اور اصطلاحات نہایت اختصار کے ساتھ آسان الفاظ میں بیان کردی جائیں جن کو سمجھے بغیر زائچے کی تفصیل اور قصیدے کی تشبیب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی ۔

منجمین نے آسمان پر اس فرضی دائرے کو ، جس پر آفتاب اور دیگر سیارے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ، بارہ برابر کے حصوں میں تقسیم کرلیا ہے اور ہر حصے کو برج کہتے ہیں ۔ ان بروج کے سعد و نحس اثرات وغیرہ بھی مقرر کر لیے گئے ہیں جو کسی بھی نجوم کی کتاب کو پڑھ کر

معلوم کئے جاسکتے ہیں ۔ اس مقام پر میں صرف وہی باتیں بتاؤں گا جن کا تعلق نفس مضمون سے ہے ۔ چونکہ پورے دائرے میں ۳٦٠ درجے ہوتے ہیں اس لیے ہر برج میں ۳٠ درجے شمار کئے جاتے ہیں اور ہر درجے کے ساٹھویں حصے کو دقیقہ کہتے ہیں ۔ ان بارہ بروج کے عربی نام بالترتیب یہ ہیں ۔ (۱) حمل (۲) ثور (۳) جوزا (۴) سرطان (۵) اسد (٦) سنبلہ (۷) میزان (۸) عقرب (۹) قوس (۱٠) جدی (۱۱) دلو (۱۲) حوت ۔ برج حوت کے فوراً بعد پھر برج حمل شروع ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح ایک دائرے کے اندر چلتا رہتا ہے ۔ ہندوؤں کی پترہ کے مطابق برج کو راس کہتے ہیں اور ان بارہ راسوں کے نام بالترتیب یہ ہیں ۔ (۱) میکھ (۲) برکھ (۳) متھن (۴) کرک (۵) سنگھ (٦) کنیا (۷) تلا (۸) برشچک (۹) دھن (۱٠) مکر (۱۱) کنبھ (۱۲) مین ۔ ان بروج کے نام اُن فرضی شکلوں کے مطابق رکھے گئے ہیں جو مختلف مجمع‌النجوم کی وجہ سے آسمان پر نظر آتی ہیں اور مشاہدۂ فلک کی ذارا سی مشق کے بعد آسانی سے پہچانی جاسکتی ہیں ۔ لہذا حمل کی شکل ایک مینڈھے کی طرح ہے جس کا مزاج آتشی ہے اور خاصیت منقلب ہے ۔ ثور کی شکل ایک سانڈ کی طرح ہے جس کا مزاج خاکی ہے اور خاصیت ثابت ہے ۔ جوزا کی شکل دو انسانی جسموں کی طرح ہے جس کا مزاج بادی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے ۔ سرطان کی شکل ایک کیکڑے کی طرح ہے جس کا مزاج آبی ہے اور خاصیت منقلب ہے ۔ اسد کی شکل ایک شیر کی طرح ہے جس کا مزاج آتشی ہے اور خاصیت ثابت ہے ۔ سنبلہ کی شکل ایک لڑکی کی طرح ہے جس کا مزاج خاکی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے ۔ میزان کی شکل ایک ترازو کی طرح ہے جس کا مزاج بادی ہے اور خاصیت منقلب ہے ۔ عقرب کی شکل ایک بچھو کی طرح ہے جس کا مزاج آبی ہے اور خاصیت ثابت ہے ۔ قوس کی شکل ایک کمان کی طرح ہے جو ایک عجیب و غریب مخلوق کے ہاتھ میں ہے ، جس کا مزاج آتشی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے ۔ جدی کی شکل ایک عجیب‌الخلقت جانور کی طرح ہے جو دریائی بھی ہے ، صحرائی بھی ہے اور چھپ کر حملہ کرتا ہے ، جس کا مزاج خاکی ہے اور خاصیت منقلب ہے ۔ دلو کی شکل ایک گھڑے کی طرح ہے جو ایک مرد کے ہاتھ میں ہے جس کا مزاج بادی ہے اور خاصیت ثابت ہے ۔ حوت کی شکل دو مچھلیوں کی طرح ہے جن کی دمیں جڑی ہوئی ہیں ۔ اس برج کا مزاج آبی ہے اور خاصیت ذوجسدین ہے ۔

برج حمل کی ابتدا کی شناخت کے لیے آسمان پر ایک چھوٹا سا ستارہ

مقرر کر لیا گیا ہے جسے اصطلاح نجوم میں نقطۂ اول حمل کہتے ہیں۔ اہل مغرب اس ستارے کو زیٹا پسیم کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہی وہ نقطہ تھا جہاں پر جب شمس پہنچتا تھا تو تمام دنیا میں دن اور رات برابر ہو جاتے تھے اور موسم اعتدال پر آجاتا تھا، اسی لیے اسے نقطۂ اعتدال بھی کہتے تھے اور چونکہ اُس وقت فصل ربیع کا زمانہ ہوتا تھا اس لیے اسے نقطۂ اعتدال ربیعی کہتے تھے۔ لیکن سینکڑوں سال بعد معلوم ہوا کہ نقطۂ اعتدال ربیعی دراصل نہایت آہستہ آہستہ نقطۂ اول حمل سے پیچھے کی طرف ہٹ رہا ہے، یعنی شمس نقطۂ اول حمل پر پہنچنے سے پہلے ہی نقطۂ اعتدال ربیعی پر پہنچ جاتا ہے اور اس طرح شمس کے برج حمل میں داخل ہونے سے پہلے ہی دن رات برابر ہو جاتے ہیں اور موسم اعتدال پر آجاتا ہے۔ یہ فرق معلوم ہونے کے بعد اہل یونان نے نقطۂ اعتدال ربیعی ہی کو نقطۂ اول حمل بھی مان لیا اور عہد قدیم میں مقرر شدہ چھوٹے سے شناختی ستارے کو نظر انداز کر دیا، اور بارہ بروج کی ابتدا نقطۂ اعتدال ربیعی ہی سے شمار کرنی شروع کر دی۔ لیکن اہل ہند نے پیچھے ہٹتے ہوئے نقطۂ اعتدال ربیعی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور بارہ بروج کی ابتدا اُسی چھوٹے سے ستارے سے کرتے رہنے کا فیصلہ کیا جو عہد قدیم میں نقطۂ اول حمل کی شناخت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اُسی وقت سے اہل یونان اور اہل ہند کی تقویم میں فرق پڑ گیا۔ اس طرح اہل یونان کے بروج دراصل آسمانی مجمع النجوم کی شکلوں کے پابند نہیں رہے بلکہ محض فرضی و عارضی ہو کر رہ گئے، جو متواتر پیچھے کی طرف سرکتے جا رہے ہیں۔ لیکن اہل ہند کے بروج عہد قدیم کی طرح اب بھی مجمع النجوم کی شکلوں کے پابند ہیں اور حقیقی و مستقل ہیں جو کبھی آگے یا پیچھے نہیں سرکتے۔ بہرحال یہ فرضی نقطۂ اول حمل آہستہ آہستہ حقیقی نقطۂ اول حمل سے پیچھے سرکتا جا رہا ہے اور ایک سال میں تقریباً ایک دقیقے سے کچھ کم پیچھے سرک جاتا ہے۔ ان دونوں نقطوں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اُسے اہل ہند اینانش کہتے ہیں۔ یعنی اگر استخراج تقویم ہندی کے مطابق معلوم کئے ہوئے سیاروں کے مقامات میں اینانش کو جمع کر دیا جائے تو تقویم یونانی حاصل ہو جائے گی اور اس کے برعکس اگر استخراج تقویم یونانی میں سے اینانش کو تفریق کر دیا جائے تو تقویم ہندی حاصل ہو جائے گی۔ اینانش کی مقدار میں بھی منجمین کا بہت کچھ اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف چند درجوں یا چند دقیقوں سے زیادہ نہیں ہے۔ غالب کی پیدائش کے وقت اینانش تقریباً

۲۱ درجے تھا ، اور اُن کا زائچہ موافق استخراج تقویم یونانی بنایا گیا تھا ۔
مندرجہ بالا بارہ بروج کی شکلوں کے تمام ستارے اپنی جگہ ہمیشہ قائم اور ثابت رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان بروج کی شکلیں بھی ہمیشہ یکساں رہتی ہیں ۔ ان ثوابت کے درمیان چند سیارے بھی نظر آتے رہتے ہیں جو اپنی جگہ قائم نہیں رہتے بلکہ ہمیشہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں ۔ یہ سیارے کبھی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف سرکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ جب یہ سیارے مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہیں تو اُن کی رفتار کو سیدھی چال یا استقامت کہتے ہیں ، اور جب یہ مشرق سے مغرب کی طرف چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو ان کی رفتار کو اُلٹی چال یا رجعت کہتے ہیں ۔ ان سیاروں کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی دھیمی پڑ جاتی ہے ۔ ان سیاروں میں شمس اور قمر سب سے زیادہ روشن ہیں ۔ ان دونوں کو نیرین کہتے ہیں اور یہ ہمیشہ استقامت میں رہتے ہیں ۔ نیرین کے علاوہ پانچ سیارے مریخ ، عطارد ، مشتری ، زھرہ اور زحل بھی ہیں جو کبھی استقامت میں ہوتے ہیں ، کبھی رجعت میں ، اسی لیے ان پانچوں کو خمسۂ متحیرہ کہتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دو فرضی نقطے بھی ہیں جو در اصل مدار شمسی اور مدار قمری کے نقاط تقاطع ہیں ۔ ایک نقطے کو ذنب اور دوسرے نقطے کو راس کہتے ہیں ۔ علم نجوم میں ان دونوں کو بھی کسی حد تک دو نحس سیاروں کی سی حیثیت دیدی گئی ہے ۔ یہ دونوں ہمیشہ رجعت میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے ہمیشہ چھ بروج کے فاصلے پر رہتے ہیں ۔ یعنی ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل اور روبرو رہتے ہیں اس لیے اگر ایک کا مقام معلوم ہو جائے تو دوسرے کا مقام خود بخود حاصل ہو جاتا ہے ۔ ھندوؤں کی پترہ کے مطابق ان نو سیاروں کے نام بالترتیب یہ ہیں ۔ (۱) سوربہ (۲) چندر (۳) منگل (۴) بدھ (۵) برھسپتی (۶) شکر (۷) شنی (۸) راھو (۹) کیتو ۔ یہی نو عدد سیارے زیادہ مشہور ہیں اور ان سیاروں کے مختلف سعد و نحس اثرات مفصل طور پر مقرر کر لیے گئے ہیں جو علم نجوم کی مختلف کتابوں میں درج ہیں ۔ ان کی حرکتوں کا صحیح حساب بھی معلوم کر لیا گیا ہے جو علم ہیئت کی مختلف کتابوں میں درج ہے ۔ پڑھنے والوں کی واقفیت کے لیے صرف چند ضروری باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔

شمس : شمس نحس سیارہ سمجھا جاتا ہے اور فلک چہارم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج آتشی ہے اور شہنشاہ فلک کہلاتا ہے ۔ قمر ، مریخ اور مشتری اس کے دوست ہیں ۔ زھرہ اور زحل اس کے دشمن ہیں ۔ عطارد اس سے بے تعلق ہے ۔ یہ برج اسد کا مالک ہے اور برج دلو میں اس پر وبال آتا ہے ۔ حمل میں شرف اور میزان میں ہبوط ہوتا ہے ۔ جوزا میں اوج اور قوس میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً ایک دن میں ، ایک برج کو تقریباً ایک مہینے میں ، اور پورے دائرۂ بروج کو تقریباً ایک سال میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ ھمیشہ استقامت میں رھتا ہے ۔

قمر : قمر سعد سیارہ سمجھا جاتا ہے اور فلک اول سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج آبی ہے اور وزیر فلک کہلاتا ہے ۔ شمس اور عطارد اس کے دوست ہیں ۔ کوئی اس کا دشمن نہیں ہے ۔ مریخ ، مشتری ، زھرہ اور زحل اس سے بے تعلق ھیں ۔ یہ برج سرطان کا مالک ہے ، برج جدی میں اس پر وبال آتا ہے ۔ ثور میں شرف اور عقرب میں ھبوط ھوتا ہے ۔ اس کے اوج و حضیض تیز رفتاری سے تبدیل ھوتے رہتے ھیں اور حساب لگا کر معلوم کرنے پڑتے ھیں ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً پونے دو گھنٹے میں ، ایک برج کو تقریباً سوا دو دن میں ، اور پورے دائرۂ بروج کو تقریباً ایک مہینے میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ بھی شمس کی طرح ھمیشہ استقامت میں رھتا ہے ۔

مریخ : مریخ نحس اصغر ہے اور فلک پنجم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج آتشی ہے اور جلاد فلک کہلاتا ہے ۔ شمس ، قمر اور مشتری اس کے دوست ھیں ۔ عطارد اس کا دشمن ہے ۔ زھرہ اور زحل اس سے بے تعلق ھیں ۔ یہ حمل و عقرب کا مالک ہے اور ثور و میزان میں اس پر وبال آتا ہے ۔ جدی میں شرف اور سرطان میں ھبوط ھوتا ہے ۔ اسد میں اوج اور دلو میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً دو دن میں ، ایک برج کو تریباً دو مہینے میں ، اور پورے دائرۂ بروج کو تقریباً دو سال میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ ایک سال میں تقریباً دس مہینے تک استقامت میں رھتا ہے اور تقریباً دو مہینے تک رجعت میں رھتا ہے ۔

عطارد : "عطارد جیسے سیاروں کے ساتھ ھوتا ہے ویسا ھی سعد و نحس ثمرہ دیتا ہے ، اور فلک دوم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج بادی ہے او

دبیر فلک کہلاتا ہے ۔ شمس اور زہرہ اس کے دوست ہیں ۔ قمر اس کا دشمن ہے ۔ مریخ مشتری اور زحل اس سے بے تعلق ہیں ۔ یہ جوزا و سنبلہ کا مالک ہے اور قوس و حوت میں اس پر وبال آتا ہے۔ سنبلہ میں شرف اور حوت میں ہبوط ہوتا ہے ۔ میزان میں اوج اور حمل میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً چھ گھنٹے میں ، ایک برج کو تقریباً ساڑھے سات دن میں ، اور پورے دائرہ بروج کو تقریباً تین مہینے میں طے کر سکتا ہے ، لیکن چونکہ یہ ہمیشہ شمس کے آس پاس ہی رہتا ہے ، اور کبھی سیدھی کبھی الٹی چال چلتا ہے ، اس لیے یہ بھی تمام آسمان کا چکر کم و بیش اسی عرصے میں لگاتا ہے جس عرصے میں شمس لگاتا ہے ۔ یہ چار مہینے میں تقریباً اٹھانوے دن استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً بائیس دن رجعت میں رہتا ہے ۔ یعنی یہ ایک سال میں تین دفعہ راجع ہوتا ہے ۔

مشتری : مشتری سعد اکبر ہے اور فلک ششم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج بادی ہے اور قاضی فلک کہلاتا ہے ۔ شمس ، قمر اور مریخ اس کے دوست ہیں ۔ عطارد اور زہرہ اس کے دشمن ہیں ، زحل اس سے بے تعلق ہے ۔ یہ قوس و حوت کا مالک ہے اور جوزا و سنبلہ میں اس پر وبال آتا ہے ۔ سرطان میں شرف اور جدی میں ہبوط ہوتا ہے ۔ حوت میں اوج اور سنبلہ میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریبا بارہ دن میں ، ایک برج کو تقریباً ایک سال میں ، اور پورے دائرہ بروج کو تقریباً بارہ سال میں طے کر لیتا ہے ۔ یہ ایک سال میں تقریباً آٹھ مہینے تک استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً چار مہینے تک رجعت میں رہتا ہے ۔

زہرہ : زہرہ سعد اصغر ہے اور فلک سوم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کا مزاج بادی ہے اور رقاصہ' فلک کہلاتا ہے ۔ عطارد اور زحل اس کے دوست ہیں ۔ شمس اور قمر اس کے دشمن ہیں ۔ مریخ اور مشتری اس سے بے تعلق ہیں ۔ یہ ثور و میزان کا مالک ہے اور حمل و عقرب میں اس پر وبال آتا ہے ۔ حوت میں شرف اور سنبلہ میں ہبوط ہوتا ہے ۔ جوزا میں اوج اور قوس میں حضیض واقع ہے ۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً سولہ گھنٹے میں ، ایک برج کو تقریباً بیس دن میں ، اور تمام دائرہ' بروج کو تقریباً آٹھ مہینے میں طے کر سکتا ہے ، لیکن چونکہ عطارد کی طرح یہ بھی ہمیشہ شمس کے آس پاس ہی رہتا ہے ، اس لیے یہ بھی تمام آسمان کا

چکر کم و بیش اتنے ہی عرصے میں لگاتا ہے جتنے عرصے میں شمس لگاتا ہے۔ یہ ایک سال میں تقریباً گیارہ مہینے تک استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً ایک مہینے تک رجعت میں رہتا ہے۔

زحل : زحل نحس اکبر ہے اور فلک ہفتم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مزاج خاکی ہے اور دہقان فلک کہلاتا ہے۔ عطارد اور زہرہ اس کے دوست ہیں۔ شمس، قمر اور مریخ اس کے دشمن ہیں۔ مشتری اس سے بے تعلق ہے۔ یہ جدی و دلو کا مالک ہے اور سرطان و اسد میں اس پر وبال آتا ہے۔ میزان میں شرف اور حمل میں ہبوط ہوتا ہے۔ قوس میں اوج اور جوزا میں حضیض واقع ہے۔ یہ اپنی اوسط رفتار سے ایک درجے کو تقریباً ایک مہینے میں، ایک برج کو تقریباً ڈھائی سال میں اور تمام دائرۂ بروج کو تقریباً تیس سال میں طے کر لیتا ہے۔ یہ ایک سال میں تقریباً ساڑھے سات مہینے تک استقامت میں رہتا ہے اور تقریباً ساڑھے چار مہینے تک رجعت میں رہتا ہے۔

راس اور ذنب : راس اور ذنب کو اہل ہند بالترتیب راہو اور کیتو کہتے ہیں۔ یہ دونوں نحس سمجھے جاتے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل اور روبرو یعنی چھ بروج کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ ان دونوں کو ایک اژدہے سے تشبیہ دی جاتی ہے جس کے سر کو راس اور دم کو ذنب کہتے ہیں۔ اہل ہند راہو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن اہل یونان ذنب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان دونوں کی رفتار ہمیشہ یکساں رہتی ہے اور یہ دونوں ایک درجے کو تقریباً انیس دن میں، ایک برج کو تقریباً انیس مہینے میں، اور تمام دائرہ بروج کو تقریباً انیس سال میں طے کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ رجعت میں رہتے ہیں۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد پڑھنے والوں کے ذہن میں بروج و سیارگان کا ایک دھندلا سا خاکہ آگیا ہو گا۔ جس کی مدد سے غالب کے زائچے کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جب کوئی سیارہ گردش کرتا ہوا اس برج میں پہنچتا ہے جو اس کا بیت یا گھر ہوتا ہے یعنی جس کا وہ مالک ہوتا ہے تو وہ سیارہ صاحب استطاعت سمجھا جاتا ہے، جب وہ اپنے برج وبال میں پہنچتا ہے تو بے بضاعت سمجھا جاتا ہے، جب وہ اپنے برج شرف میں پہنچتا ہے تو صاحب عزت سمجھا جاتا ہے، جب

وہ اپنے برج ہبوط میں پہنچتا ہے تو بے عزت سمجھا جاتا ہے ، جب وہ اپنے برج اوج میں پہنچتا ہے تو بلند ہمت سمجھا جاتا ہے ، جب وہ اپنے برج حضیض میں پہنچتا ہے تو پست ہمت سمجھا جاتا ہے - جب وہ اپنے دوست کے برج میں پہنچتا ہے تو بشاش طبع سمجھا جاتا ہے ، جب وہ اپنے دشمن کے برج میں پہنچتا ہے تو کبیدہ خاطر سمجھا جاتا ہے ، جب وہ اپنے سے بے تعلق کے برج میں پہنچتا ہے تو اجنبی سمجھا جاتا ہے - جب وہ استقامت میں ہوتا ہے تو تندرست سمجھا جاتا ہے ، اور جب وہ رجعت میں ہوتا ہے تو بیمار سمجھا جاتا ہے - غرض یہ کہ ہر سیارہ اپنی اصلیت ، اپنی خاصیت ، اپنی حیثیت اور اپنی حالت وغیرہ کے مطابق مختلف زائچوں میں مختلف ثمرہ دیتا ہے - منجمین نے مختلف بروج سیارگان کے انفرادی اور اجتماعی اثرات بیان کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ نکالا ہے کہ بروج اور سیاروں کو مختلف صورتوں ، طبیعتوں اور کرداروں کے افراد فرض کر لیا ہے اور زائچے میں جیسی اُن کی حالت ہوتی ہے ویسی ہی تاثیر اور ویسے ہی ثمرات اُن سے اخذ کر لیے جاتے ہیں - اس فن کو علم نجوم کی اصطلاح میں " تمزیج سیارگاں " کہتے ہیں اور مرزا غالب اس فن کے میدان میں سب سے گوئے سبقت لے گئے ہیں - تمزیج سیارگاں کی افادیت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کا مفصل بیان کفایة التعلیم فی صناعة التنجیم میں کیا گیا ہے -

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمزیج سیارگاں کی چند مثالیں دے کر اس فن کی کچھ وضاحت کردی جائے تا کہ غالب کے قصیدے کی تشبیب کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکے - مثلاً زائچے میں زحل اگر اچھی حالت میں ہو تو اُسے دھقان یا کشاورز وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن اگر وہ بری حالت میں ہو تو اُسے کافر یا دزد وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں - مریخ اگر اچھی حالت میں ہو تو اُسے سپاہی یا سپہ سالار وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن اگر وہ بری حالت میں ہو تو اُسے قاتل یا قصاب وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں - زہرہ اگر اچھی حالت میں ہو تو اُسے رقاصہ یا مطربہ وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن اگر وہ بری حالت میں ہو تو اُسے فاحشہ یا قحبہ وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں - اسی طرح دیگر سیاروں کے لیے بھی سمجھ لینا چاھیے - ان سیاروں کے باھمی تعلقات کے لیے اُن کی " نظروں " کو سمجھ لینا بھی ضروری ہے ، یعنی اگر دو سیاروں کے درمیان چھ بروج کا فاصلہ ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نظر تنصیف سے دیکھ رہے ہیں - اگر چار بروج کا فاصلہ ہو تو

اسے نظر تثلیث کہتے ہیں، اگر تین بروج کا فاصلہ ہو تو اُسے نظر تربیع کہتے ہیں، اور اگر دو بروج کا فاصلہ ہو تو اُسے نظر تسدیس کہتے ہیں۔ تنصیف کو مکمل دشمنی کی نظر، تثلیث کو مکمل دوستی کی نظر، تربیع کو نصف دشمنی کی نظر، اور تسدیس کو نصف دوستی کی نظر سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی زائچے میں مریخ اور زحل آپس میں ایک دوسرے کو نظر تربیع سے دیکھ رہے ہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ دونوں سیاروں پر ایک دوسرے کی نصف دشمنی کا برا اثر پڑ رہا ہے۔ یعنی اُس زائچے کے مولود کو مریخ ایک کینہ خاطر سنگدل انسان کی طرح ستا رہا ہے اور اُس کے ساتھ ہی زحل بھی اُس مولود کو خشم آلود کافر کی طرح برباد کر رہا ہے۔ یا مثلاً اگر کسی زائچے میں شمس، زحل اور زہرہ ایک ہی برج میں موجود ہوں اور اچھی حالت میں ہوں تو یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک شہنشاہ کے ساتھ ایک دھقان بیٹھا ہوا ہے اور ایک مطربہ اُن دونوں کے سامنے گا رہی ہے۔ اسی قسم کی بہت سی اور بھی تشبیہات کو اصطلاحاً تمزیج سیارگان کہتے ہیں۔

تمزیج سیارگان کے بعد سہام کے متعلق بھی کچھ واقفیت بہم پہنچا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مختلف سہام کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کا مفصل بیان کتاب التفہیم لاوائل صناعۃالتنجیم میں موجود ہے۔ منجمین نے طالع کے لحاظ سے مختلف سیاروں کی ایک دوسرے سے دوری کی بنیاد پر مختلف سہام مقرر کیے ہیں جن کے استخراج کا طریقہ دن کے وقت کچھ اور ہوتا ہے اور رات کے وقت کچھ اور ہوتا ہے۔ چونکہ غالب کی پیدائش رات کے وقت ہوئی تھی اس لیے میں صرف رات کے وقت کا طریقہ بیان کروں گا اور صرف انھی چار سہام کا ذکر کروں گا جن کے نام غالب کے زائچے میں درج ہیں۔ سہم السعادت حاصل کرنے کے لیے شمس کے مقام میں سے قمر کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ سہم الغیب معلوم کرنے کے لیے قمر کے مقام میں سے شمس کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ سہم اولاد معلوم کرنے کے لیے مشتری کے مقام میں سے زحل کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ سہم امراض معلوم کرنے کے لیے زحل کے مقام میں سے مریخ کے مقام کو تفریق کرتے ہیں اور حاصل تفریق میں طالع کو جمع کرتے ہیں۔ ان سہام کے بھی مختلف نیک و بد ثمرات مقرر کرلیے گیے ہیں لیکن اُن کے متعلق یہاں کچھ بیان نہیں کیا جائے گا۔

اب زائچے کی شکل کے متعلق بھی چند ابتدائی باتیں درج کی جاتی ہیں تاکہ غالب کے زائچہ کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو سکے - کسی خاص شخص کی پیدائش کے وقت اُس کا زائچہ بنانے کے لیے بارہ خانوں والا ایک نقشہ دائرہ نما یا مربع نما ، یا مستطیل نما بنایا جاتا ہے۔ پھر پیدائش کی ساعت اور مقام پیدائش کے مطابق حساب لگا کر معلوم کیا جاتا ہے کہ اُس وقت افق مشرق میں کون سا برج طلوع ہو رہا ہے - جو برج طلوع ہو رہا ہوتا ہے اُسے اُس نقشے کے پہلے خانے میں لکھ دیا جاتا ہے اور اُس برج کے طلوع شدہ درجے اور دقیقے بھی اُس کے ساتھ ہی لکھ دیے جاتے ہیں - اس کے بعد اُس سے اگلے برج کو اُس نقشے کے دوسرے خانے میں لکھ دیا جاتا ہے اور پھر اُس نقشے کے باقی خانوں میں بھی باقی بروج بالترتیب لکھ دیے جاتے ہیں - اس طرح جو برج اُس وقت افق مغرب میں غروب ہو رہا ہوتا ہے وہ خود بخود اُس نقشے کے ساتویں خانے میں پڑ جاتا ہے ، جو برج سر کے اوپر خط نصف النہار پر ہوتا ہے وہ دسویں خانے میں پڑ جاتا ہے ، اور جو برج زمین کی دوسری سمت میں ہمارے قدموں کے نیچے (یعنی امریکہ کے نصف النہار پر) ہوتا ہے وہ چوتھے خانے میں پڑ جاتا ہے۔ اُن چاروں خانوں کو بہت ہی اہم سمجھا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو وتد اور چاروں کو اوتاد کہتے ہیں - خصوصاً پہلے خانے کو یا اُس کے برج کو طالع اور ساتویں خانے کو یا اُس کے برج کو غارب کہتے ہیں - اہل ہند طالع کو لگن کہتے ہیں - اس کے بعد یہ حساب لگایا جاتا ہے کہ اُس دن اور تاریخ کو سیاروں کے مقامات کیا تھے - پھر جو سیارہ جس برج میں ہوتا ہے اُسے اُسی برج کے خانے میں لکھ دیا جاتا ہے اور اُس کے طے شدہ درجے اور دقیقے بھی اُس کے ساتھ لکھ دیے جاتے ہیں - اس طرح زائچہ مکمل ہو جاتا ہے - بعض منجمین سہم السعادت ، سہم الغرب ، سہم اولاد ، سہم امراض وغیرہ کو بھی زائچے میں مناسب مقامات پر لکھ دیتے ہیں - مختلف خانوں میں مختلف بروج کے درجے اور دقیقے معلوم کرنے کا بھی ایک جداگانہ طریقہ ہے جو یہاں بیان نہیں کیا گیا ، کیونکہ زیر تحریر مضمون سے اُس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے - زائچے کے بارہ خانوں کی سعادت و نحوست بھی اُن بروج اور اُن سیاروں پر منحصر ہوتی ہے جو پیدائش کے وقت اُن خانوں میں واقع ہوتے ہیں - زائچے کا ہر خانہ بھی ایک خاص شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً مولود کے زائچے کا پہلا خانہ جسم اور دل سے تعلق رکھتا ہے ، دوسرا خانہ دولت اور خاندان سے ، تیسرا خانہ بھائی اور

طاقت سے ، چوتھا خانہ ماں اور سکون سے ، پانچواں خانہ بیٹے اور علم سے ، چھٹا خانہ دشمن اور بیماری سے ، ساتواں خانہ بیوی اور عیش سے ، آٹھواں خانہ موت اور عمر سے ، نواں خانہ قسمت اور ایمان سے ، دسواں خانہ حکومت اور کاروبار سے ، گیارھواں خانہ آمدنی اور فائدے سے ، اور بارھواں خانہ خرچ اور نقصان سے تعلق رکھتا ہے۔

غالب کے زمانے میں زائچے کے اندر ہندسے لکھنے کا رواج نہیں تھا بلکہ ابجد ، ہوز کے قاعدے کے مطابق ہندسوں کے بجائے حروف لکھ دیے جاتے تھے - یعنی ھا کا صفر ، الف کا ایک ، ب کے ۲ ، ج کے ۳ ، د کے ۴ ، ھ کے ۵ ، و کے ۶ ، ز کے ۷ ، ح کے ۸ ، ط کے ۹ ، ی کے ۱۰ ، ک کے ۲۰ ، ل کے ۳۰ ، م کے ۴۰ ، ن کے ۵۰ ، س کے ۶۰ ، ع کے ۷۰ ، ف کے ۸۰ ، ص کے ۹۰ ، ق کے ۱۰۰ ، ر کے ۲۰۰ ، ش کے ۳۰۰ ، ت کے ۴۰۰ ، ث کے ۵۰۰ ، خ کے ۶۰۰ ، ذ کے ۷۰۰ ، ض کے ۸۰۰ ، ظ کے ۹۰۰ ، اور غ کے ۱۰۰۰ ہوتے ہیں۔ اب اگر ہمیں ۸ لکھنا ہے تو صرف ح لکھ دینا کافی ہوگا - اور ہمیں ۲۷ لکھنا ہے تو ک اور ز کو ملاکر ہم کز لکھیں گے ، اور اگر ۳۹ لکھنا ہے تو لط لکھیں گے - یعنی اگر کسی وقت کسی مقام پر طالع برج قوس کے ۲۷ درجے ۳۹ دقیقے پر ہے تو ہم زائچے کے پہلے خانے میں صرف ح کز لط لکھ دیں گے ، کیونکہ آٹھ مکمل بروج طے ہو چکے ہیں اور نواں نا مکمل برج قوس طلوع ہو رہا ہے جس کے ۲۷ درجے ۳۹ دقیقے طلوع ہو چکے ہیں - اب اگر ہم حساب لگا کر معلوم کریں کہ اُس وقت سیارہ زھرہ بھی برج قوس میں تھا اور اُس برج کے ۱۴ درجے ۲۳ دقیقے طے کرچکا تھا تو ہم زھرہ کو بھی زائچے کے پہلے خانے میں لکھ کر اُس کے نیچے یدکج لکھ دیں گے - اسی طرح تمام سیاروں اور سہام کو زائچے کے متعلقہ خانوں میں لکھ دیاجاتا ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں - صفحہ ۲۲ پر غالب کے اُس زائچے کا عکس دیا جاتا ہے جو اُن کے کلیات فارسی کے نولکشوری ایڈیشن مطبوعہ ۱۲۷۹ ھجری (۱۸۶۳ عیسوی) میں شائع ہوا تھا اور جس کی اشاعت کے چھ سال بعد تک غالب زندہ رہے تھے - یہ زائچہ صفحہ ۱۹۸ اور صفحہ ۱۹۹ کے درمیان موجود ہے - غالب کا یہی زائچہ کلیات فارسی مطبوعہ ۱۲۶۴ ھجری (۱۸۴۸ عیسوی) میں بھی موجود ہے - اور اُس میں بھی اسی قسم کی تفصیلات درج ہیں لیکن ذرا کم ہیں - اس کی شکل و صورت میں بھی

ذرا سا فرق ہے اور اس میں سنہ عیسوی کا ذکر بھی نہیں ہے ۔ یہ ملحوظ رہے کہ غالب کی پیدائش اکبرآباد یعنی آگرے کے مقام پر ہوئی تھی جس کا عرض البلد تقریباً ۲۷ درجے شمال ہے اور طول البلد تقریباً ۷۸ درجے مشرق ہے ۔ اس شائع شدہ زائچے کے طالع یعنی پہلے خانے کے سوا باقی خانوں کے درجوں اور دقیقوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ ہمارے مقصد کے لیے غیر ضروری ہے ۔ طالع کے درجے اور دقیقے معلوم ہوجانے کے بعد اسی کی مدد سے باقی خانوں کے درجے اور دقیقے خود بخود حاصل ہوجاتے ہیں ۔ زائچے کا عکس صفحہ ۲۲ پر ملاخط فرمائیے ۔

اس زائچے سے ہمیں مندرجہ ذیل خاص خاص باتیں معلوم ہوجاتی ہیں ۔

غالب کے شائع شدہ زائچے کے مطابق تقویم سیارگان

۱- استخراج تقویم یونانی بروز یکشنبہ ۸ رجب ، بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع آفتاب بمقام اکبر آباد (شائع شدہ سنہ ہجری ۱۲۱۳ ہے اور سنہ عیسوی ۱۷۹۸ ہے ، لیکن دونوں مشکوک ہیں جیسا کہ بعد میں بتایا جائے گا) ۔

۲- طالع یعنی پہلا خانہ ، برج قوس کے ۲۷ درجے ۳۹ دقیقے پر تھا ۔

۳- شمس دوسرے خانے میں ، برج جدی کے ۱۸ درجے ۲۰ دقیقے پر تھا ۔

۴- قمر چھٹے خانے میں ، برج ثور کے ۸ درجے ۲۱ دقیقے پر تھا ۔

۵- راس آٹھویں خانے میں ، برج سرطان کے صفر درجے ۱۵ دقیقے پر تھا ۔

۶- ذنب دوسرے خانے میں ، برج جدی کے صفر درجے ۱۵ دقیقے پر تھا ۔

۷- مریخ چوتھے خانے میں ، برج حوت کے ۲۳ درجے ۲۹ دقیقے پر تھا ۔

۸- عطارد دوسرے خانے میں ، برج جدی کے ۲۶ درجے ۸ دقیقے پر تھا ۔

۹- مشتری چوتھے خانے میں ، برج حوت کے ۱۰ درجے ۳۷ دقیقے پر تھا ۔

۱۰- زہرہ پہلے خانے میں ، برج قوس کے ۱۴ درجے ۲۳ دقیقے پر تھا ۔

موافق استخراج تقویم یونانی
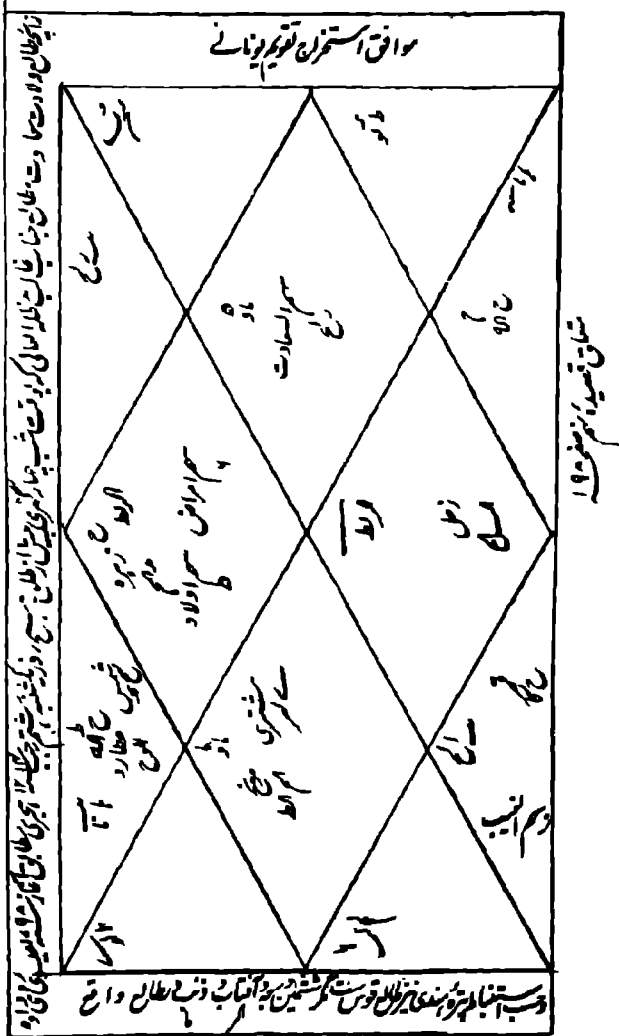
۱۱- زحل ساتویں خانے میں ، برج جوزا کے ۲۲ درجے ۲۸ دقیقے پر تھا -

۱۲- سہم السعادت دسویں خانے میں ، برج سنبلہ کے ۷ درجے ۳۸ دقیقے پر تھا -

(سہم الغیب ، سہم اولاد اور سہم امراض کا ذکر بعد میں کیا جائے گا) -

نوٹ : ھندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق بھی طالع برج قوس ھی میں تھا لیکن اُس برج کے چھ درجے پر تھا - اس کے علاوہ شمس بھی برج قوس کے ستائیس درجے پر تھا ، ذنب بھی برج قوس کے گیارہ درجے پر تھا -

معلوم نہیں غالب کا یہ زائچہ کس زیج کی بنیاد پر بنایا گیا تھا کیونکہ اُس زمانے میں بہت سی زیجیں رائج تھیں اور ھر زیج کے حسابات میں دوسری زیجوں کے حسابات سے چند درجوں یا چند دقیقوں کا فرق ضرور پڑ جاتا ھے - بہر حال اگر ھم اس معمولی سی اختلافی حقیقت کو سامنے رکھیں اور چند درجوں یا دقیقوں کے فرق کو نظر انداز کرنے کے بعد کسی بھی زیج کی مدد سے یہ معلوم کرنا چاھیں کہ سیاروں کے مندرجہ بالا اجتماعات کب واقع ھوئے تھے تو ھم کو غالب کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم ھو جائے گا ، کیونکہ زائچے میں سیاروں کے مجموعی مقامات صرف ایک خاص دن اور خاص ساعت ھی میں حاصل ھوتے ھیں اور پھر ھزاروں سال میں بھی اُس قسم کا زائچہ نہیں بن سکتا - اس لیے اگر غالب کے شائع شدہ زائچے کی سرخی میں اُن کی پیدائش کا وقت ، دن ، تاریخ اور سنہ نہ بھی لکھے ھوتے تو بھی صرف زائچے کے سیاروں کے مقامات ھی سے حساب لگا کر سب کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا - اس قسم کی ایک مثال اس مضمون کے آخر میں درج کر دی گئی ھے -

میں نے جن کتابوں اور زیجوں سے مدد لے کر مندرجہ ذیل حسابات لگائے ھیں اُن کا ذکر اس مضمون کے خاتمے پر کر دیا گیا ھے - یہ زیجیں مختلف صدیوں میں لکھی گئی ھیں اور ان میں مختلف اھرگن ، جولین ڈے اور تقویم سیارگاں وغیرہ معلوم کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ھیں - اھرگن

در اصل دنوں کی اُس تعداد کو کہتے ہیں جو ایک خاص تاریخ سے دوسری خاص تاریخ تک گزر جاتے ہیں ۔ لہذا میرے حساب کے مطابق غالب کا یہ زائچہ صرف اور صرف ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی مطابق ۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری بروز یکشنبہ بمقام اکبر آباد طلوع آفتاب سے چار گھڑی قبل یعنی انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علے الصباح ۵ بج کر ۳۶ منٹ کے لیے ھی ھو سکتا ھے ، کسی اور وقت ، دن ، تاریخ یا سنہ کے لیے ھر گز نہیں ھو سکتا ۔ مثال کے طور پر صرف قمر کے مقام ھی کو لیجئے ۔ اگر تاریخ پیدائش میں ایک دن کا بھی فرق ھو جائے تو قمر کے مقام میں تقریباً تیرہ درجے کا فرق ھو جائے گا ۔ یعنی اگر غالب کی پیدائش بتاریخ ۷ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز شنبہ فرض کریں تو قمر پانچویں خانے میں برج حمل کے تقریباً ۲۰ درجے پر آتا ھے ، حالانکہ غالب کے زائچے کے مطابق قمر چھٹے خانے میں برج ثور کے تقریبا ۸ درجے پر ھے ۔ یہ بات بھی بالکل یقینی طور پر کہی جا سکتی ھے کہ یہ زائچہ غالب کی پیدائش کے وقت ھی اُن کے والد نے کسی قابل منجم سے بنوایا تھا کیونکہ اگر یہ زائچہ بعد میں بنایا گیا ھوتا تو اُس میں اتنی صحیح تفصیلات درج نہ ھوتیں ۔ خصوصاً ھندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق ذنب کو برج قوس کے گیارہ درجے پر بتادا گیا ھے ۔ یہ اُسی وقت ممکن ھے جبکہ مکرند ساری سے بنی ھوئی اُس سال کی پترہ کو بغور دیکھ کر حساب لگایا گیا ھو ۔ ورنہ اگر یہ زائچہ کوئی منجم بعد میں بناتا تو ذنب کی یونانی تقویم (یعنی برج جدی کے صفر درجہ ۱۰ دقیقے) میں سے اینانش کے ۲۱ درجے تفریق کر کے ھندی تقویم (یعنی برج قوس کے ۹ درجے ۱۰ دقیقے) حاصل کر لیتا اور نتیجتاً گیارہ درجے کے بجائے ۹ درجے لکھ دیتا ۔ میرے حساب کے مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو صبح ۵ بجکر ۳۶ منٹ پر زائچے کے لیے مندرجہ ذیل تقویم سیارگاں حاصل ھوتی ھے ۔ عام پڑھنے والوں کی سمجھ میں اگر بعض علمی اصطلاحات نہ آئیں تو کوئی مضائقہ نہیں ھے کیونکہ ان کو سمجھے بغیر بھی نفس مضمون کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ھے ۔ میں نے طالع کے استخراج کے لیے این سی لاھری کی جدولوں سے کام لیا ھے ۔ شمس کی تقویم کے لیے نیوکومب کی زیج کے مطابق حساب لگایا ھے ۔ قمر ، راس اور اور ذنب کی تقویم کے لیے ای ڈبلیو براؤن کی زیج کا سہارا لیا ھے ۔ باقی سیاروں کے لیے گرہ لا گھو کی زیج کو بنیاد بنایا ھے ۔ استنباط پترہ ' ھندی کے لیے مکرند سارنی کی زیج کو استعمال کیا ھے اور تاریخوں

کی مطابقت کے لیے غرۃالزیجات کو اپنایا ہے۔ طلوع آفتاب کا وقت اور انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم وغیرہ معلوم کرنے کے لیے آگرے کی پلبھا کو تقریباً چھ انگل سات وینگل مانا ہے۔ چرکھنڈوں کو بالترتیب ۶۱ پل ، ۴۹ پل اور ۲۰ پل مانا ہے۔ عرض البلد کو تقریباً ۲۷ درجے شمال مانا ہے ، طول البلد کو تقریباً ۷۸ درجے مشرق مانا ہے ، قدیم لنکا کو تقریباً ۷۵ درجے ۴۰ دقیقے مشرق طول البلد پر مانا ہے ، اور انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کو ۸۲ درجے ۳۰ دقیقے مشرق طول البلد کے مطابق مانا ہے۔

میرے حساب کے مطابق تقویم سیارگان

۱- استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ بمقام اکبر آباد بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع آفتاب انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علی الصباح ۵ بجکر ۳۶ منٹ پر۔ اینانش تقریباً ۲۱ درجے۔ مساوات وقت تقریباً ۷ منٹ مثبت۔ غرۃ الزیجات اھرگن ۳۰۳۴۷۔ گرہ لاگھو چکر ۲۵ ، اھرگن ۶۹۳ ، جولین ڈے ۲۳۷۴۰۹۰۔

۲- طالع یعنی پہلا خانہ۔ برج قوس کے ۲۹ درجے ۱۸ دقیقے پر
(فرق ۱ درجہ ۳۹ دقیقے مثبت)

۳- شمس دوسرے خانے میں۔ برج جدی کے ۱۸ درجے ۲۰ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ صفر دقیقہ)

۴- قمر چٹھے خانے میں۔ برج ثور کے ۹ درجے ۱۸ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ ۵۷ دقیقے مثبت)

۵- راس آٹھویں خانے میں۔ برج سرطان کے صفر درجے ۴۰ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ ۱۱ دقیقے منفی)

۶- ذنب دوسرے خانہ میں۔ برج جدی کے صفر درجہ ۴۰ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ ۱۱ دقیقے منفی)

۷- مریخ چوتھے خانے میں۔ برج حوت کے ۲۵ درجے ۲۳ دقیقے پر
(فرق ۱ درجہ ۴۵ دقیقے مثبت)

۸- عطارد دوسرے خانے میں۔ برج جدی کے ۲۸ درجے ۱۲ دقیقے پر
(فرق ۲ درجے ۴ دقیقے مثبت)

۹- مشتری چوتھے خانے میں - برج حوت کے ۱۱ درجے ۳٦ دقیقے پر
(فرق ۱ درجہ ۹ دقیقے مثبت)

۱۰- زہرہ پہلے خانے میں - برج قوس کے ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ ۱۷ دقیقے مثبت)

۱۱- زحل ساتویں خانے میں - برج جوزا کے ۲۵ درجے ۱٦ دقیقے پر
(فرق ۲ درجے ۳۸ دقیقے مثبت)

۱۲- سہم السعادت - دسویں خانے میں ، برج سنبلہ کے ۸ درجے ۲۰ دقیقے پر
(فرق صفر درجہ ۲۳ دقیقے مثبت)

نوٹ : ہندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق طالع برج قوس کے چھ درجے پر تھا ، شمس برج قوس کے ستائیس درجے پر تھا ، اور ذنب برج قوس کے گیارہ درجے پر تھا - (یہ مقامات بجنسہ وہی ہیں جو غالب کے شائع شدہ زائچے میں درج ہیں اور ان سے میرے بیان کی صداقت کسی شک و شبہ کے بغیر ثابت ہو جاتی ہے) -

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں - ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی ، سلسلہٗ انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۱۲۲ ، مطبوعہ دہلی (۱۹۳۹ء) کے مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو ۹ رجب ۱۲۱۱ ہجری کی تاریخ پڑتی ہے ، لیکن غالب کے زائچے کی سرخی کے مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری کی تاریخ تھی - اس بات سے شاید عام پڑھنے والوں کے دلوں میں شک پڑ جائے ، اس لیے پہلے میں ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی کی اصل حقیقت کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں - یہ تقویم در اصل شمس و قمر کی صرف اوسط رفتاروں کی بنیاد پر بنائی گئی ہے ، اور اس میں عام طور پر سلسلہ وار ایک قمری مہینہ ۳۰ دن کا اور دوسرا قمری مہینہ ۲۹ دن کا سمجھا جاتا ہے - سال کبیسہ میں ذی الحجہ کے مہینے کو بھی ۲۹ کے بجائے ۳۰ دن کا سمجھ لیا جاتا ہے - لیکن جیسا کہ زیج الغ بیگ میں ثابت کیا گیا ہے ، حقیقی رویت ہلال کے مطابق کبھی دو ، کبھی تین ، کبھی چار اور کبھی پانچ قمری مہینے یکے بعد دیگرے متواتر تیس تیس دن کے ہو سکتے ہیں - اسی طرح کبھی دو اور کبھی تین قمری مہینے یکے بعد دیگرے متواتر انتیس

آنتیس دن کے بھی ہو سکتے ہیں ۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی کے مطابق معلوم کی ہوئی اوسط ہجری تاریخ اور رویت ہلال کے مطابق معلوم کی ہوئی حقیقی ہجری تاریخ کے درمیان کبھی ایک دن اور کبھی دو دن کا فرق پڑ سکتا ہے ۔ بلکہ اگر مطلع صاف نہ ہو تو تین دن کا فرق بھی پڑ سکتا ہے ، اس لیے جو حضرات کسی تحقیقی کام کے لیے ایڈورڈ ماہلر کی تقویم ہجری و عیسوی کو حرف آخر سمجھ لیتے ہیں ، وہ بہت بڑی غلطی کرتے ہیں ۔ میں نے اکثر ایسے ناواقف لوگوں کی تحریریں پڑھی ہیں جنھوں نے محض ایڈورڈ ماہلر کی تقویم کی بنا پر بڑے بڑے تاریخی واقعات کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے ۔

در اصل علم ہیئت کی مختلف کتابوں میں حقیقی رویت ہلال معلوم کرنے کے لیے معیاری قاعدے درج ہیں ۔ اس لیے تحقیقی کام کرنے والوں کو لازم ہے کہ وہ ان معیاری قاعدوں سے صحیح ہجری تاریخ کا تعین کریں ۔ اگر چہ وہ کتنے ہی دشوار کیوں نہ ہوں ۔ علم ہیئت کے ان معیاری قاعدوں کو استعمال کرنے کے باوجود بعض اوقات ہجری تاریخ میں ایک دن کا فرق پڑ سکتا ہے ۔ جس کا سبب یہ ہے کہ کبھی کبھی شام کے وقت ہجری مہینے کی ۲۹ تاریخ کو آسمان اس قدر گرد و غبار و ابر آلود ہوتا ہے کہ لوگوں کو چاند نظر نہیں آتا ، حالانکہ چاند نظر آنے کے قابل ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں شرعی طور پر رویت ہلال نہیں مانی جاتی بلکہ اس ہجری مہینے کے ۳۰ دن پورے کرنے کے بعد اگلا ہجری مہینہ شروع کیا جاتا ہے ۔ یعنی جس دن حقیقی طور پر اگلے مہینے کی یکم تاریخ ہونی چاہیے تھی ، اس دن کو شرعی طور پر پچھلے مہینے کی ۳۰ تاریخ سمجھ لیا جاتا ہے ۔ ایسی صورت میں دن کے نام کو بنیاد بنا کر حسابات لگانے چاہئیں ، کیونکہ دن کے نام میں کسی حالت میں بھی کوئی اختلاف یا شک و شبہ پیدا نہیں ہو سکتا ۔ اسی قسم کا اتفاق غالب کی پیدائش کے وقت بھی ہوا تھا ، جس کی تفصیل اس جگہ بیان کرنا ضروری ہے ۔ میں نے علم ہیئت کے معیاری قاعدوں سے حساب لگا کر معلوم کیا ہے کہ یکم دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو آگرے میں بروز پنجشنبہ جمادی الآخر ۱۲۱۱ ہجری کا چاند نظر آیا تھا ، اس لیے ۳۰ دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو بروز جمعہ جمادی الآخر ۱۲۱۱ ہجری کی ۲۹ تاریخ تھی ۔ اس دن آگرے کے مقام پر غروب آفتاب کے وقت تقویم یونانی کے مطابق شمس برج جدی کے ۹ درجے ۳۹ دقیقے پر تھا ، قمر برج جدی کے

۲۳ درجے ۲ دقیقے پر تھا اور راس برج سرطان کے ۱ درجہ ۸ دقیقے پر تھا - ان مواضع کی بنیاد پر علم ہیئت کے معیاری قاعدوں کے مطابق حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اُس شام کو رویت ہلال کا قوی امکان تھا کیونکہ ہلال نظر آنے کے قابل ہو چکا تھا - لیکن قراین سے پتا چلتا ہے کہ اُس وقت افق مغرب اس قدر مکدر تھا کہ لوگوں کو رجب کا چاند نظر نہ آسکا - اس لیے اُنھوں نے شرعی طور پر بروز شنبہ ۳۱ دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو ۳۰ جمادی الآخر ۱۲۱۱ ہجری مانا - اور بروز یکشنبہ یکم جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو یکم رجب ۱۲۱۱ ہجری مانا - یہی وجہ ہے کہ غالب کے زائچے کی سرخی میں بروز یکشنبہ ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری مانا گیا ہے - اُس زمانے میں نشر و اشاعت کے ذرائع اتنے مؤثر نہیں تھے کہ اگر کسی دور دراز کے علاقے میں چاند نظر آجائے تو اُس کی اطلاع فوراً ملک کے ہر حصے میں پہنچ جائے - اس لیے آگرے والوں نے صرف اپنے ھی افق کے مطابق ہجری تاریخ کا تعین کیا تھا ، حالانکہ ملک کے بعض دوسرے حصوں میں ۳۰ دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو بروز جمعہ چاند ضرور نظر آیا ہو گا - یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ غالب کا زائچہ اُن کی پیدائش کے وقت ھی بنایا گیا تھا - اگر بعد میں بنایا جاتا تو زائچہ بنانے والا منجم ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کو لازمی طور پر ۹ رجب ۱۲۱۱ ہجری مانتا کیونکہ اُسے اتنے عرصے بعد اس حقیقت کا علم کس طرح ہو سکتا تھا کہ ۳۰ دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو آگرے میں رجب کا چاند نظر نہیں آیا تھا ، جبکہ ایڈورڈ ماہلر کی تقویم کے مطابق ، غرۃالزیجات کے اوسط طریقے کے مطابق ، اور علم ہیئت کے معیاری قاعدوں کے مطابق بھی ۳۰ دسمبر ۱۷۹۶ عیسوی کو ضرور چاند نظر آنا چاہیے تھا -

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جب غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری مطابق ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ ہے تو پھر غالب نے اُسے ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری کیوں سمجھا ہے اور ہر مقام پر اپنی پیدائش کا سنہ ہجری ۱۲۱۲ کیوں بتایا ہے ، جیسا کہ اُن کے خود نکالے ہوئے مادہ ہائے تاریخ یعنی شورش شوق ، غریب اور تاریخا سے بھی ظاہر ہوتا ہے - نیز اُن کے شائع شدہ زائچے میں سنہ ہجری ۱۲۱۳ اور سنہ عیسوی ۱۷۹۸ کیوں درج ہے - اس کا جواب یہ ہے کہ میں ازروئے قراین

وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب کے زائچے کے اصل مخطوطے کی سرخی میں "بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۱ ھجری مطابق آغاز ۱۷۹۷ عیسوی" لکھا ہوا ہوگا۔ اُس زمانے میں عیسوی تاریخ کو زیادہ اھمیت حاصل نہیں تھی ، اس لیے ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی کے بجائے صرف آغاز ۱۷۹۷ عیسوی لکھنا ھی کافی سمجھا گیا ہوگا۔ یا ممکن ہے اصل مخطوطے میں سنہ عیسوی کا ذکر ھی نہ ھو اور بعد میں اسے شامل کیا گیا ھو۔ بہر حال جب غالب نے ایک عرصے تک یتیمی اور مصیبت کی زندگی گزارنے کے بعد ھوش سنبھالا ھوگا اور پرانے کاغذات میں اپنے بوسیدہ زائچے کو بھی دیکھا ھوگا تو ممکن ہے اُس وقت اُس کی سرخی کے بعض حروف صاف صاف نہ پڑھے جا سکے ھوں اور بالخصوص سنہ ھجری اور سنہ عیسوی کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ھو گئی ھو ، جس کی بنا پر ۱۲۱۱ ھجری کو ۱۲۱۲ ھجری اور ۱۷۹۷ عیسوی کو ۱۷۹۸ عیسوی فرض کر لیا گیا ھو۔ حالانکہ اگر ۱۲۱۱ ھجری کو ۱۲۱۲ ھجری فرض کر لیا گیا تھا تو آغاز ۱۷۹۷ عیسوی کو اواخر ۱۷۹۷ عیسوی فرض کرنا چاھیے تھا ۔ ایسا معلوم ھوتا ہے کہ شاید غالب کو بھی اس امر کی تحقیق کا موقع نہیں مل سکا ھوگا اور اُنھوں نے ۱۲۱۲ ھجری ھی کو صحیح ماننے میں کوئی مصلحت سمجھی ھو گی ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر غالب کے زائچے کا اصل مخطوطہ دیکھا جائے ، یا کلیات فارسی کا وہ مخطوطہ دیکھا جائے جس کی بنیاد پر نولکشوری ایڈیشن شائع ہوا تھا تو زائچے کی سرخی میں سنہ ھجری اور سنہ عیسوی کے آخری ھندسے یعنی بالترتیب "۲" اور "۸" ضرور مشکوک و مشتبہ نظر آئیں گے ، جن کو اگر غور سے دیکھا جائے تو بالترتیب "۱" اور "۷" بھی پڑھا جا سکتا ھو گا ۔ اور شاید اس مشکوکیت ھی کی وجہ سے نولکشور پریس والوں نے مخطوطے کے سنہ ھجری کو نہ ۱۲۱۱ پڑھا ، نہ ۱۲۱۲ پڑھا بلکہ ۱۰۱۲ پڑھ لیا اور اُسی طرح شائع کر دیا ۔ بہر حال اب یہ دوسرے اھل علم حضرات کا کام ہے کہ وہ اس مشکوکیت کی اصل حقیقت معلوم کریں ۔ میں تو صرف اتنا بتانا چاھتا ھوں کہ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ازروئے زائچہ ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبہ مطابق ۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری ہے ۔

غالب نے اپنی تحریروں میں بار بار یکشنبہ کو اپنا یوم پیدائش اور ۸ رجب کو اپنی تاریخ پیدائش بتایا ہے ، جیسا کہ نواب علائی کے نام

ایک خط مورخہ جون ۱۸۶۱ عیسوی سے اور تذکرۂ مظہرالعجائب کے لیے بھیجی ہوئی اُن کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان حقائق سے اس بات کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ اُن کا سنہ پیدائش ۱۲۱۲ ھجری نہیں ہے بلکہ ۱۲۱۱ ھجری ہے ، کیونکہ ۸ رجب ۱۲۱۲ ھجری کو یکشنبہ نہیں تھا ، بلکہ چہار شنبہ تھا اور جیسا کہ بعد میں بتایا جائے گا سیاروں کے مواضع بھی غالب کے زائچے سے بالکل مختلف تھے - ۸ رجب ۱۲۱۳ ھجری کو ضرور یکشنبہ تھا ، لیکن اس دن بھی سیاروں کے مواضع غالب کے زائچے سے بالکل مختلف تھے - ۸ رجب ۱۲۱۴ ھجری کو بھی یکشنبہ نہیں تھا بلکہ جمعہ تھا اور سیاروں کے مواضع بھی غالب کے زائچے سے بالکل مختلف تھے -

غالب کے زائچے میں سیاروں کے جو مواضع درج کئے گئے ھیں اور جن کی بنیاد پر میں نے غالب کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم کی ہے اُن کی تصدیق غالب کے اُس لاجواب فارسی قصیدے کی تشبیب کے اشعار سے بھی ہوتی ہے جو اُنھوں نے سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ‌السلام کی شان میں کہا تھا - یہ قصیدہ اُنھوں نے اپنی کہنہ مشقی کے زمانے میں یعنی تقریباً چالیس سال کی عمر میں کہا تھا - اس کا ایک ایک شعر معارف و معانی کا دریا ہے - اس قصیدے کے کل ایک سو بارہ اشعار میں سے صرف وہ اٹھارہ اشعار جن کا نفس مضمون سے تعلق ہے ذیل میں درج کیے جاتے ھیں - ان اشعار میں غالب نے اپنے زائچے کے سیاروں کی سعادت و نحوست پر اپنے مخصوص عالمانہ و شاعرانہ انداز میں خود ھی تبصرہ فرمایا ہے - اگر اس زیر مطالعہ مضمون کی تمہید کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو ان اشعار کے سمجھنے میں ذرا سی بھی مشکل پیش نہیں آئے گی -

مگر مرا دل کافر بود شب میلاد
کہ ظلمتش دھد از گور اھل عصیاں یاد

خود اصل طالع من جزوے از کمانستے
کزوست ناوک غم را ھزار گونہ کشاد

خرام زھرہ بطالع اگر چہ دادہ نشاں
ھم از لطافت طبع و ھم از صفائے نہاد

ولے ازاں کہ غریب است زھرہ اندر قوس
نشستہ بر رخ نقد قبول گرد کساد

تو گوئی از اثر انتقام ہاروت است
کہ سر بطالع من چرخ زہرہ را جاداد
بہ صفر جدی ذنب را اشارۃ باشد
بخاک و حلقۂ دام و کمیں گہ صیاد
چہ دام ؟ روح رواں را گذارش پر و بال
چہ صفر ؟ رنج و الم را فزائش اعداد
زمہر و پیکر تیر آشکار شد بجدی
فروغ اخگر رخشندہ و کفے زرماد
بحوت در شدہ ہم مشتری و ہم مریخ
یکے کفیل صلاح و یکے دلیل فساد
یکے بہیئت پیرے کہ ناگہ از غوغا
بکنج صومعہ وا ماندہ باشد از اوراد
یکے بصورت ترکے کہ از پئے یغما
ستیزہ جوئے در آید بخانۂ زہاد
قمر بہ ثور کہ کاشانہ ششم باشد
چو نور خویش کند دستگاہ خصم زیاد
سیاہ گشتہ دو پیکر زسیلیٔ کیواں
چنانکہ از اثر خاک تیرہ گردد باد
بدیں دو نحس نگر تا چہ شکل مستقبل
کشیدہ اند ز تربیع خویش در اوتاد
بہ چارمیں کدہ بہرام پنجمیں پایہ
بہ ہفتمیں زدہ کیواں ہفتمیں بنیاد
کند چو ترک ستمگر بہ کشتن استعجال
کند چو ہندو رہزن بہ بردن استبداد

ز حوت ہیئت طوفان نوح پردہ کشا
عیاں ز صورت جوزا نہیب صرصر عاد
تو و خدا کہ دریں کشمکش کہ من باشم
چگونہ چوں دگراں زیستن تواں بمراد

ان اشعار کا اردو ترجمہ اور علمی اصطلاحات کی وضاحت نہایت اختصار کے ساتھ ذیل میں درج ہے۔

شعر ۱۔ (ترجمہ) میرے لیے میرا دل کافر ایسی شب ولادت ہے جس کی تیرگی کے آگے بڑے سے بڑے گنہگار کی قبر کی تاریکی ہیچ ہے۔ (وضاحت) اس شعر میں غالب نے کنایۃً یہ بتا دیا ہے کہ ان کی پیدائش رات کے وقت ہوئی تھی۔

شعر ۲۔ (ترجمہ) در اصل میرا طالع ولادت کمان (یعنی برج قوس) کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے ناوک غم کو ہزار گنی سہولت حاصل ہو گئی ہے۔ (وضاحت) کسی زائچے میں برج قوس اگر طالع ہو جائے تو مولود کو بڑی دکھ بھری زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ اسی بات کو غالب نے نہایت ہی لطیف اور شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

شعر ۳، ۴۔ (ترجمہ) اگرچہ میرے طالع میں زہرہ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ مولود لطافت طبع اور صفائے نہاد میں یکتائے روزگار ہوگا لیکن چونکہ برج قوس میں ہونے کی وجہ سے زہرہ کی حیثیت ایک غریب کی سی ہے، اس لیے میرے نقد قبول کے چہرے پر کساد بازاری کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ (وضاحت) برج قوس کا مالک مشتری ہے جو زہرہ سے بے تعلق ہے، گویا زہرہ ایک ایسے گھر میں پڑا ہوا ہے جہاں اس کی حیثیت ایک اجنبی مسافر کی سی ہے اور اسی وجہ سے وہ سعد اصغر ہوتے ہوئے بھی اپنا پورا اثر دکھانے سے معذور ہے۔ یعنی اس نے اتنا نیک اثر تو دکھایا کہ غالب کو لطیف طبع اور نیک نہاد بنا دیا لیکن اس درجہ نیک اثر نہیں دکھا سکا کہ غالب کی متاع سخن کے خریداروں کی ریل پیل ہوتی۔

شعر ۵۔ (ترجمہ) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چرخ نے (مجھ پر مہربان ہو کر نہیں بلکہ) ہاروت سے انتقام لینے کی غرض سے (اس کی محبوبہ یعنی) زہرہ کو میرے طالع میں جگہ دی ہے (تاکہ ہاروت چاہ بابل کے عذاب کے ساتھ ساتھ آتش رقابت میں بھی جلتا رہے اور مجھے بھی بد دعا دیتا

رہے) - (وضاحت) اس شعر میں غالب نے ہاروت و ماروت کی مشہور تلمیح سے کام لیا ہے جو دو فرشتے تھے اور بالترتیب زہرہ و مشتری پر عاشق تھے اور اپنی بدکرداری کی پاداش میں چاہ بابل میں ابھی تک اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں - تمزیج سیارگاں اور تخئیل شاعرانہ کا یکجائی تاثر اس سے بہتر کوئی پیش نہیں کر سکتا -

شعر ۶- (ترجمہ) برج جدی کے صفر درجے پر ذنب کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ میری قسمت میں خاک ، حلقہ دام اور کمیں گاہ صیاد کے سوا کچھ بھی نہیں ہے - (وضاحت) برج جدی کا مزاج خاکی ہے جس سے خاک کی طرف اشارہ ملتا ہے ، ذنب کی شکل اژدہے کی حلقہ نما دم کی سی ہے جس سے حلقہ دام کی طرف اشارہ ملتا ہے ، اور جدی کی شکل چھپ کر حملہ کرنے والے جانور کی سی ہے جس سے کمیں گاہ صیاد کی طرف اشارہ ملتا ہے - اس شعر میں بھی غالب نے تمزیج سیارگاں کا بڑا اچھوتا تصور پیش کیا ہے -

شعر ۷- (ترجمہ) یہ دام کیا ہے ؟ یہ میری روح رواں کے پر و بال کو جلا دینے کی طرف اشارہ ہے - اور صفر یہ کیا ہے ؟ یہ میرے رنج و الم کے لیے افزائش اعداد کی طرف اشارہ ہے - (وضاحت) صفر میں یہ خصوصیت ہے کہ جس عدد کے آگے لگا دیا جاتا ہے اس کی قیمت دس گنی ہو جاتی ہے - صفر کی اسی خصوصیت کا سہارا لے کر غالب نے ذنب کے صفر جدی پر ہونے سے رنج و الم کے لیے افزائش اعداد کا نہایت لطیف نکتہ پیدا کیا ہے -

شعر ۸- (ترجمہ) برج جدی میں شمس بھی ہے اور عطارد بھی ہے - جس سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ میری قسمت میں آتش عشق اور اس کے بعد جلی ہوئی راکھ لکھی ہوئی ہے - (وضاحت) شمس کا مزاج آتشی ہے اور وہ آگ کے ایک گولے کی طرح ہے جو متحرک بھی ہے - اس لیے غالب نے شمس کی برج جدی میں موجودگی کو اخگر رخشندہ سے نسبت دی ہے ، جو مجازاً آتش عشق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے - تیر یعنی عطارد کا مزاج بادی ہے جو آگ کو بھڑکانے میں مدد دیتا ہے اور جدی کا مزاج خاکی ہے جو جل کر راکھ کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے - کف کے معنی سوختہ چقماق کے بھی ہیں - اس شعر میں غالب نے تمزیج سیارگاں کی ایک لاجواب مثال قائم کی ہے -

شعر ۹- (ترجمہ) برج حوت میں مشتری بھی موجود ہے اور مریخ بھی

موجود ہے۔ ان دونوں میں سے ایک (یعنی مشتری) کفیل صلاح ہے، اور ایک (یعنی مریخ) دلیل فساد ہے۔ (وضاحت) مشتری سعد اکبر ہے اور اس کی شکل ایک معمر شخص کی سی ہے جو نیک مشورہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مریخ نحس اصغر ہے اور اس کی شکل ایک ایسے جنگجو جوان کی سی ہے جو قتل و غارت کے لیے بہانے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

شعر ۱۰۔ (ترجمہ) ایک (یعنی مشتری) ایسی حالت میں ہے جیسے کوئی بوڑھا آدمی ناگہانی شور و غل سے گبھرا کر اپنی خانقاہ کے گوشے میں وظیفہ اور ورد بھی چھوڑ بیٹھا ہو۔ (وضاحت) برج حوت کا مالک مشتری ہے اور وہ اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہے۔ ایسی حالت میں مشتری سے نیک ثمرہ ملنے کی توقع تھی کیونکہ یہ سعد اکبر ہے، لیکن چونکہ مریخ بھی ساتھ ہی موجود ہے اور فتنہ و فساد اور شور و غل میں مشغول ہے، اس لیے ایسی پریشان کن حالت پیدا ہو گئی ہے کہ مشتری بھی نیک ثمرہ دینے سے قاصر ہو گیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے مشتری کی تمزیجی حیثیت کا جو مکمل نقشہ کھینچا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔

شعر ۱۱۔ (ترجمہ) ایک (یعنی مریخ) ایسی صورت میں ہے جیسے کوئی خونخوار و ظالم ترک لوٹ مار کرنے کے ارادے سے زاہدوں کے گھر میں گھس آیا ہو۔ (وضاحت) مریخ برج حوت میں داخل ہو گیا ہے جو مشتری کا گھر ہے اور مشتری بھی اسی گھر میں بیٹھا ہے۔ گویا کہ مشتری تمزیجی حیثیت سے ایک زاہد کی مانند ہے۔ لہذا برج حوت خانہ زہاد کی مانند ہوا۔ اس تمزیج میں غالب نے ایک نہایت ہی لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ یعنی اگر کوئی ڈاکو کسی غریب زاہد کے گھر میں ڈاکہ ڈالنے آجائے اور اسے وہاں ذرا سا بھی مال ہاتھ نہ آئے تو پھر اندازہ لگائیے کہ مسلسل تلاش مال، نا امیدی اور غصے کی حالت میں اس ڈاکو کی شکست خوردہ ذہنیت اور اس کے ظلم و ستم کا کیا حال ہوگا۔ اپنے زائچے میں مریخ کی نحوست انگیزی کا اس قدر جامع اور مؤثر نقشہ پیش کرنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

شعر ۱۲۔ (ترجمہ) قمر برج ثور میں ہے اور برج ثور زائچے کے چھٹے خانے میں پڑا ہے، اس لیے قمر اپنے نور کی طرح میرے دشمن کی دستگاہ کو بھی بڑھا رہا ہے، (وضاحت) برج ثور میں قمر کو شرف حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نیک ثمرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن غالب کے زائچے

میں قمر برج ثور میں ہوتے ہوئے بھی زائچے کے چھٹے خانے میں جا پڑا ہے۔ چونکہ چھٹا خانہ دشمن سے تعلق رکھتا ہے اس لیے قمر کا سارا نیک ثمرہ بجائے غالب کے حق میں ہونے کے اُن کے دشمن کے حق میں ہو گیا ہے۔ قمر کا یہ نیک ثمرہ غالب کے حق میں اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ قمر برج ثور میں ہوتے ہوئے زائچے کے پہلے خانے میں بھی ہوتا، جس کا تعلق مولود کے جسم اور دل سے ہے۔ غالب نے اس تمزیج میں بھی ایک باریک نکتہ بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ کہ قمری مہینے کی آٹھ تاریخ کا زائچہ ہے اس لیے قمر کا نور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں نور قمر کی زیادتی کے تناسب سے دشمن کی دستگاہ بھی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔

شعر ۱۳۔ (ترجمہ) زحل کے طمانچے سے جوزا کا چہرہ سیاہ پڑ گیا ہے جس طرح کہ (اندھی کے وقت) خاک کے اثر سے ہوا تاریک ہو جاتی ہے۔ (وضاحت) برج جوزا کو دو پیکر اور زحل کو کیوان بھی کہتے ہیں۔ برج جوزا قدرے نیک ثمرہ دینے والا ہے لیکن چونکہ اس میں زحل بھی موجود ہے جو نحس اکبر ہے، اس لیے برج جوزا کا تھوڑا بہت نیک اثر بھی زائل ہو گیا ہے۔ چونکہ جوزا کا مزاج بادی ہے اور زحل کا مزاج خاکی ہے، اس لیے غالب نے مٹی کے اثر سے ہوا کے تاریک ہو جانے کی تشبیہ استعمال کی ہے جو نہایت با معنی اور حسب حال ہے۔

شعر ۱۴، ۱۵ - (ترجمہ) ان دونوں نحس سیاروں (یعنی مریخ و زحل) کی حالتوں پر غور کرو کہ آپس میں نظر تربیع بھی رکھتے ہیں اور اوتاد میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس طرح ان دونوں نے مل کر میرے مستقبل کی کیسی (مہیب) تصویر کھینچ رکھی ہے یعنی فلک پنجم سے تعلق رکھنے والا مریخ زائچے کے چوتھے خانے میں ہے اور فلک ہفتم سے تعلق رکھنے والا زحل زائچے کے ساتویں خانے میں ہے۔ (وضاحت) مریخ کو بہرام بھی کہتے ہیں۔ جب دو سیاروں کے درمیان تین بروج کا فرق ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو نظر تربیع سے دیکھتے ہیں۔ یہ نصف دشمنی کی نظر سمجھی جاتی ہے۔ غالب کے زائچے میں مریخ برج حوت میں ہے اور زحل برج جوزا میں ہے، اس لیے ان دونوں کے درمیان نظر تربیع ہے جس کی وجہ سے ان دونوں کی نحوست میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مزید بر آں دونوں ہمارے اوتاد میں یعنی چوتھے اور ساتویں خانوں میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں جس سے ان کی نحوست اور بھی مستقل اور دیرپا ہو گئی ہے۔

شعر ۱۶ - (ترجمہ) اول الذکر (یعنی مریخ) ظالم ترک کی طرح مجھے ہلاک کرنے میں تیزی دکھا رہا ہے اور موخرالذکر (یعنی زحل) ہندو لٹیرے کی طرح مجھے لوٹنے کھسوٹنے میں اذیت پہنچا رہا ہے ۔ (وضاحت) مریخ اور زحل دونوں کے فطری خواص اور زائچے میں اُن کی مخصوص حالتوں کے مطابق غالب نے جو تشبیہیں ان دونوں سیاروں کے لیے پیش کی ہیں وہ نہایت ہی بلیغ اور مکمل ہیں ۔ غالب کے سوا کوئی دوسرا شاعر اتنی صحیح عکاسی نہیں کرسکتا ۔

شعر ۱۷ - (ترجمہ) برج حوت (اور اُس میں بیٹھے ہوئے مریخ) پر نظر ڈالنے سے طوفان نوح کی سی ہیبت سامنے آجاتی ہے ۔ اسی طرح برج جوزا (اور اُس میں بیٹھے ہوئے زحل) کی شکل کو دیکھنے سے صرصر عاد کی سی دہشت طاری ہو جاتی ہے ۔ (وضاحت) حوت کا مزاج آبی ہے اور اُس میں مریخ موجود ہے جو نحس اصغر ہے، اس لیے اس کے نحس اثرات کو طوفان نوح کی غرقابیوں سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ اسی طرح جوزا کا مزاج بادی ہے اور زحل اُس میں موجود ہے جو نحس اکبر ہے، اس لیے اس کے نحس اثرات کو اُس آندھی کی تباہ کاریوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو قوم عاد کے لیے بھیجی گئی تھی ۔ یہ تمزیج بھی غالب نے بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کی ہے اور دو مشہور تلمیحات کا ذکر کر کے حسن بیان کو اور بھی دو بالا کر دیا ہے ۔

شعر ۱۸ - (ترجمہ) خدا کے لیے مجھے یہ تو بتا دو کہ (اپنے زائچے کے سیاروں کے نحس اثرات کی) اس کشمکش میں پڑ کر میں کیوں کر دوسرے لوگوں کی طرح بامراد زندگی گزار سکتا ہوں ۔ (وضاحت) غالب نے اپنے زائچے میں سارے سیاروں کے مجموعی اثرات کو اپنے لیے بڑا مایوس کن بتایا ہے ۔ علم نجوم کی رو سے غالب کا ایک ایک لفظ صحیح ہے ۔ اُنھوں نے راس اور سہم السعادت وغیرہ کا ذکر کرنا اپنے قصیدے میں ضروری نہیں سمجھا کیونکہ ان کے اثرات کو نظر انداز کر دینے کے باوجود زائچے کے مجموعی اثر میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

غالب کے قصیدے کے ان اشعار سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ غالب کا شائع شدہ زائچہ بالکل صحیح ہے اور اُس صحیح زائچے کی بنیاد پر غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی مطابق ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری بروز یکشنبہ ہے ۔ اس شائع شدہ زائچے میں سہم الغیب،

سہم اولاد اور سہم امراض کے مقامات غلط درج ہوگئے ہیں جو محض کاتب کی غلطی پر محمول کیے جاسکتے ہیں ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصل زائچے کے مخطوطے میں ان تینوں سہام کا ذکر نہ ہو بلکہ بعد میں کسی نے ان تینوں کو زائچے کے خانوں میں غلط طور پر درج کردیا ہو ، کیونکہ یہ تینوں سہام زیادہ اہم نہیں سمجھے جاتے اور عام طور پر صرف سہم السعادت ہی کو زائچے میں لکھنا کافی سمجھا جاتا ہے ۔ اگر صحیح حساب لگایا جائے تو غالب کے زائچے میں سہم الغیب پانچویں خانے میں برج حمل کے ۱۷ درجے ۴۰ دقیقے پر ہونا چاہیے ، سہم اولاد دسویں خانے میں برج سنبلہ کے ۱۰ درجے ۴۸ دقیقے پر ہونا چاہیے ، اور سہم امراض چوتھے خانے میں برج حوت کے ۲۶ درجے ۳۸ دقیقے پر ہونا چاہیے ۔ اغلب یہی ہے کہ ان تینوں سہام کو شائع شدہ زائچے میں کسی نے بعد میں غلط طور پر درج کر دیا ہوگا ، ورنہ زائچے کے اصل مخطوطے میں ان تینوں سہام کا اندراج نہیں ہوگا ۔ بہر حال ان تینوں سہام کے غلط مواضع سے زائچے کی اصل حقیقت پر ذرہ بھر بھی اثر نہیں پڑتا ، کیوں کہ یہ سہام کوئی علاحدہ حیثیت نہیں رکھتے ، بلکہ طالع اور دیگر سیاروں کے مقامات کی مدد سے اخذ کر لیے جاتے ہیں ۔ لہذا اگر سہم السعادت کا مقام بھی غلط درج ہوتا تو بھی زائچے کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا ۔ عام پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے صفحہ ۳۸ و ۳۹ پر غالب کے دو مختلف زائچے مختصر اور آسان کر کے درج کئے جا رہے ہیں ، ایک زائچہ بحساب یونانی اور ایک زائچہ بحساب ہندی ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اگر ہم یونانی حساب میں سے ہرجگہ ایناتش یعنی ۲۱ درجے کم کرتے چلے جائیں تو ہندی حساب حاصل ہوجاتا ہے ۔ اہل ہند کی قدیم کتب میں سہام کا ذکر نہیں ہے ، اس لیے حساب ہندی کے مطابق سہام کا استخراج نہیں کیا جاتا اور حساب یونانی میں بھی صرف سہم السعادت ہی کو زیادہ قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے ۔

ان زائچوں کو دیکھنے سے ہمارا اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے ، پھر بھی میں نے پڑھنے والوں کی مزید دلچسپی کے لیے ذیل میں ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری ، ۸ رجب ۱۲۱۳ ہجری اور ۸ رجب ۱۲۱۴ ہجری کے مطابق تین زائچے بحساب یونانی بنائے ہیں اور ان کے سیاروں کے مقامات کا حساب درج کیا ہے ۔ غالب کے شائع شدہ زائچے کے سیاروں کے مقامات میں اور ان تینوں زائچوں کے سیاروں کے مقامات میں جو نمایاں فرق آتا ہے وہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہوجائے گی کہ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش صرف

غالب کا زائچہ بحساب یونانی

طالع یعنی پہلا خانہ
برج قوس
زہرہ

دوسرا خانہ۔ برج جدی۔ شمس
عطارد۔ ذنب

تیسرا خانہ
برج دلو

چوتھا خانہ
برج حوت
مریخ۔ مشتری

پانچواں خانہ
برج حمل

چھٹا خانہ
برج ثور۔ قمر

ساتواں خانہ
برج جوزا
زحل

آٹھواں خانہ
برج سرطان۔ راس

نواں خانہ
برج اسد

دسواں خانہ
برج سنبلہ
سہم السعادت

گیارھواں خانہ
برج میزان

بارھواں خانہ۔ برج عقرب

غالب کا زائچہ بحساب ہندی
لگن یعنی پہلا گھر
دھن راس
سوریہ۔ کیتو
بارھواں گھر۔ برشچک راس
شکر
گیارھواں گھر
تلا راس
دسواں گھر
کنیا راس
نواں گھر
سنگھ راس
آٹھواں گھر۔ کرک راس
ساتواں گھر
متھن راس
شنی۔ راہو
چھٹا گھر۔ برکھ راس
پانچواں گھر
میکھ راس
چندر
چوتھا گھر
مین راس
منگل
تیسرا گھر
کنبھ راس
برہسپتی
دوسرا گھر۔ مکر راس
بدھ

۸ رجب ۱۲۱۱ ھجری ہی ہو سکتی ہے جیسا کہ پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے۔

"۸ رجب ۱۲۱۲ ھجری کا زائچہ"

۱ - استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ ھجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ عیسوی بروز چہار شنبہ بمقام اکبرآباد بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع آفتاب - انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علی الصباح ۵ بجکر ۳۳ منٹ پر - ایناش تقریبا ۲۱ درجے - مساوات وقت تقریبا ۷ منٹ مثبت - غرۃالزیجات اھرگن ۳۰۳۷۹۰ - گرہ لاگھو جکر ۲۵ ، اھرگن ۱۰۳۶ - جولین ڈے ۲۳۷۷۷۶۲ -

۲ - طالع یعنی پہلا خانہ - برج قوس کے ۱۷ درجے ۵۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۹ درجے ۴۳ دقیقے منفی)

۳ - شمس ، دوسرے خانے میں - برج جدی کے ۵ درجے ۵۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۲ درجے ۳۰ دقیقے منفی)

۴ - قمر ، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۱۲ درجے صفر دقیقے پر تھا - (فرق ۲۶ درجے ۲۱ دقیقے منفی)

۵ - راس ، ساتویں خانے میں - برج جوزا کے ۱۱ درجے ۵۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۸ درجے ۵۳ دقیقے منفی)

۶ - ذنب ، پہلے خانے میں - برج قوس کے ۱۱ درجے ۵۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۸ درجے ۵۳ دقیقے منفی)

۷ - مریخ ، بارھویں خانے میں - برج عقرب کے ۱۴ درجے ۹۵ دقیقے پر تھا - (فرق ۷ بروج ۲۱ درجے ۳۰ دقیقے مثبت)

۸ - عطارد ، دوسرے خانے میں - برج جدی کے ۲۰ درجے ۵۵ دقیقے پر تھا - (فرق ۵ درجے ۱۳ دقیقے منفی)

۹ - مشتری ، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۱۱ درجے ۲۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج صفر درجہ ۱۵ دقیقے مثبت)

۱۰ - زھرہ ، تیسرے خانے میں - برج دلو کے ۲۲ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۲ برج ۷ درجے ۱۵ دقیقے مثبت)

۱۱ - زحل، آٹھویں خانے میں - برج سرطان کے ۱۱ درجے ۵۳ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۹ درجے ۲۵ دقیقے مثبت)

۱۲ - سہم السعادت، دسویں خانے میں - برج سنبلہ کے ۱۱ درجے ۴۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۴ درجے ۲ دقیقے مثبت)

نوٹ : ہندوؤں کی پترہ کے استنباط کے مطابق طالع برج عقرب کے ۲۶ درجے پر تھا، شمس برج قوس کے ۱۴ درجے پر تھا، اور ذنب برج عقرب کے ۲۲ درجے پر تھا -

"۸ رجب ۱۲۱۳ ھجری کا زائچہ"

۱ - استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۳ ھجری مطابق ۱۶ دسمبر ۱۷۹۸ عیسوی بروز یکشنبہ بمقام اکبر آباد بوقت چہار گھڑی پیش از طلوع آفتاب - انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علی الصباح ۵ بجکر ۲۸ منٹ پر - اینانش تقریباً ۱۲ درجے - مساوات وقت تقریباً ۴ منٹ منفی - غرۃالزیجات اھرگن ۳۰۴۱۴۴ - گرہ لاگھو چکر ۲۵، اھرگن ۱۴۰۰ - جوالین ڈے ۲۳۷۸۱۱۶ -

۲ - طالع یعنی پہلا خانہ - برج قوس کے ۱۷ درجے ۲۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۲۰ درجے ۱۹ دقیقے منفی)

۳ - شمس، پہلے خانے میں - برج قوس کے ۴۲ درجے ۲۳ دقیقے پر تھا - (فرق ۲۲ درجے ۵۷ دقیقے منفی)

۴ - قمر، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۲ درجے ۳۲ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۵ درجے ۴۹ دقیقے منفی)

۵ - راس، چھٹے خانے میں - برج ثور کے ۲۳ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۷ درجے ۳۷ دقیقے منفی)

۶ - ذنب، بارھویں خانے میں - برج عقرب کے ۲۳ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۷ درجے ۳۷ دقیقے منفی)

۷ - مریخ، پانچویں خانے میں - برج حمل کے ۳ درجے ۴۷ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۰ درجے ۱۸ دقیقے مثبت)

۸ - عطارد، دوسرے خانے میں - برج جدی کے ۱۲ درجے ۳۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے منفی)

۹ - مشتری ، چھٹے خانے میں - برج ثور کے ۱۸ درجے ۵ دقیقے پر تھا - (فرق ۲ بروج ۷ درجے ۲۸ دقیقے مثبت)

۱۰ - زهره ، پہلے خانے میں - برج قوس کے ۲۱ درجے ۱۶ دقیقے پر تھا - (فرق ۶ درجے ۳۵ دقیقے مثبت)

۱۱ - زحل ، آٹھویں خانے میں - برج سرطان کے ۲۸ درجے ۶ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۵ درجے ۳۸ دقیقے مثبت)

۱۲ - سہم السعادت ، نویں خانے میں - برج اسد کے ۲۹ درجے ۱۱ دقیقے پر تھا - (فرق ۸ درجے ۲۷ دقیقے منفی)

نوٹ : هندوؤں کی پتره کے استنباط کے مطابق طالع برج عقرب کے ۱۶ درجے پر تھا ، شمس برج قوس کے ۳ درجے پر تھا ، اور ذنب برج عقرب کے ۴ درجے پر تھا -

"۸ رجب ۱۲۱۴ هجری کا زائچه"

۱ - استخراج تقویم یونانی بتاریخ ۸ رجب ۱۲۱۴ هجری مطابق ۶ دسمبر ۱۷۹۹ءعیسوی بروز جمعه بمقام اکبرآباد بوقت چہار گھڑی قبل از طلوع افتاب - انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق علی الصباح ۵ بجکر ۲۱ منٹ پر - ایناشش تقریباً ۱۲ درجے - مساوات وقت تقریباً ۹ منٹ منفی - غرة الزیجات اهرگن ۳۰۴۴۹۹ - گره لاکھو چکر ۲۵ ، اهرگن ۱۷۵۵ - جولین ڈے ۲۳۷۷۴۷۱ -

۲ - طالع یعنی پہلا خانه - برج عقرب کے ۲۶ درجے ۵۵ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج صفر درجه ۴۴ دقیقے منفی)

۳ - شمس ، دوسرے خانے میں - برج قوس کے ۱۳ درجے ۵۷ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۴ درجے ۲۳ دقیقے منفی)

۴ - قمر ، چھٹے خانے میں - برج حمل کے ۴ درجے ۴۸ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۳ درجے ۳۳ دقیقے منفی)

۵ - راس ، ساتویں خانے میں - برج ثور کے ۴ درجے ۲۶ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۲۶ درجے ۲۵ دقیقے منفی)

۶ - ذنب - پہلے خانے میں - برج عقرب کے ۴ درجے ۲۶ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۲۶ درجے ۲۵ دقیقے منفی)

۷ - مریخ ، پہلے خانے میں - برج عقرب کے ۱۰ درجے ۱۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۷ بروج ۲۱ درجے ۵۴ دقیقے مثبت)

۸ - عطارد ، تیسرے خانے میں - برج جدی کے ۳ درجے ۴۹ دقیقے پر تھا - (فرق ۲۲ درجے ۱۹ دقیقے منفی)

۹ - مشتری ، آٹھویں خانے میں - برج جوزا کے ۲۹ درجے ۳۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۳ بروج ۱۹ درجے ۶ دقیقے مثبت)

۱۰ - زهره ، پہلے خانے میں - برج عقرب کے ۴ درجے ۵۲ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۹ درجے ۳۱ دقیقے منفی)

۱۱ - زحل ، دسویں خانے میں - برج اسد کے ۱۵ درجے ۴۰ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۲۳ درجے ۱۲ دقیقے مثبت)

۱۲ - سہم السعادت ، دسویں خانے میں - برج اسد کے ۶ درجے ۴ دقیقے پر تھا - (فرق ۱ برج ۱ درجہ ۴۳ دقیقے منفی)

نوٹ : هندوؤں کی پتره کے استنباط کے مطابق طالع برج عقرب کے ۵ درجے پر تھا ، شمس برج عقرب کے ۲۲ درجے پر تھا ، اور ذنب برج میزان کے ۱۰ درجے پر تھا -

مندرجه بالا تینوں زائچوں کا مقابلہ غالب کے شائع شدہ زائچے سے کرنے کے بعد یہ امر یقینی طور پر ثابت هو جاتا ہے کہ غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۷۹۷ عیسوی بروز یکشنبه ہے ، جبکه جولین ڈے ۲۳۷۷۴۰۹ تھا - آن کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ عیسوی کو بروز دو شنبه هوئی تھی جبکه جولین ڈے ۲۴۰۳۷۴۴ تھا - اس طرح غالب نے اس دارفانی میں کل ۲۶۳۳۵ دن قیام کیا تھا -

اس مقام پر همارا مقصد پورا هو جاتا ہے ، لیکن ضمنی طور پر غالب کے اس قصیدے کا بھی ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نه هوگا جو انھوں نے ابو ظفر بہادر شاہ کی شان میں کہا تھا ، کیونکه اس سے همارے نفس

مضمون کو کافی تقویت پہنچے گی ۔ اس قصیدے کی تشبیب میں بھی غالب نے سیاروں کے اُن مقامات کا ذکر کیا ہے جو اُس مخصوص ساعت میں واقع ہوئے تھے ، جبکہ غالب نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے یہ قصیدہ بہ نفس نفیس پڑھا تھا ۔ وہ دس اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

بو ظفر قبلۂ آفاق کہ در مسلک شوق
هر کہ رو سوئے تو دارد بہ جہاں قبلہ نما ست

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دهر قلم مدعی و نکتہ گواست

ذوق مدح تو بر آں داشتہ باشد کامروز
رگ اندیشہ زدم گر چہ قمر در جوزاست

اینکہ خور در حمل و مہ بہ دو پیکر باشد
ہست تسدیس ہمایوں نظر مہر فزا ست

بادہ با نیر اعظم زدہ کیواں بہ حمل
هم نشینی بہ شہنشہ ز کشاورز خطا ست

زهرہ دیدم بہ حمل تن زدم از خبث زحل
بہر شہ مطربہ آوردہ نہ دهقاں تنہا ست

قاضی چرخ کہ در خوشہ بود واژوں پوئے
متحیر کہ چرا اوج و وبالش یکجاست

چوں فرود آمدہ مریخ بہ منزلگہ ماہ
کلبۂ پیک طرب گاہ سپہبد نہ رواست

تا چہ افتادہ کہ در خانۂ قاضیست دبیر
پرسش واقعۂ ہست اگر پرسی راست

گشتہ در دلو و اسد روئے برو جادہ نورد
ذنب و راس کہ از طالع و غارب پیداست

مضمون کو مختصر کرنے کی غرض سے ان اشعار کے ترجمے کو اور اصطلاحات کی تشریح کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر اس مضمون کی تمہید کو سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو ان اشعار کی تنجیمی اہمیت کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی۔ ان اشعار میں بھی غالب نے تمزیج سیارگان کی بڑی اعلیٰ و ارفع مثالیں قائم کی ہیں اور کنایتہً اپنے حریفوں پر، خصوصاً استاد شاہ یعنی شیخ ابراہیم ذوق پر بڑی چوٹیں کی ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ ان اشعار میں غالب نے شاعرانہ طور پر کنایتہً بہادر شاہ ظفر کو شمس سے تشبیہ دی ہے، اپنے آپ کو قمر سے تشبیہ دی ہے، ذوق کو زحل سے تشبیہ دی ہے، اور زہرہ کو اس مطربہ سے تشبیہ دی ہے جس نے شاید اس محفل میں ذوق کا قصیدہ ترنم کے ساتھ پڑھ کر یا گا کر سنایا ہو گا۔ اسی طرح باقی سیاروں کو بھی حسب مناسبت اپنے دوسرے حریفوں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ تمزیجی اعتبار سے غالب نے شمس کو شہنشاہ، قمر کو پیک طرب، مریخ کو سپہبد، عطارد کو دبیر، مشتری کو قاضی، زہرہ کو مطربہ، زحل کو کشاورز و دہقان، اور ذنب و راس کو روئے برو جادہ نورد بتایا ہے۔ اس طرح تمزیج سیارگان کی لذت میں شاعرانہ شوخی کی چاشنی بھی شامل ہو گئی ہے۔

ان اشعار سے جن باتوں کا علم ہوتا ہے وہ یہ ہیں۔ اُس وقت طالع برج دلو میں تھا اور اُس میں ذنب بھی موجود تھا۔ غارب برج اسد میں تھا اور اس میں راس بھی موجود تھا۔ شمس برج حمل میں تھا اور اس کے ساتھ زحل و زہرہ بھی تھے۔ قمر برج جوزا میں تھا اور اُس پر شمس کی نظر تسدیس بھی پڑ رہی تھی جو مبارک سمجھی جاتی ہے۔ مشتری راجع ہو کر برج سنبلہ میں پڑا تھا جہاں اُس کا اوج بھی ہے اور وہاں بھی ہے۔ قمر کے گھر یعنی برج سرطان میں مریخ تھا۔ اور مشتری کے گھر یعنی برج حوت میں عطارد تھا۔ سیاروں کے ان مواضع پر غور کر کے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے یہ قصیدہ جشن نو روز کے موقع پر کہا تھا اور جس تقویم سیارگان کا اس قصیدے میں ذکر ہے وہ دراصل زائچہ نوروز کی تقویم تھی، جیسا کہ غالب نے لفظ "امروز" استعمال کر کے ظاہر کیا ہے۔ میں نے اس تقویم سیارگان کو بھی اُسی طرح معلوم کر لیا ہے جس طرح کہ غالب کے زائچے کے لیے حسابات لگائے تھے لیکن اس تقویم کی تفصیلات کو اس جگہ بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ صرف اتنا سمجھ لیجیے کہ اس وقت طالع برج دلو کے ۲۲ درجے پر

تھا، شمس برج حمل کے صفر درجے پر تھا، قمر برج جوزا کے ۲۷ درجے پر تھا، راس برج اسد کے ۲۲ درجے پر تھا، ذنب برج دلو کے ۲۲ درجے پر تھا، مریخ برج سرطان کے ۲ درجے پر تھا، عطارد برج حوت کے ۱۸ درجے پر تھا، مشتری برج سنبلہ کے ۲۰ درجے پر تھا، زہرہ برج حمل کے ۵ درجے پر تھا، اور زحل برج حمل کے ۸ درجے پر تھا۔ یہ یاد رہے کہ جب شمس برج حمل میں داخل ہوتا ہے تو اُس داخلے کو علم نجوم کی اصطلاح میں " تحویل شمس در برج حمل" کہتے ہیں اور اس ساعت کی تقویم سیارگان کو زائچہ' نوروز کہتے ہیں۔ یہ ساعت نہایت مبارک سمجھی جاتی ہے اور اہل یونان و ایران کے مطابق اُس وقت سے نئے شمسی سال کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی لیے اس موقع پر نہایت شاندار جشن نو روز منایا جاتا ہے اور تہنیتی قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ غالب نے بھی شاہجہان آباد (یعنی دہلی) میں ایک ایسے ہی جشن نو روز کے موقع پر بہادر شاہ ظفر کی شان میں یہ تہنیتی قصیدہ پڑھا تھا۔ لہذا جس ساعت میں غالب نے یہ قصیدہ پڑھا تھا وہ ساعت بتاریخ ۲۱ مارچ ۱۸۵۰عیسوی، بروز پنجشنبہ مطابق ۷ جمادی الاول ۱۲۶۶ء ہجری، علے الصباح ۴ بج کر ۱۷ منٹ (انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم) سے شروع ہوئی تھی جبکہ تحویل شمس در برج حمل واقع ہوئی تھی اور تقریباً ۴۵ منٹ کے بعد ۵ بج کر ۲ منٹ پر ختم ہو گئی تھی جب کہ طالع برج دلو سے برج حوت میں تبدیل ہوا تھا۔

کتابیات:

۱۔ غرۃالزیجات: یہ ابو ریحان محمد البیرونی کی وہ لاجواب زیج ہے جو اُس نے گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھی تھی۔ اس کا واحد مخطوطہ احمد آباد شہر میں درگاہ پیر محمد شاہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ دراصل یہ سنسکرت کی کتاب کرن تلک کا عربی ترجمہ ہے جو بیرونی نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ اصل سنسکرت کتاب کا مصنف وجے نندی تھا جو کاشی کا رہنے والا تھا، لیکن وہ سنسکرت کتاب اب ناپید ہو چکی ہے۔ میں نے غرۃالزیجات کو اُس کے انگریزی ترجمے، تشریح اور تصحیح کے ساتھ مکمل کرلیا ہے، اور اب اس کتاب کو میں حیدرآباد (دکن) کے انگریزی سہ ماہی رسالے " اسلامک کلچر" میں بالاقساط شائع کرا رہا ہوں۔ اس وقت تک اپریل ۱۹۶۳ء، جولائی ۱۹۶۳ء، اکتوبر ۱۹۶۳ء، جنوری ۱۹۶۴ء،

جولائی ۱۹۶۴ء، جنوری ۱۹۶۵ء اور اپریل ۱۹۶۵ء کے شماروں میں سات قسطیں شائع ہوچکی ہیں -

۲- کتاب التفہیم لاوائل صناعتہ التنجیم : یہ علم نجوم کی معرکہ آرا کتاب ہے اور اسے ابو ریحان محمد البیرونی نے گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھا تھا - بیرونی نے اس کتاب کو خود ہی عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا تھا - اس کا ایک مطبوعہ فارسی نسخہ لیاقت میموریل نیشنل لائبریری کراچی (پاکستان) میں محفوظ ہے، یہ ایران میں شائع ہوا تھا -

۳- کفایتہ التعلیم فی صناعتہ التنجیم : یہ بھی علم نجوم کی بڑی مستند کتاب ہے اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی تھی - اس کا ایک فارسی مخطوطہ میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے جو سو سال پرانا ہے اور بہت اعلیٰ معیار کا ہے -

۴- زیج الغ بیگ : یہ زیج پندرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جدولوں کی شکل میں لکھی گئی تھی اور اس کے حسابات سمرقند کی رصد گاہ کی مدد سے مقرر کئے گئے تھے - اس کا ایک نادر فارسی مخطوطہ آج کل اسلامیہ کالج پشاور (پاکستان) کی لائبریری میں محفوظ ہے یہ بڑی قابل اعتماد زیج سمجھی جاتی ہے -

۵- مکرند سارنی : یہ زیج پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی تھی اور آج تک ہندو جیوتشیوں میں مقبول عام ہے - اس کے حسابات جدولوں کی شکل میں سوریہ سدھانت کے مطابق ہیں لیکن بعض مقامات پر بیج سنسکار سے یعنی ترمیمات سے بھی کام لینا پڑا ہے - یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی ہے اور اس کے مطبوعہ نسخے بھارت کے بازاروں میں عام ملتے ہیں -

۶- گرہ لاگھو : یہ زیج سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھی گئی تھی اور اس کے مصنف گنیش دیوگیہ نے ذاتی طور پر مشاہدات فلک کرنے کے بعد اس کے حسابات مقرر کئے تھے - حسابات کی صحت کے لحاظ سے یہ زیج بہت مشہور ہے اور ہندو جیوتشی اسے مکرند سارنی سے زیادہ قابل اعتماد سمجھتے ہیں - یہ کتاب بھی سنسکرت میں لکھی گئی ہے اور اس کے مطبوعہ نسخے بھی بھارت کے بازاروں میں عام ملتے ہیں -

۷- ای ڈبلیو براؤن اور نیو کومب کی زیجیں : یہ ونوں زیجیں دور

حاضر کے ہیئت دانوں نے مغربی ممالک کی رصد گاہوں کے مشاہدات کے مطابق لکھی ہیں ، اور جدولوں کی شکل میں ہیں ۔ ان زیجوں کا جزوی اور مختصر ہندی ترجمہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ ' ریاضی کے ریڈر ڈاکٹر گورکھ پرشاد نے کیا تھا جسے کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے ''چندر سارنی'' اور '' سوریہ سارنی'' کے ناموں سے بالترتیب ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۸ء میں شائع کیا تھا ۔ ان زیجوں کے حسابات موجودہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر مقرر کئے گیے ہیں ۔

۸- این سی لاہری کی جدولیں : یہ جدولیں خط استوا سے لے کر ۶۰ درجے عرض البلد تک کے لیے علاحدہ علاحدہ بنائی گئی ہیں ، اور انگریزی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں ۔ ان جدولوں کی مدد سے ہر مقام کا اور ہر ساعت کا طالع معلوم کیا جاسکتا ہے ۔ ان جدولوں کو این سی لاہری نے مرتب کیا ہے ، اور ایسٹرو ریسرچ بیورو کلکتہ نے شائع کیا ہے ۔ یہ جدولیں اپنے صحیح حسابات کے لحاظ سے بڑی اہم سمجھی جاتی ہیں اور آج کل کے منجمین میں مقبول ہیں ۔ ان کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا ۔

طلسم گنجینۂ معانی

ڈاکٹر شوکت سبزواری

[۱]

غالب نے اپنی شاعری پر فخر کرتے ہوئے فکر اور فن دونوں کو سراہا ہے:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن میں سمجھتا ہوں فن یعنی انداز بیان اور روش خاص یعنی بداعت اسلوب پر غالب کو زیادہ ناز ہے کہ اس میں شاعر کی صد رنگ شخصیت اور ہمہ رنگ انفرادیت کے جوہر زیادہ روشن نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ اس نے ایک طرف اپنے عہد کے اہل خرد کی روش خاص کا مضحکہ اڑایا ہے:

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہ عام بہت ہے

دوسری طرف اپنے بیان کی ندرت کا واشگاف طور پر اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

بیان سے کیا مراد ہے اور انداز بیان کی ندرت ، جس کا ذکر غالب نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ، کیا ہے ، یہ تو میں تفصیل کے ساتھ نہ بتا سکوں گا صرف اتنا عرض کروں گا کہ بیان کا فنی تجزیہ کرنے سے تین اجزا ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ اول الفاظ جو مفرد بھی ہو سکتے ہیں اور مرکب بھی ، دوم فقرے یا ترکیبیں ، سوم پورے پورے جملے ۔ ان سب میں ایک طرح کی حیاتیاتی ترتیب پائی جاتی ہے ۔ فقرے الفاظ سے ترکیب پا کر وجود میں

آتے ہیں اور جملوں کا کالبد فقروں کی وضع اور ترتیب کا منت کش ہوتا ہے - بیان نام ہے لفظوں ، فقروں اور چھوٹے بڑے جملوں کے مجموعے کا جنہیں ایک سے زیادہ طریقوں سے جوڑا جاسکتا ہے - جس طرح خشت و گل کی مدد سے ہر نقشے کا مکان تعمیر ہوسکتا ہے ، اسی طرح لفظوں اور جملوں کی ترکیب ، وضع خاص اور ترتیب سے بیان کے رنگا رنگ ڈھانچے تشکیل پاتے ہیں جن میں سے بعض عام انداز کے ہوں گے اور بعض جدت ، بداعت یا آب و رنگ کے حامل ہونے کی وجہ سے خاص انداز کے - بیان کی جدت ، بداعت ، رنگینی و رعنائی اس وقت زیر بحث نہیں ، اس لیے چند مثالوں سے اس کی وضاحت شاید کافی ہوگی -

[۲]

غالب کہنا چاہتے ہیں کہ شب فرقت کے رنج و اندوہ کا بیان خود عاشق حرماں نصیب کے صلاح کار کے لیے ضروری ہے - اظہار و بیان سے اگر اسے باز رکھا گیا تو اس کا انجام دیوانگی کے سوا کچھ نہ ہوگا - عاشق ماہ زدہ ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لے گا - اس مضمون کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے :

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

چاند کا دیوانگی سے خاص تعلق ہے - اس بنا پر داغ ماہ کو مہر دہان قرار دینا اور اس سے حرماں نصیب عاشق کا جنوں مراد لینا ایک بالکل نیا اور روش عام سے ہٹا ہوا انداز بیان ہے -

یا مثلاً کہنا یہ ہے کہ کسی زمانے میں ہمیں بزم آرائی کا شوق تھا - جب سے یہ شوق دھیما پڑا ہے ہم اس کی یاد کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں - اب یہ یاد بھی مٹتی جارہی ہے - اسے اس طرح کہا ہے :

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بزم آرائی کی بھولی بسری یاد کو طاق نسیاں کا نقش و نگار قرار دینا پر لطف ہی نہیں دل نشین بھی ہے جو تیر کی طرح دل میں پیٹھتا چلا جاتا ہے - اسی غزل کا ایک شعر ہے :

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیہ' چاک گریباں ہوگئیں

'' بخیہ' چاک گریباں '' سے عاشق زار کے اخفائے حال کا حال کھلتا ہے ۔ ضبط گریہ نے چاک گریباں پر بخیہ کا کام کیا اور راز الفت طشت از بام نہ ہوسکا ۔ ذیل کے شعر کا انداز بھی کچھ اسی قسم کا ہے :

نکوہش مانع بے ربطی' شور جنوں آئی
ہوا ہے خندہ' احباب بخیہ جیب و دامن میں

اوپر ضبط گریہ نے آہوں کو بخیہ' چاک گریباں بنایا تھا ، یہاں خندہ' احباب بخیہ' جیب و دامن قرار پایا اور اس طرح جنوں کی بے ربطی پر بدستور پردہ پڑا رہا ۔ مذکورہ بالا غزل کا آخری شعر ہے :

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

زبان کے عام محاورے اور قواعد کے خلاف اس شعر میں مستقبل کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے ۔ کہنا یہ تھا کہ غالب لگاتار یونہی اشک باری کرتا رہا تو دیکھ لینا ایک دن بستیاں سب تباہ و برباد ہو جائیں گی ، لیکن کہا یہ کہ بستیاں ویران ہوگئیں ۔ مستقبل کی جگہ صیغہ' ماضی کا استعمال وثوق اور یقین ظاہر کرتا ہے ۔ غالب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بستیوں کی ویرانی یقینی ہے ، ویران ہو کر رہیں اور پھر رہیں ۔

ذیل کا شعر سطور بالا میں درج ہو چکا ہے ۔ اس میں ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ استعمال ہوا ہے :

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

مطلب یہ ہے کہ آج تک چار و ناچار جس طرح ہوا ضبط سے کام لیا گیا ، آیندہ اظہار و بیان سے باز رکھا گیا تو اس کا نتیجہ دیوانگی کی صورت میں ظاہر ہوگا ۔

ایک مثال اور پیش کرتا چلوں تاکہ انداز بیان کی وہ تمام صورتیں روشنی میں آجائیں جنھیں میں واضح کرنا چاہتا ہوں :

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

'خدا کرے'' کو الٹ کر ''خدا نہ کرے'' کہنے میں جو لطف ہے اسے بجلی کے قمقمے کے روشن ہونے اور بجھنے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ایک غزل کے یہ تین شعر بھی اسی سلسلے کے ہیں :

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
اس کی بزم آرائیاں سن کر دل رنجور یاں
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے
نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

پہلے شعر میں کھوئے جانے اور پائے جانے کا تقابل داد کے قابل ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں بالترتیب بیٹھنا اور کھنچنا دو فعل دو مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جن کا لطف صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

یہ کل دس مثالیں ہوئیں جن میں سے پہلی چار مثالوں کا تعلق بلاغت کے شعبۂ بیان سے ہے جس میں عموماً اظہار کے گوناگوں طریقوں ، ان کے حسن و اثر یا چمک دمک سے بحث کی جاتی ہے ۔ دوسری قسم کی دو مثالیں شعبۂ معانی کے ذیل میں آتی ہیں جسے فلسفۂ قواعد کہنا چاہیے ۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ زبان کے محاوروں اور قاعدوں کی پابندی کے کیا معنی ہیں اور وہ کون سے مواقع ہیں جہاں قواعد سے انحراف ، لطافت و بلاغت سمجھا جاتا ہے ۔ تیسری اور آخری چار مثالوں سے طرز اظہار کی چاشنی یا چٹ پٹے پن پر روشنی پڑتی ہے جو شعبۂ بدیع کا موضوع ہے۔

بیان اور اس کے اسالیب سے ہٹ کر اس وقت صرف اجزائے بیان یعنی الفاظ اور ان کے آمیزے زیر بحث ہیں جو بقول غالب :

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ کے غالب مرے اشعار میں آوے

کلام غالب کے لیے طلسم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ غالب کے کلام کی روح تک رسائی کے لیے اس کے لفظوں کی طلسم کشائی ضروری ہے ۔ الفاظ و مرکبات کی قدر و قیمت کی تعیین جو کلام غالب کے آینہ خانے کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں ، اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان کی ساخت ، حقیقت اور اصول انتخاب سے پوری طرح آگاہ ہوں ۔

[۳]

ڈاکٹر بجنوری مرحوم فرماتے ہیں " مرزا کی شاعری دلی کی کلیوں یا لکھنؤ کے کوچوں کی پابند نہیں بلکہ آزاد اردو زبان ہے " ۔ غالب کی زبان آزاد ہی نہیں تازہ اور جدید بھی ہے ۔ غالب ایک حد تک خود اپنی زبان کے واضع ہیں ۔ انھوں نے پیش پا افتادہ ، پامال' گھسے پٹے الفاظ ، مرکبات اور محاورے کم سے کم استعمال کیے ہیں ۔ وہ زبان کے مزاج کے پارکھ ہی نہ تھے ، اس کے لوچ اور لچک کا صحیح ذوق بھی رکھتے تھے ، فارسی اور اردو کے خلا ملا کا بھی انھیں پوری طرح احساس تھا ۔ اس لیے انھوں نے ماہر صنعت کار کی طرح لفظ سازی سے کام لیا ، حسب ضرورت کھلے ڈھلے الفاظ وضع کیے ، پرانے الفاظ کی رگوں میں نئے معانی کا تازہ خون دوڑا کر ان کا کایا کلپ کیا ۔ غالب کے کلام کی تازگی بڑی حد تک تازہ کاری ، ایجاد اور رستخیز الفاظ و مرکبات کی منت کش ہے ۔

" آینہ دار " فارسی میں مشاطہ کو کہتے ہیں جو حسینہ کے سامنے آینہ رکھ کر اس کے شوق جمال آرائی کا سامان کرتی ہے ۔ غالب نے شاید اس بنا پر کہ آینہ چہرے کے حسن وقبح کو دکھاتا ہے ، آینہ دار کو (مثال دے کر یا دکھا کر) بتانے والے یا دکھانے والے کے معنوں میں استعمال کیا ہے :

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

حیرت نقش پا نے اپنی افتادگی دکھا کر کوئے یار میں رہنے کی وضع بتادی ۔ " آینہ داری " اظہار کے معنوں میں غالباً بعد میں وضع ہوا ۔

غالب کے یہاں آیینہ داری جمال آرائی ہے :

تماشا کر اے محو آیینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

" سیہ گلیم " فارسی کی عام ترکیب ہے اور اس کے معنی ظاہر ہیں ، غالب نے سیاہ بخت اور بدقسمت کے معنوں میں استعمال کیا ہے :

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

غالب کے ان تصرفات کو میں لفظوں کا حشر و نشر کہتا ہوں ۔ کہیں انہوں نے زبان کے عام قواعد کے مطابق نئے لفظ یا پرانے لفظوں کی ترکیب سے نئے انداز کے مرکب ڈھالے ہیں ، کہیں پرانے مرکب سے نئے مناسب ترکیبی معنی مراد لیے ہیں ، اور ایک ماہر فنکار کی طرح اسے اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ نئے معنوں کی طرف قاری کا ذہن بآسانی منتقل ہوجاتا ہے اور مفہوم تک رسائی میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ۔ یہ صحیح ہے کہ نئے خیال کو نئے لفظ کے قالب میں ڈھال کر ہی پیش کیا جاسکتا ہے ، لیکن فنکار کو زبان پر قدرت یا لفظ سازی میں مہارت نہ ہو تو یہ خطرہ بہرحال رہتا ہے کہ خیال کی باریکی پر بیان کی تاریکی چھا جائے اور مفہوم واضح نہ ہونے پائے ، غالب کے یہاں خیال کی باریکی تو ہے بیان کی تاریکی نہیں ۔

[۴]

سوال یہ ہے کہ غالب اس مشکل کام سے کس طرح عہدہ برآ ہوئے ، نئے خیالات کی ادائی کے لیے نئے الفاظ کا ذخیرہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا ، کن اصولوں کے مطابق نئے لفظ ڈھالے اور کس طرح پرانے الفاظ کو نئے معنوں میں استعمال کر کے ان کا خلق نو کیا اور اس طرح ایک تازہ کار ، زندہ اور نئے تصورات و خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ زبان کا ڈول ڈالا ۔

غالب نے فارسی کی آغوش میں تربیت پائی تھی جس کی توانائی و برنائی کا انہیں پوری طرح احساس تھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ، اردو اور فارسی کے تال میل سے بھی وہ بے خبر نہ تھے ۔ انھوں نے فارسی کے

ذخیرے سے بے دریغ استفادہ کیا - فارسی کے ڈھلے ڈھلائے الفاظ مستعار لیے، انھیں ترکیب دے کر نئی وضع کے مرکبات ڈھالے، فارسی افعال و محاورات کے اردو میں ترجمے کیے اور فارسی کا ایک بڑا سرمایہ اردو میں منتقل کردیا - فارسی الفاظ سے جنھیں غالب نے اپنے اردو کلام میں استعمال کیا ہے' ایک طویل فرہنگ ترتیب دی جاسکتی ہے جو اپنی جگہ ایک مستقل کام ہے - فارسی حروف سے ترکیب پا کر جو کلمے بنے ہیں ان میں سے بقدر، بانداز، از بسکہ، ز بسکہ، از بس، برنگ (= طرح) بجز وغیرہ کا غالب نے کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے - درخور، باب (= بابت) زنہار (= ہرگز) وغیرہ کی بھرمار بھی ہے لیکن باب (= لائق) اور زنہار (بطور فجائیہ) ذیل کے شعروں میں ملے ہیں :

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوس نا و نوش ہے

کثرت بتانے کے لیے ظرف کی تکرار یا بطور پیمانہ اس کا استعمال فارسی میں عام ہے - غالب نے بڑے شوق و رغبت سے اسے اردو میں جگہ دی ہے - صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
[یک جہاں ہنگامہ = فراوانی ہنگامہ]
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
[خیاباں خیاباں = کثرت کے ساتھ]
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
[یک شہر آرزو = ہجوم آرزو]
نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
[یک بیاباں ماندگی = کثرت ماندگی]

فارسی لفظ صد (= سو) سے کثرت یا تنوع کا اظہار غالب کے بیان کی ایک خصوصیت ہے -

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

فارسی جمع و خوباں، اور 'دل آشفتگاں' وغیرہ کا بغیر اضافت استعمال بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ یہ اردو محاورے کے خلاف ہے۔

[۵]

فارسی محاورات کے اردو ترجمے غالب کے یہاں بہت زیادہ ہیں جن میں سے بعض شاید اردو میں نہ کھپ سکیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے موقع و محل کے لحاظ سے انھیں بڑی خوبصورتی سے کھپایا ہے اور ان سے جو کام لیا ہے وہ غالباً ان کے ہم معنی خالص اردو محاورات سے نہیں لیا جا سکتا تھا اور اگر لیا جا سکتا تھا تو بیان وہ تازہ کاری لہ آتی جو ان ترجموں نے پیدا کی۔ چند ترجمے ملاحظہ ہوں:

وا کرنا (وا کردن) انتظار کھینچنا (انتظار کشیدن) درست کرنا (درست کردن) تماشا کرنا (تماشا کردن) بباد دینا (بباد دادن) عذر لانا (عذر آوردن) باور آنا (باور آمدن) شادمانی کرنا (شادمانی کردن) جا دینا (جا دادن) رنگ پکڑنا (رنگ گرفتن) شکایت کی جانہ رہنا (جائے شکایت نہ ماندن) خجالت کھینچنا (خجالت کشیدن) ناز فرمانا (ناز فرمودن) کنارہ کرنا (کنارہ کردن) ناز کھینچنا (ناز کشیدن) تسلی ہونا (تسلی شدن) منت کھینچنا (منت کشیدن) رخصت دینا (رخصت دادن) دریغ آنا (دریغ آمدن) دریغ رکھنا (دریغ داشتن) طرف ہونا (طرف شدن) شعار کرنا (شعار کردن) جاگرم کرنا (جاگرم کردن)۔ ذیل کے شعر میں تقریر کرنا بمعنی بیان کرنا:

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

فارسی 'تقریر کردن' کا ترجمہ ہے۔ یہی حال اس شعر کا ہے:

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

'' ازو ہم آغوشی آرزو دارم '' کو لفظ بلفظ اردو میں منتقل کر دیا گیا ہے ۔ ایک اور شعر ہے :

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس سے جان عزیز رکھوں ، ترجمہ ہے '' ازان بت جان عزیز دارم '' کا ۔

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

سر کرنا ، کے معنی ہیں شروع کرنا اور یہ فارسی ' سر کردن ' کا ترجمہ ہے ۔

ان محاورات و استعمالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب فارسی رنگ میں کچھ اس طرح رنگ گئے تھے کہ فارسی میں سوچتے اور اردو محاورے کا خیال کیے بغیر بے تکلف اردو میں بیان کر دیتے تھے ، مثلاً شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے ، ترجمہ ہے 'خالی ز ادا نیست' کا ۔ ' نہ ' اردو محاورے کے خلاف ہے ۔

فارسی (عربی) الفاظ بھی اسی ضمن میں آتے ہیں جو اگرچہ فارسی میں مستعمل تھے ، اور انھی معنوں میں مستعمل تھے ، جن معنوں میں غالب نے انھیں استعمال کیا ، لیکن اردو میں ان کا رواج نہ تھا ، یا تھا تو عام نہ تھا ۔ غالب نے سکۂ رائج الوقت کی طرح انھیں چلن عطا کیا ۔ مثلاً محابا ، ڈر کے معنوں میں :

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

مقدم ، بمعنی آمد :

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

جلترنگ کو ساز صدائے آب کہنا بھی لطف سے خالی نہیں ۔ صرفہ ، فائدے کی جگہ اور اس کے معنوں میں :

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

رقیب بمعنی دشمن :

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

''معلوم'' کے بعد عموماً غالب ''ہے'' یا ''تھا'' وغیرہ فعل حذف کر دیتے ہیں اور اس سے نفی کے معنی مراد لیتے ہیں -

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم
باوجود دل جمعی خواب گل پریشان ہے

بنالہ حاصل دل بستگی فراہم کر
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

[۶]

جدید فارسی مرکبات کی شرح و تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان صفات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جو کسی لفظ کی توضیح یا

تعیین کی غرض سے غالب نے بطور صفت یا بطور خبر استعمال کی ہیں۔ صفت کی خوبی یہ ہے کہ جس لفظ کی توضیح یا تعیین مقصود ہو اسے کچھ اس طرح واضح کر دے کہ حقیقت آیئنہ ہو جائے اور نظر کے سامنے اس کی تصویر کھنچ جائے۔ غالب نے قریب قریب ہر جگہ جہاں ضرورت سمجھی ہے مناسب اور برمحل صفات کی مدد سے لفظ کی حقیقت کو بر افگندہ نقاب کیا ہے۔ اور دو ملتی جلتی ہم جنس حقیقتوں کے لیے دو مختلف لیکن موزوں ترین صفات استعمال کی ہیں جس سے غالب کی دقت بینی کا پتا چلتا ہے:

آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

آہ کے لیے بے اثر اور نالہ کے لیے نارسا مناسب ترین صفات ہیں۔

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم

دوست دار کی جگہ دوست بھی ہو سکتا تھا لیکن دوست دار برمحل لفظ ہے جس کے معنی ہیں دوست یعنی عزیز رکھنے والا۔

حال اور طاقت کے نازک ترین فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا ہے:

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

چند الفاظ اور ان کی صفات درج کی جا رہی ہیں۔ غور فرمایے کہ صفات نے حقائق کی وضاحت میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

بت آینہ سیما ، نگاہ بے محابا ، مے مرد افگن ، بت بیداد فن ، نگاہ غلط انداز ، نگہ سرمہ سا ، رند شاہد باز ، خامہ خونچکاں ، عشق خونابہ مشرب ، تغافل تمکین آزما ، شکایت رنگیں ، نوازش بے جا۔

دو یا دو سے زیادہ لفظوں کے جوڑنے کی دو بڑی بنیادی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اجزائے کلمہ مل جل کر شیر و شکر ہو جائیں۔ اس قسم کے لفظ کو مرکب کہیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ترکیب کے باوجود اجزا الگ الگ رہیں اور گھلنے ملنے نہ پائیں۔ اسے ترکیب کہتے ہیں۔ آینہ سیما ، اور بیداد فن ، مرکب ہیں۔ اس کے مقابلے میں طاق نسیاں ، روح و رواں ، اور روئے زیبا ترکیبیں ہیں۔ کیوں ؟ اس لیے کہ آینہ سیما ، اور بیداد فن ، میں دو اسم برابر برابر رکھے ہوئے ہیں جن میں باہم کوئی رشتہ نہیں ، نہ ان کو جوڑنے والی کوئی ظاہری علامت ہے۔ اس کے برعکس طاق نسیاں ،

وغیرہ کاموں میں ان کو جوڑنے والی علامات موجود ہیں جو ان کے باہمی تعلق یا رشتے کو ظاہر کرتی ہیں - طاق نسیاں کا کسرہ اضافت کے لیے ہے - طاق مضاف ہے اور نسیاں مضاف الیہ - 'روے زیبا' کا کسرہ صفت کے لیے ہے - روح کو رواں کے ساتھ واو عطف سے جوڑا گیا ہے - روح و رواں عطفی ترکیب ہے - اس قسم کی تمام ترکیبیں جن کا باہم تعلق ہو اور کسی حرف یا حرکت کی مدد سے انھیں وصل کیا جائے نحوی ترکیبیں کہلائیں گی -

نحوی ترکیبیں اردو میں عام طور سے مستعمل رہی ہیں - لیکن غالب نے جو ترکیبیں استعمال کی ہیں ان میں زبان کی تازہ کاری بھی ہے اور تخیل کی رعنائی اور نادرہ کاری بھی - غالب نے تشبیہ، استعارے اور کنایے سے کام لے کر لفظوں کا جو چمن کھلایا ہے اس میں ہر رنگ کے پھول ہیں اور ہر پھول میں رنگا رنگ پتیاں ہیں - ڈاکٹر بجنوری نے اس قسم کی ترکیبوں کی ایک فہرست، اور خاصی طویل فہرست، پیش کی ہے - لیکن ان ترکیبوں کا تعلق لفظ سازی سے نہیں شاعرانہ تخییل اور اس کی خلاقی سے ہے - ان سے بے شبہ غالب کی فن کارانہ خلاقی پر چھوٹ پڑتی ہے - لیکن اس وقت میں غالب کی صنعت گری دکھانا چاہتا ہوں اور یہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، لفظ سازی سے ظاہر ہوگی یا پیوند کاری یعنی نادر اور تازہ کار مرکبات کی وضع و تعمیر سے -

غالب نے فارسی قواعد کے مطابق جو مرکبات وضع کئے ہیں صوتی اعتبار سے وہ رواں دواں اور خصوصی آہنگ کے حامل ہیں - معنوی اعتبار سے ان میں گہرائی اور دور رسی ہے - وہ مفہوم کو اس کی تمام پہنائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ بیان ہی نہیں کرتے اس کی اس طرح تصویر کشی یا تجسیم کر دیتے ہیں کہ مفہوم اپنے تینوں ابعاد کے ساتھ نظر کے سامنے آ جاتا ہے - آتش دیدہ اور آتش زدہ غالب نے دو مرکب استعمال کیے ہیں جن کا پہلا جز آتش دونوں میں مشترک ہے - دونوں سہل اور رواں دواں ہیں - آتش دیدہ کے معنی ہیں وہ چیز جسے آگ سے اس طرح قریب کیا جائے کہ جلنے نہ پائے - آتش زدہ وہ ہے جو آگ پکڑنے کی وجہ سے جھلس جائے - حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ کہا گیا کہ بال آگ کے قرب سے گرم ہو کر مڑ جاتا اور حلقے کی شکل اختیار کر لیتا ہے - اب ذرا ذیل کے مرکبات ان کی ساخت، بناوٹ، صوتی آہنگ، گیرائی اور گہرائی پر غور

فرمائیں - ان میں سے ہر مرکب میں فکر و خیال کی ایک وسیع دنیا آباد نظر آئے گی -

بے سبب رنج ، بے سبب آزار ، زبونی کش ، روکش (روکشی) سبک سر ، سرگراں ، نیم باز ، نیم کش ، حسرت سنج ، پردہ سنج ، نشاط آہنگ ، زود پشیماں ، رستخیز اندازہ ، جنوں جولاں ، وحشت خرام ، (وحشت خرامی) آرزو خرام (آرزو خرامی) لب تشنہ ، جگر تشنہ ، لظارہ سوز ، زوال آمادہ ، بہشت شمائل ، تنک آب (تنک آبی)، خدا ساز ، فنا تعلیم ، پشت گرمی ، واشد -

ان کی مدد سے غالب نے لا تعداد تازہ کار ترکیبیں وضع کی ہیں جن سے جملے بنے - یہ ترکیبیں اور جملے ان کے کلام کے آینہ خانے کی تعمیر و تشکیل میں صرف ہوئے ہیں -

[۷]

اس میں شک نہیں کہ غالب حیات و کائنات دونوں میں رم یعنی حرکت کے قائل ہیں :

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اور یہ امر بھی شبہہ سے بالا تر ہے کہ سرمایہ' زبان میں سے تنہا فعل ایک ایسا کلمہ ہے جس سے حرکت کا اظہار ہوتا ہے - فعل میں حدوث بھی ہوتا ہے اور زمانہ بھی - اپنی دلالت یعنی معنی اور مفہوم کے اعتبار سے فعل گریز پا ہے - اور متحرک تصور یا خیال کی لفظی تصویرکشی کرتا ہے - اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ غالب کے یہاں اس کے اپنے حرکی تصور اور رجحان کے تعلق سے افعال مقابلتہ' زیادہ استعمال میں آتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غالب نے افعال کے مقابلے میں اسما یا مرکبات زیادہ استعمال کیے ہیں - عام افعال ہونا ، کرنا ، ہے ، تھا، کو چھوڑ کر جو حسب موقع و محاورہ حذف بھی ہوئے ہیں ، جیسا کہ ذیل کے شعر میں منفعل کے بعد " ہو" محذوف ہے :

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

غالب نے اردو کے ذخیرہ' افعال میں سے چند منتخب اور متداول فعل

استعمال کئے ہیں ۔ چنانچہ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ جہاں تک افعال کے استعمال کا تعلق ہے غالب کا مقام ان کے ہمسر انگریزی شاعر شیکسپیر سے فروتر ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی کہ غالب کی شاعری بیانیہ نہیں فکری ہے جس میں وسعت کی جگہ عمق اور پھیلاؤ کی جگہ گہرائی ہونی چاہیے ۔ غالب کی شاعری میں عمق یا گہرائی بھی ہے اور حرکت بھی ہے ، لیکن یہ حرکت افقی نہیں عمودی ہے ۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ غالب نے عام طور سے وہ افعال زیادہ استعمال کیے ہیں جو معاون افعال کی ترکیب سے وجود میں آئے ۔ مثلاً " جانا " یہ معروف کو مجہول بنانے کے علاوہ فعل کی تکمیل بھی بتا تا ہے اور اس کا امکان و استمرار بھی ۔ غالب نے " جانا " سے تمام معانی مراد لیے ہیں ۔

وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

پہلا " جانا " مجہول کے لیے ہے اور دوسرا ' سکنا ' کے معنوں میں امکان کے لیے ۔

اٹھ جانا ، آجانا ، ڈر جانا ، رہ جانا ، کھل جانا ، الگ جانا ، مٹ جانا ، مل جانا ، وغیرہ افعال بھی غالب کے یہاں استعمال ہوئے ہیں جن میں " جانا " اصل فعل کی تکمیل یا تتمیم بتاتا ہے ۔

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

' مرنے ' اور ' مر جانے ' کے فرق پر غور فرمائیں ۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

" چلی جائے " کے معنی ہیں مسلسل اور لگا تار چلتی رہے ۔ " جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں " یعنی کہتے رہیں ۔

اس کے علاوہ آنا ، بیٹھنا ، پانا ، پڑنا ، پھرنا ، دینا ، رہنا ، کرنا ، لگنا ، لینا ، نکلنا وغیرہ افعال سے بھی غالب نے فعل معاون کا کام لیا ہے ۔ جیسے دیکھ آنا ، دھو بیٹھنا ، اڑنے نہ پانا بمعنی اڑ نہ سکنا :

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

آپڑنا ، رکھتا پھرنا ، مٹا دینا ، پڑے رہنا ، کیا کرنا ، رکنے لگنا ، سن لینا ، چل نکلنا وغیرہ افعال کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں عمودی حرکت ہے - یہ عمل کی گہرائی بتاتے ہیں -

[٨]

اس سلسلے میں غالب کے لفظی سرمائے کی ان چند خصوصیات کا ذکر بھی ہونا چاہیے جن سے غالب کے کلام میں لطف ، چاشنی یا چٹ پٹا پن پیدا ہوا -

غالب نے مفرد کے ساتھ مرکب افعال بھی استعمال کیے ہیں - لیکن محاورے ان کے یہاں بہت کم ہیں - محاورہ پامال اور فرسودہ ہوتا ہے - غالب فطری طور سے جدت پسند تھے - وہ نئی بات نہیں کہہ سکتے تھے تو اس کے روادار بھی نہ تھے کہ رہ و رسم قدیم کی پابندی کریں - کسی خاص وجہ سے پا مال انداز بیان انھیں اختیار کرنا پڑا ہے تو کسی خاص لفظ یا مرکب سے بیان میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں

جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیرباد نہیں

اس سے قطع نظر کہ شعر کے دونوں مصرعے چست اور ایک دوسرے کے مقابل یا معادل واقع ہوئے ہیں ' آؤں ' اور 'جاؤں ' کا تقابل توجہ کے قابل ہے جس سے لطف کلام دوبالا ہوگیا ہے - ذیل کے شعر میں مہرباں اور نامہرباں میں تضاد داد کا خواہاں ہے -

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز

نا مہر باں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

نیچے کے شعر میں نفی و اثبات کا اجتماع تو ہے ہی - ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک فعل دو مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے -

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے

ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

نہ نکلا دل سے ، یعنی فراموش نہ ہوا -

غالب نے اکثر ایک ہی فعل کو ایک شعر میں یا ایک مصرعے میں دو مختلف معنوں میں برتا ہے اور اس طرح دھوپ چھاؤں کی سی عجیب وغریب کیفیت پیدا کی ہے -

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

پہلے مصرعے میں 'چھوڑنا' اصلی معنوں میں ہے اور دوسرے مصرعے میں مجازی معنوں میں -

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

جلتا ہوں = حسد کرتا ہوں - ذیل کے مصرعے میں جلنا کے دونوں معنی مراد ہیں :

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

پہلے مصرعے میں "ملتی ہے" کے معنی ہیں مشابہ ہے -

سر جاے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

"رھنا" کے دو معنی ہیں -

کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

یہاں "کہنا" دو معنوں میں استعمال ہوا ہے -

ان مثالوں میں فعل کی تکرار تھی - ذیل میں ایک ہی فعل بیک وقت دو معنی دے رہا ہے -

زھر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

قسم بھی کھائی جاتی ہے اور زھر بھی -

اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

"باندھنا" قید کرنے کے معنوں میں بھی ہے اور نظم کرنے کے معنوں میں بھی -

[٩]

ایک اور قابل توجہ خصوصیت جس کا ذکر اس سلسلے میں ہونا چاہیے یہ ہے کہ غالب نے مستقل طور سے کسی قدر اصرار یا استمرار کے ساتھ فعل مضارع کی جگہ امر کے صیغے استعمال کیے ہیں -

دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں

وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوشہائے مژگاں کا

ہے کیا کہ کس کے باندھیے میری بلا ڈرے

پرسش طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے

بزم میں اس کے رو برو کیوں نہ خموش بیٹھیے

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایے تو نوحہ خواں کوی نہ ہو

نا چار بے کسی کی بھی حسرت اٹھایے

یہ صرف چند مثالیں ہیں -

مضارع اور امر کے صیغے اردو اور فارسی دونوں میں مشترک تھے - کم سے کم صورت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہ تھا - اس لیے شاید غالب نے مضارع کی جگہ امر کے صیغے استعمال کیے ہیں - لیکن مثالوں پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے امر کے صیغے استعمال نہیں کیے امر احترامی کے

صیغے استعمال کیے ہیں جو فعل "چاہیے" کی طرح صورت و معنی دونوں اعتبار سے مجہول کے صیغے ہیں - "عرض کیجیے" کے معنی ہیں عرض کیا جائے - "باندھیے" کے معنی ہیں باندھی جائے - اس کے علاوہ مذکورہ مثالوں میں کوئی فعل ایسا نہیں جس کا فاعل مذکور ہو یا کم سے کم معلوم ہو، اس لیے اس کا امکان ہے کہ وہ تمام صیغے جنھیں ہم امر کے صیغے سمجھتے ہیں مضارع مجہول کے صیغے ہوں اور غالب نے انھیں اس لیے استعمال کیا ہو کہ وہ فاعل کو غیر اہم ہونے کی وجہ سے تاریکی میں رکھنا چاہتے تھے -

بعض مقامات پر امر غائب کی جگہ امر حاضر کے صیغے بھی استعمال ہوئے ہیں :

کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اس باب میں غالباً بہتر روش یہ ہے کہ اسے غالب کی زبان یا اس کی خصوصیت قرار دینے کی بجائے یہ کہا جائے کہ غالب کے زمانے میں زبان کا انداز یہی تھا جسے غالب نے برقرار رکھا - ویسے غالب عموماً مصدر سے جو دراصل استقبالیہ ہے امر حاضر کا کام لیتے ہیں -

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

دستگاہ دیدۂ خوں بار مجنوں دیکھنا

اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

غالب کے زمانے میں لکھنؤ کی نام نہاد لسانی اصلاحی تحریک کا آغاز ہوچکا تھا - چنانچہ اردو کو بنانے سنوارنے کی غرض سے متاخرین شعرائے لکھنؤ نے زبان میں جو تصرفات کیے ان میں سے ایک تصرف یہ بھی تھا کہ اہل لکھنو مصدر میں تصریف یعنی قواعدی تغیر کے روا دار نہ تھے - ہر حال میں مصدر کو واحد مذکر نظم کرتے تھے خواہ اس کا فاعل (یا مفعول جس سے مصدر کا تعلق ہے) مونث یا جمع کیوں نہ ہو - غالب ہر چند ناسخ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جو لکھنوی زبان اور اس کی شریعت کے پیغمبر سمجھے جاتے ہیں -

اپنے رقعات میں غالب نے لکھنؤ کی زبان کو سراہا بھی ہے ، لیکن لکھنؤ کی لسانی اصلاحات کی انھوں نے پیروی نہیں کی اور اپنی زبان کو ، جو فطرت کی پیداوار ہے ، ایک خاص طبقے کے من مانے تصرفات سے پاک رکھتے ہوئے مصدر کو فاعل کے مطابق مذکر یا مونث استعمال کیا ہے ۔

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یہاں بات کے تعلق سے ' سمجھنا ' کی جگہ سمجھنی نظم ہوا ہے ۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

' جاں ' اور ' نذر ' دونوں مونث ہیں ، اس لیے غالب نے " دینی " بصورت تانیث لکھا ۔

[۱۰]

غالب کا زمانہ زبان کی تخریب و تعمیر اور شکست و ریخت کا زمانہ تھا ۔ تہذیبی قدروں کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں زبان میں بھی توڑ پھوڑ ہوئی ۔ کچھ لفظ متروک ہوئے اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ آئے ۔ کچھ ایسے تھے جنھوں نے اپنا روپ بدل لیا ۔ کچھ ادھر آدھر سے تراش دیے گئے ۔ بعض میں معنوی تبدیلیاں ہوئیں اور وہ اپنے قدیم معنوں سے مختلف ، اور بعض صورتوں میں مخالف ، معنوں میں برتے جانے لگے ۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور سے زبان کے عام بدلنے والے فطری رجحان کے تحت ہوا اور جیسا کہ عام طور سے ایسی صورتوں میں ہوا کرتا ہے ، ترک و اختیار کا فعل غیر شعوری طور پر جاری رہا ، نئے الفاظ اور ان کی نئی بدلی ہوئی صورتوں کے پہلو بہ پہلو پرانے لفظ اور ان کی پرانی صورتیں بھی رائج رہیں ۔ دونوں سکے اردو کے بازار میں چلتے رہے ۔ غالب کے یہاں لفظوں کی یہ آنکھ مچولی دیکھی گئی ہے ۔

' کسی ' کی قدیم شکل ' کسو ' کے بارے میں تو غالب نے خود ہی لکھا ہے ، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں ، البتہ فصیح نہیں ۔ قافیے کی رعایت سے لکھا جائے تو عیب نہیں ، ورنہ فصیح بلکہ افصح ' کسی ' ہے ۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ ' کسو ' واقع ہوا ہے اور سب جگہ ' کسی ' ہے ۔

غالب نے جس شعر کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے :

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

'آگے' اب آیندہ کے معنوں میں ہے۔ غالب کے زمانے تک گزشتہ یعنی گزری ہوئی مدت کے لیے بولا جاتا تھا ، غالب نے انھی معنوں میں استعمال کیا ہے :

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

آنا ، جانا ، دینا ، لینا وغیرہ افعال کے آخر میں 'الف' یا 'ے' ہے۔ آج جب ان سے مضارع یا مستقبل کے صیغے ڈھالے جاتے ہیں تو 'لینا' اور 'دینا' کو چھوڑ کر باقی افعال کے آخر میں ہمزہ یا 'ے' اضافہ کر کے کہتے ہیں: آئے ، جائے ، پئے ، سنے ، آئے گا ، جائے گا ، پئے گا ، سنے گا ۔ 'لینا' سے لے ، لے گا ۔ 'دینا' سے دے ، دے گا وغیرہ ۔ غالب کے زمانے میں ان کے آخر میں 'و' اضافہ کیا جاتا تھا ۔ لیکن موجودہ رجحان کی بنیاد پڑ چکی تھی ۔ اس لیے غالب کے یہاں آوے ، جاوے ، لیوے ، دیوے ، وغیرہ صیغے بھی ملتے ہیں اور آئے ، جائے وغیرہ بھی :

نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آیینہ میں روئے نگار آتش

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

غالب کی ایک پوری غزل 'آوے' کی ردیف میں ہے جس کا مطلع ہے :

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

دوسری غزل 'آئے' کی ردیف میں ہے اس کے درج ذیل دو مصرعوں میں ''آئے'' مضارع کا صیغہ ہے :

ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

'' آئے '' میں یک گونہ اشتباہ تھا کہ ماضی کا صیغہ جمع بھی ہو سکتا ہے جو اردو میں احترام و تعظیم کے لیے ہے - جیسے وہ آئے اور بیٹھ گئے - غالب نے شاید اس اشتباہ سے بچنے کے لیے 'آوے' کو برقرار رکھا اور اسے ردیف قرار دے کر پوری ایک غزل کہہ ڈالی -

قریب قریب یہی حال قدیم فعل حال آئے ہے ، جائے ہے، کا ہے - غالب نے ' آتا ہے' اور ' جاتا ہے ' کے ساتھ ساتھ اسے بھی قائم رکھا ہے - اس میں شک نہیں کہ ' آئے ہے ' میں بڑی روانی ہے - بعض مقامات پر ' آئے ہے' ' آتا ہے ' سے زیادہ سبک ، سلیس ہلکا اور رواں محسوس ہوتا ہے -

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

' آئے ہے ' کی جگہ ' آتا ہے' پڑھ کر دیکھیے زبان لڑکھڑا جائے گی - ایک شعر ہے :

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

' آسان ' کا 'ن' ظاہر کر کے یوں پڑھ سکتے ہیں :

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آسان سمجھے ہیں

لیکن یہ موقع فعل حال کا ہے اور 'سمجھے ہیں' سے گزرے ہوئے زمانے کا اشتباہ ہوتا ہے -

'ہوجیو' یا 'ہو جیے' وغیرہ متروک صیغے بھی کہیں کہیں غالب کے یہاں ملے ہیں - لیکن میرے نزدیک جس رجحان کو اس سلسلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ غالب نے آج کی زبان اور محاورے کے خلاف عموماً مصدر کی جگہ ماضی کے صیغے استعمال کیے ہیں -

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
[غبار ہوئے پر = غبار ہونے پر]

کہ جس کو دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
[دیکھے سے = دیکھنے سے]

دیکھوں اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

[مر گئے پر = مرجانے پر ۔ ویسے 'پر'
'مگر' کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے]

آج ''دیکھا چاہیے'' مستقبل کا صیغہ ہے اور دیکھنے کے معنوں میں ہے۔ غالب کے زمانے میں 'دیکھنا چاہیے' کے معنوں میں تھا ۔ غالب نے 'چاہیے' کے ساتھ ہر جگہ مصدر کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے :

نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے

' کہ' اور ' جو' دو آزاد حرف ہیں ۔ غالب نے انہیں جوڑ کر ' کہ جو' لکھا ہے :

خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

بعض اہل علم 'جوکہ' بولتے اور لکھتے ہیں ۔ صحیح اور فصیح ، جیسا کہ میں نے عرض کیا ، تنہا جو یا کہ ہے ۔ * اس کے علاوہ 'سو' بمعنی 'وہ' آج قابل ترک ہے ۔ غالب نے ذیل کے شعر میں استعمال کیا ہے :

ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا

[سو بھی = وہ بھی]

آخر میں چند متروکات کا ذکر کروں گا ۔

'کر' بجائے 'کرنا' :

ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

---

* ''دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا'' اس میں 'کہ' بیانیہ 'جو' سے الگ ہے ۔ غالب نے 'جوکہ' بھی لکھا ہے : بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار میں ....

' تسپر ' بجائے ' اس پر ' :

ایک دل تسپر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

' آن بیٹھنا ' ' بجائے آبیٹھنا ' :

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

' کے ' یا ' کر ' اضافہ کیے بغیر عاطفہ کا استعمال :

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

' بھوں پاس ' بجائے ' بھوں کے پاس ' :

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

[۱۱]

غالب کو زبان کے لطائف و نکات کا کس درجہ شعور تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے میں دو ایک لسانی نکتے بیان کروں گا، جن سے قارئین کرام کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ غالب کے بعض نکتہ چینوں نے غالب کی جو لسانی گرفت کی ہے اس میں قصور فہم کا کیا حصہ ہے اور کس حد تک غالب کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

عام طور سے فعل ' کہنا ' کا صلہ اردو میں ' سے ' آتا ہے۔ جیسے :

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے

لیکن غالب نے اس شعر میں ' سے ' کی جگہ ' کو ' استعمال کیا ہے :

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

بادی النظر میں یہ غلط سمجھا جائے گا لیکن جو زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ' کہنا ' اگر امر اور حکم کے معنوں میں ہو تو اس کا صلہ ' کو ' ہوگا۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ ' ہاں اور ' میں حکم کا پہلو ہے اس لیے کہے جائیں کا صلہ ' کو ' صحیح ہے جیسا کہ باغ و بہار میں ہے :

"ساتھ والوں کو کہا کہ یہ سب نقد و جنس بار کر لو"۔

غالب کا ایک شعر ہے :

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

بظاہر ' میرا سا ' کی جگہ ' مجھ سا ' ہونا چاہیے لیکن غور کرنے سے دونوں کا فرق واضح ہوتا ہے ۔ ' میرا سا ' کے معنی ہیں میرے دن جیسا ، یہاں یہی معنی مراد ہیں ۔ اگر ' مجھ سا ' کہا جاتا تو اس کے معنی ہوتے 'مجھ جیسا' ۔ یہ غلط ہے اس لیے کہ خود شاعر سیاہ نہیں اس کا دن سیاہ ہے ۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر

اثر گریہ میں یعنی اثر گریہ کے بارے میں ۔ یہاں ' باب ' یا ' بارے' وغیرہ مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ۔ خود 'میں' سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے ۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن

جگر کھودنے لگا یعنی جگر کو کھودنے لگا ۔ 'کو' کی چنداں ضرورت نہیں ۔ ہم عام طور سے بولتے ہیں ، جو گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گر جاتا ہے ۔

کبھی نیکی بھی اس کے دل میں گر آجائے ہے مجھ سے

' سے ' کے معنی ہیں ساتھ ۔ ' مجھ سے ' یعنی میرے ساتھ جیسا کہ اس مصرعے میں ہے :

تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے
[قد دلکش سے = قد دلکش کے ساتھ]
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

قاعدے کی رو سے ' مجھے ' کے بعد ' اپنی اوقات سے ' آنا چاہیے تھا ، لیکن غالب نے ' میں ' کی نسبت سے 'مجھے ' نظم کیا ہے تاکہ اس کی ذات سامنے رہے اور کسی دوسرے کا اشتباہ نہ ہو ۔ ''اپنی'' غیر یا غائب کے لیے بھی ہوسکتا ہے ۔

[۱۲]

موسیقت ، نغمگی یا ترنم نے غالب کی لفظی صنعت گری میں اہم بنیادی کردار ادا کیا ہے جو لفظوں کے انتخاب اور آوازوں کے زیروبم یا ان کے

مخصوص متوازن آہنگ کا منت کش ہے۔ آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے خصوصیت کے ساتھ غالب نے اپنے کلام کو پر شکوہ بنایا ہے ۔ کہیں خاص جھنکار یا شکوہ والی آواز کے تسلسل سے :

نقش ناز بت طناز بآغوش رقیب

اس میں 'ن' اور 'ز' کا تسلسل ہے۔

لوں وام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

اس میں 'خ' کا تسلسل ہے جو حلقی آواز ہے ۔

پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ان دونوں مصرعوں میں 'پ' کی آواز کا تسلسل توجہ کے قابل ہے ۔

آوازوں کے تسلسل کی کئی صورتیں ہیں ۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک آواز کسی مصرعے یا شعر میں بلاترتیب بار بار آئے ، جیسے نقش ، ناز ، طناز ، میں 'ن' کی آواز یا بخت ، خفتہ ، خواب میں 'خ' کی آواز۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ہی آواز کلمے کے شروع میں ہو۔ جیسے 'پیرہن' اور 'پیکر' یا 'پائے' اور 'پے' میں 'پ' کی آواز ہے ۔ انگریزی میں اسے (Alliteration) کہتے ہیں ۔ تیسری صورت غالب کے یہاں ذرا کم استعمال میں آئی ہے ۔ وہ یہ کہ ایک کلمہ جس آواز پر ختم ہوا تھا ، اسی آواز سے دوسرے کلمے کی ابتدا ہوئی ، جیسے ذیل کے مصرعے میں :

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

'رکھوں' کے آخر میں 'ن' ہے اور یہی 'ن' 'نوحہ گر' کے شروع میں ہے۔ ایک چوتھی صورت بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ یعنی جدا جدا دو بنیادی لفظ ہیں جن کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے ۔ دونوں لفظوں کی ابتدا ایک خاص آواز سے ہوئی ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

' خزاں ' اور ' خاطر ' بنیادی لفظ ہیں ، دونوں کی ابتدا میں 'خ' ہے ۔ اس کے علاوہ ' بہار اگر ہے یہی ' میں 'ہ' کا تسلسل بھی ہے ۔

کام گر رک گیا روا نہ ہوا

اس میں ' ر ' کا تسلسل ہے :

لے کے دل ، دلستاں روانہ ہوا

اس میں ' دل ' اور ' دلستاں ' کا تسلسل ہے ۔

بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

' بحر ' اور ' بیاباں ' دونوں 'ب' سے ہیں ۔

بعد یک عمر رواں بار تو دیتا بارے

کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

رواں ، بار ، بارے ، رضواں ، در ، یار ، درباں ، میں ' ر ' اور 'د' کی آوازوں نے فردوس گوش کا منظر پیش کیا ہے ۔

راز مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے

کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

وابستگیٔ رسم و رہ عام بہت ہے

بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو اہتمام کے بغیر محض یادداشت سے لکھی گئی ہیں ۔ ان میں مختلف آوازوں کے صوتی آہنگ کی ترنگ دیکھی جا سکتی ہے ۔

ابوالفضل محمد عباس رفعت شروانی

[غالب کے ایک بھوپالی دوست اور شاگرد]

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

مولانا عباس رفعت(۱) کے دادا مولانا مرزا محمد تقی خاں جو بعد میں شیخ محمد شروانی کے نام سے مشہور ہوئے ، اپنے وقت کے بڑے عالم تھے ۔ مولانا احمد یمنی شروانی انھی کے بیٹے تھے جو مدت تک کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ میں عربی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ عربی زبان و ادب مین بڑی صلاحیت کے مالک تھے ، بقول سید ممتاز علی مصنف آثار الشعرا ''مولانا احمد علامہ عصر اپنے وقت کے حریری اور متنبی تھے'' ۔ نفحتہ الیمن ، عجب العجائب ، حدیقتہ الافراح ، منہج البیان ، مناقب حیدریہ اور جوھرالوقاد وغیرہ کتابیں لکھیں ، جو شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں کی طرح مشہور ہوئیں اور تمام مدارس میں ان کا درس دیا جانے لگا ۔

۱- تاریخ آل امجاد ، ص ۱۰۶ پر رفعت کے نسب و خاندان کے بارے میں اس طرح درج ھے :

''نسب ابوالفضل عباس بن احمد بن محمد بن علی بن ابراھیم بن یوسف بجابر بن عبداللہ انصاری الخزرجی السلمی رضی اللہ عنہ منتھی میشود ۔ اجداد کرامش از مدینہ منورہ بشہر بغداد آمدند و مدت دراز در دار السلام بسر بردند و بعد مرور دھور بہمدان کہ نزھت کوہ الوندش مشہور آفاق است شتافتند ۔ و قرنہا در آں نزھتکدہ توطن نمودند و چوں نادر ایران گرفت مرزا ابراھیم خاں بن یوسف مشیر و وزیر شاہ شد و بعدہ پسرش مرزا محمد علی خاں مستوفی الممالک کہ مرزا مہدی کوکب در تاریخ جہاں کشا او را بالقاب علامی فہامی

جب وہ بہت زیادہ مشہور ہوئے تو غازی‌الدین حیدر شاہ نے گورنمنٹ سے انھیں مانگا ۔ حکام نے انھیں لکھنؤ بھیج دیا جہاں وہ مدت تک بہ حیثیت مصاحب کام کرتے رہے ۔ اسی دوران میں مناقب‌الحیدریہ تصنیف کی اور اسی زمانے میں سید اسماعیل خاں مرشد آبادی رئیس بنارس کی دختر سے ان کی شادی ہوئی ۔ وہ غازی الدین حیدر شاہ کی وفات کے بعد بنارس چلے گئے جہاں راجا صاحب کاشی نے انھیں اپنے ہاں ملازم رکھ لیا، یہیں سے لانسیلٹ ولکنسن صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کے ایما سے بھوپال تشریف

(جاری)

خلاصتہ الفضلاء الکرام میرزا محمد علی خان نائب الصدارة ممالک محروسہ یاد میکند ، بمراتب امارت وزارت فائز گشته و مدتی بر مسند اقبال نشسته ، قبل دو ماه از قتل نادر جام شہادت نوشیده ' پسرش مرزا محمد تقی خان از اردوی نادر بدر رفته بشروان سرکشید و چون مدتی بعد کشته شدن نادر ایران دار الجدال‌والقتال بود مرزا در شروان مانده خود را محمد شروانی نامیده ، هر گاه فرصت یافت بنجف اشرف شتافت و در حلقه تلامذه اغا باقر به بہانی و سید مہدی طبا طبائی که هر دو مجتهدالعصر بودند زانو زده از علوم متعاوفه بهره ور گردیده ، رو بهند نهاد چه شنیده بود که عمش مرزا محمد حسین خان همدانی و شیخ علی حزین گیلانی در شهر بنارس اند و چون وارد بلده کاشی شد مزار هر دو بزرگوار یافته فاتحه خواند و بخدمت آصف الدوله وزیرالممالک فرمان ده اوده رفت و چندی ضعیف آصف هندی مانده نطاق سفر حرمین بست و چون وارد بندر حدیده شد که از بنادر یمن ست با تاجر نامی سید محمد حیدر بغدادی برخورد ، سید حیدر چون ایشان را بنام و نسب میشناخت با دختر خود کتخدا نموده مقیم بندر حدیده کرد ، محمد بیاد اللهی گوشه گیرگردید تا که بجوار رحمت الٰهی پیوست ، خلف‌الرشید او مولانا احمد یمنی الشیر ما بشروانی که ۱۲۰۰ھ بعالم وجود خرامیده بود از محسن بن عیسیٰ النجفی و بہا الدین جبل عاملی و علی بن یحییٰ الدریهمی‌الزبیدی و سید ابراهیم امیر صنعائی و سید زین‌العابدین جمل‌اللیل مدنی علوم و فنون آموخته فاضل و ادیب کامل گشته وارد کلکته شد "۔ (تاریخ آل امجاد ، ص ۱۰۶)

لائے اور نواب دولہ جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر کے اتالیق مقرر ہوئے ، یہاں سے ہوتا بھوپال پہنچے جہاں ۱۹ ربیع الاول ۱۲۰۶ھ کو ان کا انتقال ہوا اور وہیں تکیہ رضا شاہ میں مدفون ہوئے ۔

مولانا عباس رفعت انہیں احمد شروانی کے فرزند تھے ۔ ان کی پیدائش ۲۲ شوال ۱۲۴۱ھ (۳۰ مئی ۱۸۲۶ء) کو بنارس میں ہوئی ۔ عربی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور فارسی میر خیرات علی خاں مشتاق خیر آبادی شاگرد علی حزیں گیلانی سے پڑھی ۔ ذہن سلیم اور اچھے حافظے کی وجہ سے جو کتابیں زیر مطالعہ رہیں وہ یاد بھی ہوگئیں ۔ طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے سیف زنی کے فن سے بھی آگاہ ہوئے ، گویا اس طرح صاحب سیف و قلم بن گئے ۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کی ، دهلی پہنچے ، اس وقت بہادر شاہ ظفر حکمران تھے ، ان تک پہنچنے کی کوشش کی ، وہیں سے مرزائی ، خانی اور ابوالفضل دوراں کے خطاب ملے ۔ اسی قیام دهلی کے زمانے میں مرزا غالب سے ملاقات ہوئی ، ان کے شاگرد بنے اور ان سے فارسی کلام پر اصلاح لی ۔ دهلی میں کچھ دن قیام کیا لیکن جب وہاں مالی امداد کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو بھوپال تشریف لائے ، جہاں سکندر جہاں بیگم نے کچھ عرصے کے لیے انہیں ملازم رکھا ۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ کی طرف سے محکمہ اجنٹی بھوپال میں چند ماہ وکیل رہے ۔ پھر بیگم سکندر جہاں اور نواب فوجدار محمد خاں اور نواب جہانگیر محمد خاں بہادر کے درمیان متوسطے کا کام انجام دیا ، بعد میں قدسیہ بیگم والدہ سکندر جہاں بیگم نے اپنے ہاں بلالیا اور انہیں جامع مسجد کی تعمیر کے لیے مہتمم بنایا ۔ یہ مسجد بیچ باز چوک میں ہے جو انہیں کے اہتمام میں تعمیر ہوئی ہے ۔ محراب باب شمال پر جو کتبہ ہے اس میں علی عباس رفعت کا نام ہے ۔ اس کے بعد چند ماہ تجارت کی اور پھر وکالت کی طرف متوجہ ہوئے ، پھر جمال الدین مدارالمہام کے روبکار ہوئے ۔

نواب شاهجہاں بیگم نے ۱۲۸۸ھ میں مولانا عباس رفعت کو کسی درخواست کے بغیر ان کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے تاریخ نگاری کی ذمہ داری دی اور ''قانون نویسی'' کا جس کا نام ''محکمہ تنظیمات شاهجہانی'' تھا ، مہتمم مقرر کیا ۔ مولانا سولہ برس تک اس عہدے پر مامور رہے اس کے

علاوہ بھی جو مختلف کام ریاست نے سپرد کئے ، بحسن و خوبی انجام دیے ۔ سرکار عالیہ کے حکم سے تاریخ بھوپال ، تاریخ افاغنہ ، تاریخ سکہ جات کہنہ ، تاریخ دکن وغیرہ مرتب کیں ۔ سالانہ رپورٹ جو ایجنٹ کے ذریعے حکومت ھند کو بھیجی جاتی تھی ، وہ بھی مولانا عباس رفعت تیار کرتے تھے ۔ وہ مجلس مشورہ کے ممبر بھی رہے ۔

سنہ ۱۳۰۴ھ میں سرکار بھوپال نے بغیر کسی خدمت کے وظیفہ مقرر کردیا ، اس کے بعد مولانا نے نہایت خاموشی سے زندگی گزاری ۔

مرزا غالب کے اگرچہ وہ شاگرد تھے لیکن ان کی قابلیت کی وجہ سے غالب ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے ۔ چنانچہ جب نواب یار محمد خاں شوکت ، غالب سے دھلی میں ملے اور مرزا غالب انھیں اپنا شاگرد بنانے پر راضی ھو گئے تو انھوں نے اصلاح کے لیے شوکت سے کہا :

''آپ میرے شاگرد ھوئے ، اگر چندے یہاں رھنے کا اتفاق ھوتا تو فن شاعری میں آپ کو مہارت کلی حاصل ھوجاتی ، مگر قیام ممکن نہیں ، بھوپال میں مولانا عباس رفعت شروانی میرے دوست ، مرد فاضل ، ادیب کامل ، موجود ھیں ۔ فارسی زبان آن کی نہایت فصیح اھل زبان سے ملتی ھے ، بارھا اپنا کلام میرے پاس بھیج کر مولانا نے مجھ سے اصلاح بھی لی ھے ، ان سے بہتر دوسرا شخص مجھے وھاں نظر نہیں آتا ۔ آپ کو میں اجازت دیتا ھوں کہ آپ آن سے اصلاح اپنے کلام میں لے کر میرے پاس بھیجا کریں ......'' ۔

(شہنشاہ نامہ ، ص ۱۱۶)

یار محمد خاں شوکت نے مرزا کے ارشاد کی تعمیل کی اور ان کے انتقال کے بعد بھی نظم و نثر مولانا رفعت عباس کو دکھاتے رھے اور اصلاح لیتے رھے ۔

مولانا عباس رفعت نے مرزا غالب کو خط لکھتے ھوئے یہ خواھش ظاھر کی کہ وہ انھیں فارسی میں خط لکھیں ۔ اگرچہ اس زمانے میں مرزا نے اُردو میں مکتوب نگاری شروع کر دی تھی لیکن مولانا عباس رفعت کے خط کا جواب فارسی میں دیا جو حسب ذیل ھے :

''والا یزدان ہست و بود آفرین کہ گماشتن وخشور و فرستادن منشور از الائے اوست بمہر نیایش داورندہ گرامی منشور همانا همایون وخشور را کہ پس از وی ازان دہ دود بہرہ وخشور کہ بازپسین آن گروہ با خداوند در نام انبازی دارد ، بہر ہنگام ہر یکی بجائے اوست بے اندازہ ستایش اگر درین مردہ دلی سوئے کلک و کاغذ گرایش میرود بمن توانائی آن نیایش و نیرو نزائی این ستایش میرود ۔ غالب سخن گزار را بسا دوستانند کہ سواد مردم چشم گرزگاہ آنان نشدہ و در سیہ خیمہ سویدائے دل میہمانند نیرنگ روزگار دو رنگ نگریستن و بسرشکی کہ در شلت خندہ از چشم کشاید گریستن دارد حاشا کہ اینچنین پست پایہ بلند نام کہ خود از فروماندگی خاک نشین یک شہر باشد و بمیانجیگری نامہ و خامہ روشناس اعیان دہر باشد جز من در دہر توان یافت از دیر باز نبشتن نثر بپارسی زبان آئین من نیست ، نامہ ہا یکدست بہ اردو نبشتہ میشود اینک خواجہ روشن فرح اثر حق پرست حق شناس مولانا محمد عباس کہ ہم ازان گروہ پر شکوہ است کہ بامن بزبان قلم راہ سخن کشودہ اند از بھوپال فرمان فرستاد کہ غالب فرسودہ روان در پارسی زبان بنام آں ہمہ دان نامہ نویسد یارب این فرمان چون بجائے آرم و در نامہ چہ نویسم باری ز جنبش خامہ لفظی چند کہ اگر بخواندن ارزد بہ ستودن نیرزد ، برروئے ورق فرو ریخت تا آن ورق بہم بیچیدہ سوئے کار فرمان روان داشتہ آمد چشمداشت آنکہ برگ سبز اردو رویش بہ تحفگی پذیر رفتہ آید '' ۔

(انشائے نور چشم ، ص ۶۳ ۔ کلیات نثر غالب ، ص ۲۴۰)

'' انشائے نور چشم '' میں یار محمد خان شوکت نے اس خط کو یہ لکھتے ہوئے شامل کیا ہے :

'' چند سال پہلے مرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا ، مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے مرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامے کا مشتاق ہوں ، جناب مرحوم نے ان کو خط فارسی میں تحریر فرمایا جو کہ ہر دو خط منظوم(۱) و منثور(۲) کلیات

۱۔ منظوم خط بنام نواب وزیر محمد خان بہادر مرحوم رئیس ٹونک ۔
۲۔ منثور خط بنام مولانا محمد عباس رفعت ۔

دیوان و انشائے جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں گزرے''
(انشائے نور چشم ، صفحہ ۳۶)

''انشائے نور چشم'' کی اشاعت ۱۲۸۹ھ میں اور کلیات نثر غالب جو میرے پیش نظر ہے ، اس کی اشاعت ۱۳۰۵ھ میں ہوئی ہے - ممکن ہے کہ اس خط کو بعد میں کلیات نثر میں شامل کر لیا گیا ہو -

مولانا عباس رفعت اپنی تصنیف ''عباس نامہ'' کے آخر میں مرزا غالب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

از کرمہائے النہی رفعتا　　ختم شد عباس نامہ مرحبا
از کلام حضرت اوستاد من　　غالب سحرالبیان جادو سخن
ہست بر این نہج قادر نامہ نظم　　من تتبع کردہ ام اے نور چشم
آں کلام و ایں کلامم یادگیر　　ہر دو را انکار تنگ شہد و شیر
(عباس نامہ ، صفحہ ۸)

'' نوردیدہ '' میں مولانا عباس رفعت اپنے استاد غالب کے لیے مندرجہ ذیل باتیں تحریر کرتے ہیں :

'' نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب ، اکبرآبادی المولد دہلوی المسکن است ، نسبتش بہ افراسیاب و جمشید منتہی میشود ، دیوان اردو و دیوان کلیات فارسی ، مہر نیم روز و ماہ نیم ماہ ، پنج آہنگ ، دستنبو ،قاطع برہان ، تیغ تیز ، عود ہندی ، درفش کاویانی ، گوہر افشاں ، قادر نامہ ، پساچین ، [سبد چین ؟] مشتمل قصائد و اشعار کہ بعد طبع کلیات خود فرمودہ است رواں شیریں اردوئے معلا ، دلائل اعجاز فضل و بلاغتش ہستند ، راقم الحروف غائبانہ بدید کلام مبینش معتقد گشت و از دور سر فرود آوردہ در حلقہ شاگرداں زانو شکست ، جناب ممدوح از راہ اخلاق بی پایاں مانند حکمائے اشراقیاں چند مرتبہ توجہ دلی فرمود و اشعار بندہ را کہ ذریعۂ نیایش نامہ ہا فرستادہ بودم اصلاح نمود یک دو شعر میر عماد در صفت آں سلالہ امجاد راست بی کم و کاست ست :

امروز بشیریں دھنی چوں تو یکی نیست
حقا کہ چنین ست و دریں ھیچ شکی نیست
زاں دم کہ بیا راست لبت خوان ملاحت
بر ھیچ لبی نیست کہ حق نمکی نیست

و چوں بکشش آب و دانہ اتفاق رفتم بدھلی شد از ملاقات جناب غالب بہرور شدم و مورد الطاف شان گشتم ۔

دوم ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ ھ در دھلی برحمت حق پیوست و در خلد بریں زیر سایہ طوبیٰ نشست ۔ "

مولانا عباس رفعت نے اپنے استاد کی وفات پر حسب ذیل اشعار کہے :

جان ارباب سخن غالب عالی ھمت   ناظم سحر بیاں ناثر والا فطرت
رشک فردوسی و خاقانی و عالی و کمال   ثانی خسرو و سعدی و حزیں و شوکت
ابر مدرار کمالات و فرات دانش   ماھر علم معانی و بیان و حکمت
از جہاں کرد سفر سوئے ریاض رضواں   گفت عباس کہ " شایان سریر جنت "
[۱۲۸۵ھ]

(تذکرہ فرح بخش ، ص ۶۸)

مولانا عباس رفعت غالب کے ممتاز اور با صلاحیت شاگردوں میں سے تھے ۔ عربی ، فارسی اور اردو میں بڑی اچھی صلاحیت کے مالک تھے ،تقریباً باسٹھ کتابیں لکھیں ۔ فارسی اور اردو زبان میں شاعری بھی کرتے تھے ۔ کسی بات پر ناراض ھو کر اپنی شاعری کا تمام سرمایہ تالاب میں ڈال دیا اور شعر و شاعری چھوڑ دی ۔ اب ان کا کلام مختلف کتابوں میں بکھرا ہوا ملتا ھے ۔ تذکرہ "فرح بخش" میں فارسی کے علاوہ آردو کے دو شعر ملتے ھیں جو حسب ذیل ھیں :

بھرا ھے رقیبوں کا چھپرکھٹ کے برابر
دس بیس تئیں ھوں گے یہاں کٹ کے برابر

نغمۂ چنگ و رباب و دف و نے
بن ترے مرثیہ خوانی سمجھا

رفعت کی ایک منظوم کتاب ''عباس نامہ'' ہے جو انھوں نے سید علی حسن خان صاحب خلف الصدق سید محمد صدیق حسن خان صاحب بہادر کی خواہش پر لکھی ہے ۔ یہ کتاب بچوں کو لغت کی تعلیم دینے کی غرض سے لکھی گئی تھی جو صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے ۔

حمد کے لائق خدائے پاک ہے		عاجز اس کے وصف میں ادراک ہے
قابل مدح و ثنا ہے وہ رسول		حق سے قرآں کا ہوا جس پر نزول
بعد ازیں ہے یہ نصاب لا جواب		غیرت الماس و در و زر ناب
بیشتر اس میں لغت ہیں فارسی		شعر دل کش مثل روئے آرسی

اس کتاب میں الفاظ کے معنی اس طرح بتائے گئے ہیں :

بانو بی بی اور اودر ہے چچا		ز آج کو ھندی میں کہتے ہیں چچا
خازنہ سالی ممانی مازرا		اور دہو رانی نیاجہ سن ذرا
فارسی سمدھی کی سامن ہے عزیز		اور سمدھن سامنہ اے با تمیز

در حقیقت یہ کتاب خالق باری ، قادر نامہ فروغی ، قادر نامہ غالب ، چراغ فوائد ، فیض شاھجہانی ، نصاب بے نظیر اور حیات عزیز کے طرز پر ہے ۔

رفعت کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے :

چشم ناظر تیرہ میگردد ز تاب چہرہ اش
روئے او را دامن برقع فگندن برقع است

بہرہ ز ملک بقا تا کہ تصور گرفت
دل ز مقام فنا بوی تنفر گرفت
شد بسر اوج عرش ھر کہ تواضع نمود
رفت بقعر بلا انکہ تکبر گرفت

نا شکیبم کرد ھجر دلبرم
جسم زارم را شرار نالہ سوخت
سوختیم و کس نہ فریادم شنفت
نار ھجر دلبر می سالہ سوخت

(صبح گلشن ؛ صفحہ ۱۸۱)

حال من آشفتہ بجاناں کہ کند عرض
درد من رنجور بدرماں کہ کند عرض
روداد دل خستہ و سوز دل وحشی
جز خامۂ عباس سخنداں کہ کند عرض

سوز من از گریہ ہرگز کم نہ گردد مثل شمع
آب اشکم بر سر آتش مثال روغن است
یافت بازار محبت رونقی از داغ من
دودمان عشق از نور چراغم روشن است

تا چشم تو آموخت فن فتنہ گری را
در فتنہ گری داد سبق چشم پری را
مہر و مہ و انجم ہمہ ہا گرم گزافند
وقت است کہ آزاد کنی جلوہ گری را

دید چوں جوہر خوں نابہ بہ چشم رفعت
موج خوں از جگر لعل بدخشاں برخواست

(شمع انجمن ، ص ۱۸۲)

تصانیف :

تاریخ بھوپال ، تزک افغانی ، تاریخ نسب افاغنہ ، سلطان نامہ ، تاریخ روم ، تاریخ دکن موسوم بہ چار چمن ، تاریخ نقد رواں در بیان سکہہائے شاہان ، تاریخ نکو شعر حال قوم بوہرہ ، تاریخ سیلون سراندیپ ، تاریخ گرامی نامہ در حال سلاطین ہند ، تاریخ دلچسپ ، تاریخ نفیس ، داستان باستان ، تاریخ آل امجاد ، چشمہ نوش ، آئین محبوب ، آئین بہین دستورالعمل سلاطین ، قبات القبسات و مراسلات ، سرمن رای در حال علم جفر ، نور دیدہ ، رواں افزا ، گل نسرین ، لخلخۂ عبہری ، مثنوی راح روح ، جواہر خانہ ، جواب باصواب ، جواب شافی ، تقریر دل پذیر ، مجربات عباسی ، نشاط

افزا ، خیرالعمل ، در نجف ، سلک گوہر ، سرداد سرور ، زر ناب انشا ، تسرالناظرین ، عباس نامہ ، ہمایوں نامہ ، منظومات رفعت ، گل صد برگ ، سبحۃالعجد ، انسان الانسان ، زینۃالانشا ، بہارگل ، ساغر مل ، دلکشا ، گلدستہ ، آرسی پارسی درلغت پارسی ، تاریخ ملوک فاطمہ مصر ، خیالات رفعت ، گلزار رفعت ، مراسلات عباسیہ ، سراج الاقبال ، چار باغ رفعت ، نور مشتری ترجمہ اخلاق ناصری ، تاج الطائف (دو حصے) ، صفحات جہانگیری (در مدح نواب جہانگیر محمد خاں) ، قیصر نامہ ، دلفروز ، گلزار معرفت وقائع سیر دکن ، تاریخ اندلس ، تاریخ جشن تاج محل ، رازدل ۔

رفعت نے سنہ ۱۳۱۰ھ میں وفات پائی اور بھوپال میں احمد آباد کے قریب کربلا میں دفن کئے گئے ۔ ان کے دو لڑکے ابوالقاسم محتشم اور ابوالحسن محترم بھی عالم فاضل بزرگ تھے ۔
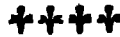
"وہ زندہ ہم ہیں ——"

ڈاکٹر وزیر آغا

بعض فن کار ایک ایسی تیز روشنی کی جلو میں نمودار ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو اُن کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر "وہ آیا ، اُس نے دیکھا ، اُس نے فتح کرلیا" کی مثل صادق آتی ہے۔ مگر تیز روشنی بجائے خود ایک اضافی شے ہے ، ایک تنگ و تاریک ڈیڑھ اینٹ کی کوٹھری میں تو شاید موم بتی کی روشنی بھی تیز کہلائے گی مگر اس موم بتی کو میدان کے بیکراں اندھیرے میں شاید ایک جگنو سے زیادہ اہمیت نہ ملے ۔ چنانچہ دیکھنے کی بات محض یہ نہیں کہ فن کار کتنی تیز روشنی کے ساتھ نمودار ہوا ، بلکہ یہ ہے کہ جب اس روشنی کو ایک وسیع پس منظر میں آنا پڑا تو کہیں یہ سمٹتی تو نہیں چلی گئی ؟ فن کے سلسلے میں پس منظر سے مراد شہر ، ملک یا براعظم کی حدود نہیں ، کیونکہ یہ تو محض مکان Space سے متعین ہوتی ہیں ۔ اس سے مراد وہ دائرہ ہے جس کی حدود کو زمان Time متعین کرتا ہے۔ گویا دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ وہ روشنی جو آج سے پچاس یا سو برس پہلے نمودار ہوئی تھی ، وقت کے ساتھ ساتھ مدھم ہوتی چلی گئی یا تیز ؟ اگر وہ مدھم پڑ گئی تو یہ طے پایا کہ اس کی حیثیت اور زور محض عارضی تھا لیکن اگر وہ تیزتر ہوتی چلی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے نہ صرف وقت کے چیلنج کو قبول کیا بلکہ اپنی داخلی توانائی کی مدد سے وقت کو شکست بھی دی ۔ غالب اسی تیزتر ہونے والی روشنی کا نمائندہ ہے اور آج کہ بین قومی سطح پر اُس کی صد سالہ برسی کے انعقاد کا اہتمام ہو رہا ہے تو اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی ۔

یہ نہیں کہ غالب کو اُن کے اپنے عہد نے نظر انداز کر دیا، گو غالب کے ساتھ زمانے نے جو سلوک کیا اسے دیکھتے ہوئے بعض لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے تبحر علمی کا چرچا تو ابتدا ہی سے ہونے لگا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے ایک مستند استاد تھے۔ ان کا تصوف کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ حد یہ کہ انہیں طب اور نجوم پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ غالب کی زندگی میں جو ادبی معرکے ہوئے ان کا مطالعہ کریں تو غالب کے تبحر علمی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً کلکتے میں جب غالب نے قتیل اور واقف ایسے فارسی شعرا کو استاد ماننے سے انکار کیا تو ایک ادبی ہنگامہ برپا ہو گیا ، اور غالب پر طرح طرح کے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی ، جس کے جواب میں غالب کو مثنوی '' باد مخالف '' لکھنی پڑی۔ اس ہنگامے میں غالب نے جس وثوق اور اعتماد نیز علمی برتری سے معترضین کو خاموش کیا اس سے ان کے وسیع مطالعے اور اعلا زبان دانی کا سراغ ملتا ہے۔

اسی طرح جب غدر کے بعد غالب خانہ نشین تھے تو وقت کاٹنے کے لیے فارسی لغات کی مشہور کتاب ' برہان قاطع ' کا مطالعہ کرنے لگے اور پھر بقول مولانا غلام رسول مہر اس میں جہاں جہاں انہیں غلطیاں نظر آئیں ، ان کے متعلق کتاب کے حاشیے پر اشارات لکھتے گئے۔ بعد ازاں ان اشارات کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا ، اور اس کا نام ' قاطع برہان ' رکھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُس وقت غالب کی تحویل میں کوئی اور کتاب بھی نہیں تھی جس سے وہ مدد لیتے اور وہ محض اپنی یادداشت پر بھروسا کرتے ہوئے اغلاط کی نشان دہی کر رہے تھے۔ غالب کے وسیع مطالعے کا یہ ایک ادنا ثبوت ہے کہ ان کی وفات کے چار برس بعد رضا قلی خاں ہدایت نے ایران میں فارسی لغت کی ایک کتاب '' فرہنگ ناصری '' لکھی اور ' برہان قاطع ' کی اغلاط کی نشان دہی کی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ''جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے تھے ان کی جا بجا ' فرہنگ ناصری ' سے تائید ہوتی ہے''۔ مگر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جب غالب نے 'قاطع برہان' لکھ کر یہی اعتراضات کئے تو ان کے خلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور '' محرق قاطع '' '' ساطع برہان '' '' قاطع القاطع '' '' موید برہان '' وغیرہ کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں سے بیشتر کا لہجہ انتہائی قابل اعتراض تھا۔

غالب کا فارسی کلام ، ان کے قصائد ، ان کی نثری تحریریں ــ غرض ہر جگہ غالب کی بے پناہ ذہانت اور علمی استعداد کا پتا چلتا ہے۔ کچھ عجب

نہیں کہ غالب کی علمی شخصیت سے ان کے معاصرین مرعوب ہوئے اور انہوں نے ہر موقع پر ایک شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا ۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ غالب نے اپنے عہد میں اذہان کو اس قدر متاثر نہیں کیا جتنا مرعوب ! متاثر کرنے کی صورت کچھ یوں ہے جیسے کوئی نہر ایک طویل و عریض علاقے کو سیراب کرے لیکن مرعوب کرنے کا عمل یوں ہے جیسے کسی ڈیم کے بند ٹوٹ جائیں اور سارا علاقہ ایک آبی طوفان کی زد میں آجائے ۔ پہلے عمل سے اذہان کی آبیاری ہوتی ہے ، یہ گویا خوشہ چینی کا ایک ایسا عمل ہے جو فیض پانے والوں کی شخصیتوں میں توانائی ، وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے ۔ دوسرے عمل سے معاصر شخصیتیں یا تو تابع مہمل ہو کر رہ جاتی ہیں اور یا اپنے تحفظ کے لیے مدافعتی عمل میں مبتلا ہوتی ہیں اور ایک نہایت شدید ردعمل وجود میں آجاتا ہے ۔ غالب سے ان کا اپنا عہد اس لیے متاثر نہ ہوا کہ ان کی علمی شخصیت کے قرب نے اذہان کو احساس کمتری کے حوالے کر دیا اور وہ تاثر قبول کرنے کی بجائے اپنی مدافعت کرنے لگے — کلکتے کے واقعے ، قاطع برہان کے تنازعے ، حتیٰ کہ سہرا لکھنے کے 'سانحے' تک کو اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ ان تمام ہنگاموں میں بیشتر لوگوں نے بغض معاویہ کا مظاہرہ کیا اور غالب کے خلاف اپنے دبے ہوئے انتقامی جذبات کی پرورش کی ۔ غالب کی زندگی کے آخری ایام تو اس قسم کی انتقامی کارروائیوں کا اس قدر نشانہ بنے کہ غالب کے لیے زندہ رہنا ہی مشکل ہو گیا اور وہ کھلے بندوں موت کی آرزو کرنے لگے ۔ ہوتا یوں تھا کہ ہر روز کی ڈاک میں انہیں ایسے خطوط موصول ہوتے تھے جن میں فحش گالیوں کی بھرمار ہوتی تھی ، جن کا مقصد غالب کو ذہنی کرب پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا ۔ اس سلسلے میں مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے غالب کے ذہنی کرب کا کچھ اندازہ ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

> "اُن دنوں مرزا کی عجیب حالت تھی ۔ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے اور جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تھا تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو ، اُن کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا .... [ایک روز] مرزا کھانا کھا رہے تھے ۔ چٹھی رساں نے ایک لفافہ آ کر دیا ۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا

ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آچکے ہیں ۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو ۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی‌الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا ۔ پوچھا کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے ؟ مجھے اس کے اظہار میں تامل ہوا ۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے ۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا ۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی ۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ الو کو گالی دینی بھی نہیں آتی ۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تا کہ اس کو غیرت آئے ، جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے ' بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا ۔ یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بیوقوف ہوگا ؟ "

ان خطوں کے ساتھ ساتھ جب اس قسم کی تحریفات کو بھی ملحوظ رکھیں ، جیسے ' پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال ' اور غالب کے اس رد عمل کو بھی جس کا اظہار ' گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی ' ایسے مصرعوں میں ہوا تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب سے اس کا اپنا عہد کس قدر مرعوب ہوا کہ ایک شدید برہمی کے اظہار کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے افکار اس قدر نئے ، ان کی جرات اظہار اتنی شدید اور ان کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ عام لوگوں کے لیے ان کے ساتھ مفاہمت کرنا ممکن ہی نہ رہا ۔ چنانچہ یہ لوگ ایک رد عمل میں مبتلا ہوئے اور اس رد عمل نے غالب سے متاثر ہونے کے عمل کو فوری طور پر منسوخ لیکن دراصل معرض التوا میں ڈال دیا ۔ غالب کی وفات کے بعد مولانا حالی نے " یادگار غالب " لکھ کر گویا غالب کو سماجی طور پر Reinstate کرنے کی کوشش کی ۔ چنانچہ یوں لگتا ہے جیسے " یاد گار غالب " کا اولین مقصد بھی غالب کی اس شخصیت کو مجتمع کرنا تھا جسے ان کے اپنے زمانے نے مسلسل سنگ باری سے پارہ پارہ کر دیا تھا نہ کہ ان کے شعری مرتبے کو اجاگر کرنا ! اس کے لیے زمانے کو مزید انتظار کرنا پڑا حتیٰ کہ عبدالرحمان بجنوری نے اپنا تاریخی فتویٰ ——— "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، وید مقدس اور

دیوان غالب " لکھ کر عوام کو جھنجھوڑا کہ غالب کے شعری مرتبے کو پہچانو ، اُس کی علمی شخصیت سے مرعوب ہونے اور ارضی شخصیت پر لعن طن کرنے کی روش سے باز آجاؤ ۔ یوں بھی وقت کے ساتھ ساتھ شخصیت کے وہ " سقم " اغماض و در گزر کے طالب قرار پاتے ہیں جو ایک خاص وقت میں ناقابل برداشت قرار پائے تھے ۔ نیز دم گھٹنے کی کیفیت بھی از خود ختم ہو جاتی ہے اور لوگ تعصبات سے آزاد ہو کر فن کار کے فن کا محاکمہ کرنے لگتے ہیں ۔ ایک وجہ اور بھی ہے ، وہ یہ کہ بعض فن کار اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں ، اس لیے ان کا اپنا عہد انھیں پوری طرح سمجھ نہیں سکتا ، متاثر ہونا تو بہت دور کی بات ہے ۔ پھر زمانہ آہستہ آہستہ فکر و وجدان کے اُس معیار کے قریب پہنچتا ہے ، یعنی اُسے ایک نئی بصارت حاصل ہو جاتی ہے تو اُسے فن کار کی اصل روشنی کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ غالب کے ساتھ بالکل یہی کچھ ہوا ۔ اُن کی شدید انفرادیت (اور فرد کی انفرادیت ہمیشہ انبوہ کے اجتماعی رخ سے متصادم ہوتی ہے) نیز اُن کے ہاں فکر کا تحرک اس بات کا متقاضی تھا کہ متاثر ہونے والے اذہان بھی اس مقام کے قریب ہی کھڑے ہوتے جہاں غالب کھڑے تھے تا کہ فیض رسانی اور فیض یابی کے اعمال میں مفاہمت پیدا ہوتی اور نہر کا پانی چھوٹی چھوٹی نالیوں کی صورت میں زمین کو سیراب کر سکتا ۔ مگر ایسا ممکن نہ ہوا اور غالب سے متاثر ہونے کا میلان زیر سطح پڑا رہا تا آنکہ جب حالات نے کروٹ لی ، اذہان متحرک ہوئے ، ذہنی افق کشادہ اور تعصبات کی گھٹن کم ہوئی تو غالب کی شعری عظمت یکایک ابھر کر سامنے آ گئی ۔ اس ضمن میں بجنوری تو محض " پہلا قطرہ " تھا ، کیونکہ بجنوری کے بعد ہی در اصل غالب سے متاثر ہونے کا رجحان عالمگیر سطح پر پھیلا ۔ پچھلے تیس چالیس برس میں غالب کے کلام نے کس طرح اردو شاعری کو متاثر کیا ، یہ ایک بالکل سامنے کی بات ہے ، لیکن اس نے کس طرح اذہان کی داخلی ضرورت کو پورا کیا ، اس کا اندازہ تو شاید مردم شماری کے موقع ہی پر ہو سکے ۔ تاہم غالب کی صد سالہ برسی کی تقریب تاثیر و تاثر کے اس عالم گیر رجحان کا ایک روشن ثبوت ضرور ہے ۔

آج سے پورے سو برس قبل غالب اس دنیا سے رخصت ہوئے مگر دراصل وہ اس تمام عرصے میں وقت سے برسر پیکار رہے ، تاآنکہ انھوں نے امتحانی دور بخیر و خوبی طے کیا اور زندہ جاوید ہو گئے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

غالب کے اشعار میں وہ کیا بات تھی جو وقت پر غالب آ گئی ؟ اس کے شاید کئی جواب مہیا کئے جائیں ، مثلاً جو لوگ ماضی اور اس کی روایات کو فن کی بقا کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں ، شاید یہ موقف اختیار کریں کہ غالب نے ماضی کی روایات ، تلمیحات بلکہ روح تک کو اپنے اندر اس طور سمو لیا تھا کہ جب انہوں نے اشعار کہے تو یہ روح اُن کے کلام کی ہئیت میں از خود شامل ہو گئی ۔ اس بات کو جدید نفسیات کی روشنی میں یوں کہنا بھی ممکن ہوگا کہ غالب ایک اتنے اچھے شاعر تھے کہ اُن کے ہاں سائکی Psyche نے اپنے جملہ خزائن کو گویا اُلٹ دیا اور نسل کا وہ سارا سرمایہ شعری قالب میں ڈھلنے کے لیے مہیا ہوگیا جو Archetypal Images کی صورت میں موجود تو ہوتا ہے لیکن اُبھرتا صرف وہاں ہے جہاں فن کار کے شعور اور لاشعور کے مابین آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوجائے ۔ بعض لوگ جو ماضی کو رجعت اور فرسودگی کی علامت قرار دے کر 'حال' اور حال کے مسائل کو تمام تر اہمیت تفویض کرتے ہیں شاید یہ موقف اختیار کریں کہ غالب کو اُن کے اپنے دور کے جزر و مد کا بھرپور احساس تھا اور وہ اُن تمام کروٹوں کے نباض تھے جو چاروں طرف ایک کہرام سا برپا کر رہی تھیں ۔ نہ صرف یہ بلکہ غالب خود بھی بار بار ان کروٹوں کی زد میں آئے ۔ معاشی بدحالی ، قیدوبند ، عزیزوں دوستوں کی بے وقت موت ، غدر کا ہنگامہ ، مسلسل بیماری ، بے عزتی اور کس مپرسی ——— ان تمام باتوں نے غالب کو اُن کے اپنے ماحول سے اس درجہ منسلک رکھا کہ اُن کے ہاں نہ صرف ' حال ' کے مسائل کا سامنا کرنے اور یوں ان سے اخذ کردہ تاثرات کو شعر میں سمونے کی تحریک ہوئی بلکہ وہ ' حال ' میں دلچسپی لینے کے باعث ارد گرد کی اشیا اور مظاہر کو پیار کرنے کی طرف بھی مائل ہوئے ۔ چنانچہ ان کے شعر کی توانائی کا باعث ماضی کی خوشبو یا مستقبل کی خوابناک کیفیت نہیں بلکہ حال کا شعور ہے (اسے ' معاشرتی شعور ' کہ لیجیے) —— اسی طرح بعض لوگ جو خواب کار ہونے کے باعث ماضی یا حال کی بجائے مستقبل میں رہتے ہیں ، شاید اس طرح سوچیں کہ غالب تو گلشن نا آفریدہ کے عندلیب تھے یعنی در اصل ایک خواب کار تھے جنھوں نے حال کی گھٹن سے گویا فرار حاصل کر کے ایک ایسا شعری یوٹوپیا تعمیر کیا جو لطافتوں اور رعنتوں کی اماجگاہ تھا اور جس کا ادراک قارئین کی تھکاوٹ اور ذہنی اضمحلال کو کم کرنے کا باعث ثابت ہوا ۔ چنانچہ غالب کے اشعار میں نہ صرف افراد کے زخموں پر پھاھا رکھنے کا وصف موجود ہے بلکہ وہ ان

کی باصرہ کو بھی یوں متحرک کرتے ہیں کہ نگاہیں ماضی کی طرف پلٹنے یا حال میں الجھنے کے بجائے کسی دور کی منزل پر مرتکز ہو جاتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہر قاری، شاعر کو اپنے مزاج کے مطابق ہی پرکھتا ہے اور اگر شاعر کا کلام اس کی داخلی طلب کی تسکین کر سکے تو اس تسکین کی نسبت ہی سے وہ اسے چھوٹا یا بڑا شاعر قرار دیتا ہے۔ خود شعرا کے ہاں بھی یہی مزاج ان کے کلام میں ایک ''خاص رنگ'' کو جنم دیتا ہے جو ایک خاص قسم کے قاری ہی کو تسکین دے سکتا ہے۔ بے شک کوئی ایسا شاعر مشکل ہی سے ملے گا جو محض حال، محض ماضی یا محض مستقبل کا شاعر ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کے ہاں بالعموم کوئی ایک رجحان اتنا نمایاں ہوگا کہ وہ اسی کا نمایندہ قرار پائے گا۔ مگر بعض شعرا بیک وقت ان تینوں سطحوں پر 'بڑے شاعر' ہوتے ہیں اور اس لیے قارئین کے جملہ طبقات کو شعری کیف مہیا کرنے کی خود میں سکت رکھتے ہیں۔ غالب کی عظمت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیک وقت ماضی حال اور مستقبل کے شاعر ہیں اور اس لیے نہ صرف ایک خاص دور کے بیشتر اذہان خود کو غالب سے جذباتی سطح پر منسلک محسوس کرتے ہیں بلکہ ہر زمانے کو غالب اس کا اپنا عکاس نظر آتا ہے۔ میرے نزدیک بڑے شاعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ لفظ کو یوں صیقل کر کے پیش کرے کہ اس میں ہر زمانے کو اپنا خوب تر عکس نظر آنے لگے۔ یوں دیکھیے تو یہ کلیہ کچھ ایسا جاندار دکھائی نہیں دے گا کہ شاعر وہی اچھا ہے، جو اپنے ماحول کی عکاسی کرے۔ وجہ یہ کہ ماحول تو ہر دم بدل رہا ہے۔ جو شاعر محض آج کے ماحول کا عکس پیش کرے گا وہ آج سے سو برس بعد کے ماحول کا عکاس کیوں کر قرار پائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ شاعر اپنی پوروں کے لمس سے لفظ کے مزاج ہی کو بدل ڈالتا ہے، اس طور کہ اب یہ لفظ کسی ایک لمحے کا پابند نہیں رہتا بلکہ وقت کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ غالب کے کلام میں یہی معجزہ رونما ہوا ہے اور اسی لیے سو برس گزرنے کے باوجود غالب آج بھی تازہ، زندہ اور نیا ہے:

غالب ـــ فکر و فن

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں ۔ انھوں نے غالب کی شخصیت ، اس کے ماحول اور فن کے بارے میں جو مقالات لکھے ہیں ، ان میں سے چند اس کتاب میں یک جا کر دیے گئے ہیں ۔ یہ مقالات حسب ذیل ہیں :

★ غالب محقق کی حیثیت سے
★ میر و غالب
★ غالب کے اردو کلام کی اشاعت
★ غالب ، خطوط کے آئینے میں
★ ذال معجمہ فارسی میں
★ غالب درد میرٹھ
★ غالب کی شخصیت

قیمت : پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ ـــ کراچی

غالب کا فکری جائزہ

سید محمد تقی

۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو مرزا غالب کی وفات کو ٹھیک سو سال کا عرصہ گزر جائے گا۔ سو سال گزرنے کی یہ یاد، صد سالہ برسی کی تقریبات کی شکل میں منائی جا رہی ہے اور ایسے تزک و احتشام سے کہ اس طرح دلی کے بادشاہ کی سالگرہ منانے کا بھی لال قلعے کے خوشامدیوں نے خیال نہ کیا ہوگا۔ کوئی نصف درجن ملک اس برسی کے منانے میں شریک ہیں، جن میں دنیا کی دو سب سے بڑی مملکتیں، سوویٹ روس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہیں۔ اور تو اور اب تو وہ برطانیہ بھی غالب کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں شامل ہو گیا ہے جس کے ادنا درجے کے ایک کارندے یعنی کوتوال نے اس 'فرمانروائے کشور ہندوستان' کو جیل میں ڈلوانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

آج اگر مرزا صاحب اپنی برسی کی ان تقریبات میں خود شرکت کر سکتے تو اُن شکووں اور شکایتوں کے سارے تیر توڑ ڈالتے جو اس ناقدر دنیا پر انہوں نے برسائے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اُنیسویں صدی نے غالب کو دریافت کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی تھی اور اس لیے اُن کی یہ مایوسیاں بھی حق بجانب تھیں۔ غالب کی صحیح عظمت دریافت کرنے کا سہرا تو بیسویں صدی کے سر ہے۔ دریافت کا مطلب یہ کہ اس عہد کی ادبی زندگی نے یہ مان لیا ہے کہ وہی خرابیاں اور نقائص جنہیں غالب کے معاصرین نے قابلِ گرفت سمجھا تھا اور جن پر غالب کو یہ احتجاج کرنا پڑا تھا کہ:

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

وہی فی الاصل جوہر ہیں اُن کے کلام کے اور وہی اختصاصی خوبی ہے اُن کے ہاں جو دوسروں میں نظر نہیں آتی -

عام انداز کے لوگوں سے توقع یہ رکھی جاتی ہے کہ وہ اُس فکری ، تہذیبی اور تاثراتی تانے بانے میں مقید رہیں گے جو ماضی اور حال تمام انسانوں کے گرد بن دیتے ہیں اور جس سے رہائی پانا صف اول کے دانشوروں کے علاوہ اور کسی کے بس کی بات نہیں ۔ غالب کو تاریخ نے ایک طاقتور تہذیبی ورثہ دیا تھا جس میں بابل ، مصر ، یونان اور مشرق وسطی کی ذہانتوں اور فارس کے قد آور شعرا کے وہ تخیلی کارنامے شامل تھے اور جس کے بوجھ تلے اچھی خاصی شخصیت رکھنے والے دانشور کے شانے کچل جاتے ، لیکن موجودہ عہد کے لوگ یہ دیکھ کر متعجب رہ جاتے ہیں کہ اتنے طاقتور اور بوجھل ماضی کا ورثہ رکھنے کے باوجود غالب نے اپنی شخصیت کی انفرادیت منوالی - انفرادیت منوانے کا مطلب یہ ہے کہ خیال کے نئے گوشے ڈھونڈ لیے -

مجھے معلوم نہیں کہ غالب نے اپنی اس غزل کو کہ :

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

اپنے کلام کے کس درجے میں رکھا تھا ، لیکن میرا مشورہ شامل حال ہو سکتا تو میں اسے اُن کی تخلیقات کے سب سے بہتر نمونوں میں شامل کرنے کا مشورہ دیتا ، اس لیے کہ جب مرزا نے دانشورانہ کرب میں ایسے سوال اٹھائے جن کی تسکین ان کا ماضی کر سکا نہ اُن کا مستقبل یعنی ہمارا حال ، نہ ہم اپنے مستقبل سے اتنے پر امید ہیں کہ وہ اس کرب کو مطمئن کرنے میں کامیابی حاصل کرلے گا تو پھر اس دانشور کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنا ضروری ہے -

لیکن بنیادی اہمیت خود ان شواہد کی اپنی نہیں ہے ، اہم بات یہ ہے کہ غالب نے ماضی اور حال کو ٹھکرا کر پوری کائنات کو ایک سوالیہ علامت کی طرح سمجھنے کی جرأت کی اور ہیہات کہ یہ سوالیہ علامت آج بھی اپنی جگہ جمی ہوئی ہے اور ایک ڈراؤنے بھوت کی طرح اس عہد کے دانشوروں کے ذہنوں کا پیچھا کرتی رہتی ہے -

شعرا کے جانچنے میں ایک بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے ، اور صرف شعرا ہی کے کیوں تمام دانشوروں کے پرکھنے میں یہی مشکل دامن پکڑ

لیتی ہے کہ اُن کی اپنی تخلیق ، ماضی کے دانشوروں کے خیال آفریں کارناموں سے اتنی وضاحت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے کہ سرقہے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ کم سے کم توارد تو ضروری ہوتا ہے اور یہ توارد اتنا عام ہے کہ کم ، بہت ہی کم ایسے لوگ گزرے ہیں جو واقعی اپنے قدموں پر کھڑے نظر آئیں ۔ ورنہ سبھی تخلیقی بیسا کھیوں پر کھڑے رہتے ہیں ۔ یہ بیسا کھیاں ماضی کے دانشور مہیا کرتے ہیں جنھیں اپنے اپنے انداز بیان میں منتقل کر دیا جاتا ہے ۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ تخلیق صرف نئے تصور کو پیدا کرنے کا نام نہیں ہے ۔ تخلیق پرانے تصور کو نیا جامہ پہنانے یا قدیم تخلیق کو نئے اطلاقات دینے اور مختلف انداز میں بیان کرنے کا نام بھی ہے ، لیکن اس جیسی تخلیق ایک بالکل نئے رخ کو دیکھنے کی اہمیت تو نہیں رکھتی ۔

دانشوری کی تمام شاخوں ، خاص طور پر شاعری میں کلام کی اہمیت تین درجوں سے گزرتی ہے ۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ ماضی سے جو کچھ کسی کو ملا ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا جائے ۔ یہ درجہ بالکل ابتدائی قسم کا ہے اور وہ عام درجہ ہے جس پر شعرا کی بہت بڑی تعداد پہنچ کر رک جاتی ہے ۔ تخلیق کے ارتقا کے عمل میں دوسرا درجہ اس جگہ آتا ہے جب پرانے تخلیقی کارناموں کو نئے تجربات کی روشنی میں برتا جاتا ہے اور نئے اسلوب بیان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔ یہاں تخلیق توارد کی زد سے بچ جاتی ہے اور پرانے تخلیقی ریزے نئے قالبوں میں ڈھل کر نئے مجسموں کی شکل حاصل کر لیتے ہیں ۔ لیکن بہت کم ایسے شاعر ہیں جو اس درجے تک پہنچ سکے ہوں ۔ زیادہ تر پہلی منزل پر پہنچے اور رک گئے اور دوسرے درجے تک پہنچتے پہنچتے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے خشک کر بیٹھے ۔ پہلی قسم میں تاریخ ادب کی سب سے بڑی اکثریت آجاتی ہے ، اسی اکثریت کو متشاعر بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ دوسری قسم ، جو چند افراد پر مشتمل ہے ، شاعر کہلانے کی حق دار ہے ۔ یہ شاعر اردو ادب کی تاریخ میں اتنے کم ہوئے ہیں کہ آپ ان کے نام بہ آسانی انگلیوں پر گن سکتے ہیں ۔ اس دوسری قسم کے بعد تیسرے درجے پر فائز ہونے والوں کی باری آتی ہے لیکن یہ تو صدیوں کے حساب سے پیدا ہوتے ہیں ۔ مگر اس منزل تک پہنچنے والے شعرا

اپنے تخلیقی عمل میں ہمیشہ نہیں، صرف کبھی کبھی اس درجے کو چھو سکتے ہیں جہاں اُن کی تخلیقی صلاحیتیں محض آزادانہ عمل کرتی ہیں۔ وہ ان لمحوں میں ماضی کے ورثے کو اتار پھینکتے ہیں اور اپنی تخلیق کے ذریعے براہ راست حیات و کائنات سے دست وگریباں ہو جاتے ہیں۔ شعرا کا یہ طبقہ دنیا بھر کی تاریخ ادب میں نادرالوجود رہتا ہے۔ لیکن اس نوع کے شعرا بھی ہمیشہ ماضی اور حال سے رشتے توڑ کر اور زمانے کی وسعتوں اور پہنائیوں کو اپنی گرفت میں لینے کے قابل نہیں ہو پاتے۔ بہت کم لمحے اور تجربے ایسے ہوتے ہیں جب یہ اپنے تنہا شعور کے سہارے روحی تجربوں کی گہرائیوں میں اُترتے اور تاثرات یا کائناتی رد عمل کے سمندر سے نئے موتی رول لاتے ہیں۔

مرزا صاحب کے کلام کا تھوڑا سا حصہ اسی قسم کے روحی تجربے کی نمایندگی کرتا ہے، اور اسی سے اُن کی عظمت کو جدید نسل نے دریافت کیا ہے۔ میرے خیال میں غالب کا یہ اعزاز بڑا ہی نادر اعزاز ہے کہ اپنے زمان و مکان کی نوری بندشوں کو توڑ کر حیات و کائنات کے دوام و قدم سے چند حقیقتیں چن لینے میں اُنھوں نے کامیابی حاصل کی، اس لیے کہ یہ اعزاز دنیائے ادب کے صرف گنتی کے چند افراد کی قسمت میں ہی لکھا گیا تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ غالب کو خود بھی اپنی اس عظمت کا اعتراف تھا لیکن یہ اعتراف محض وجدانی رہا، شعوری نہ ہوسکا۔ اس کی ذمہ داری خود ان پر عاید نہیں ہوتی بلکہ ان کے ابنائے زمانہ پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے اپنی خود پسندی سے اپنے دور کے اکابر کو بھی اتنا متاثر کرلیا تھا کہ وہ ٹھیک طرح خود اپنی شخصیت کی معرفت حاصل نہ کر سکے تھے۔

"مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست"

اسی ذہنیت کی نمایندگی کرتا ہے جس کا غیر محسوس اثر خود مرزا صاحب پر پڑتا تھا، چنانچہ وہ خود بھی اپنی شخصیت کی گہرائی اور گیرائی کا عمق اور وسعت نہ ناپ سکے۔ دوسرے اردو شعرا کی طرح غالب بھی ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جسے ماضی سے طے شدہ نظریے اور طے شدہ تصورات کے ڈھانچے ملے تھے۔ یہ تصورات اور نظریے اس کائنات کی بناوٹ، تخلیق، زوال اور موت، وسعت، پھیلاؤ اور اندرونی نظام سے بھی تعلق رکھتے تھے اور کائنات میں انسان کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی متعلق تھے۔ ان تصورات اور نظریوں میں وہ دیو مالائی تشریحیں، کہانیاں

اور قصے بھی شامل ہیں جو مشرق وسطائی تہذیب کا حصہ ہیں اور جو ادبی استعاروں کی جان اور بلاغت کا منبع خیال کی جاتی ہیں ۔ عربی اور فارسی کی شاعری ، جس کی کڑیوں میں اردو شاعری بھی پروئی ہوئی ہے ، اُس وقت منظم ہوئی تھی جب مشرق وسطی کا یہ کلچر اپنے تقریباً سارے ساز و سامان مکمل کر چکا تھا ۔ رہا فکری تصورات کا معاملہ تو وہ عربی شاعری کو تو نہیں لیکن فارسی شاعری کو بڑی حد تک منظم شکل میں ملے تھے ۔ پھر خوش‌قسمتی سے مشرق وسطائی تہذیب نے وحدت‌الوجود کے نظریے کی تکمیل کی تو اُس وقت فارسی شاعری بھی ساتھ ساتھ ترقی کر رہی تھی ۔ ہاں جہاں تک اردو شاعری کا معاملہ ہے اُسے فکر کے سارے سانچے بنے بنائے ملے اور اس لیے اردو شعرا کے لیے بڑی آسانی یہ رہی کہ وہ اپنے انفرادی تجربات ورثے میں ملے ہوئے فکری سانچے میں ڈھال لیتے تھے ۔

اردو شاعری میں تین موضوع بار بار سامنے آتے ہیں ۔ صوفیانہ خیالات جن میں وحدت‌الوجود کا نظریہ بھی شامل ہے ۔ رومانی تصورات جو شاعری کے بڑے حصے پر حاوی ہیں ، اور مذہبی جذبات جو تبرک کے طور ہر سب کے ہاں ملتے ہیں ۔ رہے حکرانوں کے لیے مدحیہ قصیدے تو ان کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں ہے جتنی ملازمتوں کی اُن درخواستوں کی ہوتی ہے جو بے روزگاروں کی طرف سے روزگار دلانے والوں کو پیش کی جایا کرتی ہیں ، چاہے اُن میں " دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا " کا انداز بیان ہو یا :

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

کا طنز اختیار کیا گیا ہو ۔ بلکہ پورے کا پورا ' شاھنامہ' بھی اس لیے اپنا ادبی مقام گرا بیٹھا کہ وہ ایک تاجدار کو خوش کرنے کے لیے بہت سے تاجداروں کی مدح پر مشتمل ہو گیا ۔ یہ اور بات ہے کہ ' شاھنامہ ' اپنے انداز بیان ، وسعت اور ادبی سلوک کی بنا پر کلاسیکی ادب میں شامل کیا جاتا ہے ۔

ادب کا یہ مفاہیمی سرمایہ تمام اردو شعرا کو ماضی کی میراث میں ملا تھا ، ہمارے بہت سے نامور شعرا اس لیے سر بلند کر کے نہیں چل سکتے کہ جو مفاہیم وہ دیتے ہیں وہ زیادہ تر دوسروں کے چبائے ہوئے

ہیں ، جن کی بار بار جگالی کر دینے سے ان مفاہیم کی نوعیت نہیں بدل جاتی - البتہ عاشقانہ شاعری میں تجربوں کی ذرا زیادہ گنجایش تھی ، اس لیے کہ عشق و رومان فرد کے اپنے اپنے تجربے کی بات تھی - لہذا جہاں بھی ذہانت کی چمک موجود ہوئی ، کوئی نیا تجربہ سننے میں آیا یا پرانے تجربے کو نئے انداز میں بیان کر کے اس تجربے کا کوئی تاریک پہلو روشن کردیا گیا - مذہبی شاعری میں بھی تخلیق کی بہت زیادہ گنجایش نہیں ہے ، یہ اور بات ہے کہ مذہب کو جب بحران کا سامنا ہوا تو اقبال کو اپنی ذات اور اپنے سماج میں ڈوب کر کچھ نئے تجربے کرنے پڑے -

ماضی کے اس تخلیقی ورثے کا بوجھ ہر نئی نسل پر پرانی نسل کی بہ نسبت زیادہ پڑتا ہے ، اس لیے کہ گزشتہ نسل کے تجربے بھی ماضی کے ورثے میں شامل ہو جاتے ہیں ، ان حالات میں ٹھوس اور فکر انگیز شاعری کے لیے ہر نیا دور زیادہ مشکلیں پیدا کردیتا ہے -

مرزا اسداللہ خاں غالب کو بھی ماضی سے طے شدہ سانچے ملے تھے - مگر ہماری ادبی تاریخ میں جو فارسی و عربی پر بھی مشتمل ہے ، یہ اختصاص غالب کو حاصل ہوا کہ انھوں نے ماضی کے ورثے کو اپنی زندگی میں برتا اور پرانے فکری سانچوں کو جوں کا توں تسلیم کرنے سے انکار کردیا - غالب حیات وکائنات سے صاف دل و دماغ کے ساتھ نمٹتے ہیں ، اگر پوری طرح نہ بھی سہی تو بڑی حد تک اُن کے کلام میں فرد کی اپنی آزادی اور اس کی انا کی ناپابندی کا اظہار ہوتا ہے - غالب کی ایغو حیات وکائنات سے آزاد فضا میں اُلجھتی ہے اور اپنے ذاتی تجربے کرتی ہے -

شعرائے قدیم ہوں یا شعرائے جدید ، کسی نہ کسی فکری مدرسے سے تعلق ضرور رکھتے ہیں - بعض رومان پسند ہیں ، بعض تصوف نواز ، چند نفرت پسند ہیں اور دوسرے ارتیابیت کیش - رہے وہ شعرا جو صرف مرقع نگاری یا حرف پیمائی کرتے ہیں ، وہ بھی کسی نہ کسی فکری مدرسے کے پس منظر سے اُبھر کر آئے ہیں - مگر میرزا غالب کسی ایک فکری خانے میں سمانے کو تیار نہیں ، وہ وحدت الوجود کا ذکر بھی چھیڑتے ہیں تو اپنے لا ادریت پسندانہ رجحان کے پیش نظر :

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

کہہ کر وحدت الوجود کے تصور کے ایک مشکل پہلو پر انگلی رکھ دیتے ہیں ۔ یہ بات دوسری ہے کہ پلوتینس یا ابن عربی اس مشکل کا حل ڈھونڈ نکالیں گے ، لیکن غالب کی نظر کا ایک ایسے پہلو پر جانا جو اس نظریے کے کمزور رخ کو ظاہر کرتا ہے ، ان کی شدید لا ادریت کا اظہار ہے ۔ لا ادریت خود بھی ایک فلسفیانہ مدرسہ ہے اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ غالب کسی نہ کسی مدرسے سے تعلق ضرور رکھتے ہیں ۔ لیکن لاادری علم اشیا کی نفی کرتے ہیں اور یہ نفی دلائل اور ثبوت سے ہوتی ہے ۔ بالفاظ دگر کہا جاسکتا ہے کہ لاادریوں کے ہاں بھی اثبات شے پایا جاتا ہے مگر غالب صرف سوالوں کی حد تک محدود رہتے ہیں ، وہ کسی منفیت کا اثبات نہیں کرتے بلکہ ہر اثبات کو سوال کی زد میں لے آتے ہیں ، لہذا انہیں مروجہ معنی میں لاادری کہنا بھی مشکل ہی ہوگا ۔ البتہ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح کے اختراع کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ میرزا غالب ایک نئے مدرسے کے بانی تھے جسے ' سوالیت ' کہا جاسکتا ہے ۔ یعنی حقائق کو سوال کی زد میں لانا اور اس کے جواب سے مایوس رہنا ۔ جدید فلسفہ' وجودیت کا مدرسہ خود سوالوں کے وجود سے انکار کرتا ہے اور منطقی اثباتیت ـ لاجیکل پازی ٹیوزم ، سوالات کو جملوں کی ساخت سے متعلق کرکے چپ ہوجاتی ہے ، گویا منطقی اثباتیت کے خیال میں فلسفے کے سارے سوالات محض لسانی مسئلہ ہیں ، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ اللہ اللہ ، خیر سلا ۔ لیکن غالب اس طفلانہ انداز نظر کی صحت تسلیم نہیں کرتے ، اس لیے کہ ان کا عمق نواز ذہن سوال اٹھاتا ہے اور ان سوالات کو بڑی فکری جسارت کے ساتھ وہ پیش بھی کرتے ہیں ۔

میں یہاں یہ کہنے کی کوشش نہیں کررہا کہ غالب نے شعوری طور پر ایک فکری مدرسے کی بنیاد رکھی ہے ، جس کے لیے میں نے سوالیت کی اصطلاح وضع کرنے کی جرات کی ہے ۔ میں اسے ایک جداگانہ مدرسہ قرار دے کر غالب کے فکری رجحان کو دیکھتے ہوئے اس فکری مدرسے کا انہیں نمایندہ قرار دینے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ۔ غالب کی اس سوچ کی صحیح نمایندگی ان کے اس مصرع سے ہوتی ہے :

ہرکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

دین بزرگاں سے ان کی مراد صرف وراثتی دین ہی سے نہیں ہے ، اپنے

ماحولی ذہن سے بھی ہے ، جسے وہ ' خوش نکرد ' کہہ کر فکری آزادی کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں ۔ اس ' دین بزرگاں خوش نکرد ' کی تشریح کے ضمن میں مولانا حالی نے یہ کہہ کر کہ " ہم نے سنا ہے کہ مرزا کے والد سنی المذہب تھے اور خود غالب اثنا عشری " سارے شعر کا مزا کرکرا کر دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی نے غالب کے بہت سے اشعار کی اس بری طرح مٹی پلید کی ہے کہ ان کی ان تشریحوں کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ " شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد " ۔

البتہ مولانا حالی کی اس رائے میں واقعی وزن ہے کہ غالب کے بعض اردو اشعار میں وہ بلندی پائی جاتی ہے جس کی مثال فارسی کی تمام شاعری سے ملنی مشکل ہے ۔ سچی بات یہ ہے کہ غالب کی یہ رائے صحت پر مبنی نہیں ہے کہ :

" بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است "

اس لیے کہ ان کا فارسی کلام نظیری ، عرفی اور ظہوری کے وضع کیے ہوئے نمونوں سے باہر نہیں نکلتا ۔ ہاں اردو میں انھوں نے واقعی 'قاعدۂ آسماں ' کو الٹ کر رکھ دیا ہے اور زندگی کے ان گوشوں کو جھانکنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن تک دوسرے شعرا کا تخیل بار پانے کی جسارت نہ کرسکا ۔

حضرت علی کی منقبت میں غالب نے جو قصیدہ لکھا ہے اس کے چند اشعار ، مثلاً :

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آینۂ فرق جنون و تمکیں
نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسیں
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگار رخ آئینۂ حسن یقیں

ان کے پورے فارسی کلام پر بھاری ہیں، بلکہ ان جیسے اشعار کا بوجھ تو پوری فارسی اور اردو شاعری اٹھانے کی سکت نہیں رکھتی۔ ہر چند ان اشعار کی باغیانہ نوعیت سے گھبرا کر انھیں گریز کرتے ہوئے یہ بھی کہنا پڑا:

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیان تحریر
یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

لیکن یہی تحریری ہذیان ان کی فکری برتری اور عظمت کا سبب بن گیا۔

غالب اپنے فکری انحراف میں نطشے کا سا انداز رکھتے ہیں جب کہ فکری گہرائی اور طرز بیان میں مارکس اور اشپنگلر کا سا دماغ اور طرز ادا ظاہر کرتے ہیں۔ اُن میں اور ان جیسی فکر رکھنے والے ان مغربی اکابر میں ماحول کا فرق ہے، ورنہ ذہنی اعتبار سے وہ یکساں برتری کے حامل ہیں۔ ہاں ان میں انداز بیان اور اسلوب کی ہیئتوں کا فرق بھی ہے مگر یہ فرق ثانوی اہمیت کا حامل ہے۔ بنیادی چیز رد عمل ہے جو کئی اعتبارات سے ان میں اور نطشے، مارکس اور اشپنگلر میں یکساں ہے۔ نطشے بھی اپنے ماحول سے باغی ہیں اور غالب بھی، اسی طرح غالب بھی اتنی ہی گہرائی میں اترتے ہیں جس قدر مارکس یا اشپنگلر فکری عمق میں جاتے ہیں۔ لیکن یاد رہے یہ تشابہ محض فکری اعتبار سے ہے ورنہ غالب و مارکس اور اشپنگلر میں نہ مضامین کا اشتراک ہے نہ ماحول کا، نہ اسلوب کا اشتراک ہے اور نہ طرز بیان کا۔ البتہ نطشے اور غالب میں ایک مزید مفاہمت اور پائی جاتی ہے کہ دونوں طرز نگارش میں ادبی ضرورتوں کا بھرپور خیال رکھتے ہیں، گو غالب اس میدان میں نطشے سے آگے نکل گئے ہیں۔

کلام غالب کے فکری پہلوؤں سے متعلق یہ صرف چند باتیں ہیں جو تشنہ بھی ہیں اور مختصر بھی، لیکن اس ایک مختصر سی گفتگو میں جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ غالب کسی فلسفیانہ چوکھٹے میں فٹ نہیں ہوتے اور یہی ان کی خوبی اور اختصاص ہے جس نے تاریخ ادب میں ان کی شخصیت کو نادر بنا دیا ہے۔

یہ رسالہ "اردو" کے ایسے مضامین کا انتخاب ہے جو فارسی زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ یہ انتخاب ممتاز ماہر ایرانیات سید حسام الدین راشدی نے کیا ہے۔ اس مجموعے کے چند مقالے:

★ تصانیف شیخ فریدالدین عطار	حافظ محمود شیرانی
★ شاہ نامے کا دیباچۂ قدیم	حکیم شمس اللہ قادری
★ فردوسی کا مذہب	پروفیسر شیخ محمد اقبال
★ رباعیات عمر خیام	عبد الباری آسی
★ فارسی زبان کے زیر سایہ اردو زبان کی تدریجی ترقی	ڈاکٹر سید عبد اللہ
★ نواب صمصام الدولہ شہنواز خاں (صاحب مآثر الامرا)	محمد حسین محوی صدیقی

قیمت آٹھ روپے

انجمن ترقی اردو (پاکستان)
بابائے اردو روڈ - کراچی

مجموعہ دھلی اور غالب

قاضی عبدالودود

ایک مجموعہ فارسی نیشنل آرکائوز دھلی میں ھے ، جس کا علم مجھے جناب اکبر علی ترمذی کی مہربانی سے ھوا ۔ میں نے اسے جا بجا سے دیکھا ھے لیکن مقالہ ھذا اس کے عکس پر مبنی ھے ۔ اس میں پہلے غالب کی تحریریں ھیں ، ان کے بعد ایک صفحہ سادہ اور پھر تین صفحات میں دوسروں کی تحریریں ھیں ۔ کسی صفحے میں ۲۱ ، کسی میں ۲۰ اور کسی میں اس سے بھی کم سطور ھیں ۔ ایک مکمل سطر کی عبارت یہ ھے :

” چه مایه بیکسم که مرا در عرض مراسم پوزش خود شفیع خویشتن باید بود ، خدارا بر تلخ کامی های غالب زهرابه نوش رحمی بحق خدای که ناز “

کم اوراق ھیں جو ناقص نہیں ، کتاب بدون تمہید و خاتمہ ھے ، اس کا امکان ھے کہ اول و آخر اور درمیان کے کچھ ورق ضائع ھو گئے ھوں ۔ صفحہ آخر میں فارسی کی آخری سطر کے بعد تین سطور کی جگہ خالی ھے ، اور پھر انگریزی عبارت جو بجنسہ درج ذیل ھے :

" Writen (کذا) by moonshee Aly Hassan of mowzah Kahra"

قبل اس سے کہ تحریرات غالب سے بحث ھو ، دوسروں کی تحریروں کا ذکر کیا جاتا ھے ۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ اس سے یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی کہ کاتب منشی علی حسن ھے یا نہیں ، اور زمانہ کتابت کی کسی حد تک تعیین ھو سکے گی ۔ پہلے ایک خط ھے جس کا عنوان یہ ھے :

” نقل صحیفه... مخدومی مولوی سید افضل علی ...... تحصیلدار پرگنه بدوسا و کالنجر ضلع باندا بوندیل کهند ، موسومه این روشناس زاویه خمول ...“ ۔

اس خط کے آخر میں منشی محمد نسیم اللہ کو سلام ہے ، دوسرے خط کا عنوان " بشرح ایضاً " ہے اور اس کے آخر میں مرقوم ہے :

" شرح لفافہ ...... در باندا بسامی خدمت ...... مخدوم و معظم نیازمندان ...... منشی سید علی حسن خان ... زاد مجدکم العالی ۔ ذریعۂ اخلاص افضل علی ... پنجم اگست ۱۸۳۹ء ، باندا " ۔

تیسرا خط (اور یہ آخری تحریر ہے) غلام امام شہید کا ہے جو پیش کار صدر عدالت دیوانی تھے ۔ یہ دوران اقامت باندا میں ، وقت روانگی الہ‌آباد منشی محمد نسیم‌اللہ " سررشتہ دار عدالت فوجداری قسمت جنوبی ضلع بوندیل کھنڈ " کو لکھا گیا تھا ۔ " قسمت ... بوندیل کھنڈ " کے متعلق اطلاع ہے کہ " در آن ایام عبارت از ضلع باندا بودہ است " ۔

میرا خیال ہے کہ عبارت فارسی کے منشی سید علی حسن خان ، اور انگریزی عبارت کے منشی علی حسن فرد واحد ہیں ۔ اور یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس مجموعے کے کاتب نہیں ۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحریرات غالب کا زمانۂ کتابت تحریرات افضل وغیرہ کے زمانے سے مختلف ہوسکتا ہے ، اس سے قطع نظر کرلی جائے اور شہید کے خط کا زمانہ کم و بیش وہی تصور کیا جائے تو زمانۂ کتابت ۱۸۳۹ء یا اس کے کچھ بعد معین کیا جاسکتا ہے ۔ یہ متیقن ہے کہ غالب کی کل تحریریں جو اس مجموعے میں ہیں ، اس سے قبل کی ہیں ۔

اس مجموعے کے خطوط کی بڑی اکثریت محمد علی خان کے نام ہے ، خواہ ان کا نام آغاز خط میں ہو یا نہ ہو ۔ باقی خطوط علی اکبر خان طباطبائی کے نام کے ہیں ، اور ان کے ساتھ بھی ان کا نام لازماً نہیں ۔ ان خطوط میں سے چند پنج آہنگ میں بھی ہیں ، بعض میں تو بڑے اختلاف ہیں ، میرا خیال ہے کہ مجموعے میں ، اغلاط کتابت سے قطع نظر ، اصلی خطوں کی نقلیں ہیں ، پنج آہنگ میں مصلحت کارفرما رہی ہے ۔ بعض تحریریں خط نہیں کہی جاسکتیں ۔ خط (۲) و (۵) دراصل ایک ہیں ۔ (...) کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قبل کچھ الفاظ ضائع ہوگئے ہیں ۔ اردو خلاصہ تیار کرتے وقت تعظیمی الفاظ عموماً حذف کر دیے گئے ہیں ۔

مجھے اس کا افسوس ہے میں یہ مقالہ حسب دلخواہ نہیں لکھ سکا ، بیشتر خطوط سے متعلق حواشی تحریر ہی نہ ہو سکے ۔

[۱]

ابتدا میں بدون اسم مصنف ظہوری کا ایک شعر ، اس کے بعد چند سطور نثر ، اس کے بعد " فرمانروائے کشور آگہی ملاذ و مطاع رہی سلامت "۔ میرا خیال ہے کہ سطور بالا جزو مکتوب ہیں ، اور قیاس ہے کہ مکتوب الیہ محمد علی خان ہیں اور خط زمانۂ اقامت باندا کا ہے۔

میر کرم علی "اغلب اوقات" آپ کی جانب سے " قدم رنجہ " نہ فرمانے کا غدر کیا کرتے ہیں ، اور یہ کہا کرتے ہیں کہ آپ میری تعریف کرتے ہیں ۔ یہی بہت ہے کہ اس " ننگ آفرینش " کو " صدر بزم قبول " میں بٹھاتے ہیں ۔ میرے " دیر دیر " سے آنے کی وجہ شوق کی کمی نہیں ، " وفور ناتوانی" ہے ، دماغ کو فکر سخن سے سر گرانی ہے ۔ " یاد باد آن روزگاران کاعتباری داشتم الغ " ۔ ' ہیچ ' کو ' ہمہ ' اور ' بد ' کو ' نیک ' سمجھنا آئین غریب نوازی ہے ۔ دو نثریں جو مختلف مواقع پر لکھی گئی تھیں ، حاضر ہیں ۔ ایک خط ہے جو " صنعت تعطیل " میں " عمو صاحب قبلہ فخرالدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ " کی "جاگیر" سے " فخرالعلما مولوی محمد فضل حق " کو جو میرے دوست ہیں ، اور جن سے بر بنائے عجلت ، دھلی سے روانگی سے قبل ، نہ مل سکا تھا ، بھیجا گیا تھا ۔ دوسری ایک عرض داشت (۱) ہے جو لکھنؤ میں " بتکلیف دوستان جدید ، سبحان علی خان و میر نیاز حسین خان (۲) و دیگر دوستان جدید(...) " معتمدالدولہ کے لیے لکھی گئی تھی ، اور اس کی صورت بھی نکلی تھی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں ۔ " اما چوں درباب معانقہ وقت نخستین ملازمت

۱- دونوں تحریریں پنج آہنگ کے خاتمۂ گل رعنا میں ہیں ، خاتمے میں جو دوسری تحریر ہے ، اس کے آخری الفاظ مجموعے میں نہیں ۔ جناب مالک رام کی عنایت سے ان کا نسخۂ گل رعنا میری نظر سے گزرا ہے ، مگر یاد نہیں کہ یہ تحریریں اس میں ہیں یا نہیں ۔

۲- کمال‌الدین حیدر کی تاریخ اودھ جلد اول میں میر نیاز حسین (بدون " خان ") داروغۂ دیوان خانۂ معتمدالدولہ کا ذکر ہے ، قریب بہ یقین ہے کہ وہی ہوں جو مجموعے میں ہیں ۔

ِ آن طرف (......) سخنها رفت آن معاملہ ذهنی در خارج صورت نگرفت
.. ، مستغینانه پاس ناموس خاکساری ورزیدم ، و دامن از اختلاط آن
ِ دولتان بیمدار (۱) بر چیدم " ۔ اس کی ' هوس ' سینے سے محو هوگئی مگر
رقم ' ' سفینے ' میں باقی ہے ۔ "مخدوما و مکرما ، من دانم و دل که بدین
سن اتفاق چه قدر شادمانی میکنم ، یعنی دعائے بے اثر از قبول یگانه که
بون ناله های دلهای بیدرد اهل هوس را بجائے نمیبرد ، اینک در خاتمہ
ین عبودیت نامه تشریف قبول یافت ۔ هم نقش مدعای خاطر مشتاق بکرسی
شست ، و هم زحمت تفرقہ نفاق و وفاق از میان برخاست ۔ امید که آثار
ن دعا بری از ریا ، بروزگار خجسته آثار جناب سامی مدظله باد " ۔

[۲]

خط نام محمد علی خان ، پنج آهنگ کے مطابق :

"قبلہ قبله پرستان و کعبہ حق پژوهان سلامت "۔ پنجشنبے کو مودها
پنج آهنگ خطی ، مژده) پهنچا ، دو شنبے کو روانه هوا ، رات ایک گاؤں میں
گزاری ۔ "بروز سه شنبه در چله تارا رسید " (...) بخار غائب هوگیا ۔ "امشب
۲) (...) اگر حیات باقیست بسیچ راه فتحپور کرده خواهد شد " ۔

[۳]

خط بنام محمد علی خان ، پنج آهنگ کے مطابق ۔ پنج آهنگ کی عبارت
' خلاصہ تحریر ... حد ادب " مجموعے میں نہیں ، اور ' قدیر ' کے بعد مجموعے
ی عبارت ذیل پنج آهنگ سے غیر حاضر ہے : بخدمت جناب شاه غلام زکریا
ماحب و خان صاحب عمیم الاحسان العام احمد خان صاحب و جناب محمد صالح
لی خان المشتهر به مرزائی صاحب سلامہائے نیاز افشان اشتیاق بار پذرفته باد ۔

[۴]

بنام محمد علی خان، مگر مکتوب الیه کا نام درج نہیں ۔ عنوان "مشتمل

۱۔ مگر یه بعد کو سبحان علی خان سے استمداد سے مانع نه آیا ،
نج آهنگ میں ان کے نام کے خطوط هیں ۔

۲۔ امشب در چله تارا رسیده (کذا) بامداد آن اگر حیات باقیست ...
ہد ... زیاده حد ادب " (پنج آهنگ ، قلمی)

بر هجو اله آباد و صفت بنارس "۔ آغاز شعر ذیل سے :

ابن شکایت نامۂ آوارگیہائے منست
قصۂ درد جدائی ها جداخواهم نوشت

دیوانه ام هر چه گویم معافم ، و درد مندم هر چه نویسم مرفوع القلم

مغلوب سطوت شرکا غالب حزیں
کاندرتنش زضعف تواں گفت جاں نبود

نویند زنده تا به بنارس رسیده است
مارا بایں گیاه ضعیف ایں گماں نبود

چله تاره کا ماجرا دو عرض داشتوں میں لکھ چکا ہوں ۔ گھاٹ پر کشتی کرایہ لی اور نوکر اور گھوڑے کے ساتھ اس پر سوار ہوا ۔ " از پیچ و تاب ریح معده در کشاکش دل حرارت غریبه حمی بر آتش"۔ " روز هفتم بویرانه (...) ورود افتاد ، آه ازاله آباد و لعنت خدا بدان خرابه باد نه در وی دوائی درخور بیمار و نه متاعی شایستۂ مردم (..................) مرد و زنش ناپیدا ، و مهر .... از طبع پیر و جوانش کم "۔ اس ' وادی هولناک ' کو شہر کہنا نا انصافی ہے ، اور " آدم زاد " کا اس " دامگاه غول " میں رہنا "بے حیائی"۔ جہنم اس نسبت پر کہ اس شہر کا مقابل کہتے ہیں ، پر از آتش ہے ، اور هوائے زمہریر اس سے سخت ناخوش ہے کہ اس " بروتکده " کی هوا سے اسے نسبت دیتے ہیں (۱) ۔ یہ سن کر کہ " بدان را بنیکان ببخشد " یہ شہر ' هزار امیدواری ' بلکہ ' صد هزار خواری ' کے ساتھ بنارس کے پہلو میں مقیم ہے اور گنگا کو بطریق شفاعت اس کی طرف بھیجا ہے ۔ اس روسیاه کی طرف دیکھنا بنارس کی طبع نازک پر گراں ہے ، مگر گنگا سفارشی ہے ۔ بخدا اگر کلکتے سے واپسی کا انحصار اس پر ہو کہ اله آباد سے گزرنا لازم ہے ، تو 'ترک وطن' کروں ۔ ایک شب و روز فقدان باربرداری کی وجہ سے اس ' دیولاخ ' میں

۱۔ اله آباد کے متعلق رائے غیر ذمہ دارانہ ہے ، قیام اتنا مختصر رہا تھا کہ وہاں کے باشندوں کی نسبت اظہار رائے کا حق ہی نہ تھا ۔ بعض اصحاب نے حسب دلخواہ سلوک نہ کیا ہوگا ، اله آباد سے نفرت کی یہی وجہ ہے ۔

ھا ۔ دوسرے دن بہلی ملی اور وقت سحر ساحل گنگا پر پہنچا ، دریا سے گزرا ، اور " پائے شوق " سے سوئے بنارس " گرم پویہ " ہوا ۔ روز ورود بنارس نسیم جانفزا سوئے شرق سے چلی ، اس کا اثر یہ ہوا کہ اثر ضعف بالکل نہ رہا ۔ اگر فرط دلنشینی کی وجہ سے اسے سویدائے عالم کہوں بجا ہے ، اور اس کے اطراف میں سبزہ و گل کا جوش دیکھ کر بہشت ارضی کہوں روا ہے ۔ کثرت عمارات کا کیا بیان ہو ۔ یہ تماشاگاہ اتنا دلفریب ہے کہ غربت کا غم فراموش ہے ۔ مقدمہ درپیش نہ ہوتا اور شماتت اعدا کا خوف نہ ہوتا تو بے محابا ترک دین کرتا ، سبحہ توڑتا ، قشقہ لگاتا ، زنار باندھتا اور اس وضع میں تا زندگی گنگا کے کنارے بیٹھتا ۔ اس " ارم آباد " میں بغیر دوا عوارض جدید غائب ہوگئے ، اور اصل مرض بھی کسی قدر کم ہوا ۔ ' مرکبات معمول ' کی فراھمی حزم و احتیاط استقبال کی بنا پر ہے ، ورنہ تلافی ماضی یا رعایت حال مدنظر نہیں ۔ خاطر اقدس میں یہ نہ گزرے کہ غالب ' خیرہ سری ' سے بنارس میں شہد کی مکھی یا دلدل کا گدھا ہوگیا ہے ، حاشا ثم حاشا ، مجھ فلک زدہ کو دماغ تماشا کہاں ؟ (۱) ' مگر دواؤں کی فراھمی اور زمستان کے لیے رخت سفر کی تیاری میں کم از کم چار ہفتے صرف ہوں گے ۔ ایک ہفتہ جو گزر چکا ہے اسی میں شامل ہے ۔ پانچ روز سرائے ہزنگ‌آباد مشہور بہ سرائے نورنگ‌آباد میں فضول بسر ہوئے ، اب مکان اسی سرا کے عقب میں مل گیا ہے ۔

---

۱ ۔ میرا خیال ہے کہ بنارس میں کسی صورت سے تعلق ہوگیا ہوگا ، طول اقامت کی اس کے علاوہ کوئی وجہ قرین قیاس نہیں ۔ وہ خود ، جیسا کہ خود متعرف ہیں ، بڑی مبتذل سی جگہ مقیم تھے ۔ مگر اس کے باوجود بنارس کی مدح اتنی کی ہے کہ کسی اور جگہ کی نہیں کی ، بنارس اس کا ہرگز مستحق نہیں ۔ اس خط میں ایک مثنوی کے ۱۲ اشعار ہیں ، جن میں سے ۱۱ چراغ دیر سے ہیں ، ان ۱۱ اشعار کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں ، ترتیب مطابق مجموعہ : تعالی اللہ، خس و خارش ، سروش (صحیح : سوادش) ، بنارس را کسے ، بخوش پرکاری ، بنارس را تو ، حسودش ، بتانش را ، میانہا ، تبسم ، بلند افتاد ۔ ایک شعر جو کلیات ۱۲۵۳ھ میں نہیں ، یہ ہے :

فرنگستان حسن بے نقاب است
ز خاکش ذرہ ذرہ آفتاب است

کبھی جی میں آتا ہے کہ عظیم آباد تک خشکی کی راہ سے جاؤں اور وہاں کرائے کی کشتی لوں ، کبھی یہ سوچتا ہوں کہ یہیں سے براہ دریا جانا چاہیے ۔ آپ خط ضرور لکھیں ، اس کے جواب میں یہاں سے روانگی کی تاریخ وغیرہ لکھوں گا ۔ ہر چند کہ آپ کا خط آنے کی بیش از بیش خواہش ہے ، لیکن دل شرم گمنامی و ہیچ کسی سے زخمی ہے ۔ میری اقامت گاہ ایک بڑھیا کا گھر ہے ، جو خود روغن چراغ کی محتاج ہے اور اس کا خرابہ ہرس و جو سے فارغ ۔ اس کے پہلو میں کوئی ایسا مکان بھی نہیں کہ اس کے پتے سے خط منگواؤں ۔ یہی ایک صورت ہے کہ آپ یہ لکھیں " محلہ نورنگ آباد عقب سرائے نورنگ آباد قریب حویلی گوسی خانساماں در حویلی مٹھالی و میاں رمضان بمطالعہ اسداللہ غریب الوطن تازہ وارد برسد " ۔ ممکن ہے کہ " قاصدان ڈاک انگریزی " خط مجھ تک پہنچادیں ۔ شاہ محمد زکریا ، خان صاحب (......) اور مرزائی صاحب کو سلام ۔

[۵]

"قبلۂ قبلہ پرستاں و کعبۂ حق پژوہاں" ۔ حامل مکتوب محض اتفاقاً ملا ، ...... مودھا پہنچا ، اتوار تک وہاں آرام کرتا رہا ، دو شنبے کو وہاں سے رخصت ہوا ، رات ایک گاؤں میں بسر کی ، منگل کو چلہ تارہ پہنچا ۔ شکر ہے کہ درد اور بخار سے نجات ملی ۔ رات یہاں گزار کر علی الصباح عازم فتحپور ہوں گا ۔ اسداللہ ۔

[۶]

بنام محمد علی خان بموجب پنج آہنگ ، جس میں یہ نامکمل ہے :

" جناب فیض مآب قبلہ و کعبۂ نشأتین " ، بنارس میں " عطوفت نامہ " ملا ۔ منگل ۴ شعبان کو براہ خشکی عظیم آباد روانہ ہوا اور وہاں سے کلکتہ پہنچا ۔ وہاں ایک اچھا مکان چھ روپے (پنج آہنگ میں دس) کرائے کا مل گیا ۔ آپ کا خط لے کر ہگلی گیا ۔ " بدر نواب صاحب (۱) (...) نخست

۱۔ مراد از علی اکبر خان طبا طبائی ، ذکر ملاقات پنج آہنگ کے خط میں بھی "بدر ... باید دید" کے مطالب پنج آہنگ میں نہیں ، اور اس میں طباطبائی کی جو تعریف ہے ، مجموعے کے اس خط میں نہیں ۔

روبسوی ایوانی کہ ضریح جناب سیدالشہدا علیہ‌التحیۃ والثنا دور بود ، آوردم
وز (...) چوں بگوشہ' بساط قرب عذوبی رسیدم از فرط عنایت برخاستند -
... (......) در انتظار تو روز ہا گذشت چوں از کیفیت منشا' انتظار پرسیدہ
شد ایں معنی گل (......) نواب صاحب رسانیدہ اند ، و بے ذریعہ' ملاقات
صوری روشناس معنوی گردانیدہ - روز ملاقات (..) درمیان نیامد ، دو سہ
ساعت نشستہ برخاستم و بہ غمکدہ معاودت کردم ، بعد دو روز کہ دوبارہ
(....) بیت افتاد ، دو روز و یک شب صحبتہا ماند و پرس و جوہا بمیان آمد ،
حال مقدمہ مفصل گفتہ (......) دل نہ دادہ کہ بدان خرسند تواں گشت
و ناامیدی نیز نہ بخشیدہ کہ از سر ایں کار تواں گذشت (......) "-

" جہان بے مہر و گیتی دشمن و دلدار مستغنی مرا بر آرزو ہائے ثنائی
خندہ می آید" -

" آشفتگی بخت (......) باید دید " - " مرگ (۱) نواب احمد بخش
خان بہادر بہ سمع اقدس رسیدہ باشد " ... " ہر چند انہدام پیکر عنصری نواب
نفس مقدمہ را چنانکہ سود ندارد زیاں ہم ندارد ، اما از خود رفتہ' ایں دو کیفیت
باشم ، یکی آنکہ ... دست گدائی پیش برادران دراز کردن ، دیگر آنکہ مسرتے
کہ بعد از فتح متصور بود ، باطل شد ، یعنی انتقام از غاصب قوی کشیدن
و در انجمنہا بدان ناز کردن - خطا پوش عیب پوش من سلامت ، بندہ' تازہ
خریدہ' جناب را ... دو لغزش واقع گشتہ ، یکے اینکہ غزلے کہ از بنارس
فرستادہ ام و مطلع آن اینست (۲) :

اے بصدمہ' آہی بر دلت ز ما باری
ایں قدر گراں نبود نالہ' ز بیماری

۱- " مرگ ...... کردن " نہ بہ عبارت پنج آہنگ میں ہے ، نہ اس کے مطالب - حذف کی وجہ ظاہر ہے ، انتقام کی مسرت کے متعلق جو کچھ تھا ، اسے غالب چھپانا چاہتے ہوں گے -

۲- مطلع کے متعلق عبارت پنج آہنگ میں نہیں ، عبارت کی خامی عیاں ہے ، جو مطلع غالب نے بھیجا تھا ، وہ نہ تھا جو مجموعے میں ہے -

" امید کہ جناب مطلع مذکور را محو فرمودہ این مطلع را بدل ما یتحلل آن دو مصرع سازند ۔ دوم اینکہ قصیدہ کہ در مدح آغا میر گفتہ ام ، خدا میداند کہ برائے خاندان من طرفہ داغ بدنامیست (۱) ، و لطف اینکہ یکصد و دہ شعر را از صفحہ حک ساختن نمی توانم (......) نواب مرشد آباد نیز سید زادہ است ، این قصیدہ را بنام وی شہرت دہم ، گو بملازمتش نارسیدہ (......) لیکن مداح بودن من بر ہمایون جاہ را (کذا) بر من ناگوار نیست ۔ توقع کہ تا زمانی کہ اشعار موضح اسم ممدوح را (...) آن قصیدہ را بکس ننمایند ، و عیب خردان را چون بزرگان بپوشند و نوازشنامہ کہ (......) عنوانش باید کہ چنیں باشد ، شہر کلکتہ قریب چیت بازار در سملیا (کذا) بازار نزدیک تالاب کرد (کذا) (.........) بمطالعۂ اسد برسد ، زیادہ آرزوی قدمبوس حد (کذا) عرضہ دارد ۔ محمد اسداللہ " ۔

[۷]

مکتوب الیہ محمد علی خاں ہوں گے : آغاز " دو سہ روز گذشتہ باشد کہ کتابتی از غمکدۂ راقم رسیدہ بود " ۔ یہ مرسل ہے اور کچھ حال اس " داوری گاہ " کا مرقوم ہے ۔ آج سنیچر یکم رجب ہے ۔ ' کار فرما ' کا خط آیا ، ان کا ذکر سابق میں کرچکا ہوں ۔ " فرستادہ آمد " میرا " یار " چارہ جوئی

---

۱ ۔ وجہ یہ نہیں کہ خاندان کی بدنامی ہوگی ، غالب قصیدے سے دوسرا کام لینا چاہتے تھے ۔ اگر نظم باعث ننگ تھی ، تو مدحیہ نثر بھی اس کا سبب ہوسکتی تھی ، مگر اس کی نقل محمد علی خان کو خود بھیجی (خط ۱) ، اسے خاتمۂ گل رعنا میں شامل کیا ، اور اس پر قناعت نہ کر کے پنج آہنگ میں بھی رکھا ۔ نواب مرشد آباد کے نام کا کوئی قصیدہ غالب کا نہیں ، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نام قصیدے کو شہرت دینے کا ارادہ قوت سے فعل میں نہیں آیا ۔ غالب کا صرف ایک قصیدہ ہے جس کے بعض اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں لکھے گئے تھے ۔ کلیات میں یہ قصیدہ مدح نصیرالدین حیدر و روشن الدولہ وزیر میں ہے ، کلیات کے قدیم خطی نسخے میں اس کا جو عنوان ہے ، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قصیدہ بادشاہ تک نہ پہنچا ، بعد کو غالب نے مصلحتہً یہ قصہ گڑھا کہ پانچ ہزار روپیے صلہ دیے جانے کا حکم ہوا ۔

سے غافل نہ تھا ۔ مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان اور مجھ سے زیادہ قاعدہ دان ہے ' خط دیر سے لکھا تو اس لیے کہ کوئی خبر نہ تھی ' اور یہ خاموشی بھی "بغرور یکدلی و یگانگی " تھی - محمد اسد اللہ

[۸]

بنام ایضاً (بدون اسم مکتوب الیہ) : " حضرت قبلہ گاھی ولینعمی مد ظلہ العالی"۔ پرسوں منشی عاشق علی خاں بہادر کا خط آیا کہ تمہارے یہاں آرہا ہوں ' اس کے ساتھ آپ کا خط بھی ان کے نام کا تھا جس میں انہیں میری 'خاکساریوں' سے آگاہ کیا گیا تھا۔ میں خود ان کے یہاں گیا ' ہر چند دفترخانے میں تعارف ہو چکا تھا (...) اور علی اکبر خاں کے یہاں اتفاق معانقہ بھی ہوا تھا ' لیکن (...) " نقش بکرسی بکرسی نشست " وہ " اہل وحدت وجود " کے مذاق کی باتیں کرتے ہیں ۔

[یہ خط جس میں اور باتیں بھی ہیں ، پنج آہنگ میں بھی ہے]

[۹]

بنام محمد علی خاں، بدون اسم مکتوب الیہ : " حضرت قبلہ گاھی" میں منشی عاشق علی خاں کے یہاں گیا تھا ، عنایتیں کیں، میں " ھذا من برکت البرامکہ" کہتا ہوا اٹھا اور گھر واپس آیا ۔ چند روز بعد ، اتوار کے دن وہ میری غیرحاضری میں میرے یہاں آئے ' میں اس کی تلافی کے لیے ان کے پاس گیا ' نواب علی اکبر خاں بہادر ہوگلی میں ہیں ۔ " وعدہ بود کہ ترا خواھم ماند (...) یاد نکردہ اند ۔گزارش جناب قبلہ گاھی وابستہ بزبان حضور است ، غالب کہ پس از فراغ امور شادی (...) " ولایت حسن صاحب پھر دورے پر گئے ہیں ۔ راجہ بنارس (...) ملازمت گورنرجنرل کی استدعا کی اور دربار عام قرار پایا ، " اما (...) میان نماند کس خبر نیافت یعنی بروز آدینہ چہار دھم فروری چون وقت برخاستن عملہ (...) صاحب سکرتر کہ من از بندگان اویم ، بنائب میر منشی کہ در غیبت میر منشی کارروائی میکند (......) اہل بار صلا باید زد کہ روز دو شنبہ روز بار است (...) شبانہ کتابتی شعر این ماجرا بمن فرستاد ، فردائے آن شب دو شنبہ بود خود را بملازمت صاحب (...) رسانیدم و تمنائے ملازمت کردم و پذرفت ... نام مرادر صف اصحاب الیمین (......) دھم بر کرسی اعتبار نشاند " ۔ نمبر (۱) راجہ ھوت (بھوپ ؟) سنگھ "جانشین راجہ

کلیان سنگھ عظیم آبادی (...) از بدر اوست(؟) "۔ تیسرا لمبر سفیر شاہ دھلی،
۴ سفیر شاہ اودھ، ۵ وکیل ھمایوں جاہ، ۶ وکیل جودھپور، ۷ وکیل جیپور،
۸ وکیل راجہ نیپال، ۹ اکبر علی خان ۔ خوش قسمتی کہ ایسے شخص کی
بغل میں جگہ ملی جسے میں نے سب " اعیان بنگالہ " میں سے چنا ہے ۔
مگر وہ شریک نہ ھو سکے ۔ میں نے " منعم " کی عنایت دیکھی، خلعت کی
آرزو کی، کچھ سوچ کر بولے کہ اتنی تھوڑی مدت میں یہی غنیمت ہے،
تمھارے چچا کو کبھی خلعت نہیں ملا، میں یہ نہیں کہتا کہ کبھی نہیں
ملے گا، مگر اس کے لیے معاملے کو کونسل میں پیش کرنا ھوگا ۔ مطمئن
رھو کہ وقت رخصت خلعت گرانمایہ با ضمیمۂ خطاب بہادری جس کی تمنا کی
ہے [مگر اس سے قبل خطاب کا ذکر نہیں] پیش گاہ لارڈ صاحب سے دلواؤں گا ۔
دوشنبے کو حاضر دربار ھوا ۔ میں نے نواب گورنر کو دو اشرفیاں نذر پیش کیں،
علی الرسم معاف کی ۔ " توقف نمودہ و نیازمند یہای مرا (...) پرورش و عنایت
داد و عطر و پان بدست خود عنایت فرمودند " (...) دھلی و سفیر شاہ اودھ
وکیل نواب مرشد آباد نے اپنے موکلوں کا شوق بیان کیا، کہا کہ میں خود
ان اضلاع میں پہنچتا ھوں ۔ اس سے قبل " زبان زد عوام " تھا کہ نواب گورنر
(............) و مجموع افراد عملۂ کونسل " ھندوستان " جائیں گے ۔ اب
ثابت ھوگیا کہ سفر متیقن ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کونسل ساتھ جاتی ہے
یا نہیں، پہلی صورت میں مجھے بھی جانا پڑے گا، مولوی فضل حق کا خط
جو " خط خانگی " کے ساتھ دھلی سے آیا ہے، عرضداشت کے ساتھ جاتا ہے ۔
۱۷ فروری مطابق ۱۳ شعبان ۔

[۱۰]

بشرح صدر : " حضرت قبلہ گاھی ... " کل ۳ رمضان اور روز دو شنبہ
تھا ۔ " زاویہ نشینان وطن " کا ایک خط ملا کہ ۵ شعبان کو تمھارا مقدمہ
" داخل کواغذ مسل " ھوا ۔ ھر چند کہ یہ بات سمجھ میں نہ آئی، لیکن
اس سے یہ معلوم ھوتا ہے کہ عرضداشت پیش ھوئی ۔ غالب کہ اسی ھفتے
کارفرما یا وکیل کا خط آئے جس سے حالات معلوم ھوں ۔ نواب سید علی اکبر خاں
بہادر کو " کاروبار شادی " سے فراغت ھوئی، دربار میں حاضر نہ تھے،
اس لیے میں نے خط لکھا اور جویائے حال ھوا، جواب آیا کہ طبیعت ناساز ہے ۔
میں عیادت کو گیا، انھیں " عارضۂ ریگ گردہ " تھا، ظاھر 'مادہ' کم تھا،

جلد صحت ہوگئی ۔ کامل پانچ دن وہاں گزار کر کل گھر واپس آیا تو '' پاسبان کاشانہ '' نے مکتوب دہلی دیا جس کا مضمون اوپر درج ہے ۔ (......) مقدمہ بھگوانداس میں کہ اس بیے کہ قبل دریافت کر چکا ہوں کہ روپے اسی قدر (.....) ''بھگوانداس رسانید و...... آن قبلہ سہو در تحریر فرمودہ بودند ۔ اما در باب بیع کتب (... ..) رنگی از معاملہ داشت ...... زحمت تحریر بر انامل مخدومی (... ..) روا داشتم چنانچہ رقعہ مرقوم ید ستخط خود شان در نورد عرضداشت بنظر خواہد گذشت''۔ خبر ہے کہ برسات میں نواب گورنر کونسل اور عملے کے ساتھ ہندوستان جائیں گے اور تین سال ضلع میرٹھ دارالسلطنت قرار پائے گا ۔ اس صورت میں '' وابستگان کونسل '' وکلا ہوں ، یا اہل داد ، سب ہم سفر ہوں گے ۔ مجھے یہاں تاب اقامت نہیں ، مگر سر و برگ سفر کہاں ؟ مقدسے نے کوئی صورت اختیار کی ہوتی تو سرکار سے قرض مانگتا ۔ '' یا خود آن بودی کہ حضرت ...... در پیجتاب اجارہ فرونماندہ بودندی تا کارمن رونق ...... گرفتی و دریں باب سگالش نرفتی ''۔ مگر یہ شکل ہے ، نہ وہ ، کیا کہوں میری کیا کیفیت ہے ۔ کاش نواب ذوالفقار بہادر کو اس کی توفیق ہو کہ امین کرن سے ہزار روپے اور دلوادیں ۔ جی میں آتا ہے کہ نواب کے نام اس مضمون کی ایک عرضداشت آپ کے پاس بھیجوں کہ آپ پڑھیں اور مرزا اوزبک جان برادر کوچک مرزا مغل بیگ کو کہ میرے بھائی اور قوت بازو ہیں ، اچھی طرح سمجھادیں کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیں ۔ '' قبل از مرگ واویلا '' اس لیے ہے کہ اس رستخیز میں صرف چار ماہ کی دیر ہے اور وہ گروہ جس کا میں حاجت مند ہوں ، سخت بے پروا ہے ۔ تہی دستی کا حال یہ ہے کہ رمضان آ گیا ہے اور توشہ ختم ہو گیا ہے ۔ اگر شعبان میں لارڈ صاحب کی ملازمت نہ ہوتی تو رمضان اچھی طرح کٹتا ، لیکن روپے انعام '' عملہ و خدمہ سکرتری و گورنری'' میں صرف ہوئے ، ہر چند کہ اس میں صرف بھی فراخدستی و کشادہ دلی نہ تھی ۔ چار پانچ ماہ کی اقامت کے لیے اسی قدر کافی ہوگا ، جو پہلے عنایت ہوا تھا ۔ امید ہے کہ آپ یہ رقم روانہ فرمائیں گے۔ '' و در باب آخروی تاملی بسزا فرمودہ شود ''۔ اسداللہ ، ۲ رمضان سہ شنبہ ۔

[۱۱]

بشرح صدر: '' حضرت قبلہ گاہی ... '' دربار وغیرہ کا حال لکھ چکا ہوں ، اور یہ بھی کہ روپے کس طرح فراہم ہوں ۔ آج پنجشنبہ ۱۲ رمضان

ہے ، ایک خط ''پا شکستگان وطن '' کا آیا ہے، ہر چند کہ لکھوانے والوں کا '' مذاق آ گہی '' خام ہے ، اور نویسندہ سلیقۂ اظہار مدعا نہیں رکھتا ، اتنا معلوم ہوا کہ وہاں کی ' داوری گاہ ' میں مقدمہ 'روبکار' ہوا اور ' فرمانده' نے اپنے کار پردازوں کو جستجو (...) پر مامور کیا ۔ یقین ہے کہ چند دنوں میں وکیل یا ' کارفرما ' کا خط آئے ۔ رسیڈنٹ ۲ شعبان کو دھلی پہنچا ، ۵ کو 'داد نامہ ' ' داد گاہ ' میں گزرا ، اور یہ خط جو اب جاتا ہے ۲۹ شعبان کا ہے ۔ مصلحت ہے کہ آپ منشی محمد حسن کو ایک دوستانہ خط لکھ کر حالات معلوم کریں ۔ ' کارفرما ' ذرا ' کاهل قلم ' هیں اور یہ '' غرور یکدلی '' کی وجہ سے ہے ، ورنہ ان کی دوستی کا کئی بار امتحان ہو چکا ہے ۔ رات ایک غزل کہی ہے ''چوں مطلع آن... داشت طراز خاتمۂ عبودیت نامہ'' ہوتا ہے :

لذت عشقم بفیض بے نوائی حاصل است
آنچناں تنگست دست من کہ پنداری دل است

۱۳ رمضان پنجشنبہ پہپی (عمہ) کا خط جو دھلی سے آیا ہے ملفوف ہے ، پڑھنے کے بعد چاک کر کے سپرد آب و آتش ہو ۔

[۱۲]

قبلہ گاھا ، جان بیلی جو اعظم و ارفع اجزائے کونسل ہیں ، برما گئے تھے ، کلکتہ آ گئے ۔ لارڈ بٹننگ گورنر شکار کو پورب گئے تھے آج واپس ہوں گے ۔ ایک ' معتمد ' کہتا تھا کہ ' اچانک ' واپسی ہوئی ۔ راجہ اودت سنگھ بنارس، ایک جماعت کے ساتھ جاھمندانہ وارد کلکتہ ہیں ، مشتہر یہ کیا ہے کہ جگن ناتھ جاتا ہوں، لیکن دراصل اس لیے آئے ہیں کہ صاحبان نے ان کی عملداری کے لیے جو نیا قانون بنایا ہے ، وہ اس پر راضی نہیں ، وہ اس کی تبدیلی چاہتے ہیں ۔ اور یہ بجا بھی ہے کہ اس سے ان کی سطوت فرماں روائی کی بربادی ہے ، مگر قانون بدلے گا نہیں ۔ اگست میں گورنر مع اعیان کونسل و اشخاص دفتر خانہ عازم ہندوستان ہوں گے اور وہاں کے معاملات وہیں طے ہوں گے ۔ داد خواہ لکدکوب رسیڈنٹ و ایجنٹ سے بچیں گے ۔ اوائل فروری میں ایجنٹ لا محالہ دھلی پہنچ گئے ہوں گے ۔ صاحب سکرتر کو مجھ سے التفات تام ہے ، بسبیل مطائبہ کہتے تھے کہ اب آپ لوگوں کو رزیڈنٹ سے ایمنی ہے ، جناب لارڈ صاحب ہر مقدمے کا خود فیصلہ کریں گے ۔ مولوی ولایت حسن خان

دورے سے واپس آ کر دو چار دن کے بعد پھر گئے ۔ مجھے بعد کو خبر ملی ورنہ ان کے پاس جاتا ۔ علی اکبر خان طباطبائی سا صاحب دل بنگالہ میں نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ " گرامی گوھر " کس کان کا ہے ۔ ھگلی سے آتے ہیں تو میرے یہاں ضرور آتے ہیں ۔ " (......) ایں دیار از راہ حسد با من در افتادہ بودند " ۔ انھوں نے میری مدد کی ۔ ان کی چھوٹی بیٹی کی شادی درپیش ہے ، مجھ سے فرما گئے ہیں کہ میں طلب کروں تو ایک ہفتے کے لیے میرے یہاں آ کر رھو ۔ اس کا منتظر ہوں ، ظاھرا ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ۔ ان کے دو رقعے ملفوف ہیں کہ آپ ان کی خاکسار نوازی سے آگاہ ہوں ۔

[۱۳]

" قبلہ گاھی ... " ۔ جمعہ ۲۹ ربیع الاول تھی کہ مولوی ولایت حسن کا آدمی ان کا اور آپ کا خط لایا۔ آپ کی اور آپ کے بھائیوں اور عزیزوں کی خبر معلوم کر کے خدا کا شکر بجالایا ۔ مولوی صاحب کے خط میں ہے کہ دوسو روپوں کے تین قطعہ نوٹ " مطابق زبان ایں دیار " آپ کے ارشاد کے بموجب مرسل ہیں ۔ حیرت ہے کہ آپ کے خط میں اس کی طرف اشارہ نہیں ، اور یہ بھی بدیہی کہ یہ آپ کے ایما کے بغیر نہیں ۔ ایک صورت یہ کہ آپ نے انھیں میری " پرورش " پر مامور کیا ہے ، یہ ہے تو اس کا ادا کرنا ضرور ہے، خواہ آپ ادا کریں یا میں خود ۔ دوسری یہ کہ روپے آپ کی طرف سے ہیں ، " کاروبار اجارہ " میں آپ کو جو نقصان ہوا ہے ، اسے دیکھتے ہوئے ، ضمیر پراگندہ ہوتا ہے ، لیکن "چوں حاجت خود را قوی تر و خودرا درماندہ تر می نگرم، در قبول آن (...) " اگرچہ یہ جانتا ہوں کہ " پیچتاب تقاضائے سرکار " میں روپے بھیجنا آسان نہ تھا ۔ حق یہ ہے کہ یہ رپے نہ آتے تو سخت مشکل کا سامنا ہوتا ۔ اب " ابن السفر والا قامت " تردد نہیں ، اس لیے گھوڑا ۱۰۰ میں بیچ دیا ۔ ایک سائیس اور ایک خدمت گار کو برطرف کر دیا ہے ، اور تین خدمت گار اور ایک کہار اس وقت میرے پاس ہے ۔ اور میں خود آدھا آدمی ہوں ، اس لیے کہ اور لوگ دن بھر میں کم از کم دوبار کھاتے ہیں (...) بیع اسپ کے بعد پچاس روپے صرف میں آئے ، سو روپے باقی تھے ، فکر تھی کے جاڑا آ گیا ، کمل وغیرہ کی ضرورت ہے ، آپ کی دستگیری نے اضطرار سے رھائی دی ۔ قیمت اسپ ساز و برگ سرما کی فراھمی اور ربیع الثانی کے چار ھفتوں تک کے کام آئے گی اور دو سو رپے

غرۂ جمادی‌الاول سے غرۂ رمضان تک وفا کریں گے - اس لیے کہ پچاس روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہ کرنا طے کر لیا ہے - پانچ مہینوں میں اگر مقدمہ انفصال کے قریب آیا تو ممکن ہے کہ سرکار سے قرض مل سکے - خدایگانا آج " کواغذ مقدمہ " دھلی بھیجے ہوئے بیالیسواں دن ہے - اب تک جواب نہیں آیا - اس ڈاک میں خط تلف نہیں ہوتے ، مکتوب‌الیہ " همدمان یکدل" سے ہیں - اس انتظار میں ہوں گے کہ مقدمے کی ہدایت ہو جائے تو خط لکھیں - میر کرم علی کے نام کا خط ملفوف ہے ، انھیں طلب کر کے مطالب سمجھا دیں کہ انھیں " دخل فکر الہامی " کی ضرورت نہ پڑے ، ان کا جواب بھی اپنے خط کے ساتھ روانہ فرمائیں - " برادران وعزیزان و نور چشمان " کو ساوجب -

[۱۴]

'قبلہ گاہا' منگل ۲۷ رجب کو ایک خط بھیجا ہے " ہر (......) یکشنبہ بود کہ بریدی از بریدان ڈاک رسید " اور ربوبیت نامہ وصول ہوا - " تا عنوان ... گشودہ شد نظارہ فروز رقمی موسومہ مخدومی (...) دام شوکتہ کہ در نظر جلوہ کرد چوں میدانستم کہ جناب ممدوح تشریف آوردہ بودند و باز رفتند ناگزیر نیاز نامہ (...) جناب میر صفات علی خان صاحب رقم زد ، و آن گرامی نامہ را در وی نوردیدہ بملازمی دادم تا بہ اثالی بخدمت میر صاحب موصوف (...) ہنوز برندہ' آن نامہ معاودت نکردہ بود کہ آدم ... مولوی ولایت حسن صاحب رسید و منشور سرفرازی (...) نوک خامۂ جناب ولینعمی درنورد عنایت نامہ جناب ممدوحی بمن رسانید ... نوازشنامۂ جناب (...) قبلہ مرقومۂ بیست و نہم جنوری کتابتی بود کہ ملفوف مکتوب لالہ کالجی مل سمت ترسیل یافتہ بود ، بندہ خود در تفقد نامہ ازیں عبارت کہ (...) عرضداشت از جانب تو رسید ، یکی را جواب پیش ازیں فرستادہ ام ، حیرتی برداشتہ بودم کہ کدام پاسخ بمن رسیدہ ، اکنون پردہ از روی کار افتاد کہ ایں ہماں عنایت نامۂ موعود است "- بہر حال یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب دورے سے پھر واپس آ گئے ہیں - " ناکامی روزگار گذشتہ " کی تلافی کی اور ان کے پاس گیا ، اس وقت انھیں کے یہاں ہوں اور یہ عرضداشت آپ کے پاس بالذا بھیجنے کے لیے انھیں حوالے کی ہے- نواب علی اکبر خان کے یہاں شادی میں شرکت کے لیے گیا تو آپ کا پیام ان تک پہنچاؤں گا- محمد اسد اللہ ، ۴ فروری چہار شنبہ -

[۱۵]

قبلہ گاہا ، روز ورود کلکتہ سے اس کا خوگر ہوں کہ مہینے میں دو بار آپ کا

خط آئے، لیکن اس بار دو مہینوں سے خط نہیں ملا۔ صحت کا کیا حال ہے، اور معاملہ اجارہ دیہات سرکار کی کیا کیفیت ہے؟ دہلی سے خط آیا ہے کہ کواغذ مرسلہ پہنچے، کارفرمائی (...) ہنوز وکالت سے قوت سے فعل میں نہ آئی تھی کہ داور دورے پر چلے گئے، ان کا انتظار ہے۔ یہ مجھ پر مجہول ہے کہ وہ جب تھے تو کارروائی کیوں نہ ہوئی۔ پانچ ماہ سے صاحب سکرتر کے سلام کو نہ گیا تھا لیکن "یوم عید یوم الاکبر" آیا تو ناچار جانا پڑا (...) شکایت کی اور وعدہ لیا کہ بعد ہفتہ عشرہ ان کی خدمت میں پہنچا کروں۔ میں خدا سے چاہتا تھا (...) اور نہ جانا شرم ناواقفیت حال مقدمہ کی وجہ سے تھا۔ مقدمے کے متعلق گفتگو ہوئی۔ "انداز و ادا" سے معلوم ہوتا ہے کہ " اہالی کونسل (...) فائدہ سرکار کہ درضمن مشاہرہ پنجاہ سوار کہ بحساب هزار روپیہ ماہوار وجہ بیست و چہار سال بہ سہ لک روپیہ میرسد، ....
.... امید تو ہے کہ کامیابی ہو۔ منشی ولایت حسن صاحب دورے پر گئے ہیں۔ جان بیلی صاحب "اعظم و ارفع صاحبان کونسل" ہیں اور زمانہ سابق میں گورنر بھی رہ چکے ہیں، برہما گئے ہیں، اور ہنٹنگ صاحب گورنر شکار کے لیے یورپ گئے ہیں، خبر ہے کہ دو ہفتوں میں واپس ہوں گے، ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ مولوی عبدالکریم میر منشی دفتر خانہ فارسی آٹھ ماہ کی رخصت پر بعبور دریا عازم لکھنؤ ہوئے ہیں، اور عظیم آباد تک پہنچ چکے ہوں گے۔ " از نوادر حالات آنکہ سخن فہمان و نکتہ رسان این دیار پس از ورود این خاکسار بزم سخن ترتیب دادہ بودندکہ در ہر ماہ شمسی، انگریزی بہ یکشنبہ نخستین سخن گویان و سخن فہمان در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندی، و غزلہا خواندندی و شنیدندی۔ ناگاہ سفری کہ از طرف پادشاہ ہرات حرسہا اللہ تعالیٰ عن الآفات رسیدہ است، در آں انجمن حاضر گردید، اشعار پارسی گویان این گرامی ...... شنید، مرا بآنک بلند ستود، و گفت قدر ایں کلام را در ہندوستان کہ خواہد دانست؟ آنچہ تو میگوئی درخور آنست کہ فصحائے ایران ایں را بشنوند، و حظ بردارند۔ دیگر رو بجماعت کردہ گفت یاران ایں شخص درمیانہ شما مغتنم است، و قطع نظر از شعر و شاعری عالم زبان پارسیست۔ چوں طبائع بالذات مفتون خود نماییست، حسد بردند و کلانان انجمن و گرانمایگان (...) اعتراض نادرست برآوردہ آں را بنام بعضی از سفہا شہرت دادند، جوابہا یافتند، و پس بزانوای خاموشی نشستند (...) دام اقبالہ دریں داوری بامن ہمزبان بود، و شوریدگان را بحسن ادا فرونشاندہ چنانچہ فقیر

(...) عرض عجز و انکسار خویش رقم کردہ است ، و باوجود اظہار ایاز جوابہای اعتراض نیز موزوں ساختہ (...) غالب کہ بقالب طبع تیز ریختہ شود " آیندہ جائے گی ۔ میر کرم علی کے نام کا خط جاتا ہے ۔ محمد اسداللہ ، ۴ رجب ۔

[۱۶]

والا نامے کے جواب میں عبودیت نامہ غرہ ذی الحجہ کو مرسل ہوا ، آج اس ماہ کی آٹھویں ہے ۔ کل مولوی ولایت حسن آئے تھے ۔ بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ " حضور لامع النور نواب معلی القاب نواب ذوالفقار بہادر دام شوکتہ " کا شقہ میری پانچ عرض داشتوں کے جواب میں موصول ہوا ۔

[۱۷]

قطعہ ہنڈوی جو بعد تفتیش شاہ جوگ نکلی ، حوالہ مولوی ولایت حسن ہوئی ، اور دو سو روپے جس میں سے "وجہ ... چہل روزہ" (......) وصول ہوئے ۔ سنیچر ۲۷ شوال کو منشی عاشق علی خان بہادر میرے یہاں آئے ۔ افسوس کہ وہ سفارت سے مستعفی ہو گئے ہیں اور دو ہفتوں سے 'بارگاہ' میں نہیں جاتے ، بطور خود یہاں مقیم ہیں ۔ دوران گفتگو میں بولے کہ منشی محمد حسن دہلی پہنچ گئے ہیں اور اپنے خدمات پر مامور ہیں ۔ ۲۸ شوال کو وکیل کا خط دہلی سے آیا ، اس کے ساتھ نوازش نامہ مہری رسیڈنٹ بنام احقر تھا ۔ اس کی ہو بہو نقل یہ ہے : " خانصاحب مہربان سلامت ۔ بعد شوق ملاقات واضح باد کہ خط آں مہربان در خصوص اظہار مطالبات یا دیگر کاغذات مصحوب پنڈت ہیرا لعل وصول نمودہ مندرجہ چہرہ ایضاح گشود ۔ مہربانا دریں مقدمہ بحضور اہالیان کونسل صدر حسن ترقیم یافت ، بعد ورود جوابش بداں مہربان سمت تسطیر خواہد یافت ، مرقومہ ہفدہم اپریل " ۔ دوشنبے کے دن جو روز بار وکلا ہے ، دفتر خانے گیا ، رسیڈنٹ کا خط دکھایا ، خداوند بارگاہ نے کہا کہ کوابروگ (کذا) صاحب کو یہاں سے ' جواب با صواب ' گیا ہے ۔ ' با صواب ' خود ان کی زبان کا لفظ ہے ۔ یہ بھی بولے کہ رزیڈنٹ کی نظر عنایت آپ پر ہے اور قریب ہے کہ ان کی تحقیقات کی رپوٹ یہاں آئے ۔ کل کہ روز سہ شنبہ اور ۳۰ شوال تھی خطوط لکھتا رہا ، آج آپ کو لکھتا ہوں (...) ۔

[۱۸]

بیکسان پناہا ، دو ماہ سے زیادہ ہوا کہ خط نہیں آیا ، مولوی ولایت

حسن سے ' استشعار ' ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی منتظر خط ہیں - عرضی کونسل میں پیش ہوئی ، ابھی جواب نہیں ملا - " تازہ " یہ کہ مقدمہ صاحبان کونسل نے قبول کیا ، لیکن یہ کہا کہ قاعدے کے مطابق پہلے رسیڈنٹ دھلی کے پاس پیش ہونا چاہیے - میں نے کہا کہ " سر و برگ سفر و تاب و توان معاودت " نہیں ، تو جواب ملا کہ وکیل کے ذریعے سے یہ کام انجام دو - وطن کے ایک دوست سے رجوع کیا ، اس نے " کارفرما " ہونا منظور کیا اور ایک وکیل مقرر کیا ، میں نے مختار نامہ مع دیگر کاغذات دوست کو جو مجھ سے زیادہ مجھ پر مہربان اور مجھ سے زیادہ قاعدہ داں ہے ، بھیج دیا ہے - " تا درمیانہ خواستہ' کرد گار چیست " کامیابی کی امید تو بندھتی ہے - پسر احمد بخش خاں جو ان کا جانشین ہے ، رندانہ زندگی بسر کرتا ہے ، اور اس کی شوریدہ وصفی " حکام و اھل القوم " کے نزدیک ناستودہ ہے ، شہری بھی اس کے اختلاط سے نفور ہیں - ایک امیر کلکتہ کی مہربانی سے ایک صاحب عالیشان نے کولبروک صاحب کے نام تو خط لکھ دیا اور وہ دھلی گیا ، لیکن کوئی آدمی جو التفات حسین خاں منشی کولبروک کو سفارشی خط لکھ سکے ، یہاں نہ ملا - " التفات حسین خاں (......) مولوی عزیز اللہ نام بزرگیست " اگر آپ سے اشنائی ہو تو براہ راست انہیں خط لکھ دیں کہ مقدمہ' اسد اللہ خاں جو بتوسط میرا اہل وکیل دائر ہوا ہے ، " این جانب " کا مقدمہ ہے ، اگر آپ سے واقفیت نہ ہو تو حکیم سلامت علی خاں سے ان کے نام کا خط لے کر دھلی بھیج دیں ، یہاں ہرگز نہ آئے ، اس میں دیر ہوگی - ایک خط بنام مرزا امیر بیگ خاں نواب ذوالفقار بہادر دام اقبالہ ملفوف ہے ، اسے دیکھ لیں اور مکتوب الیہ تک پہنچا دیں - محمد اسداللہ -

[۱۹]

" حضرت قبلہ گاھی ... " والا نامے میں القاب ھیں " قبلہ' مہجوران سلامت " یہ مغز جان کے لیے نشتر ہے اور مدت العمر یاد رہے گا - عرض‌داشت جو اخوی مولوی ولایت حسن کے خط کے ساتھ ملفوف ہے ، میرے سوز سینہ کی پردہ کشا ہوگی - " اگر بفرزندی مہر نمیدارند ، غلامی خربدہ انگارند و خواھی نخواھی بتلافی ' قبلہ'مہجوران سلامت ' القابی کہ دست آویز نازش این ننگ آفرینش تواند بود رقم فرمایند " :

گر تو مرا نخواھی من خویش را بسوزم
جائے کہ آب نبود روزی کے باد باشد

" لختے بنیروی ازو پارہ بسعی نظر ، رپورٹ ارماندہ دھلی با ضمیمہ حکم ... " حاصل ہو گئی ہے اور اس خط کے ساتھ ملفوف ہے ۔ مکتوب وکیل ابھی دھلی سے نہیں آیا (...) لیکن مضمون صفحہ راز سے خبر ملتی ہے کہ " درنگ مکتوب وکیل مبشر است بہ تندر (؟) ہفتہ گذشتہ (...)۔

۴۷ء روپوں کی ہنڈوی اکبر آباد سے آئی ، روپے وصول ہوئے اور جواب اکبر آباد (...) ، ابھی تک آپ کے عطیے میں سے کچھ باقی ہے ، اور قبل " خرامش کاروان کونسل " کامیابی کا اُمیدوار ہوں ۔ خاطر جمع رہے کہ اب ایسا اضطرار نہیں کہ اھالی بزم نواب کے آگے بگدائی ہاتھ پھیلاؤں ۔ امید ہے کہ اس جماعت سے اس معاملے میں گفتگو نہ کریں مگر اسے اس راز کا محرم بھی نہ بنائیں ۔ منشی عاشق علی خان یکم ذی‌الحجہ کو براہ دریا کلکتہ سے روانہ ہوئے ۔ جہت سفر مجھے معلوم نہیں ۔ حکیم ظفر علی خان جو اشراف فیض آباد سے ہیں ، ان کی جگہ عہدہ سفارت پر لکھنؤ سے آئے ہیں ۔ مولوی عبد الکریم رخصت ہشت ماہ پر لکھنؤ گئے تھے ، واپس آ رہے ہیں اور عظیم آباد تک پہنچ چکے ہیں ۔ غالباً اس مہینے کے آخر تک یہاں آجائیں گے ۔ منشی محمد حسن دھلی پہنچ کر اپنے عہدے پر قائم ہیں ۔ نواب علی اکبر خان بہادر کشا کش حکام سے فارغ ہیں اور " اغاب واکثر " آم بھیجتے رہتے ہیں ۔ اسد اللہ

[۲۰]

عنایت نامہ ملا ، حسب الارشاد مزار کثیرالانوار جناب اقضی القضات پر جانا ہوا ، مکتوب اسمی میر کرم علی سے معلوم ہوا ہوگا ۔ خط لکھنے میں دیر تساہل سے نہ تھی ، چاھتا تھا کہ کوئی قابل تحریر امر ہو تو لکھوں ۔ گرامی نامے کے وصول ہونے کے بعد عرض داشت جناب بیگم صاحبہ و قبلہ (...) "۔

ایک دوست نے راھنمائی کی اور دولت سرائے مخدومی مرحومی میں اپنالی گیا ۔ پہلے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا ۔ " بیا د عہد (..) و لختی بر بیکسی خویشتن گریستم " عریضے کو حرم سرا میں بھجوایا ۔ مولوی غلام علی مجھے حرم سرا میں لے گئے اور بیگم صاحبہ نے بے توسط پردے کے پیچھے سے بات کی ۔ آپ کا حال پوچھا ، میری کیفیت دریافت کی ، اور یہ کہا کہ میرے

بھانجے مولوی ولایت حسن موجود نہیں ، وہ آئیں گے تو آپ کے پاس جائیں گے
اور اس گھر میں آپ کے ٹھہرانے کا انتظام ہوگا۔ بازار سملا شہر اور بارگاہ حکام سے
دور ہے ۔ اس کے بعد جناب ، مخدومہ ممدوحہ کے در دولت پر حاضر نہیں ہوا ، اور
میر ولایت حسن ابھی تک دورے سے واپس نہیں ہوئے ۔ ایک '' معتمد ''
صبح کو کہتا تھا کہ آج آئیں ۔ گے آج سہ شنبہ ۱۲ شوال ہے ۔ میں کاغذات
کی نقل کی فکر میں رہا ، یہ دشوار نظر آیا تو اس سے در گزرا اور ان کواغذ
کو خصوصاً اور دفتر سرکار کو عموماً مقدمے میں بطور ثبوت قرار دیا ۔ ایک
عرض داشت مشتمل بر ماجرائے بیست سالہ لکھی ، دو شنبہ ۱۳ تاریخ کو روز
دربار ہے اور مجموع سفرا و وکلا و اہل بار اس دن فریزر صاحب سے ملتے ہیں ۔
ان کے پاس پہنچا ۔ یہ ایک صاحب عالیشان ہیں اور اس درگاہ کے '' بواب ''
بلکہ بمنزلہ' باب ہیں ۔ وہ کل اہل حاجات اور صاحبان کونسل کے درمیان
واسطہ ہیں ۔ عرائض پہلے انھیں کے پاس پہنچتے ہیں ، اور وہ ان کا انگریزی
ترجمہ صاحبان کونسل کو پیش کرتے ہیں ۔ میں مع عرض داشت موسومہ'
نواب گورنر بعد اطلاع ان کے پاس پہنچا ۔ اٹھے اور معانقہ کیا ۔ میں نے
مجملاً حال بیان کیا ، نصراللہ بیگ خان ، میرے چچا کا نام سنا تو بولے کہ
میں انھیں جانتا ہوں ، آپ ان کے کون ہیں ؟ میں نے جواب دیا کہ ان کا
حقیقی بھتیجا ہوں ۔ عرضی گریبان قبا سے نکال کر پیش کی ، رزیڈنٹ کی خدمت میں
عدم ارجاع کا عذر قبول ہوا ۔ فریزر صاحب کو اختیار ہے کہ اگر کسی مقدمے
کو کونسل کے قابل نہ سمجھیں ، خود جواب دیں ۔ وقت رخصت عطر و پان
اپنے ہاتھ سے دیا اور تمام قد کرسی سے اٹھ کر میرا سلام لیا ۔ ان امور کے
وقوع کو احیائے اموات سمجھتا ہوں ، جو ہوا ہرگز گمان میں نہ تھا ۔ (...)
میرزا یوسف دیوانہ' سرشار تھے ، سراپا برہنہ رہتے اور ماں کو ماں نہ کہتے (...)
۲۷ رمضان کو ان کا خط ملا ، القاب و آداب ہوش مندوں کی طرح لکھتے ہیں ۔
خوشی سے زار زار رونے لگا ۔ اس کے بعد '' خط خانگی '' دیکھا تو لکھا تھا
آپ کے جانے کے بعد ہم سب ڈرتے رہتے تھے ۔ اور دن رات ان کے نالہ و
فریاد اور زدو کشت سے بری طرح گزرتے تھے ۔ ایک سرکار شاہی کا فیل بان
ایک خادمہ' محل کے ذریعے بہم پہنچا ، وہ کہتا ہے کہ میرزا پر جادو ہوا
ہے ۔ اس کے کہنے سے شہر کے باہر ایک درخت کی جڑ کھو دی گئی اور
ایک کنواں ڈھونڈا گیا ، اس نے جو کچھ بتایا تھا ، وہاں ملا ۔ اس کے

معالجے سے انھیں قدرے افاقہ ہے ، چنانچہ کپڑے پہنتے ہیں ، ستر عورت کو چھپاتے ہیں ، بول و براز سے احتراز کرتے ہیں ، کھانا دسترخوان پر کھاتے ہیں ، اور زن و دختر و مادر کو زن و دختر و مادر سمجھنے لگے ہیں ۔ " باللہ صحت او را گرامی تر از زندہ گشتن پدر مردہ دانستہ ام "۔ امید ہے کہ آپ اسے اپنا فرزند سمجھ کر مسرور ہوں گے ۔ میر کرم علی صاحب کو بھی اس کی اطلاع ہو ۔

گر کسے شکر حق فزوں گوید
شکر توفیق شکر چوں گوید

[۲۲]

۲۹ ذیقعدہ روز جمعہ تھا کہ ربوبیت نامہ وارد ہوا ، دل بہت پریشان تھا اور میں آپ کی کرامت پر ایمان لایا ۔ ۲۰ رمضان کی دوپہر تھی کہ آپ کا پہلا خط لے کر ایک دوست کی رہنمائی میں فاتحہ خوانی کے بعد ، بیگم صاحب کے یہاں پہنچا ۔ کچھ لوگ جو اس در دولت کے متوسل تھے ، مجھ سے پرس و جو کرنے لگے ، ہر چند میں نے کہا کہ اس سفر میں مولوی محمد علی خان صاحب سے پہلے پہل ملا ہوں ، مگر قبول نہ کرتے تھے ، اور مجھے آپ کا رشتہ دار سمجھ کر اندیشہ کرتے تھے کہ میں خصومت کے لیے آیا ہوں ۔ بعد کو مولوی غلام علی برادر زادہ ' بیگم صاحبہ آئے (...) " ہر چہ گفتند یکی از آن مفہوم کتب (کذا) و تردد در ارسال آن بود بنوعی کہ ما میخواستیم بفرستیم ، و برندہ بہم نمی رسد " ۔ میں نے جواباً کہا کہ یہ خط کلک مشکیں رقم کی تراوش ہے ، مجھے زحمت کیا ہے ، اگر حصول کتب کا طریقہ بتایا جائے تو میں انھیں اپنے پاس رکھ لوں گا ، اور وقت معاودت حوالے کردوں گا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتابیں " یکایک " نہ دیں گے ۔ مولوی ولایت حسن اوائل شعبان میں دورے سے واپس ہوئے ، آپ کا خط بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچاؤں گا ، اور جو بات پہلے کہی تھی ، پھر کہوں گا ۔ علی اکبر خان ہگلی میں ہیں ، تین بار وہاں گیا ہوں ، اور وہ بھی ایک بار جب کلکتہ آئے تھے تو میرے یہاں تشریف لائے تھے ۔ کافر ہوں ۔ اگر دھلی سے کلکتہ تک ایک ، " معمر امیر " اس " لطافت طبع ، نزاکت ادا ، حسن بیان ، فہم درست اور مشرب صاف " کے ساتھ دیکھا ہو ۔ یہ " مہذب " بھی ہیں اور " مہذِب " بھی ، مگر مولوی محمد علی خان کہاں کہ میرے سے شخص کے

کام آتی ۔ آب و ہوائے کلکتہ مجھے سازگار ہے ، شدت گرما میں ناریل کا تازہ پانی " باضافہ قند و نبات " مفید ثابت ہوا۔ آج کل برسات کا موسم ہے ، میں نے اس کا استعمال ترک کردیا ہے ۔ عوارض بدنی کی شکایت نہیں ، بلکہ یہاں دھلی سے بہتر ہوں ۔ افضل بیگ " از یاران و معاشران و ہم صحبتان راقم " یہاں وکیل اکبر شاہ ہیں ، ان کی اور منشی عبدالکریم کی دوستی ہے ، بلکہ دونوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں ۔ افضل بیگ خواجہ حاجی کے سالے ہیں ، اور یہ وہ شخص ہے جسے احمد بخش خان نے میرے چچا کا رشتہ دار بتا کر سہرا شریک قرار دیا تھا ، اور میرے مقدمے میں ایک درخواست یہ بھی ہے کہ اس کی شرکت غلط ہے۔ افضل بیگ مجھے مجمع اھل تسنن میں رفض و غلو اور امامیہ میں الحاد و زندقہ (......) لیکن اس سے میرا کچھ نقصان نہیں ہوا ۔ " وقت ملاقات فریزر صاحب چہ رنگ‌بنیہا از مولوی عبدالکریم سر زدہ بود ، اما اعجاز علی ابن ابیطالب را نازم کہ فریزر صاحب با من در ملاقات و مشایعت بجا آورد ، و معانقہ و عطر و پان را کہ اعم و اضعف ازانست کہ می پرسد"۔ پہلی ہی صحبت میں عرضداشت لی گئی ، اور مطابق قاعدہ حوالۂ پائن صاحب ہوئی ۔ ان کا کام فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرنا ہے ، فریزر صاحب ترجمے کا اصل سے مقابلہ کر کے کونسل میں پیش کرتے ہیں ۔ گذشتہ دو شنبے کو میں ان سے ملنے گیا تو ادائے تعظیم و پرسش مزاج کے بعد انھوں نے ترجمہ دکھا کر کہا کہ مقابلہ کر چکا ہوں ، اور اب یہ صاحبان کونسل کے پاس پہنچے گا ۔ تمھارا حق سرکار پر ثابت ہے ، اور اھالی سرکار کو حق دار کا حق دلانے میں عار نہیں ۔ کونسل میں عرائض کی پیشی کے لیے پنجشنبہ اور جمعہ مقرر ہے ، آج جمعہ ہے ، شاید عرضداشت کونسل میں پیش ہو چکی ہو ۔ اندرو استرلنگ صاحب " قوس عروجی کونسل " کے لیے " نقطۂ ھدایت " اور "قوس نزولی" کے لیے " نقطۂ نہایت " ہیں ۔ سنا ہے کہ سرمایۂ علم و آگہی رکھتے ہیں ، سخن فہم ہیں اور لطف سخن تک پہنچتے ہیں ۔ میں نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس میں کچھ اپنا حال بھی نظم کیا تھا ، بغیر کسی دوسرے شخص کی سعی کے ان کی ملاقات "بردلش گزیدہ" میسر آئی ۔ " اعتبار خاکساریہا افزود ، وامید کامیابی (......) " قصیدہ پیش کیا ، اور اس کا کچھ حصہ سنایا ، محظوظ ہوئے اور دلجوئی کی ۔ " وعدہ ھا داد و کاغذ ھائے مقدمہ مرا (...) " اس کے بعد پھر ملنا نہیں ہوا ۔ فریزر صاحب ان کے

پیشکار و پیشدمت ہیں ۔ کچھ مقدمے رجوع کونسل کے ایسے جمع ہو جاتے ہیں تو " فریزر صاحب (......) داد خواہان ہوی عرضہ میدارند و او بآن مدعیان فراخور اندازہ و مقدار ہر یک ملاقات میکند" قابل سماعت اور ناقابل سماعت مقدموں کو جدا کرتے ہیں ۔ اس وقت " نوید پر نوید " ہے ۔ افضل بیگ نے ایک بات اور کی ، شعرا میں شہرت دی کہ غالب ، قتیل کو ناسزا کہتا ہے ، اور شعرائے کلکتہ کو نظر میں نہیں لاتا ۔ " ہمہ را بر من بشورانید ، و خلقی را با من معارض گردانید"۔ مولوی عبدالکریم کے ایک رشتہ دار نے خاص طور پر میری تذلیل و تحریب کی غرض سے " انجمن بنا نہادہ و مشاعرہ قرار داد" ۔ شعرائے ریختہ کو مصرع ریختہ ، شعرائے فارسی کو مصرع فارسی ، اور مجھے دونوں بھیجے ۔ یکشنبہ گذشتہ ۸ جون کو میں بھی گیا ، اور دونوں زبانوں کی طرحی غزلیں پڑھیں ، خاص و عام متلذذ ہوئے۔ اور منصفین کے ایک گروہ نے کہا کہ " ہرکرا این مایہ فصاحت ، قتیل چہ بلاست ؟ بل اگر بر گذشتگان دگر چون اسیر و بیدل و امثال اینہا ناز کند ، میرسدش و می زیبدش" خدا کا شکر کہ جس ہنگامے کی غرض میری رسوائی تھی ، وہی باعث شہرت و اظہار کمال ہوگیا ۔ آب و ہوائے کلکتہ سے خشنود ہوں ، اگر مقدمے کا آغاز اچھا نہ ہوتا تو آج میں حیدرآباد یا ایران میں ہوتا ، ہرگز یہاں نہ رہتا ، اسپ و متاع بیچ کر قلندرانہ آوارگی اختیار کرتا ۔ اُمید نے یہاں اقامت کی قوت بخشی ۔ " مخفی نخواہد بود کہ فقیر بچہ بے سروسامانی از وطن (......) خانہ را پاک رفتہ ، و ترک وطن و اھل وطن گفتہ ، چو در بالدا رسیدم دو ہزار روپیہ از نواب (......) خرابی دادہ ۔ ما خود اندیشیدم کہ غالب این ہمہ غنیمت است ۔ کروبرد (کذا) اگر مقدمہ بہ کلکتہ نخواھد شد (......) رخت قلندری بر خواھی کرد و سرتاسر آفاق خواھی گردید ' (......) یک ماہ بودہ پارہ از بایستنیہای زمستان گرد آوردم و ...... کلکتہ رسیدم روز ورود (......) شش صد بود ، شعبان و رمضان و شوال و ذیقعدہ گذشت ، اینک ذی‌الحجہ رسیدہ است (......) از فلک نرہزد تا دو ماہ دیگر از فکر روزی فارغم ۔ توقع موھومی بدستگیر بہای نواب داشتم ، اما (......) چہ ہرگاہ نامہ بجناب فرستادہ ام ، اول مکتوبی بخدمت نواب و دیگر اخوان و احباب خط جدا (......) اگر بخدمتٗ پنج عریضہ رسیدہ اند ، در آن انجمن نیز پنج عریضہ رسیدہ اند ، اما صدای بر نخاستہ "۔ حتیٰ کہ میر کرم علی نے " اتنی کوچک دلی و گرم خولی " کے باوجود

جواب نہ دیا ۔ خیال تھا کہ ہزار روپے اور قرض مانگوں ، لیکن امید کا وجود موہوم ہوگیا ۔ ذرا آپ تنہائی میں میر کرم علی سے دریافت تو کریں کہ نواب اور ان کے مقرب میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ھیں ۔ مقدمے کا حال ان سے پنہاں نہیں ، کوہ و کاہ کا مقابلہ ہے ۔ اگر نواب کی مدد رہی تو ''دود از نہاد احمد بخش خان و ہوا خواہانش برمیآرم ۔ ہرگز لطفی نکرد و لانعمی نگفت '' ۔ آپ تحقیق کر کے ان لوگوں کی خاموشی کی وجہ لکھیں ۔ ''فرصت دو ماہ آن قدرھا نیست ، ناچار ہم ازینجا ویرانۂ خود را بکاوم ...... ہرچند دو ماہ را روزان و شبان بسیار است ، اہل توکل (...) اگر ہمہ در وعدۂ قتل یک شب درمیان باشد نمیترسند ، اما بشریت اقتضای ذاتی دارد کہ آدمی را گاہ در تصور ماضی افگندد و صور مستقبلہ را بر ضمیرش ارتسام میدھد ورنہ درحقیقت ماضی و مستقبل جز حال نیست ، و حال خود نقطہ ایست موہوم کہ از گردش فلک فرض کردہ اند و ہمچناں گردش افلاک نیز کیفیت از عالم وہم و خیال ، لا موجود فی‌الوجود (...) و از موثر فی‌الوجود الا اللہ '' ۔

[۲۳]

تین ہفتے گزرے کہ پنج شنبے کے دن مولوی ولایت حسن آئے اور بولے کہ بر سر راہ ہوں اور دورے پر جا رہا ہوں (...) جسر جاوں گا ۔ دروازے تک مشایعت کی اور خدا کے سپرد کیا ۔ وقت رخصت کہنے لگے کہ میر صفات علی خان (...) میرے دوست (...) '' جانشین و وکیل '' ہیں ، خط بھیجنے کا طریقہ وہ بتائیں گے ۔ آپ کو خط کا انتظار تھا ، ان کے پاس آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ کل باندا سے خط آیا تھا ، جسر بھیجا گیا ، میرے نام کا خط اس کے ساتھ ملفوف ہوگا ۔ آج سہ شنبہ ۱۷ جمادی الاولی ہے ، میر صفات علی خان کا آدمی آیا اور مولوی ولایت حسن کا خط لایا ، کھولا تو آپ کا خط نکلا ۔ ''پیش نگشتن مقدمہ در دھلی بتازگی دل را شورش‌کدہ ساخت''۔ '' ارباب اوہمۂ کونسل '' نے دھلی جانے کا حکم دیا تو میں نے مسٹر اندرو اسٹرلنگ سے فریاد کی ۔ جواب ملا کہ نہ جانا ہو تو نہ جاؤ، مقدمہ وہاں بھیج دو ۔ مجھے تامل ہوا تو بولے کہ کیا سوچتے ہو ، مقدمہ قابل سماعت ہے ، کوئی وجہ نہیں کہ رزیڈنٹ نہ توجہ کریں ۔ اس سے دل کو اطمینان ہوا ۔ گھر آیا تو یہ فکر ہوئی کہ کسے یہ کام سپرد کروں ۔ دشمن '' جاہ مند ''

ہے ، کہیں وہ شخص اس سے نہ مل جائے ۔ آخر مولوی فضل حق ابن مولوی فضل امام کی طرف دھیان گیا جو منشی برکت علی خان مرحوم کے اقربا سے ہیں اور آج کل "سررشتہ دار دیوانی و فوجداری ضلع خاص دہلی" ہیں ۔ خدا انہیں زندہ رکھے اور پایہ ہائے بلند کو پہنچائے ۔ میں نے انہیں لکھا کہ وہ اس کام کو اپنے ذمے لیں اور وکیل مقرر کر کے مطلع کریں ۔ " بالجملہ من کواغذ مقدمہ با عرضی دستخطی کونسل و خط صاحب سکرتر کونسل کہ محتوی ایمای شمول رزیڈنٹ در مبادی مقدمہ بود برائے استواری بنائے مقدمہ و چٹھی صاحب عالیشانے بنام کولبروک صاحب و خط مخدومی نواب علی اکبر خان بہادر موسومہ منشی التفات حسین خان ، این مجموع کاغذ پارہ ہا را در ورقی نوردیدہ خود بڈاک کدہ رفتم و صاحب ڈاک و اہالی ڈاک را بر جمیع آن کواغذ گواہ گرفتہ و سرنامہ را در حضور آنان بلک فروبستہ ، چون وزن آن لفافہ گرفتہ شد بدہ روپیہ برآمد ، محصول ڈاک انگریزی برائے روانگی دہلی یک روپیہ سنک (کذا) ییک روپیہ میر سد ، دہ روپیہ محصول ڈاک سرہسر گزاردہ ، و رسید ڈاک گرفتہ باخود آوردم"۔ یہ سہ شنبہ ۲۴ صفر کی بات ہے ، مولوی فضل حق کا خط آیا ، مضمون یہ کہ مختار نامۂ مہری بے دستخط رجسٹری نہ بھیجا جائے ، اور جو مختار نامہ گیا تھا ، وہ رجسٹری کا طراز نہ رکھتا تھا ، فوراً اسٹامپ لیا ، مختار نامہ لکھا اور رجسٹری کراکے روانہ کیا ۔ "چنانکہ سہ روز وانکی (کذا) این قطعہ چہارم ربیع الاول روز دو شنبہ است تا امروز کہ ہفدہم یا ہیزدہم جمادی الاول است (...) نہ خبری ازان نامہ و اثری ازان ہنگامہ پدیدنیست " ۔ چارہ گر کا یہ حال ہے ۔ بھائی دیوانہ ، تین پردہ نشین خواتین ، ان میں سے ایک کا شوہر نہیں ، دوسری کا شوہر ہے ، مگر وہ سالا ہے خواجہ حاجی کا ۔ "ہر آیینہ از وی وحشتی دارم (...) بفتوای خرد (...) نہ بدستوری وہم "۔ تیسری کا شوہر سادات دہلی سے ہے ۔ ہر دانشمند (...) اقرار کرے گا کہ یہ شخص اہل جنت سے ہے ۔

آدم از خاک و سید از نور است
آدمیت ز سیداں دور است

اس میں صلاحیت نہیں ، اسے اس پر مامور کیا ہے کہ اخبار مقدمہ سے آگاہ کرتا رہے اور اکثر مولوی فضل حق کے پاس جاتا رہے ، لیکن اس کے جد امجد کے قربان کہ تین ماہ میں صرف ایک خط اس کا آیا ہے ، اور اس میں بھی کسی بات کی نوید نہیں ۔ انگریزی ڈاک کا خط تلف نہیں ہوتا ، خاص

طور پر جب صاحب ڈاک کی مہر ہو - سخت پریشان ہوں ، " منعم " کے پاس بھی نہیں جاتا ، وجہ یہ کہ وہ مقدمے کا حال دریافت کریں تو میں کچھ نہ کہہ سکوں گا - ' کارفرما ' کے متعلق کچھ شک نہیں ، ان کے تغافل کا البتہ شکوہ ہے - جانتا ہوں کہ وہ اس خیال میں ہوں گے کہ مقدمے کا آغاز ہولے تو خط لکھوں - " و خط منشی محمد حسن ...... لامحالہ تاریخی یک ماہ پیش از امروز خواھد بود ، اگر بعد تحریر این قطعہ مقدمہ در پیش گردانده باشد عجب نیست " -

[۲۴]

خط بتوسط اخوی مولوی ولایت حسن ملا - ھنڈوی لے کر خود بازار گیا ، بالآخر اسے مولوی ولایت حسن کے سپرد کیا ، اور جیسا کہ عریضہ سابق میں ہے ، روپے وصول ہوئے - " سخن اینست کہ مرا (...) گرانمایگی چہار صد [صد کے اوپر ہزار مرقوم] روپیہ در نظر است ... چہ من ناظر آن کیفیت و جدائیم کہ سراپائے دل را فرو گرفتہ و منشا (...) با آنکہ حق (...) خدمتی ندارم ، سیما در عالمی کہ خود بہ پیچ و تاب خسارہ اجارہ و رنج و تعب و مطالبہ عوام پراگندہ خاطر خواھند بود ... منت پرست طالع آوارگی ھائے خویشم کہ مرا در عرض این سفر منعمی و خداوندی دست بہم دادہ کہ مکرمت ھائے او جز رحمت ایزدی مشبہ بہ ندارد ھم ازینجاست کہ فارغ از تب و تاب ادای سہامم ... مرا در مدت العمر خویشتن دو جا اتفاق نازش پدر خواندگی افتادہ است ، یکی با میر پیر علی خان مغفور و دیگر با حضور مکرمت ظہور ، حقا کہ ھر دوجا آثار عطوفت پدری باستیفا معاینہ کردم ، جناب مغفور نیز پس از روزی چند شیوہ تحریر گردانده و در القاب سہیم و انباز اخوی مخدومی میر وارث علی خان ساختہ بودند ، ایدون از جناب چشم دارم کہ بدین القاب یاد نشدہ باشم و بخطابی کہ برائے مولوی ولایت حسن و دیگر عزیزان موضوعست سرفراز گردم .....

خرسندی غالب نبود زین ھمہ گفتن
یک بار بفرمای کہ اے ھیچ کس ما

حالت استغنائے برادران ... (...) التفات نواب صاحب بحال این آوارہ رنج و محن آشکار شد ... فرستادہ دھلی کہ در مکتوب اسمی من اشارہ باطلاع

ثانی صدر (...) کہ مقدمہ مرادر نظرش استواری پدید آمد ، و کواغذ عہد جرنیل لیک صاحب آنچہ در دفتر ریسیڈنٹی (...) صدر طلبید ، و اجازت تحقیقات این مقدمہ بتجدید از صاحبان کونسل گرفت چنانکہ نواب گورنر بہادر (..) کونسل فرمان تحقیق و تشخیص وجوہ تظلم سائل باضافۂ لفظی کہ آن ترجمہ آن معنی زود و شتاب بر میخیزد (...) و کواغذ عہد جرنیل صاحب فرستادند و این معنی مرا بہ تگ و دو بسیار معلوم گشتہ چنانکہ نقل رپورٹ فرماندہ دہلی یا حکمی کہ ازینجا صادر گشتہ بجنسہٖ "ہ" بکف آوردہ ام و ... مسٹر انڈرو اسٹرلنگ بہادر ہر آنچہ گفتند ھو بہو بودہ نست (کذا) بلکہ از انداز بیان خدیو حق پژوہ چنان می تراوید کہ گویا زمان رسیدن رپورٹ ثانوی نیز قریبست"۔ حقیقت جو معلوم ہوئی یہ ہے " بعد رحلت عم مرحوم بیست ہزار روپیہ سالانہ در وجہ پرورش باز ماندگان و نوکری سوارانش بر احمد بخش خان ... گردیدہ ... بالجملہ دو ہزار روپیہ سالانہ در وجہ تنخواہ پنجاہ سوار است ، و دہ ہزار روپیہ سالانہ کفاف ...... میراث خوار" ۔ ۳۰ ہزار رپے جو میں سمجھتا تھا ، غلط نکلا ۔ انداز و ادا سے معلوم ہوتا ہے کہ حکام کو زر نوکری سواران کی طرف التفات نہیں اور میرا اس میں گھاٹا نہیں ، میں خود اس سے باز آچکا ہوں ۔ " گویا اہالی سرکار سواران منظور دارند خواہی از احمد بخش خان و خواہی از نصراللہ بیگ خان ، اما این دہ ہزار روپیہ نقد است در مستقبل و مطابق قوانین سرکار وصول باقیات سنین ماضیہ نیز بدیہیست" ۔ تحقیقات اب دو باتوں کی ہو گی ، ایک میری اور میرے 'شرکا' کی ' بازیافت ' جاگیر احمد بخش خان سے میں نے جو کچھ پایا ہے وہی بتایا ہے ، اور مدعا علیہ بھی اس کے خلاف نہیں کہہ سکتا ۔ دوسری خواجہ حاجی کا معاملہ ، دیکھیے اس باب میں رزیڈنٹ کی کیا رائے ہوتی ہے ۔(...)"بخواجہ حاجی و پسرانش رسیدہ اگر در وجہ پرورش مجرا نخواہد شد ہفت ہزار روپیہ سالانہ (...) تا امروز میباید ، و بالفرض اگر برعایت تحریر سرکار گو ہمہ خلاف نمائی احمد بخش خان (...) نیز محسوب گشت ، پنج ہزار روپیہ سالانہ من ابتدائے سنہ ۱۸۰۶ ء لغایت سنہ ۱۸۲۱ ء بذمۂ خصم واجب (...) " امید تو ہے کہ کامیابی ہو ۔ میر کرم علی کے خط کا جواب نہیں آتا " استخبار روپیہ آن بظہور آمد جواب یا سکوت منافاتی ندارد"۔ آیندہ خط مولوی ولایت حسن کے توسط سے نہیں، اس پتے سے بھیجیں : محلہ بازار گول تالاب حویلی میر احمد ۔ مولوی ولایت حسن آج کل یہاں نہیں ہیں ۔ دو تین دن میں "عدم آباد" دہلی سے اگر کوئی خبر آئی تو

دن پھر خط لکھوں گا ، اور اس کے ساتھ میر کرم علی کے نام کا بھی
ہو گا ۔ جواب نوازشنامہ اس کے ورود کے دن ہی جا رہا ہے ۔ سہ شنبہ ۱۷
۱۸ جمادی الاولیٰ ۔

[۲۰]

”قبلہ خواہم یا پیمبر یا خدا یا کعبہ ات اصطلاح شوق بسیار است و من
اله ام “ ۔ ’ربوبیت‌نامہ‘ ملا ۔ اپنا ایک شعر نذر ہے ”خرسندی“ غالب الخ“ ۔
اسمی مولوی ولایت حسن ان کی ” خدمت رفعات درجت “ میں پہنچا دیا
۔ نواب علی اکبر خاں کے نام کا خط ، وہ آئیں گے تو انہیں دوں گا ۔ ان کا
آیا تھا کہ بعد عشرہ محرم کلکتہ آؤں گا اور تم سے ملوں گا ، آج ۸ محرم
۔ مخدوم واجب‌التعظیم مولوی عبدالکریم واپس آگئے ، مولوی ولایت حسن
تے تھے کہ بعد عشرہ دورے پر جاؤں گا ۔ ” ظاهرا شیوع فتنہ“ قوانین
یدہ هنوز فرصتی میخواهد ۔ صدر نشینی که هنوز فرمالرواست ندالم که چه
د سر دارد و چها میکند ۔ شنیده میشود که هم انجمنان وی از گریزپهائے
، ستوهند و در مخالفتش با یکدیگر گروه ... گویند اهل سعایت با ارباب
ت بکونسل رسانیدند که فرماندهان اطراف بطریق نذر ره آورد ارمغان که از
ام رشوت است هزارها و صد هزارها ... میستانند فرمان ... فرستاده آمد که رسم
و پیشکش باطل و ارمغان و ره آوردگو همه سبدی از فواکهه و طبقی از نبات
د موقوف ... بدیں سبب منع رشوت ستانی حکام نتوان کرد ... همت بلندان
قوم ... جز تواضع از خلق نخواستندی ... از تلخی ایں حکم رو در هم کشیده
... و باعتقاد فقیر حق بجانب آنانست ۔ چه این حکم چاره درد رعیت لکرد و
تی بحال حکام رسانید بالجمله چون قهرمان [” فرمان “ چاهیے] رسم
بر افتاد “ ۔ اس بارگاہ کی رسم تھی کہ عیدین اور روز بزرگ کے موقع پر کل
لا اور اهل بار (...) ” دادگر ستر اندرو استرلنگ بہادر نذر پیش
کشیدند اگرچه پذرفته نمیشد اما نغز رسمی و لیکو (...) “ عمل میں نہ
۔ غالب نے رباعی لکھ کر گزرانی ... بہت خوش ہوئے اور بولے
” زهی لذر مخلصان (......) نه منع میتوان کرد و نه معاف “ ۔ رباعی
سرتاسر دهر باغ و بستان تو باد الخ“ ۔ حیرت یہ ہے کہ معاملات تنقیح طلب
ف دو ہیں ، مگر ابھی تک دهلی میں اس مقدمے کی طرف فرمان دہ
لی کو توجہ نہیں ۔ اواسط اپریل میں یہاں سے حکم جا چکا ہے ،
یل کی تحریر اس پر مشعر ہے کہ ۱۰ جون = هفتم ذی‌الحجہ تک کچھ

پرسش نہیں ہوئی ۔ اس کے بعد سے ۸ محرم تک کیا ہوا ، مجھے علم نہیں ۔
تہی دستی سے ایمنی ہے ، اور کلکتہ کی آب وہوا بھی مقابلۃً دہلی سے سازگار تر
ہے ، لیکن " ...... رپورٹ فرمانده دہلی و عیار حکم صدر مقتضی درنگ
نیست " ۔ آپ منشی محمد حسن سے دریافت کریں کہ حکم صدر ، اور نامہ
رسیڈنٹ اسمی غالب کے باوجود اب تک کچھ کیوں نہ ہوا ۔ مدعا یہ کہ اگر
وکیل لاابالی ہے تو اسے متوجہ کیا جائے اور حاکم محابا کرتا ہے تو صدر میں
اس کی شکایت کی جائے ۔ نواب کا خط آیا ہے ، محض شوقیہ ، کوئی مطلب کی
بات نہیں ، اسے جواب ہی سمجھیے ۔ "تاریخ بنائے امام باڑہ در جوار مزار
حضرت اقضی القضات " تاریخ مسجد کہ اسی امام باڑے کے صحن میں ہے ۔
۸ محرم روز شنبہ ۔

[۲۶]

"دریا بوجود خویش موجی دارد حسن پندارد کہ این کشاکش با اوست"۔
۱۰ جون مطابق ۶ ذیحجہ تک باز پرس عمل میں نہ آئی تھی ۔ اس کی وجہ کہ
دشمنوں نے رزیڈنٹ پر تہمتیں لگائی ہیں اور وہ بالفعل امور مرجوعہ کی طرف
متوجہ نہیں ۔ الزام سے بری ہوگئے تو توجہ کریں گے ، ورنہ کوئی دوسرا
شخص ان کی جگہ لے گا ۔ سنیچر یکم اگست کو لارڈ صاحب کا دربار عام
ہوا ، میرا نمبر دسواں ، نواب علی اکبر خان کی بغل میں تھا ۔ اس کے بعد
" نواب معلی القاب " کے " ہندوستان " جانے کی خبر شائع ہوئی ، ستمبر
میں دفتر خانہ براہ دریا جائے گا ، اور آخر اکتوبر میں لارڈ صاحب ڈاک یا دخانی
جہاز سے جائیں گے ۔ دخانی جہاز اس ' فرقے ' کے مخترعات سے ہے ، اورکئی بار
کلکتہ سے الہ آباد تک دو ہفتوں میں پہنچا ہے ۔ خیال آیا کہ اس قافلے سے
قبل روانہ ہونا چاہیے ۔ " داور " سے رخصت ہو چکا ہوں ، اور باندا تک
کے لیے کشتی مل چکی ہے (......) وہاں سے براہ خشکی دہلی جاؤں گا ۔ آج
جمعہ ہے ، کچھ سامان کشتی پر لد چکا ہے ، شنبہ ۱۴ صفر مطابق ۸ اگست
سے لے کر دو شنبے تک کسی دن روانہ ہو جاؤں گا ۔ نواب علی اکبر خان نے
آپ کے خط کا جواب دیا ہے ۔ ' عرصہ دو ماہ ' میں باندا پہنچوں گا ۔ آپ کا خط
میری روانگی کے بعد یہاں آیا تو موافق قاعدہ آپ کے پاس واپس جائے گا ۔ اگر
کوئی خط دہلی یا کلکتے سے میرے یا آپ کے نام کا پہنچے تو بعد ملاحظہ
محفوظ رکھیں ۔ دہلی کا خط اخوی مکرمی مولوی محمد فضل حق کا ہوگا ،

اور کلکتہ کا خط مخدومی مولوی سراج الدین احمد برادر زادہ مولوی عبدالکریم کا ہوگا ۔ یہ " اعیان دفتر خانہ فارسی " میں خود بھی شامل ہیں ۔

[۲۷]

"مربی بے کساں" ۔ " متاعی کہ در بار منت باشد کہ شایستہ قبول دزد نباشد " ۔ نواب صاحب بھی باہر جارہے ہیں اور سمت مخالف ، اس لیے باربردار کا انتظام مشکل ہے ۔ آپ شحنہ شہر کو جو مجھ سے نا آشنا ہے (...) کہوادیں کہ بنارس تک نہ ہو تو الہ آباد تک کے لیے اس کا انتظام کردیں ۔ مشہور ہے کہ پنجشنبے کا سفر مبارک ہے ، اس لیے کل روانگی کا ارادہ ہے ، یہ نہ ہو سکا تو جمعے کے دن ، علی الصباح حاضر ہوں گا اور شرف پابوسی حاصل کر کے رخصت ہوں گا ۔ خطوط آج عنایت ہوں ، تاریخ بداؤنی و رسالہ تصوف واپس ہے ۔ محمد اسداللہ ۔

[۲۸]

"حضرت قبلہ گاہی"۔ کلکتہ کے لیے خط جاتا ہے ،کسی نوکر کو حکم ہو کہ " کدہ ڈاک " تک پہنچادے ، اور " محصول " ادا کردے ۔ غالباً شب کو حاضر ہوں گا ۔

[۲۹]

صبح ہنگامے میں اور نیم روز خامہ فرسائی میں گزرا ، آخر روز " نوید بساط بوس حضرت نواب " ہے ، شب کو دھن الحروع (کذا) نمک آپ کے ساتھ پینے کا ارادہ ہے ۔ زندگی ہے تو کل صبح حاضر ہوں گا ۔ مکتوب موعود جاتا ہے ۔ میرا نوکر " جادہ شناس و قاعدہ دان ڈاک کدہ " نہیں ، خط دیکھ کر ، اپنا نوکر اس کے ساتھ کردیں کہ محصول دے کر رسید حسب دستور لے ۔ اسداللہ ۔

[۳۰]

" اعلیٰ حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبہ کونین مدظلہ العالی " ۔ یکم جمادی الاول جمعے کو باندا پہنچا ، اور اسی دن (......) آپ کا خط ملا ۔ " بے داور ماندن بزم آں داد کدہ (رزیڈنٹی) ... عیانست "۔ " فرانسس ہاکنس بہادر جاھمندی از حکام اربعہ دائر سائر بہ دهلی رسیده ... شکار دوست و بے پروا خرام افتادہ است ، بداد خواهان نمی پردازد ، و سر بسر کارهائے امروز بفردا می اندازد ۔ وای اگر (......) بہ دهلی رسیده باشم ، مصداق مضمون

' تاتو ہما میرسی مابخدا میرسم ' گردیدہ باشم " ۔ خیال تھا کہ بنارس جاؤں اور قافلہ وہاں سے آگے بڑھے تو اس قافلے کی ' گرد ' بنوں ، لیکن عقل نے اس کا فتویٰ نہ دیا ۔ ۹ ماہ رواں کو عازم دھلی ہوں گا اور پایان ماہ تک وہاں پہنچوں گا ۔ اگر ممکن ہو تو مسٹر ھاکنس کے نام کا ' سپارش نامہ ' اس ' قوم ' کے عمائد میں سے کسی کا روانہ فرمائیں ۔ ہر چند ' حکم صدر عیار کامل ' ہے ، خط کی غرض یہ کہ ایک ' داد خواہ گمنام ' بے توجہی کا شکار نہ ہو ۔ اگر کوئی صاحب جو مسٹر ھاکنس بہادر کا آشنا اور آپ کا یا آپ کے کسی دوست کا دوست ہو ، مل جائے تو " سپارش نامہ " باندا مولوی محمد علی خان صاحب کے پاس بھیج دیا جائے ۔ ۶ جمادی الاول چہار شنبہ ۔

[۲۱]

" جوھر جان گرامی فدای خاک پای حضرت قبلہ گاھی ولینعمی راد ، مدظلہ العالی "۔ سنیچر پہلی جمادی الثانی کو وطن پہنچا ۔ لوگوں کا حال تباہ ہے ۔ " حاکم معزول " گوشہ نشین ہے اور فرماں دہ حال لا اُبالی ، ایک " اعادۂ جاہ " کا امیدوار ، دوسرا " بیم سرعت زوال دولت " سے پریشان ۔ خبر ملی ہے کہ قافلہ بنارس تک پہنچ کر حسب الحکم کلکتہ واپس ہوا اور یہاں آنا ملتوی ہوا ۔ میں نے مسٹر ھاکنس کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا ، " مطبوع طبع نکتہ داں " ہوا ۔ "انجمنیان با من حکایت کردند کہ ایں داور ... تا امروز از ھیچ یک از اعیان دھلی التفات و اختلاط نکردہ ، آری خلاف واقع نیست ، چہ روز نخستین ملازمت تا یک ساعت نجومی ھا (کذا) بخواندن قصیدہ و پرسیدن اخبار کلکتہ و باز جستن وجہ تظلم ملتفت ماند ... بزعم خویشتن سخن فہمست ، چہ خوش بودی اگر لختی معاملہ فہم و ادا شناس نیز بودی... در ماہ اپریل سنہ ۱۸۲۹ء رپورٹ مقدمۂ من از دھلی بصدر رسید و ہم در آں ماہ جوابش صادر گردید ۔ اتفاق چناں افتاد کہ رسیدن حکم صدر و ھنگامۂ معزولی حاکم و پریشانی شیرازۂ اوراق دفتر ھمہ در یک جزو زمان واقع شد ۔ رسیدگی بخت من ... خاص ھمان صفحہ را بے نام و نشان ساخت کہ طراز کامیابی غالب سیہ روز است ۔ اھل دفتر ... ورق ھا گرداندند و آں ورق دست بہم نداد ۔ صاحب سکرتر رسیدنسی دھلی بمن میگفت کہ حالیا دریں مقدمہ بصدر نبشتہ ام و مثنای آن حکم... طلبیدہ "۔ بھائی کو جو افاقہ تھا ، وہ "رلگے از فنون جنون" تھا ۔ عین الیقین ہے کہ مرزا یوسف جب تک زندہ ہیں ، بیمار رہیں گے ۔ کیا

قسمت کہ آتشکدہ ہائے یزد (...) و میخانہ ہائے شیراز تک نہ پہنچ سکا، جنت البلاد بنگالہ ہی میں رہتا ہوتا، مگر اس "خارزار" اور "غولستان" میں واپس آنا پڑا۔ واللہ در قائل: غالب چو ز دام گہہ بدر جستم من الخ۔ نواب اور دیگر احباب کو کثرت آشوب پریشانی سے خط نہ لکھ سکا، اس خط کا ذکر نہ ہو، ورنہ ان لوگوں کو شکایت ہوگی۔ ۱۰ جمادی‌الثانی ۱۲۴۰ ہجری۔

[۳۲]

"حضرت قبلہ گاہی ولینعمی مد ظلہ العالی"۔ ۴ جنوری دو شنبے کو "فرماں دہ دھلی" کا خط بنام جاگیردار فیروز پور روانہ ہوا، مکتوب الیہ یہیں تھا، اس لیے دیکھنے میں آیا۔ "خلاصہ تحریر" انہیں کے الفاظ میں:

"چون برائے تحقیقات مقدمہ دعوی محمد اسداللہ خان حکم صدر عالی قدر اصدار یافتہ، نقل عرضی خاں مرقوم ... حوالہ قلم محبت رقم میگردد کہ بفحوای مضمونش وا رسیدہ، جواب شرحوار آن بزودی ارسال دارند"۔

ہنوز ریذیڈنٹی سے "اجرائے حکم صدر" عمل میں نہیں آیا، لیکن 'داور' کی طبیعت میں "حیف و میل" نہیں۔ "حسن اتفاق اینکہ از اہل دفتر ہم کسی روشناس من نیست"۔ "دفتر خانہ" کی بنارس سے واپسی، اور "مہین داور" "روشناس حقیر" کی آمد کا سال آیندہ پر موقوف ہونا محتاج بیان نہیں۔ مجھے رنج اس بات کا ہے کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ قصیدہ جو مدح "ناظم‌الملک مسٹر فرانسس ہاکنس بہادر ہیبت جنگ" میں ہے، نقل کیا جاتا ہے۔

[اس کے بعد ۲۷ شعر (ایک شعر کی جگہ شعر ہفتم کے بعد خالی، ممکن ہے کہ عکس میں نہ آیا ہو) شعر اول:

یافت آیینہ بخت تو ز دولت پرداز
جلوہ ہا ساز کن اے دھلی و بر خویش بناز

مصرع آخر دیوان میں یوں ہے:

ہلہ کلکتہ بدیں حسن خداداد بناز

اس کے بعد مجموعہ و دیوان دونوں میں چھ شعر یکساں، شعر ہفتم دیوان "فرصت‌الخ" مجموعے میں ہوگا مگر ضائع، شعر نہم دیوان، مجموعے میں یوں:

(...) ہر خیال چمن کوئے او
بستہ بر دامن نظارہ ز فردوس طراز

دیوان میں مصرع اول اس طرح : " چارلس مٹکف فرخندہ شمائل کہ بدھر "۔ اشعار ۱۰ تا ۲۱ دونوں میں ایک طرح ، شعر ۲۲ مجموعے میں یوں ہے :

بندہ ام لیک درین مرحلہ مہمان توام
کردہ ام طی بامید تو رہ دور و دراز

اس کا مصرع اول دیوان میں اس طرح ہے : " یاد باد آنکہ ازین مرحلہ تا کلکتہ " ۔ شعر ۲۳ مجموعے میں کسی قدر مختلف طور پر :

گر نہ آوازۂ عدلت شدی آهنگ حدی
ناقۂ من ز رہ سعی نگردیدی باز

شعر ۲۶ کا مصرع اول مجموعے میں اس طرح : بیست (دیوان 'هفت') سالست کہ با یکدگر آویختہ ایم"۔ اس کے بعد تا شعر ۳۲ دونوں یکساں ، اور ۲۰ شعر جو دیوان میں ہیں ، مجموعے میں نہیں ، قرینہ قوی ہے کہ مجموعے کا ایک ورق یا اس سے بھی زیادہ یہاں سے غائب ہے ۔ دیوان میں قصیدہ بنام سرچارلس مٹکف بہادر ۔]

[۳۳]

نقل رقعہ کہ جناب محمد اسداللہ خان صاحب عرف مرزا نوشہ بجناب نواب سید علی اکبر خان بہادر طباطبائی در خصوص فرمائش انبہ مفوضۂ خامۂ قدرت نگار فرمودہ وھوھذا : " قبلۂ محمدیان آفاق سلامت ، ممدوح از ستایش مستغنی و مادح در بیان نارسا ، عرض نیاز فضولی و ابرام در اظہار شوق بدنما ، چہ باید گفت تا آبروی خموشی نریزد ، و چہ توان نوشت تا داغ کوتہ قلمی برخیزد ۔ همانا کہ این عبودیت نامہ قماش سلام روستائی دارد ، و دائرۂ هرحرفش پرداز کاسۂ گدائی ۔ لختی شکم بندہ ام و قدری ناتوان ، هم آرایش خوان جویم و هم آسایش جان ۔ خرد پژوھان دانند کہ این ھر دو صفت بانبہ اندر است ، و اھل کلکتہ بر آنند کہ قلمرو انبہ ھوگلی بندر است ۔ آری انبہ از ھوگلی و گل از گلشن ایثار از جناب و سپاس از من ۔ شوق میسگالد کہ ھر آیینہ تا پایان

فصل دوسہ بار بخاطر خداوند خواہم گذشت و آز میبالد کہ حاشا بدیں مایہ تمتع خرسند خواہم گشت :

گلویم تشنہ و خون (............) ہے ساقی
بدہ نوشینہ داروئے کہ ہم آتش ہم آبستی

نخل مراد ہم بارور باد دہم ثمر افشاں (...) داماں نگاہ و این بفرق درویشاں ہوا خواہ "۔

[۳۴]

مخفی نہ رہے کہ میں کلکتہ پہنچا تو دھلی کے ایک " نکوھیدہ سیر " شخص نے جو یہاں پہلے سے تھا ، اور "ارباب دیوان داد " سے واقفیت رکھتا تھا، اس امر کو شہرت دی کہ ایک شخص نے جو دھلی سے ابھی آیا ہے ، اپنا نام و تخلص دونوں بدلا ہے ۔ " اعیان بارگاہ را در اظہار اسم ابن ہیچمیرز بخداوند دفتر کدہ تامل رو [یہ لفظ نامکمل ، ممکن ہے کہ اس کے بعد ایک اور لفظ ہو جو ضائع ہوگیا] چار دیوان ریختہ کہ گرد آوردن آن را بیش از ہفت سال گذشتہ و معہذا مہری از مواہیر این روسیاہ کہ اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ نقش نگین و جلوہٴ سال ۱۲۳۱ ہجری طراز دامن و آستینش بود ، بر خاتمہٴ اوراق آں سفینہ رقم آخر ' زبان بندی اعدا داشت ' بخدمت سر حلقہٴ افراد دفتر کدہ بشہادت فرستادم ، و سوزسینہ را بدستیاری برگ گیاہ بر صفحہ بدین رنگ جلوہ دادم " :

" قبلہٴ سعی ستمرسیدگان " ۔ " تفرقہٴ اسم و علم " کی گفتگو آئی تھی ۔ میں دو سو " فرسنگ " سے اس دادگاہ میں آیا ہوں ، نہیں چاہتا کہ میری نسبت یہ کہا جائے کہ ایک " مجہول الاحوال " شخص یہاں آیا تھا ، جو ہر سال نیا تخلص رکھتا تھا اور ہر ہفتے نام بدلتا تھا ۔ نقش خاتم خاتمہٴ دیوان اور مقطع دیرین غزلیات دیدنی ہے ، اور مسکت مدعی ۔ میرا نام اسد اللہ خان ، علم مرزا نوشہ اور تخلص غالب ہے ، لیکن یہ کلمہٴ رباعی ہے اور بعض بحور میں اچھی طرح نہیں آتا ، لفظ ' اسد ' کو جو مخفف "اسم " اور کلمہٴ ثلاثی ہے، کبھی کبھی بطور تخلص استعمال کرتا ہوں ۔ " چشم دارم کہ داغ دلائت تبدیل اسم از دامن حال من بشویند و پس ازاں ... بہر نامی کہ خوانند از من بسر دویدنست " ۔ مہر : اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ

" از واردات جناب سابق الالقاب من لوامع پرتہ " ۔ میں کلکتہ آیا تو

بہت لوگ لکتہ چینی پر آمادہ ہوئے ۔ '' جمعیتی خاص از برائے پراگندگی ساختند ... بمہر باہم نشستند از ہر سو گرد آمدہ آن بزم را مشاعرہ نام نہادند و از تمہید این صحبت بر من ستی تمام نہادند ''۔ صحبت دوم میں میں نے غزل کے دس بارہ شعر پڑھے ، حکیم ہمام کے مقطع سے اس کی زمین معلوم ہوگی :

درمیان من و دلدار ہمام است حجاب
دارم امید کہ این ہم ز میان برخیزد

ایک ہفتے کے بعد خبر ملی کہ ایک '' بے دانش '' نے شعر ذیل :

جزوی از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موی کہ بتان را ز میان برخیزد

پر یہ اعتراض کیے ہیں : 'ہمہ' لفظ 'عالم' کے ساتھ جو مفرد ہے ، درست نہیں ۔ ''چار شربت و نہر الفصاحت خبری از آن ندارد ''۔ 'بیش' کی جگہ 'بیشتر' چاہیے ۔ رستن موی بر کمر معشوق عقلاً [بعض الفظ ضائع] ۔ 'رستن موی و سبزہ' کو برخاستن سے تعبیر نہیں کر سکتے ۔ اعتراضات و معترض کو میزان نظر میں تولا تو زحمت جواب کی ضرورت نظر نہ آئی ، لیکن حق کی پاسداری [چند الفاظ ضائع] ناگوار گزرا اور صحبت سومیں میں اعتراضات کے جواب کا متعہد ہوا ۔ اسی زمانے میں ایک' گرانمایہ' شخص 'اعیان عجم' سے بطور سفیر آیا اور اس مشاعرے میں منتظمین کی استدعا سے شریک ہوا ، دوسروں کے اشعار سنے ، اور میری نوبت آئی تو باوجود نا آشنائی اپنے کو میرا مشتاق ظاہر کیا ۔ ایرانی جو قبل سے کلکتہ میں موجود تھے ، میری تعریف اس سے کر چکے تھے ۔ اس نے کہا کہ آپ سب پر غالب اور اسم باسمی ہیں ۔ مجلسیوں کو مخاطب کر کے اس نے کہا کہ اس شخص کی قدر کرو ، شعر و شاعری سے قطع نظر ، زبان پارسی کا عالم ہے ۔ ''ہم درعرض این گفتگو اشہب لطقم توسنی کرد ، و در میدان داوری گرد فتنہ برانگیخت ۔ چوں لب بپاسخ اعتراضات گشودم ، سفیر ممدوح با من ہمزبان شد و مرا بیشتر ستودن و بر آنان خندیدن گرفت '' ۔ اساتذہ کے چند اشعار جو اس نے اس موقع پر پڑھے ، ان میں سے حافظ ، سعدی ، ظہوری اور ایک استاد کا شعر مجھے یاد ہے :

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
همه عالم گواہ عصمت اوست (حافظ)

بجہاں خرم از آنم کہ جہاں خرم ازوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم ازوست (سعدی)

کم ازانم کہ در معذرتم باید زد
بیش ازانم کہ دھی خجلت تقصیر مرا (ظہوری)

از رخ خط مشک سود برخاست
آتش بنشست دود برخاست (استاد)

خاتمۂ صحبت کے بعد ، حاضر مندان (؟) آں بقعہ چہ شاعر و چہ غیر شاعر شوریدہ ترگشتند و رونق خویش در شکست من دیدند "۔ میرے شعر :

شور اشکی بفشار بن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدہ"

پر یہ اعتراض کیا کہ ' زدہ ' ، مضاف الیہ چاہتا ہے ، جواب دیا گیا کہ 'زدہ' کا کسرہ اضافی نہیں "یای وحدت" (کذا) ہے ، تو دوسرا اعتراض کیا کہ ، ' زدہ ' جز بمعنی مفعول نہیں آتا ۔ اس کا جواب مثنوی میں ہے ۔ مخالفین میں سے ایک " بزرگ " نواب سید علی اکبر خان کے پاس گئے اور میری شکایت کی کہ آپ کا نیازمند اسد اللہ جلسوں میں شوخی کرتا ہے ، مغلوب الغضب ہے اور زبان دراز ۔ اسی صحبت میں جس کا ذکر آیا ہے ، میں نے کہا تھا کہ کوئی مخاطب صحیح اور پارسی‌دان مسلم نہیں کہ فیصلہ کرسکے ۔ ان بزرگ نے اس ' کلمۂ درد مندانہ " کو اس طرح پیش کیا کہ یہ گویا سب کی توہین تھی ۔ نواب نے مجھے نصیحت کی اور سرزنش کی کہ یہاں سخن‌پروری اور شعر گوئی کے لیے نہیں آئے ، راہ دشوار ہے اور راہزن بہت ۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا کروں کہ اس کی تلافی ہو ۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ معذرت نامہ لکھو اور مجھے بھیجو کہ میں مخالفین کو دکھاؤں ۔ میں نے اسے قبول کیا ۔ مثنوی نظم کی ۔ اس کا آشتی نامہ نام رکھا اور ' ناصح محسن '

کو بھیج دی - [اس کے بعد مثنوی کے اشعار میں سے دیوان کا شعر ۱۷ مجموعے میں یوں ہے :

میہماں را نواختن رسم است
کار او نیک ساختن رسم است

دیوان کے شعر ۳۰ کے بعد ، شعر ذیل مجموعے میں زائد ہے :

اندہ خویش کردہ زار مرا
با سخن پروری چہ کار مرا

دیوان کا شعر ۴۸ " تا بشورید ... خیری سری " مجموعے میں نہیں ، اور بعد شعر ۵۹ دیوان ، مجموعے میں یہ شعر زائد :

رخ دعویٰ نہ برفروختمی
بے سخن ھمچو شمع سوختمی

شعر ۷۴ دیوان کا صرف ایک لفظ مجموعے میں ہے - اور اس کا امکان ہے کہ اصلاً اس کے بعد ایک شعر رہا ہو ، جو اب محو ہے - شعر ۷۹ مجموعے میں ذرا مختلف طور پر ہے ، مصرع اول کا بہت بڑا حصہ ضائع ، مصرع آخر یوں ہے : " بہ خیال فقیر مقلوبست " - اس کے بعد کے دو شعر ۸۰ و ۸۱ مجموعے سے غائب ھیں - " کردہ ام ...... زدہ' " " مگر ... غلط نبود " ، ان دونوں میں سے ایک مجموعے میں اصلاً رہا ہوگا ، مگر اب اس کی جگہ عکس میں خالی ہے - شعر ۹۸ دیوان " وعدہ' ...... رفت " مجموعے میں نہیں - یہی حال شعر ۱۱۳ " زاہ ...... ہاشم " کا ہے - شعر ۱۲۹ دیوان ، کے بعد مجموعے میں یہ شعر زائد :

پردہ سنجان باستانی (کذا) را
طالب و سعدی و فغانی را

دیوان کا شعر ۱۳۶ " آنکہ ... واقف را " مجموعے میں نہیں ، شعر ۱۳۸ " دل ... احبابست " کی جگہ عکس میں سادہ ، یہ اصلاً رہا ہوگا - شعر ۱۴۹ و شعر ۱۵۰ " پادشاہی ...... شگرف " " خامہ ...... فرمائش " مجموعے میں نہیں - شعر ۱۵۰ کے بعد مجموعے میں یہ شعر زائد :

بوجود چنیں شگرف بیان
شکوہ دارد عجم ز ھندستان

مجموعے میں مثنوی کی وہی روایت کچھ اختلاف کے ساتھ ہے ، جو دیوان فارسی میں ہے ۔ میں نے " باد مخالف کی اولین روایت " میں جس روایت کا ذکر کیا ہے اور جو متفرقات غالب میں بھی ہے ، اس سے بہت مختلف ہے ، اور یقین ہے کہ " ناصح محسن " کو یہی بھیجی گئی ہوگی ۔ سوال یہ ہے کہ مجموعے میں جو روایت ہے وہ مرتب مجموعہ کو ان عبارات کے آخر میں ملی تھی جو بعنوان " از واردات ...... برقہ " درج ہیں ، یا اس نے خود اضافہ کی ہیں ، اور اس صورت میں یہ روایت کہاں پائی ۔ غالب سے یہ ناممکن نہیں کہ انھوں نے مثنوی دو شکلوں میں کلکتہ ہی میں لکھی ہو ، ایک شکل جسے میں نے 'روایت اولین' کہا ہے ، اہل کلکتہ کے لیے ، اور دوسری باہر والوں کے واسطے] ۔

غالب کے متعلق چند غیر معتبـــر روایات

نادم سیتاپوری

غالب اپنی زندگی میں مقبول رہے ہوں یا نا مقبول — لیکن ان کی 'هشت پہلو' شخصیت اپنے عہد ھی میں مرکز توجہ بن چکی تھی - یہی وجہ ہے کہ ان کے 'دامن شہرت' میں گلوں کے ساتھ کچھ خار بھی سمٹ آئے ھیں جنھیں اگر روایت نگاروں کی خوش نیتی سے الگ کرکے روایت و درایت کے اصولوں پر پرکھا جائے تو یہ روایتیں اس میزان پر پوری نہیں اترتیں - میں صاحب 'آب حیات' کے کمال فن تذکرہ نویسی کا بھی معترف ہوں اور ان کی نیک نیتی کا احترام بھی کرتا ہوں، مگر اس کے باوجود 'آب حیات' کے ان کمزور پہلوؤں کو متوازن تنقیدی جائزوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا جن کی زد سے شاید ھی کوئی تذکرہ نگار بچا ہو - اس سلسلے میں ''آب حیات'' کا یہ مشہور لطیفہ 'روایت بالمعنیٰ' کے اعتبار سے خواہ کتنا ھی دلچسپ کیوں نہ ہو، پھر بھی صاحب آب حیات نے اس کے سیاق و سباق کی یقیناً کوئی چھان بین نہیں کی اور اس عہد میں جس طرح سنا تھا، من وعن نقل کردیا -

> ''مولوی فضل حق صاحب مرزا (غالب) کے بڑے دوست تھے - ایک دن میرزا ان کی ملاقات کو گئے - ان (مولانا فضل حق) کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا مصرع پڑھا کرتے تھے :
>
> بیا برادر آؤ رے بھائی
>
> چنانچہ میرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا - ابھی بیٹھے ھی تھے کہ مولوی صاحب

(فضل حق) کی ' رنڈی ' بھی دوسرے دالان سے اٹھ کر پاس آن بیٹھی - مرزا نے فرمایا ، ہاں صاحب ، اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے -

به نشیں مادر بیٹھ ری مائی " (۱)

جہاں تک غالب کی بدیہہ گوئی کا تعلق ہے ، یہ لطیفہ ان کے کمال فن کا عکاس ہے ، مگر اس کے ساتھ ہی مولانا ' فضل حق کی رنڈی ' کا تذکرہ یقیناً درست نہیں ہے ، کیونکہ اس عہد کے سب سے بڑے ' منکر حقائق ' مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کی تفصیلات میں مولانا فضل حق کی ' رنڈی ' کا ذکر نہیں کیا ہے ، حالانکہ یہ مرزا حیرت دہلوی وہی ہیں جنھوں نے حضرت شاہ اسمعیل شہید سے ' غلو عقیدت ' کی بنا پر ایشیا کے اس بڑے منطقی خاندان کی علمی عظمت سے انکار کر دیا تھا - اگر انہیں مولانا فضل حق کی اس کمزوری کا پتا چل جاتا تو وہ ' آب حیات ' سے زیادہ بڑھا چڑھا کر اسے پیش کرتے - مرزا حیرت نے اس لطیفے کو اس طرح نقل کیا ہے :

" کسبیوں کا ناچ ہو رہا تھا اور میرزا نوشہ (غالب) تشریف لائے - ان کے ایک بھائی نے جو ایک چھوٹی ریاست کے نواب تھے ، امیر خسرو کی ' خالق باری ' کا میرزا نوشہ کو دیکھ کے مصرع پڑھا :

بیا برادر آؤ رے بھائی

میرزا نوشہ نے بے ساختہ جواب دیا کہ دوسرا مصرع بھائی تم نے کس کے لیے رکھ چھوڑا ہے - بی صاحبہ (یعنی طوائف) کی طرف خطاب کر کے پڑھ دو - اس پر مجلس میں بڑا قہقہہ پڑا - اور دوسرا مصرعہ ہے :

به نشیں مادر بیٹھ ری مائی"

(چراغ دہلی ، صفحہ ۳۲)

صحیح واقعہ کس طرح پر تھا اور کیا تھا — ؟ اس سلسلے میں تقریباً اسی عہد کی ایک روایت اور بھی ملتی ہے جو اس لحاظ سے قریب تر کہی جا سکتی ہے کہ اس کے نقل کرنے والے غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم کے

۱- آب حیات ، ساتواں ایڈیشن ۱۹۱۳ء ، صفحہ ۵۲۸/۵۲۷

پوتے سرور جنگ(۱) آغا مرزا بیگ ہیں، جنھوں نے کچھ زمانہ اپنے دادا (غالب) کا بھی پایا تھا اور پھر اپنی خاندانی روایات سے انھیں ایک خاص لگاؤ بھی تھا۔ سرور جنگ نے لکھا ہے:

"مرزا غالب کی مولانا فضل حق (خیر آبادی) سے کمال دوستی تھی۔ ہر شب کو معمولاً مرزا غالب مولانا (فضل حق) کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک شب کو مولانا جو سررشتہ دار ریزیڈینٹ تھے، باہر صحن میں تخت پر بیٹھے ہوئے کچھ مسلیں دیکھ رہے تھے۔ ایک 'رنڈی' بھی اس امر کی منتظر کہ مولانا دیکھ لیں تو سلام کر کے بیٹھ جاؤں، کھڑی ہوئی تھی۔

اس عرصے میں مرزا (غالب) لالٹین لیے آگے آگے پہنچے۔ مولانا (فضل حق) نے سر اٹھا کر کہا:

بیا برادر آؤ رے بھائی

۱۔ غالب کی حقیقی چھوٹی بہن 'چھوٹی خانم' دھلی کے 'سبز پوش' خاندان میں مرزا اکبر بیگ بدخشی کو بیاہی تھیں۔ مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) اُن کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے اور سرور جنگ مرزا جواد بیگ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ غالب کی انھیں بہن، چھوٹی خانم سے ان کے تین بھانجے اور ایک بھانجی امانی خانم تھیں جو نواب علی بخش خان لوھارو کو بیاھی گئی تھیں۔ ان کی پوتی سکندر زمانی بیگم سرور جنگ کی اھلیہ تھیں، اس کے علاوہ سرور جنگ کی ساس عزیزالنسا مرزا غالب کی حقیقی بھتیجی تھیں، یعنی مرزا یوسف کی اکلوتی صاحبزادی۔ اس لحاظ سے غالب اور سرور جنگ میں تہری رشتہ داریاں تھیں۔ سرور جنگ کے والد اپنے پورے خاندان کو لے کر ۱۸۵۷ء میں سیتاپور چلے آئے تھے، جہاں ان کے بڑے بھائی مرزا عباس بیگ مستقل طور پر رہ اس گئے تھے۔ سرور جنگ کی ابتدائی تعلیم سیتاپور اور لکھنؤ میں ہوئی، پھر اس خاندان کا بڑا حصہ دکن چلا گیا۔ سرور جنگ نظام دکن آصف جاہ سادس کے استاد تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں علی گڑھ آگئے تھے، یہیں جون ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔ لاش دلی لے جائی گئی۔ اپنے خاندانی قبرستان "مہندیوں" میں آسودۂ خواب ہیں۔

مرزا (غالب) نے کہا — دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجیے کہ
دیر سے (یہ) منتظر کھڑی ہے - دوسرا مصرع یہ ہے :

یہ لشیں مادر پیٹھ ری مائی" (۱)

یہ متضاد روایات اس حقیقت کی نشاندھی کرتی ہیں کہ غالب کی زندگی میں اُن کا فن ہی نہیں شخصیت بھی ایک ایسی شہرت سے دو چار ہوچکی تھی جس کے پس منظر میں مشتبہ اور مشکوک روایات کا جنم پا جانا کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے - پھر ان کے مرنے کے بعد تو تعریف سے تنقیص اور مدح سے قدح کے ایسے ایسے پہلو نکالے گئے جن کی مکمل تفصیلات بھی آج نہیں ملتیں - غالب کی وفات کے تیس سال بعد جب مجددالسنہ مشرقیہ مولانا سید احمد حسن شوکت میرٹھی کی شرح دیوان غالب چھپی تو اس میں نہ محض غالب کے فن کو شوکت میرٹھی کی تحریفات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ شوکت نے بعض جگہ بغیر کسی حوالے کے نہایت ہی مبتذل واقعات کو غالب سے منسوب کر دیا - مندرجہ ذیل شعر :

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

کی شرح کرتے ہوئے شوکت میرٹھی تحریر فرماتے ہیں : (۲)

" ... ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں پڑھا تو ختم مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس شعر میں کیا معنی پہنا دیے ہیں - مرزا صاحب نے کہا کہ مولانا ! آپ اس شعر کے معنی کیا سمجھیں گے ، نہ آپ نے رنڈی بازی کی ، نہ خانگی بازی ، نہ امرد بازی کی ، نہ فاعل بنے نہ مفعول ، میں نے تو اپنا ایک واقعہ لکھا ہے - یعنی جس 'مسماۃ' پر میں فریفتہ تھا ، بڑی تدبیروں اور چالوں سے اس کو کسی کوٹے

۱- کارنامۂ سروری ، مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ، حاشیہ ص ۳۷ -
۲- حل کلیات اردو ، غالب دھلوی ، شوکت المطابع میرٹھ ، اکتوبر ۱۸۹۹ء ، صفحہ ۸۸ -

کھدرے میں ڈھب پر چڑھایا۔ مگر اس خوف سے کہ کوئی آ کھڑا ہوگا، رجولیت چو ہے کے بل میں گھس گئی ۔ سماۃ سمجھی کہ غالب محض نامرد اور عنین ہے۔ میں نے معذرت میں یہ شعر پڑھا "۔

ایسے مبتذل اور غیر ادبی جھوٹ کی مثال شاید شوکت میرٹھی کے بعد مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی (یگانہ چنگیزی) ھی کے یہاں ملے تو ملے، دوسری جگہ ممکن نہیں – مرزا یاس (وفات ۱۹۰۲ع) نے اپنے رسالہ عروض و قوانی (چراغ سخن) میں بلا کسی حوالے کے ایک ایسی ھی من گڑھت حکایت تحریر فرمائی ہے :

" غالب یہ کیا ؟ کتنے ھی ہونہار شاعر اس قوت متخیلہ کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت گمراہ ہو گئے اور بعضے جو گمراہ ہوئے وہ اس وقت تک راہ پر نہیں آئے جب تک قوت ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنا لیا ۔ ھائے میر تقی میر ! کیا جوھری سخن تھا ، مرزا غالب کے شعر سن کر صاف کہہ دیا کہ اس لڑکے کو اگر کوئی استاد کامل مل گیا اور سیدھے راستے پر لگا دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا – وھی ھوا کہ غالب نے کسی کو استاد نہ بنایا اور نہ راہ راست پر آئے – چنانچہ غالب کے کسی بے تکلف دوست نے یہ مطلع پڑھ کر از راہ تمسخر ان کی بہت تعریفیں کیں –

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
بعد اس کے جزو کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے اور کہا – نہ معلوم کس مسخرے نے یہ مطلع میری طرف منسوب کردیا ہے – اس پر ان کے مہربان نے فرمایا کہ بھئی برا کیوں مانتے ہو ، تمھارے شعر تو ایسے ہوتے ھی ہیں"۔ (۱)

غالب کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں اس قسم کی فرضی حکایتوں اور جھوٹی روایتوں کو خاصی اھمیت حاصل ہے ، جنھیں احتیاط و توازن کے ساتھ اگر جانچا اور پرکھا نہ گیا تو غالبیات کے بہت سے گوشے تاریکی میں چلے جائیں گے۔

---

(۱) چراغ سخن، صفحہ ۹۳، مطبع منشی نولکشور لکھنؤ، دسمبر ۱۹۲۱ء –

شوکت میرٹھی اور یاس عظیم آبادی کے بعد اس ضمن میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم (وفات ستمبر ۱۹۶۸ء) کا نام لاشعوری طور پر سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے ایسی ہی مشتبہ ، مشکوک اور غلط روایات کا ایک " دفتر بے پایاں " چھوڑا ہے ۔ ایک کثیر التصانیف مصنف کی حیثیت سے جو اہم ذمہ داریاں ان پر عاید ہوتی تھیں ، افسوس کہ وہ کبھی ان کو پورا نہ کرسکے ۔ " لطائف الشعرا " مفتی صاحب مرحوم کی ایک مشہور تصنیف ہے جس میں محض غالب ہی کے متعلق نہیں ، بلکہ دیگر مشاہیر کے بارے میں بھی جابجا ایسی فرضی حکایتیں شامل کردی گئی ہیں جن کا سر پیر نہیں ۔ بعض جگہ فرضی کتابوں کے حوالے بھی ہیں لیکن زیادہ تر روایات ایسی ہیں جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ۔ غالب کے متعلق جو لطائف اس کتاب میں نقل کیے گئے ہیں ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے قبول عام حاصل کر چکے ہیں ۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ چند لطیفے ایسے بھی ہیں جو بہر قیمت غلط یا مشکوک اور مشتبہ ہیں ۔ چند لطیفے ملاحظہ ہوں :

" مرزا غالب نے مولانا غلام امام شہید سے اپنے خاص ظریفانہ انداز میں دریافت کیا ، آپ شہید کب سے ہوئے اور کیوں کر ہوئے ؟ غلام امام نے فرمایا کہ جب سے ' کافر غالب ہوئے ' ۔ اور مرزا کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا :

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

مرزا مسکرا کر رہ گئے " ۔ (۱)

اسی طرح ایک دوسرے لطیفے (دلی کی ادبی صحبت) میں تحریر فرمایا ہے :

" حکیم مومن خان مومن کے یہاں احباب کا مجمع تھا ۔ مرزا غالب ، نواب شیفتہ ، مفتی صدر الدین آزردہ ، حکیم آغا جان عیش سے حضرات شریک صحبت تھے ۔ قاضی نجم الدین برق آبادی بھی حکیم صاحب (مومن) سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے ۔ ناسخ

۱- لطائف الشعرا ، مطبوعہ فاروقی پریس دھلی ، صفحہ ۲۳ -

لکھنوی کے کلام پر بحث تھی، میر تقی میر کا ذکر آ گیا، مرزا غالب فی البدیہہ فرماتے ہیں:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

عیش کہنے لگے، استاد ناسخ نے کیا خوب شعر کہا ہے:

یوں نزاکت سے گراں سرمہ ہے چشم یار پر
جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار پر

ہر ایک نے توجہ سے سنا اور داد دی۔ برق سکندر آبادی نے دست بستہ عرض کی کہ حضرت ناسخ نے سرمہ چشم یار پر لکھ کر جدت کا ثبوت دیا ہے اور ہم سے نو آموزوں کے لیے اب تو سند ہوگئی اور ادھر استادوں نے توثیق بھی کر دی۔ حکیم صاحب بولے میاں برق خوب بات پیدا کی اور معقول گرفت ہے . . . .''۔ (۱)

یہ تیسرا لطیفہ (ذوق و غالب) بھی اسی رنگ میں ترتیب دیا گیا ہے:

" حضرت ذوق اور مرزا غالب میں شاعرانہ چشمک تھی۔ ذوق کا قلعہ معلی میں طوطی بول رہا تھا، بادشاہ کے استاد کیا تھے جگت استاد بنے ہوئے تھے۔ اکثر شہزادے مرزا غالب سے مانوس تھے، مرزا بلانے پر قلعہ جایا کرتے، حضرت ذوق کی کوشش رہتی تھی کہ مرزا اسداللہ خان کا کہیں قلعہ میں پالا نہ جم جائے تو اس کی ریختہ گوئی پر حرف گیری کیا کرتے۔ خضر سلطان کو مرزا سے تلمذ تھا، انھوں نے قلعہ والوں کی باتیں جا لگائیں۔ مرزا فرماتے ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است (۱)

اس قسم کا ایک اور لطیفہ (تازہ نہال) بھی غالب کے ایک شعر سے گڑھا گیا ہے۔

۱- لطائف الشعرا، ص ۳۰ - ۲۹

۲- ایضاً - ص ۳۱ - ۳۰

" مرزا غالب قلعۂ معلیٰ میں جب جاتے تو حضرت سلطان (۱) آپ کی بڑی خاطر مدارات کرتا اور جہاں مرزا پہنچے اور اپنے والد ماجد بہادر شاہ سے جا کر کہا ، مرزا صاحب آئے ہیں ۔ حضور بادشاہ سلامت جلد باریابی کا موقع عطا فرما دیتے ، ورنہ حضرت ذوق کے مقابلے میں کسی کی دال گلنے والی نہ تھی ۔ ایک دن بادشاہ سے مرزا صاحب (غالب) نے خضر سلطان کے لیے کہا :

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سر سبز

شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے" (۲)

اور یہ لطیفہ بھی غالباً پہلی بار مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی وساطت سے اہل ادب تک پہنچا ہے :

" مرزا غالب رام پور گئے ہوئے تھے ۔ حضرت جلال (حکیم ضامن علی) مرزا صاحب سے ملنے آئے ۔ شراب نوشی میں مصروف تھے ، ایک جام مے ناب سے بھر کر جلال کے سامنے پیش کیا ، انھوں نے کہا میں نہیں پیتا ہوں ۔ مرزا نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا آج تو ابر ہے ۔ جلال نے کہا ، حضرت مجھے اس سے رغبت نہیں ہے ۔ غالب بولے ، اجی حضرت ابر بھی ہے ، سردی بھی ہے ۔ آخر جلال جھلا گئے اور کہنے لگے ، حضرت میں حرام جانتا ہوں ۔ اس پر مرزا مسکرائے اور کہنے لگے ، پھر یہ شعر آپ نے کیوں کر کہا :

رات پی خوب سی ہی صبح کو توبہ کرلی

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" (۳)

ان لطائف کے سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم نے کسی راوی کے حوالے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی اور ان لطیفوں کے سیاق و سباق سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ غالب کے مختلف اشعار کو واقعات کا جامہ پہنا کر

۱- ' حضرت سلطان ' غالباً کتابت کی غلطی ہے ' خضر سلطان ' ہونا چاہیے ۔

۲- لطائف الشعرا ، ص ۳۵ - ۳۶

۳- ایضاً - ص ۲۹ -

لطائف کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اول تو یہ روایات لطیفوں کے انداز میں کہیں دوسری جگہ نظر بھی نہیں آئیں ، اور اگر فرض کر لیا جائے کہ جس التزام کے ساتھ جلال لکھنوی اور غالب کی ملاقات کو قلم بند کیا گیا ہے، کسی حد تک سچ بھی ہو تب بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ غالب نے جلال کا شعر پڑھ کر انہیں لا جواب کر دیا ہو۔

مفتی صاحب مرحوم نے کچھ لطیفوں کے ساتھ مولوی اکرام اللہ گوپاموی کی ' تصویر الشعرا ' کا حوالہ بھی دیا ہے مگر یہ مزید نہیں فرمایا ہے کہ یہ کتاب کب لکھی گئی۔ اور کہاں ہے ، یا مخطوطے کی شکل میں کس کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور نہ اس کتاب (لطائف الشعرا) میں مولوی اکرام اللہ گوپاموی کے اس تعلق کو ظاہر فرمایا ہے جو مرزا غالب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ' مولوی سید مدد علی تپش ' کے عنوان سے " لطائف الشعرا " میں اس شعر:

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غالب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

کو بھی غالب سے منسوب کردیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :

" حضرت تپش مرزا صاحب (غالب) کے شاگرد تھے۔ مراسلت سے شاگرد ہوئے تھے۔ دہلی مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ گھبراہٹ میں دیوان کا صاف شدہ مسودہ بھول آئے۔ ایک دوسرا مجموعہ تھا وہ ہمراہ چلا آیا۔ مرزا صاحب سے اپنے دیوان کا ذکر کیا اور اس مجموعے کو ملاحظہ سے گزارا ، اس میں بہت تھوڑا کلام ان کا تھا۔ باقی دوسروں کا کلام تھا، پوری پوری غزلیں بھی نہ تھیں۔ مرزا صاحب (غالب) نے دیکھ کر کہا :

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

تپش صاحب نے اس مجموعے کو واپس لے کر دیکھا تو دیوان نہ تھا ، دوسرا نسخہ تھا ، جلد ایک سی بنی تھی اس سے دھوکا ہوا۔ مرزا صاحب سے بھی معذرت کی اور دوبارہ وہ دیوان لے جا کر دکھایا اور اصلاح لی۔ یہ دیوان ان کے پوتے منشی عبدالحمید تاج محلی کے یہاں بطور تبرک محفوظ ہے " ۔ (۱)

۱۔ لطائف الشعرا ، ص ۳۸ ۔

یہ شعر نہ تو غالب کا ہے، نہ سید مدد علی تپش اکبرآبادی کے دیوان سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ اس غلط انتساب سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے مصرع ثانی میں 'غالب' کے تخلص کو دیکھ کر ایک فرضی حکایت گڑھ دی گئی ہے۔ یہ شعر حقیقتاً عبداللہ خاں اوج کا ہے۔ جس کا ذکر 'آب حیات' میں موجود ہے۔

"اوج تخلص، عبداللہ خاں نام۔ ۴۰، ۵۰ برس کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لاسکتے تھے اور انہیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی و درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا۔ اس لیے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے، فکر مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ مزے لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہو گیا تھا۔ بعض دفعہ پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا، جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے (شعر) پر کہتے تھے کہ چھ مہینے تک برابر پڑھتا رہا۔ پڑھتے اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صف مجلس سے آگے نکل جاتے تھے۔ بعض اشخاص شہر میں اور قلعے میں اکثر مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے، مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعرائے با کمال کو جا کر سناتے تھے اور واہ واہ کی چیخیں اور تعریفوں کی فغان و فریاد لے کر چھوڑتے تھے، کیونکہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے "خوب خوب ... بہت خوب" کہتے اور مکرر پڑھواتے تھے۔ مسکراتے اور چہرے پر سرور ظاہر کرتے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں۔ اور میرزا (غالب) تو ایسی دل لگی کے مصالحے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کہ — 'نعمت خدا دے، شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ شعر کے خدا ہو خدا! سجدے کا اشارہ کرتے اور کہتے سبحان اللہ! سبحان اللہ — میں ان دنوں میں مبتدی شوقین تھا۔ اپنا مشتاق سمجھ کر مجھ سے بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو۔

رستے میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے
اور جو نیا شعر کہا ہوتا اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے - پھر شعر
سنتے سناتے چلتے ، قلعے کے لیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر
پڑھتے رہتے تھے - غریب خانے پر بھی تشریف لاتے اور پہر بھر سے
کم نہ بیٹھتے - ایک دن رستے میں ملے ، دیکھتے ھی کہنے لگے ،
آج گیا تھا ، انھیں (غالب کی طرف اشارہ ھے) بھی سنا آیا - میں نے
کہا کیا ؟ کڑک کر کہا :

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ھے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا " (۱)

غالب سے ایک ' نئے شعر ' کا انتساب کرتے ہوئے مفتی انتظام اللہ
شہابی مرحوم نے ایک واقعے کو دو جگہ کھپانے کی کوشش کی ھے -
مولانا عرشی رام پوری نے اس کی تفصیل ان الفاظ میں تحریر فرمائی ھے :

" یہ شعر مفتی انتظام اللہ شہابی نے ' انشائے بے خبر ' کے دیباچے
میں اس تمہید کے ساتھ لکھا ھے :

" ایک بار مرزا صاحب دھلی سے آگرے گئے تو ' لیل کے کٹھرے '
میں مجلس احباب منعقد ہوئی - مرزا حسام الدین بیک ، خواجہ غلام غوث
بیخبر وغیرہ سخن سنج شریک مجلس تھے - شعر و شاعری کا چرچا تھا -
اس زمانے میں فرقہ' اھل نشاط سے ایک رقاصہ ' صنم ' تھی جس کا
شہرہ بہت تھا اور وہ خود بھی فکر سخن کرتی تھی - وہ بھی شریک
مجلس ہوئی ، مرزا صاحب (غالب) نے فی البدیہہ (یہ شعر) (۲) ارشاد
فرمایا " -

" اس کے بعد مفتی صاحب (انتظام اللہ شہابی) نے اخبار قومی
زبان کراچی بابت یکم دسمبر ۱۸۰۷ء (۳) میں " غالب اور ساحر "
کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا ، اس میں لکھا ھے کہ :

۱- آب حیات ، مطبوعہ مفید عام لاھور ، حاشیہ صفحات ۳۰-۵۲۸

۲- سیہ چوٹی ، زر افشاں مانگ ، سبز اس پر دوشالا ھے
تماشا ھے پر طاؤس میں کالے کو پالا ھے

۳- یہ ٹائپ کی غلطی ھے ، ۱۹۵۷ء چاھیے -

' مرزا غالب آخری مرتبہ دلی سے سنہ ۱۸۲۳ع یا ۱۸۲۴ع میں (اپنے) وطن (آگرہ) آئے ' مرزا حسام الدین بیگ خلف مرزا مغل بیگ رئیس برارا کے یہاں چند روز مقیم رہے ۔ ننھیال میں کوئی نہ رہا تھا ، ماموں بالدے جا چکے تھے ۔ مرزا صاحب کی تشریف آوری پر صحبت احباب منعقد کی گئی ... صحبت میں مہر (مرزا حاتم علی بیگ) راجہ (راجہ بلوان سنگھ) بے خبر (غلام غوث خان بے خبر) شیخ احمد علی شیون ، میر زین العابدین شورش وغیرہ شریک ہوئے ۔ تمام اصحاب جمع ہوگئے تو ' صنم ' زرق برق لباس میں آئی ، اس پر غضب یہ تھا کہ سبز دوشالہ اوڑھ رکھا تھا ، پیشانی پر قشقہ لگا ہوا ۔ داخل محفل ہوئی ، ہر ایک کی نگاہ اس پر پڑے بغیر نہ رہی ۔ مرزا غالب بے ساختہ کہتے ہیں :

سیہ چوٹی زرافشاں مالک سبز اس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پر طاؤس میں کالے کو پالا ہے " (۱)

بلاشبہ یہ شعر غالب کا نہیں ہے ، لیکن اگر یہ واقعہ ' انشائے بے خبر ' کی روایت تک محدود رہتا تو شاید ' من حیث الواقعہ ' ایسی مضبوط گرفت میں نہ آسکتا جتنا ' قومی زبان ' (کراچی) کی تفصیلات کے بعد واضح ہو گیا ہے ، کیوں کہ اس دوسری روایت میں صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کا نام ہی اس کے بے بنیاد ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے مرزا حاتم علی بیگ مہر کا کوئی تعلق کبھی آگرے سے نہیں رہا ۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے ، ان کا آبائی مکان آج بھی کٹرہ ابوتراب خان میں موجود ہے ۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے ، غدر کے بعد جب انگریزوں نے فتح پور سیکری کے پاس دو گاؤں جاگیر میں دیے تو پہلی بار آگرے سے ان کا تعلق قائم ہوا ۔ اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا غالب کبھی آگرے گئے ہوں ۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں :

" ۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپایا ،

۱۔ دیوان غالب ، نسخہ عرشی ، ص ۳۹۳ ۔

اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر (مرزا حاتم علی بیگ) کے ماموں شریک تھے۔ پھر لکھنؤ سے ان کو آگرے لے گئے، گورنمنٹ سے اس خدمت کے صلے میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے اور جاگیر میں دو موضع قریب فتح پور (سیکری) مرحمت ہوئے۔ اب (مہر نے) اپنا قیام آگرے میں کرلیا اور وہیں ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے" ۔ (۱)

جناب مالک رام نے اسی شعر کے سلسلے میں لکھا ہے:

" شرح غالب (ص ۳۹۳) میں جناب عرشی صاحب نے اس شعر سے متعلق صاحب موصوف (مفتی انتظام اللہ شہابی) کے دو مختلف مضمونوں کے اقتباس دیے ہیں ۔ دونوں کا مضمون ایک ہی ہے کہ جب مرزا غالب ' آخری مرتبہ ' آگرے گئے تو وہاں محفل احباب میں ایک رنڈی ' صنم ' نامی کو زرق برق لباس میں ملبوس، سبز دوشالہ اوڑھے دیکھا تو (غالب نے) فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ۔

مفتی صاحب موصوف نے خلاف معمول اس روات کے لیے حوالہ نہیں دیا ۔ بہرحال اگر وہ ایسا کرتے جب بھی قابل قبول نہ ہوتا۔ میں افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مفتی صاحب روایتیں ' وضع ' کرنے میں بہت مشاق ہیں ۔ وہ بالعموم کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے اس کی سند دیں گے کہ یہ کتاب ' مفتیان گوپامؤ ' (ضلع ہردوئی) کے کتاب خانے میں ہے یا آرکاٹ (مدراس) کے شاہی کتاب خانے کی زینت ہے یا کسی اور جگہ ہے ۔ حالانکہ اس کا کہیں وجود نہیں ہوتا ۔ گوپامؤ میں خیر سے کوئی کتاب خانہ ہے ہی نہیں ۔ اور جن کتابوں سے متعلق انھوں نے بعض مضامین میں ' آرکاٹ ' کا نام لیا ہے، تحقیق سے وہ بھی غلط ثابت ہوا ہے ۔ وہ (مفتی صاحب) پچھلے ۲۵ - ۳۰ ۔ برس سے اس ' جعل ' کے مرتکب ہو رہے ہیں اور بہت لوگ اس سے گمراہ ہوئے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو اس پر متنبہ کیا جائے۔اور ان کی کوئی روایت اس وقت تک تسلیم نہ کی جائے جب تک کہ یہ کسی دوسری مصدقہ

۱- آب بقا، نول کشور لکھنؤ، ص ۱۱۹ ۔

شہادت سے درست نہ ہو - فی الحال اتنے اشارے پر اکتفا کرتا ہوں -
میں اس شعر کو محض مفتی صاحب کی سند پر غالب کا تسلیم کرنے
سے انکاری ہوں " - (۱)

غیر معتبر اور غیر مستند روایات کے سلسلے میں جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے ، انھیں الفاظ کی مستحق اسی عہد کی ایک اور شخصیت بھی ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - مولانا عبدالباری آسی الدنی مرحوم (وفات ۱۹۴۶ء) اپنے دور کے ان باکمالوں میں تھے جنھیں اگر زمانہ چین سے بیٹھنے کی مہلت دیتا تو شاید آج اردو ادب کی تاریخ میں وہ ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے ہوتے - لیکن گردش ایام کی نامساعدت نے انھیں پل بھر کی مہلت نہیں دی - لکھنؤ پہنچے بھی تو اس دور میں جب ' عزیز و یاس ' کی ادبی ہنگامہ آرائیوں کا آغاز ہو چکا تھا - ' معرکہ چکبست و شرر ' کا غبار بھی فضاؤں میں موجود تھا - لکھنوی اور غیر لکھنوی کی تلخیاں بھی باقی تھیں - اس ' اجنبی دیار ' میں زندہ رہنے کے لیے انھیں " نولکشور" کا سہارا لینا پڑا - اردو اور فارسی کتابوں کی نشر و اشاعت کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا - قابل اشاعت کتابوں کا انتخاب ، ان کی ترتیب و تدوین ، تشریح نگاری اور حواشی نویسی ، سب کچھ انھیں سے متعلق تھا - ان کے زمانے میں بیشمار نئی اور پرانی کتابوں کا قابل قدر اضافہ ہوا - اور نولکشور پریس کو نشاہ ثانیہ نصیب ہوئی - اسی زمانے میں نیاز فتح پوری مرحوم ' نگار ' کو لے کر بھوپال سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور مقبول حسین وصل بلگرامی بھی لکھنؤ کی بساط ادب پر جلوہ نما ہو چکے تھے - وصل مرحوم کے یہاں روزانہ نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی کے ساتھ غالب کے دیوان میں ' نیا اضافہ ' ہونے لگا - کلام غالب میں کئی سو نئے اشعار شامل کر کے مولانا آسی نے " مکمل شرح دیوان غالب " تصنیف فرمادی جسے صدیق بکڈپو لکھنؤ نے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا -

' مکمل شرح دیوان غالب ' میں نہ محض غالب کے نام سے جعلی کلام کا (۲) الحاق کیا گیا بلکہ کچھ ایسے نئے انکشافات بھی کیے گئے جن سے

۱- سہ ماہی " فکر و نظر " علی گڑھ ، جنوری ۱۹۶۱ء ، ص ۱۵۲ -
۲- ملاحظہ ہو ' غالب کے کلام میں الحاقی عناصر ' شائع کردہ فروغ اردو ، لکھنؤ -

اہل علم و ادب اس وقت تک بے خبر تھے - مکمل شرح کے طویل مقدمے میں دو ایسی بیاضوں کی نشان دھی کی گئی جن میں غالب کا ' غیر مطبوعہ ' کلام سمویا گیا تھا - اور اس کے ساتھ ھی اس فاضلانہ مقدمے میں بعض ایسی باتیں بھی کہی گیئں جن کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا - چنانچہ جناب مالک رام جیسے محقق نے پہلا کسی تحقیق کے تذکرہ " تلامذہ غالب " میں صرف مولانا آسی کے بیان کا سہارا لے کر منشی خلیفہ حسام الدین احمدالدنی کو غالب کا شاگرد لکھ دیا جو قطعا ایک مشکوک و مشتبہ روایت ھے اور روایت و درایت کے جن اصولوں پر پرکھنے کے بعد جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی کی روایت ماننے سے انکار کیا ھے ، مولانا آسی بھی اس میزان پر پورے نہیں اترتے -

' مکمل شرح دیوان غالب ' کے اسی مقدمے میں مولانا آسی نے ' آب حیات ' کی اس روایت کی تکذیب کرتے ہوئے " کہ غالب کا مروجہ دیوان مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی خان کا انتخاب کیا ھوا ھے " ایک سخت تنقید کی ھے اور ایک ایسی روایت تحریر فرمادی ھے جس کا کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا - مولانا آسی نے تحریر فرمایا ھے :

" مرزا خانی (خان) ہوں یا مولانا فضل حق (خیرآبادی) ، میرا ہر گز یہ خیال نہیں ھے کہ مرزا (غالب) ایسے غیور طبع نے اپنے جگر پاروں کو ان کے حوالے کرکے ان کی زندگی اور موت کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ھوگا ، غلط ھے اور بالکل غلط ھے ، یہ اور بات ھے کہ ان دونوں نے صلاحیں دی ھوں اور مرزا نے ان کی دوستانہ صلاح کو مانا بھی ھو - مگر یہ انتخاب مرزا ھی نے کیا ھے ... خود میرے والد (خلیفہ حسام الدین احمدالدنی) مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے ، ان کے کمال فن کے پورے رازدان تھے - وہ جب آزاد کا یہ ' آب حیات ' والا لطیفہ دیکھتے تھے کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصے کے مارے سرخ ھو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان باندھا ھے -

" والد صاحب بیان کرتے تھے کہ مرزا اصلاح دے کر بعض شاگردوں سے ایک ھندو تمبولی کی نسبت تو ضرور یہ کہتے تھے کہ ذرا اس کو بھی سنا لینا اور باقی کسی کو وہ کچھ نہیں سمجھتے

تھے ۔ صہبائی (امام بخش) کو ملائے مکتبی ، آزردہ (مفتی صدرالدین) کو ایک حکمران ، ذوق کو بادشاہ کا استاد ، مومن کو لڑاکو جانتے تھے اور ذرا بھی ان کی پروا نہ تھی'' - (۱)

قطع نظر اس سے کہ مروجہ دیوان غالب کے انتخاب کی نوعیت کیا تھی ، مولانا آسی اپنے والد منشی خلیفہ حسام الدین احمد کے بارے میں کوئی ثبوت اس کا پیش نہیں کر سکے کہ وہ غالب کے ' کمال فن کے پورے رازداں ' تھے ۔ غالب کا کوئی ایسا خط آج تک سامنے نہیں آسکا جس میں خلیفہ حسام الدین احمد کا ذکر کسی سلسلے میں آیا ہو ۔ جناب مالک رام نے محض مولانا آسی کے خود نوشت حالات (مطبوعہ ماہنامہ نگار لکھنؤ ، بابت جنوری فروری ۱۹۴۰ع) کو بنیاد بنا کر خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد اور ' کمال فن کا پورا رازداں ' تصور کر لیا ۔ حالانکہ انھیں خود نوشت حالات کے جس ٹکڑے پر جناب مالک رام نے یہ عظیم عمارت تعمیر فرمائی ہے ، اگر اس کے صرف اسی حصے پر توجہ فرما لیتے تو پوری بات سمجھ میں آجاتی ۔ جناب مالک رام نے مولانا آسی کے خود نوشت حالات کا جو حصہ نقل کیا ہے ، اس کی ابتدائی سطور یہ ہیں :

'' حسام ، خلیفہ حسام الدین احمد الدنی ۔

ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) کے نواح میں ' الدن ' ایک قصبہ ہے ، وہیں کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ شاعری گویا ورثے میں پائی تھی ۔ ان کے والد مولوی شیخ خدا بخش بھی شاعر تھے ، عاجز تخلص تھا ۔ عاجز کے والد شیخ عبد الحکیم عرف میاں ننھن عاشق تخلص کرتے تھے ۔ یہ میر تقی میر کے ہم عصر اور جلیس تھے ، آپس میں خوب صحبتیں رہتی تھیں اور ایک ساتھ شعر و شاعری سے شوق کرتے تھے ...'' - (۲)

جس طرح غالب کے ' کمال فن کے رازداں ' (خلیفہ حسام الدین احمد) کا نام یا کوئی شعر آپ کو کسی تذکرے میں نہ ملے گا ، اسی طرح تمام قدیم و جدید تذکرے میر تقی میر کے ان ' ہم عصر اور جلیس ' سے خالی نظر آئیں گے ۔

۱- مکمل شرح دیوان غالب ، مطبوعہ اشاعت العلوم لکھنؤ ، ص ۱۱-۹

۲- تلامذۂ غالب ، ص ۹۲ - ۹۳

اگر جناب مالک رام ' کلیات میر ' مرتبہ مولانا آسی کے طویل مقدمے میں میر کے ان ' ہم عصر اور جلیس ' کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو شاید بلا تصدیق خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد تسلیم نہ کرتے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی طرح مولانا آسی مرحوم کا ذہن بھی ہمیشہ احساس ذمہ داری سے خالی رہا اور ایسی ایسی روایتیں ان کے قلم سے بیساختہ نکل گئی ہیں جنھیں کوئی غیر تحقیقی ذہن و شعور بھی مشکل سے قبول کرے گا۔ ' ہندو تمبولی ' کا ذکر مولانا آسی نے مذکورہ بالا روایت میں کیا ہے۔ اس کا ذکر آپ کو آزاد کے یہاں ملے گا نہ حالی کے یہاں۔ غالب کے کسی ہم عصر نے ایسے سخن فہم تمبولی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ اگر ایسی کوئی با ذوق شخصیت اس دقت دلی میں ہوتی تو آزاد و حالی نہ سہی، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشدالخیری اور ناصر نذیر فراق جیسے روایت نگار تو اسے کبھی فراموش نہ کرتے۔

مولانا آسی نے غالب کے اردو کلام میں الحاقی کلام تو شامل ہی کیا تھا، سب سے بڑا ستم یہ کیا کہ ۱۹۲۵ء میں دیوان غالب (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ سے ایسا شایع کرایا جس میں ایک طرف تو نسخۂ حمیدیہ (مکتوبہ ۱۸۲۱ء مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کا ایک انتخاب بھی "انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالب مرحوم" کے عنوان سے شامل کردیا اور نسخۂ حمیدیہ کے حوالے کے بغیر تحریر فرمایا :

> " چونکہ مرزا غالب کی غیر مطبوعہ غزلیں یا وہ کلام جسے غالب نے خود قابل طبع نہ سمجھا تھا، اکثر بیدل اور شوکت، اسیر وغیرہ کے رنگ میں ہیں اور اس وجہ سے وہ بیحد الجھی ہوئی اور بعیدالفہم ہیں، لہذا ان غزلوں میں سے وہ اشعار انتخاب کیے گئے جو اس رنگ میں بیحد سہل اور آسان ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو ان کے مروجہ دیوان کی غزلوں میں شامل کر دیا جائے مگر چونکہ خود مرزا نے ان کو علاحدہ کردیا ہے لہذا ہم نے بھی مصنف مرحوم کا اتباع کیا "۔ (۱)

۱- دیوان غالب، ایڈیشن ۱۹۲۵ء ص ۱۱۵ -

دوسری طرف اس دیوان میں حاشیے پر بعض اشعار کی شرح بھی کی گئی ہے ، اور بے سروپا روایات بلا کسی حوالے کے لکھ دی گئی ہیں - ۱۹۲۵ء کے ایڈیشن کا جو نسخہ میرے سامنے ہے اس پر سرورق نہیں ہے اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس پر بحیثیت مرتب مولانا آسی کا نام ہے یا نہیں ؟ لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ دیوان مولانا آسی ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے اور شرح کے پیرائے میں جن اشعار پر غیر مستند روایات کے حواشی لکھے ہوئے ہیں ، وہ سب مولانا ہی کی جدت طبع سے تعلق رکھتے ہیں - مولانا آسی مرحوم کے ایک قریبی دوست میرزا محمد عسکری بی - اے نے اپنے خود نوشت حالات " من کیستم " میں مولانا آسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"شاعر و ناقد و شارح ، مشہور نولکشور پریس میں بعہدہ مصحح و شارح ملازم ہیں ، خوشا نصیب پریس کے کہ ایسا گوہر بے بہا کوڑیوں کے مول مل گیا اور وہ اس کی قدر نہیں کرتا " - (۱)

اس ایڈیشن میں شرح کے پردے میں جو " روایت سازی " کی گئی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور افسوسناک بھی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان اشعار کے ' پس منظر ' میں جھانک کر کچھ تصوراتی خاکے بنا ڈالے ہیں جو اس دیوان کے حاشیوں کے سوا شاید کہیں بھی نظر نہ آئیں گے - اب آپ ان اشعار کے آئینے میں وہ روایات ملاحظہ فرمائیں جنھیں بلا کسی مستند حوالے کے اس دیوان غالب میں لکھا گیا ہے :

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ غالب مرحوم نے یہ غزل قلعہ میں پڑھی تھی - بہادر شاہ ظفر مرحوم نے جب یہ مقطع سنا تو فرمایا کہ ہم تو اس وقت بھی آپ کو ایسا نہ سمجھتے - مرزا نے ازراہ شوخی عرض کیا کہ حضور تو اب بھی ایسا ہی کہتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ میں اپنی حالت پر مغرور نہ ہو جاؤں - (صفحہ ۲۱)

۱- من کیستم ، نامی پریس لکھنؤ ، ۱۹۴۳ء ، ص ۹۶ -

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذوق مرحوم اس شعر کو پڑھ کر پہروں سر دھنتے تھے اور غالب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے تھے کہ غالب کو اپنے اچھے شعروں کی خود بھی خبر نہیں ہوتی ۔ (صفحہ ۲۹)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

مولانا آزردہ کبھی غالب کے کسی شعر کی تعریف نہیں کرتے تھے ، اس لیے کہ وہ خود نہایت صاف شعر کہتے تھے اور شعر میں صفائی کو پسند کرتے تھے ۔ ایک دن کسی نے اچانک یہ شعر پڑھا ، پھڑک گئے اور پوچھا یہ کس کا شعر ہے ؟ کسی نے کہا ۔ غالب کا شعر ہے ۔ جواب دیا کہ پھر اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے ، یہ تو ہماری روش خاص ہے اور اس کے مستحق ستائش ہمیں ٹھہرتے ہیں ۔ (صفحہ ۳۰)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

ذوق مرحوم کہیں پالکی میں بیٹھے جا رہے تھے غالب کی نظر پڑی ، چونکہ ان سے ہم عصرانہ چشمک تھی ، انھوں نے یہ مصرع فی البدیہہ کہہ کر پڑھا ۔ ذوق مرحوم نے سن لیا اور بادشاہ سے شکایت کی ۔ بادشاہ نے غالب کو بلوایا اور پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے ۔ انہوں نے پوری غزل سنائی ۔ آخر میں مقطع میں یہ مصرع شامل کر کے سنا دیا ۔ (صفحہ ۹۱)

اس قسم کی متعدد روایات (۱) اس دیوان کے حاشیوں پر لکھ دی گئی ہیں جن کے بارے میں کوئی قابل اعتبار ثبوت یا حوالہ نہیں دیا گیا ہے ۔ جو مکالمات ان روایات میں درج کیے گئے ہیں یقیناً بے بنیاد اور من گھڑت ہیں ۔

۱۔ مولانا آسی کی بیان کردہ روایات میں سے بعض " یادگار غالب " میں بھی موجود ہیں ۔ (ادارہ)

مولانا آسی کے مرتبہ دیوان غالب اردو کا ایک ہی ایڈیشن جون ۱۹۲۰ء میں نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا کہ ۱۹۳۲ء میں مولانا کا انتقال ہوگیا ۔ ان کی وفات کے بعد مولوی امیر حسن نورانی (رکن شعبہ طباعت دہلی یونیورسٹی) ان کے قائم مقام کی حیثیت سے نولکشور پریس کی راجہ رام کمار برانچ میں پہنچ گئے ۔ ان کے زمانے میں اس دیوان غالب کے دو ایڈیشن ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئے جن کے سرورق پر مولوی امیر حسن نورانی کا نام اس التزام کے ساتھ چھپا ہوا ہے کہ " مع تصحیح و اضافہ حالات زندگی" لیکن سوائے اس کے کہ مولانا آسی کے لکھے ہوئے حالات میں رد و بدل کیا گیا ہے، باقی ان ایڈیشنوں میں سب کچھ وہی موجود ہے جو مولانا آسی نے لکھا تھا ۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۷ء کے ایڈیشن میں صفحہ ۱۱۵ پر " انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ غالب مرحوم" کی خوش خبری ۱۹۶۰ء کے ایڈیشن میں بھی موجود ہے اور صفحات ۱۳۴ و ۱۳۵ پر غالب کا مشہور ' سہرا ' شایع کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ :

> " یہاں تک ' غزلیں ' دیوان غالب کی تمام ہوئیں ۔ اب آگے قصائد اور قطعات ہیں " ۔

مولانا نورانی کے تصحیح کیے ہوئے ایڈیشنوں میں بھی یہ تمام فرضی حکایات بدستور موجود ہیں ، کہیں ایک نقطے کا فرق نہیں ۔ نسخۂ حمیدیہ کو چھپے ہوئے نصف صدی سے زیادہ زمانہ ہو گیا ۔ اس کے نہ جانے کتنے انتخابات شائع ہو چکے مگر مولانا نورانی کے نزدیک یہ آج بھی ایسا نادر ذخیرہ ہے جس کی دریافت کا سہرا انہیں کے سر ہے ۔

غالب کا مزاج شعری

مخمور اکبر آبادی

غالب کی نوائے شوق پارسی ہے اور مزاج شعری بھی ایرانی - اپنے عہد کے نصاب کے مطابق، اس نے فارسی زبان پڑھی تھی اور اپنے شوق کے جوش سے اس زبان میں اہل زبان کی سی مہارت و دستگاہ حاصل کرلی تھی، لیکن حقیقت اس سے بالاتر اور کچھ مختلف ہے - وہ یہ کہ نسل و خون کی بنا پر یہ زبان اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی - اُس کی فطنت کو اس سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ اس کی لسانی بصیرت اپنی ہی فطنت کی مرہون منت ہے - اس کو اپنے نسب کی صحت اور اپنے آبا کے فن کی شرافت پر ناز ہے اور اس نازش کا ذکر اُس نے اپنی زبان کی صحت و شگفتگی کا ڈنکا بجانے کے لیے کیا ہے:

غالب از خاک پاک تورانیم — لا جرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکم از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم
ور ز معنی سخن گزاردہٗ — خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم نفسیم — ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم — ہمہ بر روزگار می خندیم

نفسیاتی زبان میں، اس قطعے کے 'فیض حق' اور 'عقل کل' سے

اپنی فطرت کی بداعت و ندرت ، ' تابش و بخشش ' سے اپنے ذوق کی شگفتگی و فراوانی ، ' تلاش ' سے اپنی بصیرت اور ' خرسندگی ' سے اپنا ہی غنا مراد ہے۔

غالب یکتا و یگانہ بھی ہے ، خود شناس و خود آگاہ بھی ، اور حق پسند و صاحب دیانت بھی ہے - اس کے ان تین پہلوؤں کا اگر اعتبار ہو جائے تو کوئی نقاد ، اس جیسے ہنر مند کا ، خود اس سے بہتر نقاد نہیں ہو سکتا - اپنے فارسی کلیات کے دیباچے میں ، ارسطو کے فلسفے کی رموز سرائی کرتے ہوئے ، مثنوی میں خود اپنی داستان سرائی و ژرف نگاہی کا ذکر چھیڑتا ہے - اس کے مزاج شعری کی نوعیت کا انکشاف ، چونکہ خود اس سے بہتر ممکن نہیں ، اس لیے یہ مختصر مثنوی تمام وکمال درج کی جاتی ہے :

اے نہاں بخش ، آشکارا نواز	دل بہ غم، تن بہ جاں گرامی ساز
شررے کز تو ، در دل سنگست	بر رخ لعل ، جلوۂ رنگ است
اے بساط زمیں نشیناں را	وے مشام یگانہ بیناں را
از رگ نو بہار نافہ کشائے	وز دم باد صبح غالیہ سائے
اے فگندہ بروئے شاھد ذات	عنبریں طرہ از نقاب صفات
بہ فروغت مہیں نمایش جائے	از بساط سیاہ کیواں زائے
اے فلکہا ، حباب قلزم تو	وے زمیں لائے بادۂ خم تو
از رحیق خمت بدیر مغاں	لای پالای می سہیل فشاں
بودنی بخش خوب و زشت توئی	رونق کعبہ و کنشت توئی
اے گزیں نقشہا ، کشیدۂ تو	ہر چہ و ہر کہ آفریدۂ تو
دیدہ را جوئے خوں کشادۂ تست	نالہ را بال و برق دادۂ تست
اے مرا فر خسروی دادہ	پارسی را بہ من لوی دادہ
ہم بہ تسلیم عجز تن زدہ ام	کز تو در مدح خویشتن زدہ ام
ناتوانی قوی اساسیہاست	خود نمائی خدا شناسیہاست

مذکورہ مثنوی کا دوسرا مصرع غالب کے نقطۂ نظر کا انکشاف ہے - اس میں وہ اپنے فلسفۂ حیات کا پہلا اصول بتاتا ہے۔ جاں سے قطع نظر ،

دل کو غم سے گرامی بناتا ہے ۔ غم کے معنی یہاں محبت ہیں اور محبت ، بنی نوع انسان کی محبت کی مترادف ہے ۔ یہ بتاتا ہے کہ 'دل' اس لیے گرامی منزلت ہے کہ غم محبت بشر سے لبریز و سرشار ہے ۔ 'غم' کے اس معنی کی شرح و وضاحت سے ، اس کا فارسی اور اردو کا سارا کلام بھرا پڑا ہے ۔ حق یہ ہے کہ یہ اس کا نہایت محبوب موضوع ہے ۔

دوسرا شعر فکر انگیز ہے ۔ اس میں یہ بتاتا ہے کہ واجب الوجود کے وجود کا ایک شرر ، سنگ کی رگ کو ودیعت کیا گیا ہے ۔ وہی شرر لعل کے رخ پر رنگ بن کر نمودار ہو گیا ہے ۔ یہ مادے کے مدارج ارتقا کی جلوہ نمائی ہے ۔ لعل کا رنگ اس جد و جہد کا انجام کار ہے جو مادے کی ازلی فطرت کا خاصہ ہے ۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ رنگ لعل کی یہ نمود فوری یا اضطراری نہیں ہے ، تدریجی ہے ۔ یہی خیال دوسرے انداز سے اردو کے اس شعر میں ظاہر کیا ہے :

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس شعر میں جہدللبقا کا پہلو زیادہ وضاحت سے نمودار کیا ہے ۔ قطرے کی بے مقداری سے گہر کی منزلت تک پہنچنے کے مدارج ارتقا کی کشمکش پر توجہ دلائی ہے ۔

اس کے آگے ایک شعر میں 'خوب و زشت' اور 'کعبہ و کنشت' دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے ۔ یعنی یہ کہ دونوں وجود کے مظاہرہیں اور معرض وجود میں نمودار ہوکر ایک ہی حیثیت کے حامل ہیں ۔ یہاں غالب کی نظر کی پہنائی ، پیمائش سے بالا تر ہوجاتی ہے ۔

دوسرے ، پانچویں اور نویں شعر سے ظاہر ہے کہ وہ 'عقل کل' کے متواتر دخل یا ہر کلے کے بہ قول ، خدا کے لمحہ بہ لمحہ توسط و تخلل کا قائل نہیں ہے ۔ بلکہ مسلسل و متواتر سعی و جہد کا حامی ہے ۔ یہ تینوں شعر ہیگل کی جدلیت کی شرح و وضاحت سے تمام و کمال ہم آہنگ ہیں ۔

اس کے علاوہ پہلے اور آخری شعروں کے دوسرے مصرعے ، ارسطو کے فلسفے کا بھی مغز و ماحصل ہیں اور ہیگل کی جدلیاتی حیات آفرینی کا نچوڑ بھی ۔ مادے کے وجود کے اثبات اور اس کے تنوعات کی ایسی دلنواز شرح کے

باب میں غالب کا زاویہ' نظر خصوصیت سے نیا ہے۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ صفات ہی کے ظہور کا نام جدید فلسفے نے حیات کی جدلیاتی آویزش اور مظاہر حیات کا ارتقا رکھ لیا ہے۔

غالب کا موقت معاشرہ ، خود نمائی کو اپنی شدید فریسیت کی بنا پر عیب قرار دے چکا تھا ، لیکن خود غالب ، خود نمائی ، کو ، خداشناسی ، بتاتا ہے۔ یہ جدت ہے اور جدت کی حیثیت سے عہد کی فریسیت کی کھلی ہوئی مخالفت ۔ اسی ، خود نمائی ، سے علامہ اقبال نے ، خودی ، کا فلسفہ وضع کیا اور وہی مسلمانوں کے سیاسی نشاۃ الثانیہ کا مشعل راہ بنا ۔

فارسی کلام سے قطع نظر ، اس نے مذکورہ صدر قدرت ، نوی ، سے معیاری و یادگاری کام لیا ہے یعنی یہ کہ فارسی الفاظ ، جملے ، ترکیبیں ، اسالیب ، محاورے اردو سیاق و سباق میں اس قدرت سے کھپائے ہیں کہ شیر و شکر کردیے ہیں ۔ کارنامہ یہ ہے کہ فارسی کی بہت سی بے اضافت ترکیبیں اس نے اردو انداز بیان میں کھپا کر مانوس بنا دی ہیں ۔ مثلاً :

فنا تعلیم :

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

سر بہ سر انداز :

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم ، سر بہ سر انداز

ستم ظریف :

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

لب تشنہ :

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ' تقریر بھی تھا

آشفتہ سر اور جواں میر :

پیشے میں عیب نہیں ، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

برف آب :

ساماں خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

اس رباعی کے چوتھے مصرعے میں ' برف آب ' کی ترکیب اضافت مقلوب کہلاتی ہے۔

آسماں اورنگ ؛ آفتاب آثار :

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاں دار آفتاب آثار

حسین ، بے اضافت ترکیبیں ، غالب کے فارسی کلام میں کثرت سے میسر آتی ہیں ۔ یہ اتنی مفید اور لطیف ہیں کہ اردو عبارت میں بہ سہولت کھپ سکتی ہیں ۔

چمن ساماں :

چمن ساماں بتے دارم کہ دارد وقت گل چیدن
خرامے کز ادائے خویش ، ہر گل کردہ داماں را

اس شعر میں غالب نے اپنے حسن بیان سے ' خرام ' کو بھی پھول کا مماثل بنا دیا ہے ۔ ایسے ہی انواع محاسن کی بنا پر اس کے بیان کو صناعی و جدت طرازی کہا جاتا ہے۔

لا آبالی پیشہ :-

کباب نو بہار اندر تنور لالہ می سوزد
چہ فیض از میزبان لا آبالی پیشہ مہماں را

شیریں حرکات :

بس کہ ہموارہ ، دل آویزی و شیریں حرکات
سایہ طوبیٰ و جوئے عسلی را مانی

مغز خام و تلخ کام :

غمت در بوتہ' دانش گدازد مغز خاماں را
لبت تنگ شکر سازد دہان کا تلخ کا ماں را

دیرست و زود رنج :

در بادہ دیرستم ، آری ز سخت جانیست
در غمزہ زود رنجی ، آری ز نازنیست

ہزار شیوہ :

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نہ خواست

مشکیں غزال :

مشکیں غزالہ ہا کہ نہ بینی بہ ہیچ دشت
در مرغزار ہائے ختا و ختن بہ مست

دل خستہ :

دل خستہ' غمیم و بود بے دوائے ما
با خستگاں حدیث حلال و حرام چیست

خونیں نفس :

دادہ خونیں نفسی ، درس خیالم غالب
رنگ بر روئے من از سیلی' استاد آمد

کافرادا ، بالا بلند ، کوتہ قبا :

تاہم ز دل برد کافر ادائے
بالا بلندے ، کوتہ قبائے

یہ نادر و جدید ، رنگ بہ رنگ اضافہ اس کا کارنامہ ہے ۔ اس نے موقت اردو کو متمول کیا ، نوع بہ نوع خیالات کے اظہار کا اہل بنایا اور مفلس و کم صلاحیت زبان کے بیان میں وقتی تصورات کے حمل و قبول کی صلاحیت پیدا کردی ۔ ایسا علمی شکوہ پیدا کرنے میں تا ہنوز کوئی شاعر کامیاب نہ ہوا تھا ۔ یہی وہ پہلو ہے جیسے سخن شگرف ، ژرف نگاہی ، دوق نوی ، جیسے معنوی اشاروں سے واضح و واشگفت کیا جاتا ہے ۔

غالب کے فارسی کلام کے باب میں حالی کا یہ لکھنا کہ :

" مرزا نے اپنی غزل کی بنیاد نظیری ، عرفی، ظہوری ، طالب اور اسیر کی غزلوں پر رکھی ہے "۔

کچھ غالب کی مدح سرائی یا داد گستری نہیں ۔ اس سے اگر غزلوں کی زمینیں متعلق ہیں تو یہ خیال بجا سہی ، لیکن اگر اس سے غزلوں کی بندش بیان یا مغز مراد ہے تو یہ منفی داد ہے اور انفرادیت کی تکذیب ۔

اس کے علاوہ یادگار غالب میں حالی کا یہ لکھنا کہ اس کی :

" غزل کا معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت اُستاد کی غزل سے گرا ہوا نہیں "۔

میری نظر میں غالب کی اہانت ہے۔ اس کی جدت و خلاقی ، اس کی قدرت ' نوی ' کی کھلی توہین و تکذیب ہے ۔ اس کے ذوق بے ہمتا کی جان پر ستم ہے۔

حیرت یہی ہے کہ حالی جیسا ترقی پسند ، پیش رو بزرگوار ، اس محل پر قدامت و روایت کا ایسا پرستار بن جائے کہ رعب قدامت کے دائرے سے باہر نکل کر سانس بھی نہ لے سکے ، جدت طرازی سے اتنا قاصر رہے۔

یہ فرسودہ و بے روح تبصرہ ، بے شک و شبہ ایسے لمحے کی پیداوار ہے جو قنوطیت و بے حوصلگی سے لبریز تھا ۔ حالی کی یہ رائے غالباً اس لیے قائم ہوئی کہ غالب نے مذکورہ صدر شعرا کی عظمت کا اکثر اعتراف کیا ہے۔ لیکن دوسرے ہی سانس میں اس نے اپنی عظمت کا آوازہ بھی بلند کردیا ہے۔

اس سے قبل مرثیے میں حالی نے جو داد دی ہے ، وہ غالب کے مقام استادی کی رتبہ شناس اور حالی کی شاگردی کے شایان شان ہے ۔ اُس کی منزلت کا یہ احساس و عرفان اس کی فطنت کا آیینہ دار ہے:

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح	اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم	لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے	ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت	خاک کو آسماں سے کیا نسبت

سوچی سمجھی بات یہی ہے کہ اُس کو اگلوں پر ' ترجیح ' ہے ۔ ' نکتہ داں ' کہنا ، اس کی مختصر سی مگر سچی توصیف ہے۔ وہ خود ایک معیار کا خالق ہے جو اچھوتا ، انوکھا اور نرالا ہے۔ خود اُس کے بہ قول ' نوی ' ہے ۔

یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا حالی کی مذکورہ صدر ، دو متضاد رایوں میں کیوں کر مطابقت پیدا کی جائے ، اس لیے کہ کم سے کم ایک استاد یعنی اسیر ، دونوں میں مشترک ہے۔

چنانچہ غالب کے کلام کو ، فارسی ہو یا اردو ، قدما یا معاصرین کے معیار پر جانچنا اعلا نقادی نہیں ہے۔ اس کے ان کی قدر سنجی کے لیے خود اسی کے کلام سے معیار اخذ کرنا ہوگا۔ اس کے باب میں شیفتہ یا آزاد کی رائیں تمام و کمال قابل قبول نہیں۔ یہ شعر کی عامیانہ سطحیت کو معیار قرار دے کر اپنا فیصلہ صادر کرچکے ہیں ، لیکن ادب کی کسوٹی اس وقت تک بدل چکی ہے۔ خود قدیم معیار کی اساسی قدریں فرسودہ ، کرم خوردہ ، لایعنی قرار پا چکی ہیں۔

ہمارا عہد انفرادیت کی جویائی اور زاویہ' نظر کی تلاش کا عہد ہے۔ کسی کی شاعری کو منزلت دینے کے لیے ہمیں انفرادیت کی وضاحت اور زاویہ' نظر کی شرح بھی کرنی ہوگی۔ ان پہلوؤں سے قطع نظر ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اس شعر :

خیز و بے راہہ روی را سر راہے دریاب
شورش افزا نگہ' حوصلہ گاہے دریاب

میں جس ' بے راہہ روی ' کا اس شد و مد سے اعلان ہے ، وہ کیا ہے۔ غالب کے مزاج شعری کے باب میں اس کا فارسی کلام ، مشعل راہ ہے اور ' بے راہہ روی ' کا ثبوت اردو سے بہت زیادہ فارسی میں ملتا ہے۔ ان سب سے بالا تر غالب کے باب میں ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اس کی انفرادیت ، اس کے زاویہ' نظر اس کی ' بے راہہ روی ' نے متاخرین کو کس طرح متاثر کیا۔ غالب کے کلام کو ' قومی سرمایہ ' ہم اسی لیے کہیں گے کہ اس کے مزاج شعری نے قوم کے متاخرین ، بالخصوص بیسویں صدی والوں میں گمبھیرتا یا جلالت مآبی پیدا کی۔

یادگار غالب میں ان پہلوؤں کا فقدان اور غالب پذیرائی کے موضوع پر ، مولانا حالی کا نیازمندانہ لب و لہجہ ، غالب کے کاخ بلند کا دروازہ نہیں کھولتا۔

غزل میں اس کو عرفی و نظیری اور مثنوی میں ظہوری کا ہم سر اور ہم مرتبہ قرار دے کر مولانا حالی نے جگہ جگہ ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ مگر خود

اس نے عرفی کا ایک مصرع پاٹ کر اپنی ' بے راھہ روی ' کی عظمت کا جھنڈا گاڑا ہے۔ عرفی کا مصرع یہ ہے :

روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتشست

غالب نے غزل میں یوں کہا ہے :

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتشست

اور اس اصلاح کا اعلان اس طرح کیا ہے :

گشتہ ام غالب ، طرف با مشرب عرفی کہ گفت
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

اس ' بے راھہ روی ' سے جراُت کا زاویہ ٔ نظر پیدا ہے۔ یہ ' زاویہ ٔ نظر ' کسی بھی محکوم قوم کے مجاھدے کا نعرہ ٔ نجات و رستگاری بن سکتا ہے۔ وتنام میں جل جل کر مرنے والے حریت کے مجاھد ، یہ شعر پڑھتے پڑھتے خوشی سے جان دے سکتے ھیں۔

قصہ کوتاہ ، میری نظر میں تقابل کا یہ لب و لہجہ غالب کی بڑائی کا اعتراف نہیں ، حالی کے احساس کمتری کا غماز ہے۔ میری جانب سے یہ اظہار خیال چھوٹا منہ بڑی بات ہے ، لیکن بہ ادب التماس ہے کہ نفس الامر یہی ہے اور یہ ھماری منحوس محکومیت کی رکیک یادگار ہے۔ یہ وھی احساس کمتری ہے جو ہم دیسیوں کو ، بدیشیوں کے مقابلے میں ہمیشہ رھا ، ہر محاذ پر رھا اور جس نے ھماری سیاسی و اخلاقی نجات کی جد وجہد میں ہمیشہ رکاوٹ پیدا کی۔ یہاں بھی غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے :

ھر چند سبک دست ، ھوئے بت شکنی میں
ھم ھیں تو ابھی راہ میں ھیں سنگ گراں اور

کہتا ہے کہ ھم نے بہت سے بت، توڑ ڈالے ھیں مگر اپنے فطری احساس کمتری کا بت توڑے نہیں ٹوٹتا۔ ممکن ہے کہ عہد کے افاضل ، اس شعر میں دوسرے معنی دیکھیں ، لیکن میری کم بینی یہیں ٹھٹک کر رہ جاتی ہے۔

حالی کے یہاں اس نامطبوع احساس کمتری کا صرف یہی ایک جواز ممکن ہے کہ چونکہ معاشرے کے ذہن پر ایرانی استادوں کے کمال کا اثر رعب کی طرح چھایا ہوا تھا، اس لیے نہ اس سے مفر تھا، نہ اس سے تقابل کی تدبیر ہی پیش نظر نہ تھی۔ نہ جرأت ایقان کی پشت پناہی حاصل تھی لیے بغیر چارہ۔ اس تدبیر کے علاوہ کسی کی بڑائی تسلیم کرانے کی کوئی تدبیر ہی پیش نظر نہ تھی۔ نہ جرأت ایقان کی پشت پناہی حاصل تھی نہ ساز و برگ کی اعانت و توانائی۔ اگر ایک ہاتھ میں وہ سپر ہوتی اور دوسرے میں یہ تلوار تو بات بن جاتی اور شرم بھی رہ جاتی۔ لیکن یہ عذر و جواز بھی، حالی سے کمتر منزلت کے نقاد کی طرف سے قابل قبول ہے مگر حالی جیسے صاحب بصیرت نقاد و ادیب کی جانب سے نہیں۔

کاش مولانا حالی ہمیں یہ بتاتے کہ عرفی، عرفی تھا اور غالب، غالب۔ نظیری، نظیری تھا اور غالب، غالب۔ ظہوری، ظہوری تھا اور غالب، غالب۔ اور مغربی نقادوں کی طرح، ان عظیم الشان شخصیتوں میں ہمیں، کیٹس، شیلی، بائرن، کولرج کا سا ما بہ الامتیاز نمایاں کرکے دکھاتے۔ ان سب کی خصوصیات اگر ایک نقطے پر منتہی ہوتی ہیں اور ان ہی کے ساتھ غالب کی بھی، تو غالب نقال تھا، خداوند فطنت نہ تھا۔

انوری اور عرفی، قصیدے میں حرف آخر کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی عظمت، ان کی آفریدگاری سے وابستہ ہے۔ قصیدے کی سرزمین میں غالب کی آفریدگاری، انھی اساتذہ کی ہم طرح و ہم منزلت ہے۔ اسی بے پایاں قدرت، اسی صناعی، اسی نوک پلک کے ساتھ، مگر اپنی انفرادیت، اپنا رنگ لیے ہوئے غالب کے قصائد میں نمایاں ہے۔

عرفی کہتا ہے:

اقبال کرم می گزد ارباب همم را
همت نه خورد، نیشتر لاو نعم را

اس مطلع میں اخلاقی قدر نقطۂ عروج پر ہے۔

اسی زمین میں غالب نے قصیدے کا مطلع کہا ہے اور مدت بعد کہا ہے۔ اس وقت کہا ہے جب عرفی، اقلیم شہرت کا تاجدار بنا بیٹھا تھا اور اس کی سعادت کا سکہ چلتا تھا۔ اس لیے قدر و قیمت کے ہر پہلو میں، جب افزایش اور معتد بہ افزایش نہ ہو، محض تاخر کے گناہ کی بنا پر غالب کا

مطلع برابر کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ یعنی یہ کہ جب تک عرفی سے یہ مراتب بلند نہ ہو، معرفین کی ذہنیت کو، ہم بانکی محسوس نہیں کرا سکتا ۔ غالب کا مطلع یہ ہے:

آوارۂ غربت نہ تواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را

غالب نے اپنے تاخر کا خلا، اپنی جمالیاتی حس کی ذکاوت و حذاقت، اپنے ذوق نوی کی شدت و جلالت سے پورا کیا ۔ جمالیاتی خلاقی، اخلاقی خلاقی سے اس لیے گراں تر ہے کہ دقت نظر کا مطالبہ کرتی ہے۔

صنمیاتی جمال کے علاوہ، اس مطلع میں آفاقی عینیت کا شعور، عرفی سے عمیق تر ہے ۔ پیکر کی چستی کا جوش، عرفی کا ہم نوع و ہم طرح ہے اور اپنی ' بے راھہ روی ' کا اعلان و آوازہ عرفی پر مستزاد ہے ۔

قومی غیرت و تیختر کا جوش، یہ سوال کر دینے پر اکساتا ہے کہ نامبردہ اساتذہ کا کلام، غالب کے آفریدہ کیف شعر یا اُن عناصر کے بغیر، جن کو اس نے ' بے راھہ روی ' ' ژرف نگاھی ' ، سخن شگرف قرار دیا ہے، معیار کیوں گردانا جائے ۔ یعنی یہ کہ وہ کلام، اس جہت سے معیار سے گرا ہوا کیوں نہ باور کیا جائے کہ اس میں غالب کے سے محاسن و معارف ناپید ھیں اور محض یہ اتفاق کہ وہ متقدم ہے، اس کے آڑے نہیں آ سکتا ۔ تقدیم و تاخیر کی بنا پر محاسن کا فیصلہ کرنا وقت پرستی ہوئی کمال شناسی نہ ہوئی ۔

مولانا حالی اگر اپنے استاد کی فکر کا جائزہ لیتے تو وہ معاشرے کو یہ بتا سکتے تھے کہ اس کے قلب پر گرانی کا جو ایک ھمالیہ رکھا ہوا ہے، اس کی اصل کیا ہے ۔ اس کا سوز دروں، اس کی قنوطیت نہیں ہے، بلکہ بدیشی حکومت کے ملعون ورود نے اس کے دل میں آتش فشاں کا دھانہ شگافتہ کر دیا ہے ۔ اس انکشاف سے وہ نوخیز متاخرین کی فکر ہی مشتعل کر سکتے تھے ۔ میں مکتب کا پڑھا ہوا، پرانی تربیت کا ایک کمترین انسان ہوں، حاشا، یہاں مولانا حالی سے گستاخی مد نظر نہیں ۔ میری طرف سے خود غالب ارشاد فرما گیا ہے:

شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

بالفرض محال ، عرفی ، نظیری ، ظہوری کا وجود نہ ہوتا تو غالب کی بے مثل و عدیل فطنت و قدرت کو کس معیار پر پرکھا جاتا - یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ارباب کمال کو کس معیار پر پرکھا گیا - جواب یہ ہے کہ ان کے لیے کسوٹی بھی نئی بنائی گئی - یہی حق غالب کو بھی حاصل تھا ، لیکن اس کی زندگی میں معاشرہ ، اس نوع ذوق و نظر سے محروم تھا - اس محرومی پر اس نے ملال بھی ظاہر کیا ہے :

جاہ ز علم بے خبر ، علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر نہ دید ، ہم زر من محک نہ خواست

اور انتباہ بھی دیا ہے :

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اس مقطعے میں ' محو ' اور ' منکر ' بلیغ اشارے ہیں - ' محو ' کے معنی یہ ہیں کہ قدامت کے بت نے تجھے اپنا پرستار بنا کر تیرا فہم کند کر دیا ہے - تیری مغلوب و اسیر ذہنیت میں عناصر ندرت و جدت پرکھنے کی صلاحیت نہیں رہی - ' منکر ' میں متانت کے ساتھ عظمت کی عالی حوصلگی مستور ہے - اپنی زبان سے اپنی ستایش پسند نہیں کرتا - اشارے سے متنبہ کرتا ہے کہ غالب کے کمال کا انکار نہ کرو - ' زمانۂ تست ' انسان کی فطرت پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور عہد کے ذوق ، محرومی و بے کیفی کا بھی ماتم گسار ہے - غالب کا مطالعہ نادرست اور احصا دور از کار نہ تھا - محکوم قوم کے مصائب کی تعداد معین کر لینا ، لب ساحل کے سنگ پارے گن لینے کی طرح محال ہے -

انیسویں اور بیسویں صدیوں میں مغرب والوں نے اپنے اہل کمال کو ابھارا ، اچھالا اور سر پر بٹھایا - ہماری قوم نے علی الرغم اپنے ہنرمندوں کو پسارا ، اتارا اور گرانے کی کوشش کی - مغرب کے اور ہمارے رویے کا فرق ، بلند و پست ، زندہ و مردہ ، چڑھاؤ اور اتار کا تضاد ہے - اس میں ہمارا

زیادہ قصور نہیں - میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ ہمارا حب وطن آج کس منزل میں ہے -

مولانا حالی نے غالب کے مزاج شعری یا اس کی فارسی دانی کی اہم سے اہم جو داد دی ہے ، وہ یہ ہے :

" خسرو اور فیضی کے بعد مرزا جیسا ادیب و شاعر ہندوستان کی سر زمین سے نہیں اٹھا " -

اس گرانمایہ داد سے غالب کی جلالت مآبی کا بیشک اندازہ ہوتا ہے - خسرو کے ذکر سے مولانا کے تحت الشعور میں اس دیوسار فضل و کمال کی ہمہ داں فطنت کا وہ زور جلال مستور تھا ، جس نے دول رانی خضر خاں اور لا'لی' عمان جیسے کمال پارے خلق کردیے اور فیضی کے اسم گرامی سے اس دوار شخصیت کی علمیت و صلاحیت کا وہ فیضان ، جس نے نل دمن جیسے شعری صناعت پارے کی تخلیق سے ، ذہن انسان کی فراخی و کشادگی کی بشارت دی ، غالب بے شک و شبہ ، انہی فرزندان ہند کا ہم وزن و ہم سنگ ہے - ان ہی آفریدگاران کمال و صناعت کی طرح تمدن کا نشان منزل ہے - مولانا کی تحریر میں لفظ ' بعد ' سے صرف عہد کا تآخر مراد ہے - اس کے مفہوم سے خسران کا کوئی پہلو لازم نہیں آتا - اس کی انفرادیت اور مجددین کے مماثل نہیں ، ان کی ہم اساس و ہم گہر ہے -

غالب کے مزاج شعری کی پارسی افتاد مستعار نہیں ، طبع زاد ہے - وصف اضافی نہیں ، ہنر ذات ہے - اس کی خلقت کی طبعی و داخلی خصوصیت کے علاوہ معاشری و خارجی دلیل بھی ہے - زبان کے نشو و نما کے اس عہد تک اردو زبان میں اُن دقیق و کائناتی مفاہیم و مباحث کے صناعانہ حمل و قبول کی قوت پیدا نہ ہوئی تھی جو غالب کی فطنت اس میں سمو سکنے کی اہل و آرزو مند تھی - اس منزل میں فارسی کے مکلف انداز بیان سے استعانت ناگزیر تھی - چنانچہ تراکیب مستعار لینے اور حسب محل وضع بھی کرنے کی ضرورت پیش آئی - یہ بھی اس کی فطنت کا فیضان ہے کہ وہ اہلیت کے دوش بدوش ، اہلیت کا صائب و موزوں مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہوا - یعنی یہ کہ جو کمال آفرینی چاہتا تھا ، وہ کرسکا اور اس میں ایرانی ترنم سرائی کا مزاج بھی پیدا کرسکا - یہی وہ پہلو ہے جو اس کو پیش رو کہلواتا ہے اور جس کی نا فہمی سے معاشرہ ناحق اس کا دشمن بنا -

ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں بیدل کا انداز بیان نادر و بدیع ہے ۔
غالب اس کی ندارت و بداعت کا نہ صرف معترف بلکہ مداح بھی ہے :

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

اسد تخلص سے ظاہر ہے کہ غالب میں یہ شعور اپنے دور شعری کے آغاز ہی میں پیدا ہو گیا تھا ۔ اس مقطع میں ' طرز بیدل ' کا مفہوم فارسی کیف و مزاج کی تراکیب کے ساتھ شعر کہنے کا مترادف ہے ۔ اس کی نوا فجائیہ ہے اور فجائیت میں سوال کے ساتھ نفی بھی حلول ہے ۔ یعنی میرے لیے دشوار نہیں ہے ، اگر قیامت سمجھا جاتا ہے تو میں یہ قیامت برپا کر سکتا ہوں ۔

[غالب سے متعلق کتاب کا ایک باب]

غالب کا اجتماعی احساس

(خطوط کے آیئنے میں)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

برعظیم پاک و ھند میں مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ سیاسی کشمکش کا جو سلسلہ شروع ھوا ، وہ غالب کے زمانے تک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ھو چکا تھا ۔ ملک کے بیشتر حصوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی عمل‌داری قائم ھوگئی تھی ۔ مرھٹہ جنگ (۱۸۰۳ء - ۱۸۰۵ء) میں لارڈلیک نے ۱۸۰۳ء میں آگرے سے بڑھ کر دھلی پر قبضہ کیا۔ مرزا غالب کے حقیقی چچا نصراللہ بیگ ان فتوحات میں جنرل لیک کے ساتھ تھے ۔ فتح دھلی کے بعد کٹ پتلی مغل بادشاہ (شاہ عالم ثانی) جو پہلے مرھٹوں کے زیر اثر تھا ، اب کمپنی کے کنٹرول میں آ گیا ۔ اس کے بعد برعظیم میں کوئی ایسی بڑی قوت موجود نہیں تھی جو کمپنی کی یلغار کو روک سکے ۔ پنجاب کی سکھا شاھی ، کمپنی کے مقبوضات اور افغان سلطنت کے مابین ایک عارضی بفر سٹیٹ کا کام دے رھی تھی ۔ کمپنی کی باج گزار دیسی ریاستیں 'سب سڈی ایری سسٹم ' اور الحاق کی حکمت عملی کے تحت جاں کنی کی حالت میں تھیں ۔ اس طرح عملاً سارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں آچکا تھا اور کشت وخون کا وہ بازار قدرے سرد پڑگیا تھا ، جو اٹھارویں صدی میں مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی کمزوری کی وجہ سے خاصا گرم رھا تھا ۔ نظم و نسق کے قیام سے اجتماعی زندگی بظاھر پر سکون ھوگئی تھی ۔ کاروبار ، رسل و رسائل اور زراعت وغیرہ معمول پر آ گئے تھے ۔ اجڑے ھوئے نگر آباد ھونے لگے تھے ۔ کمپنی کا مرکز حکومت اگرچہ کلکتہ تھا ، لیکن دھلی انگریزی تسلط کے بعد پھر آباد ھونے اور اپنا کھویا ھوا وقار بحال کرنے لگی ۔ لال قلعے کا شاھی اقتدار تو

ایک عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن برائے نام مغل بادشاہ کے نام سے اس کا ایک بھرم سا باقی رہ گیا تھا ۔

سیاسی کشمکش یا جنگ و جدل کا سلسلہ ختم ہوکر ماحول بظاہر پرسکون ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی جنگ کا ایک دوسرا مرحلہ شروع ہوگیا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار نے ملک سے بد امنی اور شورش تو ختم کردی ، لیکن خود یہ اقتدار جس صورت میں قائم ہوا وہ یہاں کے تاریخی حالات اور تہذیبی روایات کے منافی تھا ۔ اگر مغل سلطنت کو ختم کر کے برسراقتدار آنے والی طاقت یہاں کے حالات و روایات کے مطابق ہوتی اور حاکم و محکوم کے درمیان رنگ و نسل اور تہذیب و تمدن کی مغائرت کی اونچی دیواریں حائل نہ ہوتیں ، تو یہ انقلاب حکومت ملک کے لیے بڑا خوش آیند ہوتا ۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ نئے فاتحین اجنبی تھے اور اجنبی بن کر ہی یہاں اپنا راج قائم کرنا اور ملکی دولت کا استعمال کرنا چاہتے تھے ۔ سامراج کا یہ وہ انوکھا روپ تھا جس سے برعظیم کے باشندوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا ۔ اس لیے قدرتی طور پر نئے نظام حکومت سے یہاں کے باشندوں کی ذہنی و جذباتی مفاہمت ممکن نہیں تھی ۔ مغل سلطنت جیسی تھی یہاں کے باشندوں کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک طرح کی قومی حکومت کا درجہ رکھتی تھی ۔ کمپنی کی حکومت نفسیاتی طور پر اس کی جگہ پر نہیں کر سکتی تھی ۔ اس لیے کمپنی کی عملداری قائم ہوجانے کے باوجود ملک کے جمہور ذہنی طور پر برائے نام مغل بادشاہ سے عقیدت رکھتے تھے ۔

کمپنی کی حکومت کے قیام کے ساتھ ملک میں جو معاشی ، تعلیمی ، تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور میں آرہی تھیں ، اُن کو جمہور بجا طور پر شک اور شبہے کی نظر سے دیکھ رہے تھے ۔ لیکن چونکہ عملاً بے بس ہو چکے تھے ، اس لیے بے چینی اور اضطراب کی ایک داخلی لہر تھی جو قلب و ذہن میں پھیلتی جارہی تھی ۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ذہنی و جذباتی کشمکش کا یہ سلسلہ شروع ہوا ، اور کمپنی کے مقبوضات میں توسیع کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی اضطراب بھی بڑھتا گیا ۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں یہ آتش فشاں لاوا انتہا تک پہنچ کر پھوٹ پڑا ۔ لاکھوں انسانوں کی قربانی لے کر یہ آگ فرو ہوئی اور برعظیم پر اجنبی سامراج کا تسلط ایک تاریخی حقیقت بن گیا ۔

غالب کی ذہنی نشو و نما اس پر اضطراب اجتماعی ماحول میں ہوئی ۔

والد اور چچا کی وفات کے بعد بچپن ہی سے انھیں سنگین حالات سے دوچار ہونا ، اور آرزوؤں اور خواہشوں کی لامتناہی فضاؤں میں رہتے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہو کر اپنا راستہ بنانا پڑا ۔ غالب ایک رومانی ادیب و شاعر تھے لیکن عملی زندگی میں ہم انھیں ایک حقیقت پسند اور معاملہ فہم انسان کی طرح اپنے نجی مسائل و معاملات سلجھاتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ اپنی پنشن کے جھگڑے کے سلسلے میں کلکتے تک کا سفر ، سرکار انگری میں اپنے موروثی تعلقات کی بنا پر حصول عزت وجاہ کی کوشش ، قلعۂ معلیٰ کے وظیفے اور مصاحبت شاہ کے علی الرغم ''کوئین ہوئیٹ '' بننے کے لیے تگ و دو ، یہ وہ مراحل تھے جن سے وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے گزرے ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت کی نہ تو خیر خواہی کی اور نہ ہی اس سے کوئی بے وفائی کی (۱) ، اور پھر انقلاب کے بعد جب ملکی باشندے جرم و سزا کے شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے تھے ، غالب کا اپنی پنشن کی بحالی کے لیے کوشش کرنا اور حکام سے رابطہ قائم کر کے اپنے بارے میں شکوک و شبہات کو رفع کرنا ، یہ سب باتیں عملی زندگی میں ذاتی سطح پر بڑی حقیقت پسندانہ ہیں ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کاروبار زندگی میں اپنے ماحول سے مفاہمت کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور جیسا موقع ہوتا تھا اُس کے مطابق کارروائی عمل میں لاتے تھے :

'' چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو ۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے ، ویسا عمل میں آتا ہے '' ۔

[خط بنام میر مہدی مجروح ، خطوط غالب ، مرتبہ مہر ، صفحہ ۲۹۲]

عملی زندگی کا یہ وہ میدان تھا جس میں ایک عام دنیا دار فرد کی حیثیت سے غالب کو حالات سے مفاہمت کرکے زیست کو اپنے اور اپنے لواحقین کے لیے خوشگوار بنانا پڑ رہا تھا ۔ بعض اوقات اپنی مطلب براری کے لیے غالب خودداری کے معروف مفہوم سے بھی گزر کر حالات سے سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں ۔ یہ بات اُن کی شاعرانہ انا کے برعکس معلوم ہوتی ہے (۲) ۔ لیکن

۱۔ بحوالہ مکاتیب غالب ، خط نمبر ۱۶ ، مرقومہ ۷ نومبر ۱۸۵۹ء

۲۔ شاعری میں تو غالب کی خود شناسی کا یہ عالم ہے کہ :

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس واقعہ کا کیا کیجیے۔ جو لوگ غالب کو ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے دیکھتے اور انہیں بشری کمزوریوں سے مبرا سمجھتے ہیں، اُن کے لیے شاید یہ باتیں ناقابل قبول ہوں ، لیکن حقیقت موجود ہو تو اس سے گریز اچھا نہیں ہوتا۔ غالب کو ایک عام فرد کی طرح زندگی میں اگر اس طرح کے سمجھوتے کرنے پڑے تو اس میں اُن کی بشری کمزوریاں اور حالات کی مجبوریاں بھی قابل لحاظ ہیں ۔ لیکن جہاں تک اُن کے ذہنی عمل اور شاعرانہ فکر و احساس کا تعلق ہے، ضروری نہیں کہ عملی زندگی کی یہ مفاہمتیں اس کے راستے میں بھی حائل ہوئی ہوں ۔ شاعر کا جسم اگر حالات کا پابند ہوتا ہے تو یہ لازمی امر نہیں کہ اس کی روح بھی حالات میں جکڑی ہوئی ہو۔ ایک انسان کی زندگی کو یوں دو خانوں میں تقسیم کرنا طبیعی لحاظ سے شاید ممکن نہ ہو ، مگر اس کا کیا جائے کہ شاعر اور فن کار اس معاملے میں بالعموم دو دنیاؤں میں گھومتے نظر آتے ہیں ۔ ایک دنیا ہم آپ اور شاعر سب کی ہے، اور دوسری آرزو کی وہ دنیا جہاں شاعر کا فکر و احساس مادی آرائشوں سے قدرے بلند ہوکر تخیل کے وسیع مرغزاروں کی گلگشت کرتا ہے۔ تخیل اور حقیقت کی یہ کشمکش زندگی میں لازمی ہے۔ انسان جتنا زیادہ حساس ہوگا ، اتنی ہی زیادہ یہ کشمکش شدید ہوگی ۔ غالب کا اجتماعی احساس اس لحاظ سے غالب کے اس طرز عمل سے ، جو عام کاروبار زیست میں حالات سے مفاہمت کے اصول پر مبنی ہے، خاصا الگ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اظہار اُن کی شاعری میں بھی ہوا ہے اور خطوط میں بھی ۔ چونکہ شاعری میں (خصوصاً غزل میں) صراحت کم اور خارجی ماحول کے بارے میں رمز و کنایہ کا انداز زیادہ ہوتا ہے، اس لیے یہاں فکر و احساس کی صحیح جہت کا اندازہ لگانا قدرے دشوار ہے ۔ خطوط میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہاں ہم شاعری کی بحث کو الگ رکھتے ہوئے خطوط کے آیئنے میں غالب کے اجتماعی احساس کا مطالعہ کرتے ہیں ، تاکہ ذہنی کشمکش کے اس دور میں غالب کی سوچ کا یہ رخ واضح ہوجائے ۔ پھر اس کے حوالے سے اُن کی شاعری کا تجزیہ بھی آسانی سے ہو سکتا ہے ۔

خطوط غالب میں ایک رویہ تو حالات سے مفاہمت اور موقع کے مطابق کارروائی کرنے کا ملتا ہے ، جو غالب کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کو ظاہر کرتا ہے۔ معاملے کے اس پہلو کے علاوہ خطوط غالب میں حالات و واقعات کے

بارے میں وہ ذہنی رد عمل بھی ملتا ہے، جس کا تعلق محض غالب کی ذات سے نہیں بلکہ اُن کے اجتماعی ماحول سے تھا ۔ اس ذہنی رد عمل سے ہم غالب کے اجتماعی احساس کا اندازہ کرسکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے قلب و ذہن میں اس انقلاب زمانہ پر کیا محسوس کر رہے تھے ۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل کمپنی کے پنشن خوار اور شاہ کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے غالب کی روزی کا سامان بنا ہوا تھا ۔ کمپنی کی حکومت میں مغل بادشاہت کی آخری نشانی کا وجود نفسیاتی طور پر کشمکش کا ایک اہم مظہر تھا ۔ اگرچہ یہ کشمکش ایک نقطہٗ ارتقا کی طرف بڑھ رہی تھی اور سوچنے والے لوگوں کے ذہن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے ۔ خصوصاً الحاق کی پالیسی کے مطابق جس طرح دیسی ریاستیں اور موروثی امارتیں ختم کی جارہی تھیں ، اس سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آگئی تھی کہ مغل بادشاہت کی آخری نشانی اب قلعہٗ معلیٰ میں آخری دموں پر ہے ۔ ۱۸۵۶ء میں انتزاع سلطنت اودھ ایک بڑے حادثے کی طرح ظہور میں آیا ۔ یہ حادثہ بھی آیندہ حادثات کا پیش خیمہ تھا ۔ غالب نے اس موقع پر جو کچھ محسوس کیا ، اس کا اظہار ایک دوست کے نام خط میں اس طرح کیا :

> " ... آپ ملاحظہ فرمائیں ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے ؟ اور کی فیض رسانی اور قدر دانی کو کیا روئیں ، اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں ۔ تباہیٗ ریاست اودھ نے با آنکہ بیگانہٗ محض ہوں ، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا ، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے ، اللہ ہی اللہ ہے ! "

[خط بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی ، ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء]

انقلاب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ۱۱ مئی کو برپا ہوا ۔ یہ خط ۲۳ فروری کو یعنی اس واقعہ سے تقریباً ڈھائی ماہ پیشتر لکھا گیا ۔ اس میں جس واقعے (انتزاع سلطنت اودھ) پر افسردہ دلی کا اظہار کیا گیا ہے ، وہ اُن بے شمار واقعات میں سے ایک تھا ، جو بتدریج کشمکش کو تیز تر اور انقلاب کے ہنگامے کو قریب تر لارہے تھے ۔ خود دھلی کی ' بزم آخر ' میں ، خصوصاً اس کی ٹمٹماتی ہوئی آخری شمع ' قلعہٗ معلیٰ ' میں جو کچھ ہو رہا تھا ، وہ

سب غالب کی نگاہوں کے سامنے تھا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جس تدریج کے ساتھ اس شمع کو گل کرنے کے لیے اقدامات کر رہی تھی اور لال قلعے کے بے دست و پا تاجدار اور اس کے وابستگان دامن دولت جس بے بسی سے ان حالات کے بہاؤ میں بہہ رہے تھے ، اس کا اندازہ اس خط سے لگایے جو واقعہ' انقلاب سے تین برس پیشتر لکھا گیا :

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا ۔ قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں ۔ وہاں کے مصرع طرحی کو کیا کیجیے گا ، اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا ؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا ، اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے ، اس کو دوام کہاں ؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو ، اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو'' !

[بنام قاضی عبدالجمیل جنون ، ۱۸۵۴ء ، خطوط غالب ، ص ۵۲۰]

آخر وہ حادثہ پیش آ کر رہا جس کا ایک مدت سے انتظار تھا ۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو انقلاب کا آغاز ہوا ، اور کمپنی کی باغی سپاہ نے دہلی پہنچ کر مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے نام پر یہاں کا نظم ونسق سنبھالا ۔ ستمبر ۱۸۵۷ء کے تیسرے ہفتے میں انگریزی سپاہ ، سکھ لشکر کی معیت میں دوبارہ دہلی پر قابض ہوئی اور 'کالوں' کے ہنگامے کے بعد 'گوروں' کی انتقامی کارروائی اور قتل و غارت گری شروع ہوئی ۔ اس طرح برعظیم کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ دہلی میں مغلیہ بادشاہت کی آخری شمع بجھ گئی ۔ اس کے ساتھ کمپنی کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آ گیا ۔

یہ انقلاب عظیم غالب کی نگاہوں کے سامنے برپا ہوا ۔ وہ اس خونین ہنگامے کے عینی شاہد ، بلکہ اس قلزم خوں کے شناور تھے (۱) ۔ ہر چند کہ ہنگامہ' انقلاب کے فرو ہو جانے کے بعد روزی کی مشکلات اور پنشن کی باز یافت کے لیے غالب کو وہ سب کچھ کرنا پڑا ، جو ایک عام دنیا دار انسان

۱- '' میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں '' ۔ [خط بنام چودھری عبدالغفور سرور ، ستمبر ۱۸۶۰ء]

ایسے حالات میں کرتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُن کا اجتماعی احساس اس تہذیبی المیے پر خون کے آنسو بہائے بغیر بھی نہ رہ سکا ۔ خون جگر کے ان قطروں کی تھوڑی سی جھلک تو اس قطعے میں ملتی ہے جو غالب نے علاءالدین علائی کے نام ایک خط (محررہ ۱۸۵۸ء) میں لکھا ہے :

بسکہ فعال مایرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے ، یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

اس کے علاوہ خطوط میں بھی غالب نے اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا ہے ۔ یہ اظہار وہ برملا نہیں کر سکتے تھے ۔ انگریزی دار و گیر میں صاف صاف لکھنا اور اسے ڈاک کے سپرد کرنا ممکن نہیں تھا (۱) ۔ پھر بھی غالب

۱- اس ذہنی گھٹن کا اظہار غالب کے بعض خطوں میں ہوا ہے ، مثلاً:

" آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں ۔ خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو ۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا ۔ ورنہ قصہ مختصر ، تمام ہوا ۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں "۔

[خط بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب ، ۸ فروری ۱۸۵۸ء]

" مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے ۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں " ۔

[خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ ، ۵ دسمبر ۱۸۵۶ء]

(جاری)

نے واقعۂ انقلاب کے سلسلے میں حالات و کوائف بیان کرتے ہوئے دبے دبے الفاظ میں اپنے تاثرات و احساسات بھی پیش کردیے ہیں۔ انقلاب کے بارے میں مذکورہ بالا قطعے کے علاوہ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں اس سانحۂ عظیم کو وہ جس خیال انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں، اس سے اُن کے دل کی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا، اور میں جس شہر میں ہوں، اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ

(سابقہ صفحے سے)

"انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا"۔

[خط بنام حکیم غلام نجف خاں، ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء]

"قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے، مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے، تو کہہ لیں گے، ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون"۔

[ایضاً، ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء]

ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں"۔

[شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء، خطوط غالب، مرتبہ مہر، صفحہ ۱۰۲]

اس انقلاب عظیم کو دو جملوں کی تمثیل سے بہتر انداز میں پیش کرنا غیر ممکن ہے!

دہلی اور لکھنؤ کے قدیم تہذیبی گہواروں کا مٹنا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ غالب نے اس پر کوئی باقاعدہ مرثیہ تو نہیں لکھا لیکن وہ اس تہذیبی المیے کو محسوس کیے اور مضطرب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس احساس و اضطراب کا اظہار خطوط میں جا بجا ہوا ہے:

"خداوند نعمت، کیا تم دلی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو، جو حضرت شیخ (۱) کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخرالدین علیہ الرحمہ کا حال پوچھتے ہو؟ این دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد"۔

[خطوط غالب، مرتبہ مہر، صفحہ ۴۳۰]

"لکھنؤ کا کیا کہنا، وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی، جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اس کی یہ فصل خزاں!"

[خطوط غالب، صفحہ ۴۳۷]

"بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا"۔

[خطوط غالب، صفحہ ۲۹۳]

۱- شیخ کلیم اللہ جہان آبادی (بحوالہ خطوط غالب، مرتبہ مہر)

" بھائی ، ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا - لاکھوں مر گئے - جو زندہ ہیں ، ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں - "

[خطوط غالب ، صفحہ ۲۰۶]

" پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا - پہلا باغیوں کا لشکر ، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا - دوسرا لشکر خاکیوں کا (۱) ، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے - تیسرا لشکر کال کا ، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے - چوتھا لشکر ہیضے کا ، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے - پانچواں لشکر تپ کا ، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی " -

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۶۷]

" ۷ نومبر ، ۱۴ جمادی الاول سال حال (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے - اناللہ و انا الیہ راجعون - "

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۱۴]

واقعۂ انقلاب کے نتیجے میں مجلسی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ، اسے تو غالب نے بہت ہی شدت سے محسوس کیا بلکہ غالب کی اردو خطوط نویسی اسی مجلسی خلا کو پر کرنے کی ایک کوشش تھی جس کے لیے انھوں نے مراسلے کو مکالمے کی صورت دی ہے - صاحب عزت لوگوں کا دار و گیر کا شکار ہونا اور احباب کا شہر بدر ہو کر بچھڑ جانا ، ایک ایسا اجتماعی حادثہ تھا جسے غالب نے نجی طور پر بھی محسوس کیا اور اجتماعی طور پر بھی وہ اس سے متاثر ہوئے :

" مگر دیکھا چاہیے ، درخت جگہ سے اکھڑ کر بدشواری جمتا ہے - خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں - "

[بنام میر مہدی مجروح ، ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء]

۱- یعنی انگریزوں کا جن کی وردی خاکی تھی -

غالب نے اپنے احباب کے نام کئی خطوں میں دھلی کی بربادی اور پھر اس کی بتدریج آبادی کے سلسلے میں متعدد واقعات بیان کیے ھیں ۔ یہ بیانات اس دور کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے سلسے میں بہت اہم ھیں ۔ واقعات کے بیان کے ضمن میں بعض جگہ وہ اھم سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنے تاثرات بھی پیش کر جاتے ھیں ۔ ان تاثرات کی روشنی میں ہم اس نازک دور کی ذھنی کیفیات کی ایک جھلک دیکھ سکتے ھیں ۔ مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جو اھم سیاسی تبدیلیاں ھوئیں، ان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ اور برعظیم کا براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آنا تھا ۔ غالب اس تبدیلی پر اطمینان کا اظہار کرتے ھوئے ایک خط میں لکھتے ھیں :

" حضرت، یہاں دو چیزیں مشہور ھیں، ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاھتا ھوں ۔ ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ھیں کہ آگرے میں اشتہار جاری ھو گیا ھے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ھے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاھی عمل ھندوستان میں ھوگیا ۔ دوسری خبر یہ کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ کے چیف سکرٹر اکبر آباد کے لفٹنٹ گورنر ھو گئے ۔ خبریں دونوں اچھی ھیں خدا کرے سچ ھوں " ۔

[بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء]

یہ ایک تاریخی حقیقت ھے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں برعظیم کے سب باشندے بلا امتیاز مذھب و ملت شریک تھے ۔ لیکن آتش انقلاب کے فرو ھونے کے بعد برطانوی حکومت نے سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا اور 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی حکمت پر عمل کرتے ھوئے ھندووں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کی بیخ کنی کا سلسلہ شروع ھوا ۔ دھلی میں مسلمانوں کو شہر بدر کرنے اور مسلمان شرفا کے دار و گیر کا شکار ھونے کے اکثر واقعات خطوط غالب میں بیان ھوئے ھیں، جن سے ھندو مسلم کی اس نئی سامراجی تفریق کا اظہار ھوتا ھے ۔ بعض جگہ معاملہ اس سے مختلف بھی تھا ۔ مثلاً لکھنؤ کے بارے میں غالب ایک خط میں لکھتے ھیں :

" بھائی، لکھنؤ میں وہ امن و امان ھے کہ نہ ھندوستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ھوگا، نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے

اور ایک نقل سنو ، وہاں انگریزی عمل‌داری میں یہ چین ہوگا ...... جو دیکھا کہ عملے میں ہنود کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں ' اہل اسلام نہیں ، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا ۔ یہ آفت تو دلی پر ٹوٹ پڑی ہے ۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عمل‌داری کی وہ صورت ہے ، جو غدر سے پہلے تھی ۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں ۔ میں نے بھی دیکھے ۔ فارسی عبارت یہ ہے ,, ٹکٹ آبادی درون شہر دھلی بشرط ادخال جرمانہ '' ۔ مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے ۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے ''۔

[بنام میری مہدی مجروح ' فروری ۱۸۵۹ء]

نئے دفتری نظام کے بارے میں بھی غالب نے اپنے بعض خطوط میں اظہار خیال کیا ہے ۔ ہنگامہ' انقلاب کے بعد غالب نے اپنی پنشن کی بازیافت کے لیے جو کوششیں کیں اور اس سلسلے میں انھیں جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ' اس کا اظہار بھی خطوط میں خاصی تفصیل سے ہوا ہے ۔ انگریز حکام سے ملاقاتوں میں بعض اوقات عزت نفس کو ٹھیس لگتی تو وہ صبر کا دامن پکڑتے ' اور جب کبھی باریابی کے موقع پر حسن سلوک کا اظہار ہوتا تو حکام کی تعریف و توصیف کے پل باندھتے ۔ اس طرح غالب کو دفتری نظام کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا ۔ بعض موقعوں پر انھوں نے دفتری نظام پر تنقید بھی کی ہے ۔ خصوصاً انقلاب کے بعد ہنگامی حالات میں ' سکھا شاہی ' کی طرح ' گورا شاہی ' کا جو سلسلہ دراز رہا ، غالب نے اُس کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار جابجا کیا ہے :

,, نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی ، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہوجائیں ۔ حکام بے پروا ، مختار عدیم الفرصت ، میں پا شکستہ ... ''

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۰۰]

,, تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھوگے ۔ کیسا نوند رائے ، کیسی نقل حکم ، کیسا مرافعہ جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں ، وہ احکام قضا و قدر ہیں ۔

ان کا مرافعہ کہیں نہیں ۔ "

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۰۳]

" ایک لطیفہ پرسوں کا سنو ۔ حافظ ممو بے گناہ ثابت ہوچکے ، رہائی پا چکے ۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں ۔ املاک اپنی مانگتے ہیں ۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہوچکا ، صرف حکم کی دیر ۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے ، مسل پیش ہوئی ۔ حاکم نے پوچھا : حافظ محمد بخش کون ؟ عرض کیا کہ ' میں ' ۔ پھر پوچھا : حافظ ممو کون ؟ عرض کیا کہ ' میں ' اصل نام میرا محمد بخش ہے ' ممو ممو مشہور ہوں ' ۔ فرمایا : یہ کچھ بات نہیں ۔ حافظ محمد بخش بھی تم ، حافظ ممو بھی تم ، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم ۔ ہم مکان کس کو دیں ؟ مسل داخل دفتر ہوئی ۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے " ۔

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۰۵]

" اے لو ، کئی دن ہوئے حمید خاں گرفتار آیا ہے ۔ پاؤں میں بیڑیاں ، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ، حوالات میں ہیں ۔ دیکھیے حکم اخیر کیا ہو ۔ صرف نوند رائے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی ، جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہے گا ۔ ہر شخص کی سر نوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں ۔ نہ کوئی قانون ہے ، نہ قاعدہ ہے ، نہ نظیر کام آئے ، نہ تقریر پیش جائے " ۔

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۰۶]

" زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے گا کہ دلی کی عمل داری میرٹھ اور آگرہ اور بلاد شرقیہ کی مثل ہے ۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے ، نہ قانون ' نہ آئین ۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے ، وہ ایسا ہی کرے " ۔

[خطوط غالب ، صفحہ ۳۷۶]

غالب کے اشک غم کی جھلک یوں تو علائی ، تفتہ اور مجروح کے نام خطوط میں جا بجا ملتی ہے ، لیکن یوسف مرزا کے نام مندرجہ ذیل خط میں انہوں نے جس طرح اپنے ذاتی اور اجتماعی غم کی روداد بیان کی ہے ، اس سے

ان کے داخلی جذبات و احساسات پوری طرح واضح ہوتے ہیں۔ ہر حالت میں خوش رہنے اور زندہ دلی کا احساس دلانے والا غالب ہجوم غم کے آگے سپر انداز تو نہیں ہوتا لیکن شدت کرب سے تڑپ ضرور اٹھتا ہے:

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں ، پیالا و ساغر نہیں ہوں میں

" یوسف مرزا، میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا ۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں ، عقل جاتی رہتی ہے ۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو کیا عجب ہے ، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے ۔ پوچھو کہ غم کیا ہے ؟ غم مرگ ، غم فراق ، غم رزق ، غم عزت ۔ غم مرگ میں قلعہ' نا مبارک (۱) سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں ۔ مظفرالدولہ ، میر ناصر الدین ، میرزا عاشور بیگ ، میرا بھانجا ، اس کا بیٹا احمد میرزا ، انیس برس کا بچہ ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں ، قاضی فیض اللہ ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا ؟ اے لو ، بھول گیا ۔ حکیم رضی الدین احمد خاں ، میر احمد حسین میکش ، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں ؟ غم فراق حسین میرزا ، میر مہدی ، میر سرفراز حسین ، میرن صاحب ، خدا ان کو جیتا رکھے ۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے ، وہاں خوش ہوتے ! گھر ان کے بے چراغ ، وہ خود آوارہ ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں ' کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے ۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے ، مگر میں علی کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے ۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ ہوگیا۔ اس کی بیٹی ، اس کے چار بچے ، اس کی ماں یعنی میری بھاوج ، جے پور میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا ۔ بھتیجی کیا کہتی

۱- لال قلعے کو مبارک کہتے تھے ۔ اس کے حوادث کی وجہ سے غالب کو پے در پے رنج پہنچے تو شدت غم میں اسے ' نا مبارک ' کہہ دیا۔

ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں ! اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں ۔ ایک بیوی ، دو بچے ، تین چار آدمی گھر کے ، کلو ، کلیان ، ایاز ، یہ باہر مداری کی جورو بچے بدستور ' گویا مداری موجود ہے ۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں ، اچھا بھائی تم بھی رہو ۔ ایک پیسے کی آمد نہیں ' بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود ۔ مقام معلوم (۱) سے کچھ آئے جاتا ہے اور بقدر سد رمق ہے ۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے ۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے ۔ آدمی ہوں ۔ دیو نہیں ، بھوت نہیں ۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں ؟ "

[۲ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ / ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء]

ذاتی اور اجتماعی ماحول کے اس دکھ ساگر میں سانس لیتے ہوئے بھی غالب نے اگر خوش طبعی کے دیپ جلائے ، تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے !

۱- رام پور۔

(بحوالہ خطوط غالب ، مرتبہ مہر ، صفحہ ۲۱۱)

اسٹوڈنٹس اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے

نئے ایڈیشن

کی چند

خصوصیات

- یہ لغت اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے تیار ہوئی۔ اس لیے اس کی جامعیت، افادیت اور صحت مطالعہ کو درجہ استناد حاصل ہے۔
- اس میں انگریزی زبان کے تمام مروجہ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں۔
- انگریزی الفاظ کے صرف اردو مترادفات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ضروری جگہوں پر الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔
- اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انگریزی کے محاورے یا روز مرہ لیے اردو محاورہ یا روز مرہ، انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اس طرح درج کی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔
- انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو مترادف الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں معانی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آ سکے۔ ہر معنی کا فرق مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے۔
- باطنی حسن کے ساتھ صوری اعتبار سے بھی خاص ایڈیشن اپنی مثال آپ ہے۔ اسے اعلی درجے کے بائیبل پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ یہ کاغذ خاص طور پر اس ایڈیشن کے لئے درآمد کیا گیا ہے۔

یہ ایڈیشن

محدود تعداد میں شائع کیا گیا ہے اس لیے اپنا نسخہ جلد از جلد حاصل کر لیں

ایک ساتھ دو نسخے منگوانے پر محصول ڈاک معاف

غالب ، مرات الاشباہ اور حکیم احسن اللہ

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

۱۹۶۷ء میں برٹش میوزیم لندن میں فارسی مخطوطہ بنام "مرأت الاشباہ" دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ اس کی تفصیل فہرست نگار ڈاکٹر چارلیس ریو نے یوں دی ہے :

> "مرأت الاشباہ ۔ سلاطین آسمان جاہ ، سلاطین تیموریہ ہندوستان کی یہ جدولیں ان کی تاریخ پیدائش ، مقام جلوس ، تاریخ وفات وغیرہ (مع مختصر حالات) بہم پہنچاتی ہیں ۔ اس کا مصنف فخرالدین حسین ہے ۔ اس میں امیر تیمور سے لے کر اس کے جانشین ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ (جو ۱۲۵۳ھ میں تخت نشین ہوا) کے تیرھویں سال جلوس (مطابق ۱۲۶۶ھ) تک کا بیان ہے ۔ اس کے مصنف نے اسے حکیم احسن اللہ خاں ، مصور غلام علی خاں اور باہر علی خاں کی اعانت سے سر انجام دیا ہے ۔ اس میں جگہ چھوڑ دی گئی ہے تاکہ اسے معاصر تصاویر شاہان سے مکمل کیا جائے " ۔

(فہرست فارسی مخطوطات ، صفحہ ۲۸۰)

آج تک اس مختصر فارسی مخطوطے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی ۔ غالب کے ضمن میں حکیم احسن اللہ خاں کی شخصیت خاصی اہمیت رکھتی ہے ۔ میری نظر سے "مرأت الاشباہ" (فارسی) مطبوعہ صورت میں نہیں گزری ، خیال ہے کہ ہنوز طبع نہیں ہوئی ۔

خوش قسمتی سے "مرأت الاشباہ" کا اردو ترجمہ مطبوعہ صورت میں میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے جو ۱۸۷۸ء میں طبع ہوا تھا ۔ مطبوعہ

کتاب کے چھ صفحات کا عکس جو براہ راست غالب سے تعلق رکھتے ہیں ، یہاں پیش کرتا ہوں ۔ پہلے عکس سے یہ واضح ہے: ''کتاب لب لباب حالات فرمارواپان ہند مسمی بہ مرأت الاشباہ معہ مختصر حالات وزرائے اودھ مولفہ من مہتمم مطبع ہذا المتخلص بہ شیدا در مطبع مرتضوی محمد ارتضیٰ خاں طبع نمود ۱۸۶۸ء'' ۔ دوسرا عکس مطبوعہ کتاب کا صفحہ' اول ہے جس سے واضح ہے کہ محمد ارتضیٰ خان مہتمم مطبع مرتضوی دھلی نے رسالہ مرأت الاشباہ (مولفہ احترام الدولہ ، عمدۃ الحکما ، معتمد الملک ، حاذق العہد و الاّوان حکیم احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ) کو لوگوں کے اصرار پر فارسی سے اردو میں عبارت سلیس اور عام فہم میں خلاصہ کیا اور کچھ مختصر حالات دیگر کتب تاریخ سے لے کر ناظرین کی خاطر اضافہ کیے ۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مرأت الاشباہ کے مصنف حکیم احسن اللہ خان تھے ۔ نیز یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی اردو تلخیص (مع اضافہ) ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی ۔ یاد رہے کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا ۔

تیسرے اور چوتھے عکس کا تعلق کتاب کے صفحات ۶۷ و ۶۸ سے ہے ۔ ان میں شعرائے دھلی کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ترجمہ' غالب انھیں صفحات میں ہے ۔ پانچویں اور چھٹے عکس مرأت الاشباہ کے آخری صفحات ۱۰۳ و ۱۰۴ کے ہیں ، جن سے کتاب کی اہمیت واضح ہوتی ہے ۔ (۱)

حکیم احسن اللہ خان سر سید کے معاصرین میں سے تھے ۔ سرسید نے حکیم احسن اللہ کا ذکر اپنی تالیف '' آثار الصنادید '' (مولفہ ۱۸۴۰ء) میں تذکرہ' اھل دھلی کے تحت کیا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کا خاندان ھراتی الاصل تھا اور کشمیر میں آ کبر آباد ہوا تھا ۔ کشمیر میں

۱- مرأت الاشباہ کی طباعت پر پہلا قطعہ محمد مظہر حسن مظہر نامی شاعر کا ہے ۔ مظہر کا حال تذکرہ' سخن شعرا میں صفحہ ۴۴۸ پر ملتا ہے ۔ دوسرا قطعہ سید جمعیت علی کا ہے ۔ آخری تین قطعات محمد صادق علی مداح کے ہیں جو مرزا غالب کے شاگرد تھے ، ان کا ذکر بھی تذکرہ' سخن شعرا میں صفحہ ۴۲۶ پر ملتا ہے ۔ ان قطعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دھلی میں ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں طبع ہو گئی تھی ۔
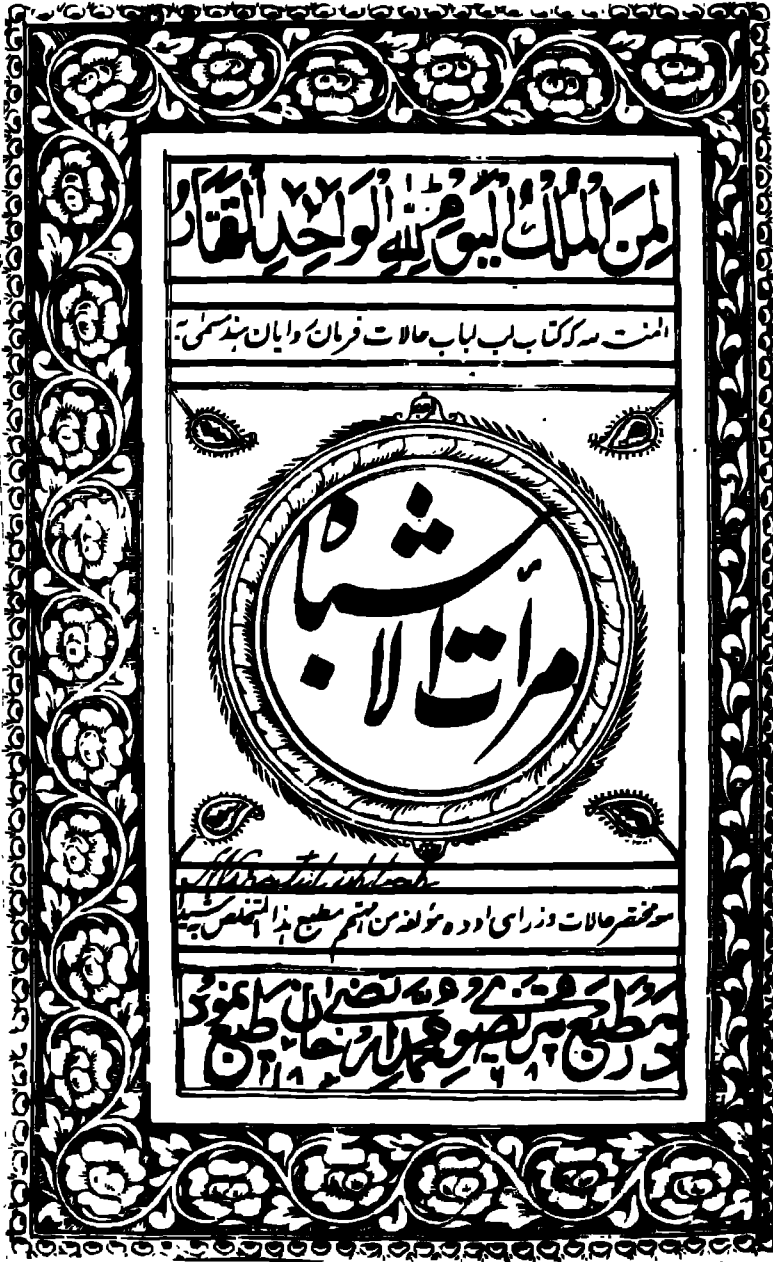
لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار

المنت للہ کہ کتاب لب لباب حالات فرمانروایان ہند مسمی بہ

مرآت الاشباہ

مع مختصر حالات وزرای اودہ مؤلفہ من مہتمم مطبع ہذا المتخلص بہ شہید

در مطبع منشی محمد تفضل حسین خان طبع شد

عکس - ۱

جناب حکیم محمد نسیم الدین خان انکی اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ احاطۂ تحریر اور حیطۂ تقریر
سے باہر ہیں اور واسطے حضرت کے مروت جبلی اور خلق طبیعی ہے ماہر ہیں شافی مطلق نے
ید و دست شفا بخشا ہے کہ آجتک دیکھا نہ سنا ہے جو مریض ایسا ہو انکی علاج سے ایک دم میں اچھا ہو

حکیم حسام الدینخان عرف حکیم منجھلے صاحب

حکیم یگانہ ملک حبیب بزرجمہر افلاطون زمان حکیم حسام الدینخان خلف الصدق حکیم محمد بخش خان
مرحوم مغفور یہ صاحب نبض شناسی میں یگانہ اور مرض دانی میں مشہور زمانہ ہیں
بیشتر علاج آنکھوں کا کرتے ہیں نابینا کو چشم زدن میں بینا کرتی ہیں گل نرگس ان سے
جامہ بدن چاہے تو بجا ہے اور صنوبر علاج خفقان کیواسطے ان سے رجوع لائے تو زیبا ہے

حکیم محمد علی خانصاحب

نباض لاثانی مشخص امراض اندرانی ارسطو فطرت افلاطون حکمت مسیح الزمان حکیم محمد علیخان
ابن حکیم نصر اللہ خان صاحب مرحوم یہ صاحب فن طب میں یکتای جہان اور مستعد
علامۂ زمان ہیں ایک دامن اخلاق وسیع اور کشادہ ہے طبیعت حضرت کی ہمیشہ متواضع
و تکریم آمادہ ہے بالفعل نواب والی دوجانہ کی سرکار میں مامور ہیں فن کتابت میں شہرہ نزدیک

شعرای دہلی

جناب مرزا اسد اللہ خان غالب

عندلیب بستان سخن گستری طوطی شکرستان معنی پروری زینت نشأ سخندانی نظر بلند

شاہ کشور دانی غواص محیط تدوین انشای بحر فیض افصح الفصحا ابلغ البلغا بادشاہ کشور
فصاحت فرمانروای قلمرو بلاغت خلاق مضامین لطیف موجد قافیہ و ردیف ناظم بے بدل
ناثر بے مثل زبدہ شعرای جہان نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خان بہادر —
انکی کمالات کا اندازہ ظرف خیال سے بیرون اور حیطہ شمار سے افزون ہے معنی تازہ
غالب الفاظ میں جان ڈالنا اور انفاس عیسوی سے معانی پژمردہ کو تازہ تر از گل بنانا
حضرت ہی کا کام ہے انکے محاورات نازک کی خوبی دلبران چگل اور مضامین پاکیزہ سے
مزاج لطیف طبعان منفعل تو دا کو انکے شکستن سے خجل اور میر انکے کلام بلاغت نظام
سے سرنگون فردوسی انکی عہد میں ہوتا تو مضمون رشک آتش زندگی سے ہاتھ دھوتا کلام
سعدی انکی خوان فیض کے شکرگزار اور شیرینی زبان حافظ شیراز انکے مقال سے
ہمدوزیہ دار جو جو خوبیاں شعرای سلف میں کسیکے ساتھ مختص تھیں وہ بالتمام حضرت کے
ذات بابرکات میں موجود ہیں مصرعہ آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری — اوسکے
شاگرد آپکا دم خاقانی بھرتا ہے ہر ایک تلامذہ حضرت کا انوری و نظامی کی کلام پر
سو اعتراض کرتا ہے نظم اس صاحب کمال کی رنگین تر از گل ہے نثر مطبوع تر از مل
کلام معجز نظام حضرت سے پایا جاتا ہے کہ قسام ازل نے فن شاعری انکی ہی حق میں
حصہ از یا ہے علم تحریر میں کمال سے علم اخلاق میں طاق مروت میں شہرہ آفاق
ہیں سن شریف آپکا ۷۰ اور ۸۰ کے درمیان ہے چراغ سحری ہیں خدا نگہبان ہے
سماعت میں فرق بالکل آگیا ہے جس کسیکو کچھ عرض کرنا ہوتا ہے بذریعہ تحریر جواب پاتے ہیں

نواب علاء الدین احمد خان صاحب بہادر

زنگ زدای آئینہ سخندانی صیقل مرارت نکتہ رانی بلبل خوش لہجہ گلزار سخنوری طوطی خوش
بیان شکرزار سبز بوری رشک افزای کلام ظہوری حسرت گزای مضامین انوری سے
وحید العصر و اکز مان نواب علاء الدین احمد خان بہادر خلف الرشید نواب مستطاب

عکس - ۴

انہوں نے جہاں قیام کیا تھا ، وہ مقام ڈل کے کنارے " زمیندار شاہ " کے نام سے مشہور ہے ۔ ان کے والد حکیم محمد عزیز اللہ خان تحصیل علم طب کی طرف متوجہ ہوئے تو دھلی میں آ کر حکیم ذکا اللہ خان سے فیض حاصل کیا اور اطبائے شاھجہاں آباد سے سبقت لے گئے ۔ ان کے لڑکے حکیم احسن اللہ خان نے علم طب اپنے والد سے حاصل کیا اور تھوڑے عرصے ھی میں مدارج کمال کو پہنچ گئے تو نواب فخرالدولہ احمد بخش خان والی فیروز پور کی ملازمت میں داخل ہوئے ، اس کے بعد نواب فیض محمد خان والی جھجھر کے پاس آ گئے ۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت معین الدین اکبر بادشاہ کی خدمت میں آ گئے ، ان کے انتقال پر بادشاہ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ نے طلب کرکے سعادت نبض گیری سے مستفید فرما کر احترام الدولہ اور ثابت جنگ کے خطابات کا اضافہ کیا ۔

دربار شاھی سے تعلق اور فرماں رواہ سے خصوصی روابط کی بنا پر سر سید کی زندگی کے بعض واقعات سے بھی حکیم صاحب کا گہرا تعلق پایا جاتا ھے ۔

حالی ' حیات جاوید ' میں لکھتے ھیں کہ بہادر شاہ نے سر سید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا تھا ۔ ۱۸۵۲ء میں جب وہ مین پوری سے تبدیل ھوکر فتح پور میں آئے تو چند روز کے لیے بتقریب رخصت یا تعطیل دلی آئے ۔ اس زمانے میں حکیم احسن اللہ خان بادشاہ کے یہاں نیابت کا کام کرتے تھے ، انہوں نے بادشاہ سے سر سید کی سفارش کی کہ ان کو ان کے دادا کا خطاب ملنا چاھیے ، بادشاہ نے منظور کرلیا ۔ اگرچہ سر سید کے دادا کا خطاب صرف جوادالدولہ تھا اور یہی خطاب لکھ کر حکیم احسن اللہ خان نے پیش کیا تھا ، مگر بادشاہ نے خود اس پر عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کرکے جوادالدولہ سید احمد خان عارف جنگ کا خطاب سر سید کو عنایت کیا ۔ اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں ۔ (۱)

اسی طرح غالب سے تعلقات پر بھی مولانا حالی نے خاصی روشنی ڈالی ھے ۔ حالی یادگار غالب میں لکھتے ھیں ۔ " ۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواھر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل

۱۔ حیات جاوید ، مطبوعہ دھلی (انجمن ترقی اردو) ۱۹۳۹ء ، ص ۴۵

مرواربد کے ، دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندان تیموریہ کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بہ مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کر کے مرزا کے حوالے کیا کریں اور مرزا ان تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں ۔ اور کتاب دو حصوں میں تقسیم کی جائے ۔ پہلے حصے میں کچھ مختصر حال ابتدائے آفرینش سے صاحب قران تیمور گورگانی تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیرالدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک بیان کیے جائیں اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے تک کے تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کیے جائیں ۔ مرزا نے تمام کتاب کا نام ' پرتوستان ' اور اس کے پہلے حصے کا نام ' مہر نیمروز ' اور دوسرے حصے کا نام ' ماہ نیم ماہ ' تجویز کیا تھا "۔ (۱)

آگرے کے ہفت روزہ اخبار "اسعد الاخبار" بابت ۲۵ جولائی ۱۸۵۰ء میں ذیل کی خبر بھی چھپی تھی : (۲)

" ان دنوں شاہ دیں پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسداللہ خان غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کی لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو ، مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آیندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیرالملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچے کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے ۔ یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیض یاب ہوگا "۔

مالک رام 'ذکر غالب ' میں لکھتے ہیں کہ مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولانا نصیرالدین میاں کالے بہادر شاہ کے پیر تھے اور غالب کے بھی دلی دوست اور پرانے مہربان ، ان کے علاوہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان

۱۔ یادگار غالب ، حالی ، مطبع نامی کانپور ، ۱۸۹۷ء ، ص ۳۳ - ۳۴

۲۔ ہندوستانی اخبار نویسی ، محمد عتیق صدیقی ، علی گڑھ ۱۹۵۷ء صفحات ۸ - ۲

مدارالمہام بھی ان کے قدر داں تھے - ان صاحبوں نے سفارش کی اور بہادر شاہ نے منظور کر لیا کہ مرزا خاندان تیموری کی تاریخ فارسی زبان میں لکھیں - مولانا محمد حسین آزاد اس کے بارے میں یوں گوہر فشانی کرتے ہیں -
'' حکیم احسن اللہ خان طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے ، انہیں کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں ، وہی دیوان ظفر ترتیب دیتے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے - مطبع سلطانی انہیں کے اہتمام میں تھا - سخن کے جوہر شناس تھے- استاد ذوق کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے-کلام کی محبت سے استاد کی محبت رکھتے تھے ، مگر خلیفہ صاحب (یعنی محمد اسمعیل صاحب خلف استاد ذوق) کے سبب سے کھٹکتے تھے ، خیال تھا کہ حضور پھر انہیں خدمت نہ سپرد کر دیں - ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے - اسی لیے مرزا نوشہ غالب مرحوم کو حضور میں پہنچایا تھا - حالانکہ استاد نے ترقی و تنزل خلیفہ کے کسی معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا ''- (۱)

غالب سے حکیم احسن اللہ خان کے تعلقات کا پتا اس بات سے بھی ملتا ھے کہ ہفتہ وار 'اسعدالا اخبار' مورخہ ۲ مارچ ۱۸۴۹ء میں مرزا غالب کی پنج آہنگ کا اشتہار ایک طویل نظم کی صورت میں شائع ہوا ، اس سے معلوم ہوتا ھے کہ کتاب حکیم احسن اللہ خان کے توسل سے قلعۂ دہلی کے مطبع سلطانی میں چھپی تھی (۲) - ان دونوں کے روابط قریبہ کا حال اس واقعے سے بھی معلوم ہوتا ھے کہ حکیم احسن اللہ خان نے مرزا سے جب وہ کلکتے میں مقیم تھے خواہش کی تھی کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے - اس کے جواب میں مرزا نے لکھا :

''درد مند نوازا! نسیم ورود مشکیں رقم نامہ غنچۂ ایں راز را پردہ کشائے و شمیم ایں نوید را غالیہ سائے آمد کہ روزگار بہ کزلک مد طول زماں فراق نقش بے اعتباری ھائے من از صفحۂ خاطر احباب نہ سترده و ترکتاز صرصر بیداد جدائی خاکساربہائے مرا ازیاد عزیزاں نبردہ است '' - (۳)

غالب کو درباری معاملات میں ایک اور موقع پر بھی حکیم صاحب

۱- دیوان ذوق ، مرتبہ آزاد ، ص ۱۳۷
۲- ھندوستانی اخبار نویسی ، ص ۲۸۸
۳- یادگار غالب ، ص ۳۸۵

سے سابقہ پڑا ۔ یہ دمغ الباطل کی اشاعت کا واقعہ ہے ۔ حالی نے ''یادگار غالب'' میں اس کی تفصیل دی ہے ۔

'' ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہو گئے ۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر بادشاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ ... مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی ۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہوجائے گی تو حضرت عباس کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے علم چڑھاں گا ، چنانچہ ... بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا ... ۔ اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے ، اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے ... مرزا صاحب (غالب) نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی ، جس کا نام غالباً دمغ الباطل (۱) رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا ۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا ۔

'' جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہدالعصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے ۔ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں ، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں ، اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں ''۔ (۲)

حسن اتفاق سے مثنوی دمغ الباطل کا مطبوعہ نسخہ راقم کے کتب خانے میں بھی موجود ہے ۔ یہ مثنوی ۱۲۷۱ھ میں فخرالمطابع میں باہتمام حافظ عبداللہ طبع ہوئی تھی۔ یہ مطبوعہ کتاب کل ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر ۱۳

۱۔ ' یادگار غالب ' میں واقعات کسی قدر غلط درج ہوئے ہیں ، صحیح واقعات کے لیے دیکھیے: 'متفرقات غالب' مرتبہ مسعود حسن رضوی (ادارہ)

اشعار ہیں ، یعنی اس مثنوی میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں -

حکیم احسن اللہ خاں کی زندگی کے واقعات میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو بہت اہمیت حاصل ہے - ۱۸۵۷ء میں اہل ہند کی طرف سے انگریزی حکومت سے بیزاری کا مظاہرہ ہوا ، ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی چھاؤنی سے ابتدا ہوئی اور میرٹھ ہی ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی - اس کے دوسرے روز دہلی میں مسلمانوں نے ہنگامہ شروع کیا اور قریب قریب پورے ملک میں آگ بھڑک اٹھی - ان واقعات کے ثقہ راویوں میں ایک تو عبداللطیف کا روز نامچہ (۱) ہے اور دوسرا حکیم احسن اللہ خاں کا -

حکیم احسن اللہ خاں نے جنگ آزادی سے متعلق یادداشتوں کو محفوظ کیا تھا ، ان کا انگریزی ترجمہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں سرجان کئی Jhon Kaye کے کاغذات میں ہے - حکیم صاحب نے خود مترجم کی خواہش پر ان یادداشتوں کو قلم بند کیا تھا - یہ روز نامچہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے جنوری ۱۹۰۸ء میں شائع ہوچکا ہے - (۲)

عبداللطیف لکھتے ہیں :

۱۹ رمضان المبارک (۱۲ مئی ۱۸۵۷ء) صبح کے وقت بادشاہ کو اصلاح ملکی کا خیال پیدا ہوا - عمدۃالحکما حکیم احسن اللہ خاں کے ساتھ نیازمندانہ طور پر بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے اور عمدۃالحکما کی سفارش پر اس معمورا اور بیرونجات کی حفاظت پر معین کیے گئے اور کچھ فوج شہر کی نگہبانی کے لیے ان کو دی گئی - دن ڈھلے پروانہ عطا کرنے کا حکم ہوا کہ راست کرداری اور نیک نیتی سے ان شوریدہ سروں کو جو بھڑوں کے چھتے کی مانند ہیں، ایسا کچلیں کہ وہ ختم ہو جائیں اور پریشان مخلوق آرام پائے - رضاء الہی اور حفاظت مخلوق کو دائمی طور پر فرض عین اور عین فرض مانیں اور ہماری خیر اندیشی میں مشغول ہوں -

---

۱- خلیق احمد نظامی : ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، از عبداللط[یف] دہلی ۱۹۰۸ء

۲- [Me]moirs of Hakim Ahsanulla Khan, edited by S. Moinul Haq, [Ka]rachi, 1958.

۲۴ رمضان (۲۰ مئی ۱۸۵۷ء): عمدۃالحکما محمد احسن‌اللہ خان کچھ عرض کرتے بارگاہ میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ تمام گروہ بداطوار لوگوں کا، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ، وقت نا وقت ہندو اور مسلمان شاہی ملازمین اور اہل دولت کے ساتھ طرح طرح کے حیلے اور بہانے کر کے ہرجگہ اور ہر مقام پر جہاں چاہتا ہے ، جھگڑا کرنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے آج کل بے رونقی کی گرم بازاری ہے۔ عمدۃالحکما اچھے حکیم اور خلیق ، نیک اور سخی آدمی تھے ، اسی سبب سے ان کے بھانجے ظہیرالدین احمد ان کے متبنیٰ تھے - ہم ان کا ذکر کیوں نہ کریں کہ وہ پسندیدہ روش اور نیک سیرت آدمی ہیں اور مجھ ہیچمداں کے بزرگ ترین احباب میں سے ہیں - یقیناً وہ ایک بڑے ادیب اور شفیق اور عظیم المرتبت ہستی ہیں -

۱۷ شوال (۱۱ جون) : عمدۃالحکما نے جو طبیبوں کے افسر تھے ، اپنے مقام پر کھڑے ہو کر گزارش کی کہ نابکار لوگ بازار میں گشت لگاتے ہوئے دکانوں کو توڑتے ہوئے ، ننگی تلواریں لے کر نہایت مفسدانہ طریقہ سے پھر رہے ہیں ، جس کے باعث باشندگان شہر کو بڑی پریشانی ہے - بادشاہ نے بخت بلند خان کو تاکید کی کہ اس روش کو بند کرانے کے لیے کمربستہ ہو اور فرمایا اس عالم فانی میں نیست و نابود ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ مخلوق کے ساتھ بدی کرے -

۱۹ شوال (۱۳ جون) : چونکہ بدذات باغیوں نے انگریز مردوں کے مقابلے میں اپنی مکاری اور روباہ بازی سے نامردی کا ثبوت دیا ، اس لیے سب نے سمجھ لیا کہ ان بدمست لوگوں سے لڑائی میں کوئی برا کام انجام نہیں پائے گا اور یہی بات بادشاہ کے دل میں بھی جم گئی۔ بس بادشاہ نے حسرت کے ساتھ آج شام کو ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اولاً نواب زینت محل اور شہزادے سے دریافت فرمایا ، پھر عمدۃالحکما احسن‌اللہ اور نواب سیف‌الدولہ میر عباس وکیل شاہی سے بھی رائے دریافت کی گئی ، جب ان کی رائے سے اطمینان خاطر نہیں ہوا تو چند خاص امیر زادوں کو بھی بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی ، چنانچہ سب امرا کو بلا کر انجمن آراستہ کی -

۲۱ شوال (۱۵ جون): بادشاہ نے فرخ جاہ نواب صمصام‌الدولہ بہادر احمد قلی خان کو جنہیں ایک بیش بہا خلعت سے حال ہی میں سرفراز فرمایا گیا تھا ، اب وزارت عطا فرما کر ان کے اعزاز میں اضافہ کیا گیا -

اس بات پر عمدۃ الحکما حکیم احسن اللہ خان کو حسد پیدا ہوا اور وہ ایک دن گم سم بیٹھے رہے ، چند ساعت گزرنے پر انھوں نے علاحدہ بادشاہ کے پاس جا کر ان کی غیبت کی ، جب گفتگو میں مبالغہ کیا تو بادشاہ نے فرمایا کہ خاموش رہو غیبت زنا سے بھی زیادہ شدید گناہ ہے ۔

۲۶ ذی الحجہ (۱۸ اگست) : ناگاہ بارود خانے میں ایک پتھر آ کر گرا اور اس سے آگ لگ گئی اور اس حادثے سے پانسو بیس بارود بنانے والوں کو ایسا جلا ڈالا کہ ان کی روح دنیا سے پرواز کر گئی، بدکردار لشکریوں نے یہ حرکت عمدۃ الحکما احسن اللہ خان کی طرف منسوب کی اور انھیں ملامت کی اور ان کے گھر اور اسباب کو لوٹ لیا ۔ بادشاہ کی حمایت سے ان کی جان بچی ۔ بادشاہ نے فرمایا کہ عمدۃ الحکما ہمارے دشمن کا دشمن ہے ۔ (۱)

مولانا غلام رسول مہر نے " غالب " میں غالباً اسی واقعے کو یوں لکھا ہے :

" حکیم احسن اللہ خان کے ایک لے پالک نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کر لیا تھا ، حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے ، لے پالک نے اس بددیانتی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے افواہ اڑا دی کہ احسن اللہ خان انگریزوں کا بہی خواہ ہے اور ان کے لیے جاسوسی کی خدمت انجام دے رہا ہے ، باغی بگڑ گئے اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے ۔ حسن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس موجود تھے ۔ باغی تعاقب میں قلعے پہنچے اور جاتے ہی حکیم صاحب کو گھیر لیا ، خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا ۔ اس طرح جان بچ گئی ، لیکن باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا اور مکان کو آگ لگا دی ، سارا مکان جل کر راکھ بن گیا ، دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو گئیں، گویا مکان کے ماتم میں انھوں نے سیاہ لباس پہن لیا "۔

حکیم احسن اللہ خاں کے اس دور کے حالات غالب کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں ، ان سے واضح ہوتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خان کو نظر بند بھی کیا گیا تھا ۔ غلام نجف خاں کے نام حکیم احسن اللہ خاں کے متعلق

۱- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، عبداللطیف ، مرتبہ خلیق احمد نظامی ، ص ۱۲۳ ، ۱۳۵ ، ۱۳۶ ، ۱۳۸ ، ۱۶۲ ۔

یکم اپریل ۱۸۵۸ء مطابق پنجشنبہ ۱۳ شعبان ۱۲۷۴ھ کو غالب ایک خط میں لکھتے ہیں -

"میاں تم کو مبارک ہو ، حکیم جی (احسن اللہ خاں) پر سے وہ سپاہی جو ان کے اوپر متعین تھا اٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا ہے کہ اپنی وضع پر رہو مگر شہر میں رہو ، باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو ، چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جاکسن کے مکان میں آ رہے - جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے ، اگرچہ از راہ احتیاط جا نہیں سکتا "- (۱)

اسی ماہ اپریل کے بعد کے خط میں غالب غلام نجف خاں کو پھر لکھتے ہیں :

"جناب حکیم صاحب ایک روز از راہ عنایت یہاں آئے تھے ، کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے ، خدا ان کو زندہ رکھے ، خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو میرا جاننے والا کوئی نہ بچا ہوگا "- (۱)

پھر ۳ فروری ۱۸۶۰ء کے خط میں لکھتے ہیں : "جناب حکیم صاحب کو سلام و نیاز "- (۱)

خلیق احمد نظامی '۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ' کے دیباچے میں حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "جہاں تک امرا کا تعلق ہے ان میں بیشتر ایسے تھے جو ذاتی مفاد اور منفعت کی خاطر بڑے سے بڑے مفاد کر قربان کر سکتے تھے- حکیم احسن اللہ خاں ، نواب احمد قلی خاں وغیرہ جو دربار کے عمائدین میں سے تھے ، عوام کی نظر میں اسی بنا پر معتبر نہ رہے تھے -
>
> "اپنے دوستوں میں عبداللطیف نے صرف حکیم احسن اللہ خاں کے بھانجے ظہیر الدین احمد خاں کا ذکر کیا ہے - حکیم صاحب کا ذکر احتراماً کیا گیا ہے ، جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید عبداللطیف بھی حکیم احسن اللہ خاں کا ہم خیال ہو اور ہنگامے کے

۱- خطوط غالب ، ص ۳۷۷ ، ص ۳۷۹ -

دوران میں اس کا طرز عمل بھی وہی رہا ہو جو حکیم صاحب کا
تھا، لیکن روزنامچے سے اس شبہے کی تائید نہیں ہوتی - (۱)

جنگ ۱۸۵۷ء کے خاتمے پر انگریزوں نے ابو ظفر بہادر شاہ پر مقدمہ چلایا، اس مقدمے کی روداد طبع ہو چکی ہے - مقدمے میں حکیم احسن اللہ خاں نے انگریزوں کی حمایت میں بہت اہم کردار ادا کیا، بطور گواہ بھی پیش ہوئے، مقدمے کی روداد کے علاوہ اس واقعے کی کچھ جھلک " واقعات دارالحکومت دہلی " میں بھی ملتی ہے :

" ۲۰ جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ فوجی کمیشن کے روبرو لائے گئے جن میں تین سردار ملکۂ معظمہ کی طرف سے اور دو کمپنی بہادر کی جانب سے - بادشاہ پر چار الزام تھے یا یوں کہو کہ چاروں طرف سے گھیرے گئے تھے - جن میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ ۱۶ مئی کو جو قلعے میں انچاس انگریز مارے گئے ان کے بانی مبانی یہی تھے— ایک دن نہ دو دن، پورے اکتیس دن مغلیہ تاجدار کمیشن کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے کشاں کشاں پھرتا رہا - ہوا بگڑنی شرط ہے، گواہوں کی کیا کمی تھی، خود حکیم احسن اللہ خاں وزیر بادشاہ کے روبرو کھڑے تھے - یوں سمجھیے کہ زمین آسمان اور اپنے دست و پا تک دشمن تھے - لسانی شہادت کے علاوہ دستاویزی شہادت کا ایک طومار تھا - بادشاہ کو جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا - پانچ سال کے بعد وہیں آخر ۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا " - (۲)

قصہ کوتاہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حکیم احسن اللہ کا کردار کچھ خوشگوار اثر نہیں چھوڑتا - اہل دہلی انھیں علم طور ناپسند کرنے لگے تھے - حکیم احسن اللہ نے عافیت اسی میں سمجھی، جےپور جا کر ملازم ہو گئے، صرف کبھی کبھار دہلی آتے تھے - غالب کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے اور غالب کے روابط بہت بڑھ گئے تھے - وہ غالب کے آخری زمانے کی تصویریں پیش کرتے ہیں :

" سن شریف آپ کا ۷۰ اور ۸۰ کے درمیان ہے، چراغ سحری ہیں،

۱- روز نامچہ، ص ۳۸ - ۴۴

۲- واقعات دارالحکومت دہلی، جلد سوم، ص ۳۶۷

خدا نگہبان ہے ، سماعت میں بالکل فرق آگیا ہے ۔ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو بذریعہ تحریر جواب زبانی حاصل کرتا ہے " ۔

مرزا غالب کو مرض کی شدت کے باعث موت سے چند روز پہلے متواتر غشی کے دورے پڑتے تھے اور دیوان خانے ہی میں رہتے تھے ۔ کھانا پینا بالکل ترک ہوچکا تھا ۔ ۱۴ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب یکایک بے ہوش ہوگئے ۔ فوراً حکیم محمود خان اور حکیم احسن اللہ خان کو اطلاع دی گئی ، انھوں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے ۔ تمام کوششیں اور علاج کیے گئے مگر بے سود ، انھیں ہوش نہیں آیا نہ اس کے بعد انھوں نے کوئی بات کی ۔ اسی حالت میں اگلے روز ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء (مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ) بروز شنبہ دوپہر ڈھلے بوقت ظہر اس با کمال کا انتقال ہوگیا ۔ (۱)

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جنازہ سہ پہر بعد اٹھا ، دلی دروازے کے باہر نماز جنازہ پڑھی گئی ۔ "راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیا الدین احمد خان ، نواب محمد مصطفیٰ خان ، حکیم احسن اللہ خان وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے " ۔ (۲)

حکیم احسن اللہ خان اس کے چند برس بعد تک زندہ رہے ۔ ۱۲۹۰ھ مطابق ستمبر ۱۸۷۳ء میں بڑودہ میں عالم غربت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ۔ نواب ضیاالدین احمد خان نیر نے الفاظ " حکیم غریب " سے تاریخ وفات نکالی : " بود سال فوتش حکیم غریب " (۳)

احسن اللہ خان محض طبیب نہ تھے ، انھیں تعمیرات سے خصوصی لگاؤ تھا ۔ ان کی تعمیر کردہ عمارتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ سنہ ۱۲۷۰ھ میں حکیم صاحب نے پرانی حویلی بدل بیگ کو خرید لیا تھا ۔ بدل بیگ خان جن

۱- ذکر غالب ، مالک رام ، ص ۱۶۶ ۔

۲- یادگار غالب ، حالی ، ص ۱۰۰ ۔

۳- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، مرتبہ خلیق احمد نظامی ، دہلی ۱۹۵۸ء ، ص ۱۶۷-۱۷۰ ۔ غالب ، از غلام رسول مہر ، لاہور ، ۱۹۳۶ء ، ص ۲۹۱ ۔ اورینٹل بائیوگرافی ، لندن ۱۸۹۴ء ، ص ۳۴ ۔

کے نام سے حویلی مشہور تھی، ان کا اصل نام ترکی بیگ تھا - اوائل زمانہ شاہ عالم ثانی (۱۸۰۶ء - ۱۷۵۹ء) میں سمرقند سے آئے تھے اور امیرالامرا مرزا نجف خان کے تحت رسالدار مقرر ہوئے تھے - حویلی بدل خان در اصل نواب قمرالدین خان کی بنوائی ہوئی تھی - اس حویلی کا کیا ٹھکانا تھا - اجمیری دروازے تک اس کا سلسلہ چلا گیا تھا اور اتنے متعدد قطعات تھے کہ نواب صاحب کا سارا خاندان اور دیگر متعلقین سب اسی میں رہتے تھے - نواب قمرالدین خان کے بعد یہ حویلی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ، جس میں سے صرف ایک قطعہ نواب بدل خان کو ملا تھا اور جب حکیم احسن اللہ خان نے خریدا تو اس وقت بھی یہ اسی بدل بیگ خان کے نام سے مشہور تھی-

حکیم صاحب کے زمانے میں اس کے مالک محمد سلام اللہ خان خلف خان بہادر مولوی اکرام اللہ خان صاحب تھے - حویلی کے اندر بہت وسیع صحن اور دلکشا ہال تھا - اس کا دروازہ حکیم احسن اللہ خان نے سنہ ۱۲۷۰ھ میں خود بنوایا تھا - جس پر مندرجہ ذیل منظوم تاریخی کتبہ نصب تھا جو غالب کا نتیجۂ فکر ہے :

نہادہ بنا احسن اللہ خان — سر رہ بد انسان در دلکشا
کہ غالب پے سال تاریخ او — رقم زد — در دلکشا حبذا
۱۲۷۰ھ

حکیم صاحب نے اس حویلی کے احاطے میں ایک حمام بھی تیار کیا تھا - حمام کے اندر دیوار پر سنگ مرمر کی تختی پر مندرجہ ذیل کتبہ تھا :

هو الحکیم

مرتب گشت ایں حمام دلخواہ — بہ تعمیر فقیر احسن اللہ
محمد امیر رضوی

سنگ مرمر کی تختی پر باہر کی دیوار پر دوسرا کتبہ یوں تھا :

بدہلی احسن اللہ خاں بنا کرد — یکے گرمابہ ہا قدسی نشیمن
پے سالش کہ یارب جاوداں باد — بفرق بانی خود سایہ افگن

نبشتم روئے لفظ آنگہ گفتم   شدہ تعمیر ایں حمام احسن
۳۰   ۱۲۹۸ - ۳۰ = ۱۲۶۸

اس کے علاوہ مہرولی میں (متصل درگاہ قطب الدین بختیار کاکی رح) حکیم احسن اللہ خان نے بادشاہ کو خوش کرنے کی خاطر ایک مسجد اور حویلی وائی تھی - مسجد اور مکان دونوں پر قطعات تاریخی پاکستان کے ظہور میں نے سے بیشتر موجود تھے -

تاریخ مسجد

مسجدے ساخت چوں بحسن عمل   احسن اللہ خان پاک سرشت
اے ظفر بہر سال تاریخش   خامہ ام '' خانۂ خدا '' بنوشت
۱۲۶۱ھ

تاریخ مکان

ارسال بنائے نو بدرگاہ   پیر خردم نمود آگاہ
برداشت لب از دیار دھلی   تعمیر فقیر احسن اللہ
۳۲   ۱۲۹۵ - ۳۲ = ۱۲۶۳ھ

مولانا بشیر الدین احمد دھلوی مولف '' واقعات دار الحکومت دھلی '' نے اپنی کتاب میں مسجد و مکان احسن اللہ خان کی تصویریں بھی دی ھیں (۱) - حکیم احسن اللہ خان شاعروں کے قدردان ھی نہیں خود بھی شاعر تھے ، سخن شعرا میں نساخ نے ان کا کلام احسن تخلص کے تحت درج کیا ھے (۲) - ان کی علمی صحبتوں کے ذکر سے تاریخ کے صفحات خالی نہیں - لال قلعے کے مشاعرے بہت مشہور تھے - تمام شعرا بہادر شاہ ظفر کے حضور میں جمع رھتے اور علمی صحبتیں گرم رھتیں ، حکیم احسن اللہ بھی اسی بزم کے

۱- واقعات دارالحکومت دھلی ، مولفہ مولانا بشیرالدین احمد ، آگرہ ۱۹۱۹ء ، ج دوم ، ص ۲۱۰ - ۱۹۹ و ج سوم ص ۲۸۹

۲- سخن شعرا ، ص ۱۳ -

ساختہ و پرداختہ تھے ۔ ایک دن معمولی دربار تھا ، ذوق موجود تھے ، ایک شہزادہ آیا اور بادشاہ سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ کر چلا گیا ۔ حکیم احسن اللہ خاں نے عرض کیا یہ آنا کیا تھا اور جانا کیا تھا ۔ بادشاہ کی زبان سے نکلا :

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ذوق نے اس وقت کہا :

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے (۱)

۱- آجکل دہلی ، اپریل ۱۹۶۰ء : شاہان دہلی کی بزم شاعری ، مولانا صباح الدین عبدالرحمن ۔

قاموس الکتب

کتابوں سے متعلق یہ کتاب انجمن کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے جو کئی جلدوں میں مکمل ہوگی ۔ پہلی جلد شایع ہو چکی ہے جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے ۔ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں جتنی بھی کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں ، یہ ان کی مکمل فہرست ہے ۔ اس میں تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق تفصیلی معلومات دی گئی ہیں جو ۲۰ × ۳۰ / ۸ سائز کے چودہ سو صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں - ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے ۔

شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے ۔

قیمت : چالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی - ۱

غالب کے ہم معنی اردو اور فارسی اشعار

مضمون ، بیان اور زبان کی مناسبت

مولانا غلام رسول مہر

میرزا غالب کی متعدد خصوصیتیں ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے با کمال شاعر تھے اور اس خصوصیت میں میری دانست کی حد تک اقبال کے سوا کوئی اردو شاعر مرزا کا شریک و سہیم نہیں - میرا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ بعض دوسرے مشہور اساتذۂ اردو نے فارسی میں شعر نہیں کہے ، یقیناً کہے بلکہ بعض کے تو مطبوعہ فارسی دیوان بھی موجود ہیں لیکن یہاں شعرگوئی کا معاملہ مطلوب نہیں بلکہ شعر گوئی کا ایک خاص پیمانہ پیش نظر ہے -

شعرگوئی کی مجمل کیفیت :

مرزا نے بالکل ابتدائی دور میں زیادہ تر اردو شعر کہے ، پھر ان کی زندگی کا بڑا اور بہترین حصہ فارسی شاعری کی نزہت گاہ میں بسر ہوا اور ان کا منظوم فارسی کلام آج بھی اردو کے مقابلے میں کم از کم پانچ گنا ہے - متوسط دور کے آخر میں پھر ان کی توجہ اردو کی طرف مبذول ہوئی، جب لال قلعے سے مستقل تعلق قائم ہو گیا تو وہ زیادہ تر بہادر شاہ کی فرمایش پر اردو شعر کہتے رہے - خود لکھتے ہیں :

> ”جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں ، سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں - آج میں نے دوپہر ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا “ -
>
> (نادرات غالب)

میرزا کا بہترین اردو کلام زیادہ تر اسی دور کا ہے ، اگرچہ پہلے دور کی بھی بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی مثالیں مشکل سے ملیں گی -

شیرانی مرحوم کا مقالہ :

میرا احساس یہ ہے کہ مرزا کی اس خصوصیت پر بہت کم اصحاب علم و فضل نے توجہ فرمائی اور جنھوں نے اس کا اندازہ فرما لیا تھا وہ بھی مفصل بحث کی فرصت نہ نکال سکے - میرے علم کی حد تک سب سے پہلے حافظ محمد محمود خاں شیرانی مرحوم و مغفور نے ایک مختصر سا مقالہ اس موضوع پر تحریر فرمایا تھا جو رسالہ " غالب " (امرتسر) میں شائع ہوا ، (جلد اول نمبر ۲ جون ۱۹۲۷ء) - اس میں فاضل موصوف نے میرزا کے بائیس یا تیئیس ہم مضمون اردو اور فارسی اشعار بالمقابل درج کر دیے تھے ، ساتھ ہی لکھ دیا تھا :

> "مرزا غالب اگر اس التفات کا نصف حصہ بھی اردو پر صرف کرتے جو انھوں نے فارسی کے لیے مخصوص کیا تھا تو ان کی اردو ، ان کی فارسی سے بلاشبہ گوے سبقت لے جاتی - تاہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے قلب پر جو وجدانی کیفیت ان کے اردو کلام سے طاری ہوتی ہے وہی لذت ان کے میخانے کی شراب شیراز سے حاصل نہیں ہوتی - یہ عقیدہ ممکن ہے ملحدانہ مانا جائے اور بنظر امعان بے بنیاد ثابت ہو ، لیکن ذوق و وجدان کے معاملات میں بحث کرنا ، میں جانتا ہوں ایک بے سود فعل ہے" -

مسئلہ ذوق و وجدان :

بلاشبہ ذوق و وجدان کے معاملات پر بحث بے سود ہوتی ہے ، تاہم ذوق و وجدان کی حیثیت ایک ایسے صفحے یا تختی یا سلیٹ کی نہیں جس پر کچھ مرقوم نہ ہو - یہ بھی تحصیل علم اور مطالعے کے ساتھ نشو و ارتقا پاتا رہتا ہے - جو شخص فارسی شعر و ادب کا مطالعہ وسیع پیمانے پر پہنچا دے گا اور مشہور اساتذۂ شعر کے کلام کی مزاولت جاری رکھے گا ، اس کا ذوق ہر ایسے شخص کے ذوق سے یقیناً مختلف ہوگا جس کا مطالعہ صرف اردو شعر و سخن تک محدود رہے گا - ہاں ، یہ ممکن ہے کہ ایک زبان کے وسیع مطالعے کے باوصف مختلف اصحاب کے ذوق و وجدان مختلف رہیں - بعض معنی آفرینی اور

حقیقت گوئی کو رفعت کلام کا معیار بنا لیں اور بعض کے ذوق کی پرواز لطف زبان کے دائرے ہی میں محدود رہ جائے۔

مشترک مضمون کے اشعار :

میں نے سرسری طور پر محض غزلیات اور ایک قصیدے کی تشبیب سے اردو اور فارسی کے ہم مضمون اشعار منتخب کیے اور ان کی تعداد چالیس سے بھی زیادہ نکل آئی۔ بعض کی حیثیت محض ترجمے کی ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک مضمون فارسی میں باندھا گیا، پھر اسے اردو میں بھی لے لیا گیا۔ بعض شعروں میں مضمون ایک ہے لیکن جب اردو میں اسے باندھا تو اس میں نہایت پر لطف اضافہ ہو گیا۔ بعض اردو اور فارسی اشعار میں محض جزوی اشتراک ہے۔

اس سلسلے میں غور و فکر اور جائزے کی اصل بنیاد میرے نزدیک یہ تھی کہ آیا مضمون فارسی میں بہتر طریق پر ادا ہوا ہے یا اردو میں؟ اسے فی‌الجملہ اردو کی فطرت سے زیادہ مناسبت ہے یا فارسی کی فطرت سے، یا دونوں میں ہر مضمون کی حیثیت یکساں رہی ہے؟

غور و بحث کی ابتدا :

مجھے بے تامل اعتراف کرلینا چاہیے کہ میرا مطالعہ اور علم محدود ہے کم از کم میری نظر سے اب تک کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں اردو اور فارسی کے ہم مضمون اشعار پر اس نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہو۔ میں بحث کا حق تو ادا نہیں کرسکتا لیکن چاہتا ہوں اس کی ابتدا ہوجائے۔ شاید یہی ابتدا اصحاب فکر و نظر کے لیے توجہ فرمائی کا سبب بن جائے۔

انسان کی طلب و تلاش :

میرزا ایک قصیدے کی تشبیب میں فرماتے ہیں :

جز در آینہ نہ دیدم اثر سعی خیال
ہر قدر بہر طلب کاریٔ انسان رفتم

انسان کی تلاش اور عالم حقیقت میں اس کی نایابی یا کم یابی نیا خیال نہیں، ایک ایرانی شاعر کہتا ہے :

با صد ہزار دیدہ بگردد جہان سپہر
جوبا ے آدمی است، ولے آدمی کجاست!

وارستہ کہتا ہے :

آنچہ بر چشیم و کم دیدیم و درکار است و نیست
در حقیقت نیست جز انساں کہ بسیار است و نیست

عالمگیر اعظم نے وارستہ کے دوسرے مصرع میں نہایت عمدہ تصرف کیا اور اس کے رقعات میں یہ شعر ایک سے زیادہ مرتبہ نقل ہوا ہے :

آنچہ بر چشیم و کم دیدیم و درکار است و نیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است و نیست

میرزا غالب نے اردو میں بھی مضمون ایسے انداز میں باندھ دیا کہ اس کا جواب نہیں ہوسکتا :

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ظاہر ہے کہ یہ اردو شعر نہ محض میرزا کے فارسی شعر پر بلکہ بعد کے دونوں فارسی شعروں پر بدرجہا فائق ہے اور یہ معاملہ میرے اندازے کے مطابق بحث کا محتاج نہیں -

طور و تجلیٔ طور :

میرزا فارسی میں کہتے ہیں :

چرا بہ سنگ و گیا پیچی اے زبانۂ طور
براہ دیدہ ز دل در رو و ز جاں برخیز

یعنی اے طور کی تجلی تو جمادات و نباتات سے کیوں الجھتی ہے؟ اپنے کرشمے حجر و شجر کو کیوں دکھاتی ہے؟ آ اور میری آنکھوں کے راستے دل میں اتر جا ، پھر جان سے ابھر کر ہوش افگن جلووں کا تماشا دکھا -

اردو میں بھی مضمون زیادہ پر تاثیر اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی ، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

جو برق تجلی طور پر گری ، اس کا اصل نشانہ ہم تھے طور نہ تھا۔ شراب ہر میخواز کو اس کے ظرف یعنی حیثیت برداشت کے مطابق دیتے ہیں۔ یہ مناسب نہ تھا کہ طور کی حیثیت برداشت کا اندازہ ملحوظ رکھے بغیر اسے ایسی تیز و تند شراب پلادی جاتی جس کا وہ حریف نہ تھا۔

دیکھیے اس شعر میں جو صرف سولہ الفاظ پر مشتمل ہے ، اپنے لیے ذوق طلب اور مطلوب کے لیے انتہائی بے تابانہ تڑپ کا اظہار بھی نہایت موثر انداز میں کردیا۔ طور پر جو قیامت گزری اس کا سبب بھی آشکارا ہو گیا۔ اس کے ساتھ اظہار ہمدردی بھی کردیا گیا اور سب سے آخر میں سورهٔ احزاب کی اس آیت کے مضمون کی طرف بھی اشارا فرما دیا جس میں ' امانت ' کا ذکر ہے اور جس کی بنا پر خواجہ حافظ نے کہا تھا :

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعهٔ فال بہ نام من دیوانہ زدند

تسکین شوق کا معاملہ :

میرزا کا ایک خاص مضمون یہ ہے کہ شوق اگر واقعی ' شوق ' ہے اور ہوس کے ہر شائبے سے پاک ہے تو محبوب و مطلوب تک رسائی ہو جانے پر بھی اس کی بیتابیوں اور بیقراریوں کو آسودگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وصال بھی اس کی دھکتی ہوئی آگ کے لیے سکون و اطمینان کا پانی مہیا نہیں کر سکتا۔ فارسی میں فرماتے ہیں :

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

چمن بلبل کے لیے محبوب کا کاشانہ ہے جہاں ہر طرف اور ہر سمت پھول ہوتے ہیں لیکن دیکھیے بلبل چمن میں بھی مصروف آہ و فغاں رہتی ہے۔ اس کے

ملی ہے بہ دستور دلدوز نالے بلند ہوتے ہیں - شمع محفل میں روشن ہوتی ہے تو پروانوں کا ہجوم شروع ہو جاتا ہے، وہ محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہونے کے بجائے تڑپ کر اس پر گرتے ہیں اور جب تک جل جل کر اپنی ہستی فنا نہیں کر لیتے ان کے جوش بے تابی کا سمندر سکون پذیر نہیں ہوتا -

دونوں مثالیں ایسی ہیں جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا - اردو میں بھی مضمون پیش کیا تو اثبات حقیقت کے لیے تیسری مثال لے آئے - فرماتے ہیں :

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی اگر تیرے دل میں خیال ہو کہ وصال میں شوق کی آگ ٹھنڈی پڑجاتی ہے تو دیکھ کہ موج سمندر میں رہ کر بھی بدستور ہاتھ پاؤں مارتی چلی جا رہی ہے اور اس کی بے تابی میں کوئی کمی نہیں آتی - یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ حقیقی شوق کی تیزی و تندی پر وصال قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا -

دیکھیے اردو اور فارسی کا اصل مضمون ایک ہے لیکن دونوں جگہ مثالیں الگ الگ پیش کیں، اس سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ کسی ایک حقیقت کی توضیح کے بعد بھی اس پر غور و فکر کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تھا -

مصائب حیات کی تلافی :

مرزا کہتے ہیں کہ جنت کتنی ہی بیش بہا متاع ہو جو اہل ایمان کو عمل صالح کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی - ان کے نزدیک انسان کو زندگی میں جو مشقتیں اٹھانی اور جو مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں جنت کو ان کی تلافی کا متوازن صلہ نہیں سمجھا جاسکتا - فارسی میں کہتے ہیں :

جنت نہ کند چارۂ افسردگیٔ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانی ما نیست

یعنی زندگی میں دل پر جو افسردگی طاری ہوتی اس کا مداوا جنت نہیں

کر سکتی، ہمارے لیے تعمیر کا جو سامان مہیا کیا ، کیا اسے ہماری تخریب سے کوئی مناسبت نہیں ۔ اردو میں فرماتے ہیں :

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

مضمون وہی ہے ، البتہ مثال دوسری پیش کردی ۔ فارسی میں تعمیر و تخریب کا تقابل تھا ، اردو میں فرمایا کہ ہم خمار کے شکنجے میں جتنی مصیبتیں اٹھا چکے ہیں ان کے برابر شراب نہیں ملی جسے پی کر سابقہ مصیبتوں کی تلخیوں کا ازالہ کر سکتے ۔

مطالعۂ کائنات :

مرزا نے خود کائنات کا مطالعہ کیا اور وہ اس مطالعے کی دعوت ہر فرد کو دیتے ہیں ۔ اس کے دو حصے ہیں ۔ اول ، ہر شے جس شکل اور جس صورت میں نظر آرہی ہے ، اس کے مطالعے پر خاص توجہ کی جائے ۔ دوم ، ہر شے میں جو گوناگوں بھید چھپے ہوئے ہیں ، ضروری ہے کہ گہرے اور مسلسل غور و فکر کے بعد ان کے چہرے سے پردے اٹھائے جائیں ۔ آج تک انسانوں نے جتنے علوم پیدا کیے اور عالم انسانیت کی ترقی و تعالی کے لیے جو کارنامے انجام دیے، وہ اسی مطالعے کا نتیجہ ہیں ۔ میرزا فارسی میں فرماتے ہیں :

عالم آیینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نہ داری بہ نگاہے درياب

یہ جہان رازوں اور بھیدوں کا آیینہ ہے ، خواہ اس کے ظواہر پر نظر ڈالی جائے یا بواطن پر ، دونوں صورتوں میں بھید کھلتے جائیں گے ۔ اے مخاطب اگر تجھ میں غور و فکر کی صلاحیت نہیں تو محض نظر اٹھا کر ظواہر ہی سے بصیرتیں اور عبرتیں حاصل کر لے ۔

اردو میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے :

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

یعنی اگر تجھ میں معنویت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں تو نہ سہی ، صرف نیرنگ صورت ہی کا تماشا اپنے لیے باعث برکت سمجھ ۔

غالب کی برزخیت :

واضح رہے کہ اس قسم کے اشعار مرزا سے پیشتر شاذ ہی نظر آتے تھے، پھر ان کے بیان میں طرز و انداز کی جدت کہاں تھی؟ حقائق کے ایسے جواہرپارے مرزا ہی کی بدولت اردو کے دامن میں پہنچے ۔ ایسے ہی مطالب کی بنا پر مرزا نے قدیم و جدید کے درمیان برزخ کی شان پیدا کر لی ۔ عام نہج و اسلوب قدیم ، معنویت زیادہ تر نئی ، انداز بیان میں ایسی وسعت کے دروازے کھول دیے کہ جو شاعری عموماً عامیانہ ہوسناکیوں کے لیے وقف ہو گئی تھی، اس میں ہر قسم کے مطالب کو قبول کر لینے کی صلاحیت آشکارا کر دی ، خواہ ان کا تعلق حقائق حیات سے تھا یا حقائق کائنات سے ۔

چند مثالیں ، ایسے اشعار کہاں ملتے ہیں جیسے یہ ہیں :

در شاخ بود موج گل از جوش بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہان است و نہان نیست

ماہ و خورشید دریں دایرہ بیکار نیند
تو کہ باشی کہ بخود زحمت کارے نہ دہی

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازیں کس در دسد آں را مہیا کردہ ای

ہر چہ در دیدہ عیان است نگاہش دارند
ہر چہ در سینہ نہان است ز سیما بینند

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چار سو ست
مے رود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

مرد نبود کز ستم بر خاطرش بارے رسد
هم ز خود رنجم گرم از دوست آزارے رسد

پیشہ اور غیرت و حمیت :

میرزا کے دل میں غیرت و حمیت کے لیے خاص تڑپ نظر آتی ہے ، وہ سمجھتے ہیں کہ جس انسان میں غیرت نہ ہو اس میں کوئی بھی خوبی نہیں رہ سکتی ۔ فرہاد نے ' مزدوروں ' کا کام کیا یعنی عام افسانے کے مطابق بے ستون پہاڑ کاٹنے اور شیریں کے باغ کے لیے نہر لانے پرآمادہ ہوگیا ۔ وہ باغ دراصل پرویز کی عشرت گاہ تھا ، مزدوری کے پیشے پر طعن میرزا کو گوارا نہ ہوا ، فرماتے ہیں :

پیشے میں عیب نہیں ، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

لیکن جب غیرت کا پہلو سامنے آیا تو اسی ' آشفتہ سر جواں میر ' کے خلاف فیصلہ صادر کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی میرزا کو تامل نہ ہوا ۔ فارسی میں فرماتے ہیں :

از جوے شیر و عشرت خسرو نشاں نہ ماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

جوے شیر یا خسرو پرویز کے مقام عیش و نشاط کا نشان تک باقی نہ رہا ۔ وہ سب آثار مٹ گئے اور تاریخ ماضی کے محض افسانے رہ گئے ۔ تا ہم غیرت آج بھی فرہاد پر طعنہ زن ہے جس نے پہاڑ کاٹ کر پرویز کی عشرت گاہ کے لیے نہر بہم پہنچائی یا جوے شیر کھو دی اور پرویز لاریب فرہاد کا رقیب تھا ۔

اردو میں یہی مضمون یوں ادا کیا ہے :

عشق و مزدورئ عشرت گہ خسرو کیا خوب !
ہم کو مطلوب نکو نامئ فرہاد نہیں

نیز :

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب

عظمت انسان :

میرزا کا ایک خاص مضمون انسان کے درجے کی انتہائی بلندی کا ہے، فارسی کے ایک شعر میں کہتے ہیں :

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بہ گرد نقطہ ما دور ہفت پرکار است

یہ مضمون انھوں نے کئی مقامات پر نئے نئے انداز میں باندھا ہے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں :

اے آنکہ از غرور بہ ہیچم نمی خری
زاں پایہ باز گوی کہ پیش از ظہور بود

یعنی آج تو غرور کا یہ عالم ہے کہ مجھے مفت بھی لے لینے پر آمادہ نہیں۔ کیا تجھے میرا وہ مرتبہ یاد نہیں جو اس دنیا میں ظہور سے پیشتر مجھے حاصل تھا ؟

یہی مضمون اردو میں یوں بیان کیا اور ایسا شعر کہہ دیا جس کی مثالیں ہمارے ہاں بہت کم ملیں گی۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

آہ و فغاں اور آداب و قواعد :

جو فرد ماتم و سوگواری کا نشانہ بنا ہوا ہو اور اس کے قلب و روح کو حزن و اندوہ کے تواتر نے بے طرح مجروح کر رکھا ہو، اس سے کوئی طبعی صورت حال کے آداب و قواعد کی پابندی کا امیدوار نہیں ہو سکتا۔ ماتم زدہ کی ہر حرکت سوگواری کا مرقع ہوگی۔ جس کے دل میں امیدوں اور آرزوؤں کا خون موجزن ہو اس سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ کسی کے ساتھ اسی انداز میں باتیں کرے گا جیسی عام حالات میں کر سکتا تھا۔

میرزا غالب نے 'ابر گہر بار' کی مناجات میں ایک مقام پر اپنی مصیبتیں بیان کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا :

دریں خستگی پوزش از من مجوی
بود بندہٗ خستہ گستاخ گوی

یہ ایک بدیہی مضمون تھا ۔ میرزا فارسی میں کہتے ہیں :

از نغمہٗ مطرب نتواں لحت دل افشاند
اے نالہ پریشاں رو و ھنجار میاموز

مطرب کا گانا مقررہ قواعد و آداب موسیقی کا پابند ہے، ان آداب و قواعد کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے دل کے ٹکڑے اچھالنا ممکن نہیں ۔ اے میرے نالے تو تمام آداب و قواعد سے کنارہ کش رہتے ہوئے جس انداز پر رواں دواں رھنا چاھتا ہے، رہ، تجھے آداب و قواعد سیکھنے کی ضرورت نہیں ۔

پھر یہی مضمون اردو میں بیان کیا تو صرف گیارہ لفظوں میں وہ حقیقت انتہائی درد و گداز کے ساتھ واضح کر دی اور ان گیارہ لفظوں میں بھی چار لفظ دو مصرعوں کی ردیفوں کے ھیں ۔ حقیقۃً صرف سات لفظ استعمال کیے :

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

پھر 'نے' کے ساتھ 'پابند' کی خوبی کسی تشریح کی محتاج نہیں ۔ ایسے ھی مقامات ھیں جہاں شاعری ایک گونہ اعجاز کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔

متاع اور رہزن:

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ جس کے پاس کوئی متاع ھو گی چور یا رہزن سے اسی کو ڈر ھوگا ۔ جس کے پاس کچھ ہے ھی نہیں وہ قلندرانہ شان کے ساتھ جہاں پھرے گا، بے خوف و خطر پھرے گا ۔ میرزا فرماتے ھیں :

تو داری دین و ایمانے بترس از دیو و نیرنگش
چو نبود توشہٗ راھے چہ باک از راہزن باشد

تیرے پاس دین و ایمان کی متاع عزیز ہے، اس لیے شیطان کی عیاریوں اور ریب کاریوں سے خوفزدہ ھونا سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ یہ ڈر ھو سکتا ہے کہ انسان کا یہ دشمن قدیم اس قیمتی متاع کو اچک نہ لے جائے ۔ جس کے پاس توشہ ہی موجود نہیں، بھلا اسے رہزن کا کیا ڈر ھو سکتا ہے اور کیوں ھو ؟

اردو میں بھی مضمون دوسرے انداز میں باندھا اور حقیقت حال کے اعتبار سے اسے انتہائی بلندی پر پہنچا دیا ، فرماتے ھیں :

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

دنیوی علائق کے لوازم :

فارسی کے شعر میں توشے سے یاد آ گیا کہ زاد راہ کا مضمون ایک اور فارسی غزل میں بھی خوب باندھا ہے ، یعنی :

براہ کعبہ زادم نیست شادم کز سبک باری
بہ رفتن پاے بر خار مغیلانم نمی آید

کعبے کا راستہ اختیار کر لیا ہے مگر زاد راہ پاس نہیں - ھلکا پھلکا چلا جا رہا ہوں اور چلنے میں کانٹوں ، پتھروں اور دوسری چیزوں سے بچتا بچاتا منزل طے کر رہا ہوں ، اگر زاد راہ کا بھاری بوجھ سر پر ھوتا تو راستے میں پاؤں اپنی مرضی کے مطابق دھرنے کی گنجایش کہاں رہتی ؟ رفتار میں اضطرار آ جاتا ، پھر کانٹوں سے بچتا ہوا کیوں کر نکل سکتا ؟

ایمان و اخلاص :

میرزا اسی ایمان کو حقیقی ایمان سمجھتے تھے جو تمام اغراض کے لوث سے بالکل پاک و مبرا ھو ، یہاں تک کہ اس میں بہشت کی گوناگوں نعمتوں سے بھی کوئی دلبستگی نہ ھو - صرف رضائے ذات باری اس کا محور و مرکز ھو - جو ایمان نعائم جنت کی امید اور عقوبت جہنم کے خوف کی آغوش میں پرورش پائے گا اس میں روح اخلاص کے لیے بالیدگی کی کوئی گنجایش ھو سکتی ہے ؟ انسان کی خواھشات کا سدرۃالمنتہیٰ رضائے باری تعالیٰ ہے - اس میں شبہ نہیں کہ جنت رضائے باری تعالیٰ ھی کا ایک انعام ہے اور دوزخ سے بچنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ انسان کا ھر فعل اور ھر عمل رضائے خدا کے عین مطابق رہے لیکن میرزا کے نزدیک یہ چیزیں مقصود نہ ھونی چاھیں ، چنانچہ وہ فرماتے ھیں :

ایماں اگر بہ خوف و رجا کردم استوار
اخلاص در نمود ونایم دو رو گرفت

اگر میں خوف و رجا کی بنا پر ایمان استوار کروں تو اخلاص میں دو رنگی پیدا ہو جائے گی۔

اردو میں یہی حقیقت ایک اور ہی انداز میں بیان فرمائی، کہتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بہشت کو دوزخ میں ڈال دینے پر اس لیے آمادہ ہو گئے کہ شراب اور شہد نیز دوسری نعمتوں کا ذکر بہشت ہی کے سلسلے میں آیا ہے، نہ یہ چیزیں موجود ہوں گی اور نہ کوئی ان کی خاطر بندگی اختیار کرے گا۔

تن پروری اور اسیری:

اغراض سے کاملاً پاک رہنے کی ستایش میرزا کے کلام میں جابجا ملتی ہے، مثلاً:

تا نیفتد هر که تن پرور بود
خوش بود گر دانه نبود دام را

جال بچھا کر اس پر دانے ڈال دیتے ہیں تاکہ ان کے لالچ میں پرندے درختوں سے اتر آئیں اور جال میں پھنسا لیے جائیں۔ میرزا کے نزدیک یہ گرفتاری اور اسیری پرندوں کی تن پروری کا نتیجہ ہے۔

کہتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ جال بچھائے جائیں تو ان پر دانے نہ ڈالے جائیں تاکہ تن پروروں کے لیے پھنسنے کی کوئی گنجایش باقی نہ رہے۔ جو پھنسیں بے غرضانہ پھنسیں۔

اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ بلند مقاصد کے لیے کام حقیقتاً وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل میں اپنی ذات کے لیے قطعاً کوئی خواہش نہ ہو۔ خواہشات کے بندے جو کچھ کریں گے، انہیں مقاصد کی حقیقی اور پر خلوص کوشش قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مرزا کا مسلک:

مخمور مکافات به خلد و سقر آویخت
مشتاق عطا شعله ز گل باز نه دانست

جس شخص کو حسن عمل کا غرہ ہے وہ بہشت و دوزخ کے جھگڑے میں الجھ سکتا ہے لیکن جس کی آرزو کا مرکزی نقطہ یہ ہو کہ جو کچھ ذات پاک باری تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو وہی حقیقی دولت ہے ، اسے پھول اور شعلے میں امتیاز پیدا کرنے کا خیال کب آسکتا ہے ۔ نعمتوں سے بھرے ہوئے باغ ملیں تو خوش ، دھکتی ہوئی آگ کے شعلے میسر آئیں تو خوش ۔ عطا کے مشتاق کی نظروں میں ہر شے مرغوب و مطلوب ہی ہوگی ، نامرغوب یا نامطلوب کبھی نہ ہوگی ۔ اس کی پوری دولت نفس عطا ہے ، جنس عطا پر نظر جا ہی نہیں سکتی ۔

پسندیدہ مضامین :

جو مضمون مرزا کو پسند آ جاتا ہے ، اسے وہ بار بار مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں اور ہر انداز بیان میں اس کے اندر ایک نیا لطف ، نئی لذت اور نئی جاذبیت پیدا کر لیتے ہیں ۔

مثلاً ان کے نزدیک وہی شے اچھی ہے جس سے گردش و تغیر کی خصوصیت زائل ہو جائے یعنی ایک حالت پر رہے اور اس میں تبدیلی نہ آنے پائے ۔ ایک مقام پر کہتے ہیں :

زینہار از تعب آتش جاوید مترس
خوش بہارے است کزو بیم خزاں برخیزد

دوزخ کے دوامی عذاب سے ڈرنے کا کیا مطلب ؟ کیا وہ بہار ہر اعتبار سے قابل خیر مقدم نہیں جس میں خزاں کا کوئی خوف باقی نہ رہے ؟

پھر فرماتے ہیں :

فیض عیش نوروزی جاودانہ خوش باشد
روز من ز تاریکی با شبم برابر کن

عیش نو روز میں دوام کی شان پیدا ہو جائے تو بہت اچھا ہو ۔ اے کارفرمائے گردش ایام ! میرے دن کو اتنا تاریک بنا دے کہ وہ میری رات کے برابر پہلو مارنے لگے ۔

نومیدیٔ ما گردش ایام نہ دارد
روزی کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

میری مایوسی میں زمانے کی گردش کا کوئی دخل نہیں ۔ ہر لمحہ ایک ہی حالت برقرار رہتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو دن سیاہ ہو جائے اس میں شام و سحر کے تغیرات کیوں کر نظر آئیں گے ؟

ایک مقام پر کہتے ہیں :

گشتہ در تاریکی روزم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را

میری شام دن کی تاریکی میں گم ہو گئی ہے ، ایسا چراغ کہاں سے ہاتھ آئے جو اس کی جستجو میں معاون بن سکے ۔

مشترک اشعار :

اب میں تشریحات سے کنارہ کش ہو کر صرف ہم معنی اشعار (کلاً یا جزواً) درج کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں :

فارسی : رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

اردو : چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

فارسی : رسیدہ ایم بہ کوئے تو جائے آن دارد
کہ عمر صرف زمیں بوسی قدم گردد

اردو : واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

فارسی : دیگر ز ساز بے خودیٔ ما صدا مجو
آوازے از گسستن تار خودیم ما

اردو : نے گل نغمہ ہوں ، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فارسی : بنازم سادگی، طفل است و خونریزی نمی داند
به گل چیدن همان ذوق شمار کشتگان دارد

اردو : ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

فارسی : در آئینۂ ما کہ ناساز بختیم
خط عکس طوطی به زنگار ماند

اردو : کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

فارسی : دهد به مجلسیان باده و به نوبت من
بمن نماید و در انجمن فروریزد

اردو : مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

فارسی : لاله و گل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تا چها در دل غالب هوس روے تو بود

اردو : مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاک حسرت پابوس تھا

فارسی : هرت گردم، بزن تیغ و درے بر روے دل بکشا
دلم تنگ است، کار از زخم پیکاں برنمی آید

اردو : نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

فارسی : گریه کرد از فریب و زارم کشت
نگه از تیغ آبدار تر است

اردو : کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

فارسی :
تا کس ز تنومندیٔ ظاهر نه شود کس
چون سنگ سر ره که گران است گران نیست

اردو :
قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

فارسی :
در مژده ز جوے عسل و کاخ زمرد
چیزے که به دل بستگی ارزد مے ٔ ناب است

اردو :
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

فارسی :
عهد وفا ز سوے تو نا استوار بود
بشکستی و ترا به شکستن گزند نیست

اردو :
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

فارسی :
دریوزهٔ راحت نتوان کرد ز مرهم
غالب همه تن خستهٔ یار است گدا نیست

اردو :
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
یارب اسے لکھ دیجیو قسمت میں عدو کی

فارسی :
گفتنی نیست که بر غالب ناکام چه رفت
مے توان گفت که این بنده خداوند نه داشت

اردو :
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فارسی :
کف خاکیم از ما بر نه خیزد جز غبار آن جا
فزون از صرصرے نبود قیامت خاکساران را

اردو :
بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

فارسی : در آغوش تغافل عرض یک رنگی توان دادن
تہی تا بے کنی پہلو بہ ما بنمودہ ای جا را

اردو : تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

فارسی : اندر آں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گزشت
کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

اردو : آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نیز :

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

فارسی : با تغافل بر نیامد طاقتم لیک از ہوس
در تمنائے نگاہ بے محابایم ہنوز

اردو : نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل‌ہائے تمکیں آزما کیا

فارسی : تاخود از بہر نثارے کیست بے میرم ز رشک
خضر و چندیں کوشش و عمر دراز آوردنش

اردو : وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

فارسی : بنائے خانہ ام ذوق خرابی داشت ، پنداری
کز آمد آمد سیلاب در رقص است دیوارش

اردو : مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

فارسی :	اختلاط شبنم و خورشید تاباں دیدہ ام
	جرأتے باید کہ عرض شوق دیدارش کنم
اردو :	پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
	میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

فارسی :	آغشتہ ایم ہر سر خاری بہ خون دل
	قانون باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم
اردو :	لخت جگر سے ہے سر ہر خار شاخ گل
	تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

فارسی :	تا حسن ز بے پردگیٔ جلوہ صلا زد
	دیدیم کہ تارے ز نقاب است نظر ہم
اردو :	نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
	مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فارسی :	رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نہ داشت
	خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ام
اردو :	یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
	لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

تلخیص الاردو

یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی ''اردو'' کے تیس سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے ۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل علمی و ادبی مقالات شامل ہیں :

مضمون	مصنف
— اصول وضع اصطلاحات	وحیدالدین سلیم
— ہجو سلطان محمود	حافظ محمود شیرانی
— کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ	مولوی عبدالحق
— بنگالی زبان و ادب کی نشو و نما	ونیش چندرسین
— ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی ، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی	مرزا فرحت اللہ بیگ
— عماد الملک بلگرامی	عبدالحلیم شرر
— بنگالی اور اردو	محمد اجمل خاں
— رومی ، نطشے اور اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
— اردو میں دخیل الفاظ	مولوی عبدالحق
— ولی کے سنہ وفات کی تحقیق	مولوی عبدالحق
— پرانی اردو میں کتبے	مولوی عبدالحق

قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان

باباے اردو روڈ کراچی

غالب اور تلامذہ غالب

تذکرۂ بشیر میں

لالہ سری رام نے ''خم خانۂ جاوید'' میں بہاءالدین بشیر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

'' شاہ بہاء الدین دھلوی معروف بہ عبداللہ شاہ بشیر ، آپ شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین صغیر کے حقیقی نواسے تھے اور چونکہ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ، اس لیے انھوں نے انھیں متبنیٰ کر لیا تھا ، چنانچہ آن کی وفات کے بعد درگاہ و جاگیر آبائی خانقاہ صدر جہاں (دھلی) کے مالک ہوئے ۔ فن سخن کا مذاق موروثی تھا ، اور اس میں اپنے عزیز ، شاہ تنویر سے مشورہ لے لیا کرتے تھے ۔ عربی فارسی کی تحصیل اچھی تھی ، تصوف اور فن سخن کی کتابوں کا اکثر مطالعہ کرتے تھے ۔ افکار زمانہ نے کبھی دل جمعی نہ ہونے دی ۔ ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا لکھنا شروع کیا تھا مگر آسے پورا نہ کر سکے ۔ سات برس کا عرصہ ہوا انتقال کیا ۔ ۵۵ ۔ ۶۰ برس کے قریب عمر پائی ۔ قلمی دیوان ...... راقم کے کتب خانے میں موجود ہے ......''۔

(جلد اول ، ص ۵۹۹)

خود بشیر نے اپنی تصانیف میں چند مقامات پر اپنا ذکر کیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آن کی تاریخ پیدائش ۶- شوال ۱۲۶۶ھ (۱۵ اگست ۱۸۵۰ء) ہے اور وہ شاعری میں تنویر کے نہیں ، اپنے نانا صغیر کے شاگرد تھے ۔ لالہ سری رام کا بیان ہے کہ بشیر نے ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا

ہو سکمل نہیں ہو سکا ، یہ درست نہیں - بشیر نے تین تذکرے لکھے تھے جن کی تفصیل یہ ہے -

۱- نگارستان بشیر - یہ قطعہ گو شاعروں کا تذکرہ ہے -

۲- بہارستان اشعار -

۳- فیضان نصیر - شاہ نصیر کے تلامذہ کا تذکرہ -

ان تذکروں کے نام تاریخی ہیں ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دو تذکرے ۱۲۹۳ھ میں سکمل ہوئے اور تیسرا ۱۲۹۱ھ میں - یہ تذکرے اب دستیاب نہیں ہوتے ، لیکن اتفاقاً ان تذکروں کا " بنیادی مواد " دستیاب ہو گیا ہے - اس کی صورت یہ ہے کہ بشیر کی یہ عادت تھی کہ اُن کے پاس جو مختلف مطبوعہ تذکرے تھے ، اُن کے حواشی پر وہ اضافے کرتے رہتے تھے یا اپنی بیاضوں میں یادداشتیں درج کرتے رہتے تھے - بشیر کے کتب خانے کی ایسی مطبوعہ کتابیں ، جن پر بشیر کے حواشی ہیں ، انجمن ترقی اردو کراچی اور پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتب خانوں میں ہیں - ایک بیاض انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے (۱) میں ہے - " نگارستان بشیر " کے چند ابتدائی اوراق بھی دستیاب ہو گئے ہیں ، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ چھپنے کے لیے پریس بھی بھیجا گیا تھا ، لیکن طباعت کی نوبت نہ آئی -

بشیر کو تاریخ گوئی سے بے حد دلچسپی تھی - " کنز تواریخ " کے نام سے انہوں نے ایک مجموعہ تیار کیا تھا ، جس میں انہوں نے اپنے عہد کے بہت سے افراد اور واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں -

بشیر نے ضرب الامثال پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا ابتدائی مسودہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ہے -

---

۱- اس بیاض کا نام " کشکول بشیر " ہے - سہ ماہی " صبح " دہلی بابت جولائی ستمبر ۱۹۶۷ء میں عتیق صدیقی نے " ایک تذکرہ جو لکھا نہ جا سکا " کے عنوان سے اس کشکول کا تعارف کرایا ہے - اس میں عتیق صدیقی نے خود بشیر کے حوالے سے لکھا ہے وہ کہ شکر شکوہ آبادی کے بیٹے تھے - یہ درست نہیں - شکر شکوہ آبادی ، منیر شکوہ آبادی کے والد تھے -

دیوان بشیر جو لالہ سری رام کے پاس تھا ، اب بنارس یونی ورسٹی میں ہے ، اس کے بارے میں ڈاکٹر حکم چند نیر کا ایک تعارفی مقالہ ''قومی زبان '' (دسمبر ۱۹۶۸ء) میں شائع ہو چکا ہے ۔

بشیر نے ''سخن شعرا'' پر جو حواشی لکھے ہیں ، ان میں نہ صرف نساخ کی پیش کردہ معلومات پر اضافہ کیا گیا ہے ، بلکہ تقریباً سترہ سو (۱۷۰۰) ایسے شعرا کے حالات دیے گئے ہیں ، جن کا ذکر نساخ نے نہیں کیا ۔ ان میں سے بیشتر گزشتہ صدی کے آخر کے شعرا ہیں اور اس اعتبار سے بشیر کا یہ کام ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ شعرا کے حالات سے متعلق بشیر کی جس قدر تحریریں دستیاب ہوئی ہیں ، انھیں '' تذکرۂ بشیر'' کے نام سے مرتب کر لیا گیا ہے ۔

'' تذکرہ بشیر'' میں غالب کے ۳۸ شاگردوں کا ذکر ہے ، ان میں سے پانچ (۱) ایسے ہیں جنھیں کسی دوسری جگہ غالب کا شاگرد نہیں لکھا گیا ۔ بشیر نے ان شعرا کے بارے میں بعض اہم معلومات پیش کی ہیں ۔

'' کنز تواریخ '' میں بھی غالب اور تلامذۂ غالب کے بارے میں چند قطعات ملتے ہیں ۔ بشیر نے غالب کی وفات پر نو قطعات تاریخ لکھے تھے جو اس مجموعے میں ہیں ۔ غالب اور تلامذۂ غالب سے متعلق یہ تمام غیر مطبوعہ مواد یہاں پیش کیا جا رہا ہے ۔ [م ۔ خ]

قطعات تاریخ وفات غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب المخاطب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ :

غالب یکتائے دوراں مخزن دانشوری
رفت زیں دارالمحن سوئے چمن زار بہشت
خامۂ فکر بشیر نوحہ خواں سال وفات
موجد طرز فصاحت شد ازیں دنیا [نبشت]

دوم ذیقعدہ روز دو شنبہ سنہ ۱۲۸۵ھ ۔

۱۔ میر افضل علی افضل ، میر چھوٹے صاحب حقیر ، شاہ سردار شائق ، حاجی محمد اسحاق عرف مظہرالحق مظہر ، غلام محمد خاں نحیف ۔

جناب حضرت غالب صد افسوس
ازیں دنیا شد و در خلد آباد
بشیر خستہ جاں سالش رقم زد
کہ " بنیاد سخن از پا بیفتاد " ۱۲۸۵ھ

چو شد زیں جہاں غالب شاد خوار
مذاق سخن ہمرہ خویش برد
بتاریخ فوتش رقم زد بشیر
کہ " سرشار صہبائے معنی بمرد " ۱۲۸۵ھ

خسرو اقلیم معنی غالب شیریں مقال
چوں ز دنیا با اجل شد پیش رب ذوالمنن
سر بجیب فکر بردم گفت آنکہ پیر عقل
شد " فرشتہ فکر" تاریخ شہہ ملک سخن ۱۲۸۵ھ

مرگ غالب سے سوے ملک عدم
ہو گیا ہے عزم بالجزم سخن
ہے یہی تاریخ اس اندھیر کی
گل ہوئی ہے مشعل بزم سخن ۱۲۸۵ھ

غالب شہہ اقلیم سخن مر گئے افسوس
صد حیف کہ بے سر ہوا اب لشکر معنی
تاریخ بشیر ان کی کہی یہ مرے دل نے
" ہے ہے موا افسوس شہ کشور معنی " ۱۲۸۵ھ

اٹھا ساقیٔ بزم معنی اسد
زمانے میں کہرام ہے پڑ رہا
بشیر ان کی تاریخ ہجری ہے یہ
" پیا آج غالب نے جام فنا " ۱۲۸۵ھ

سحر بستر خواب سے اٹھ کے میں
سوے بزم رنداں روانہ ہوا
عجب ڈھنگ کچھ واں کے آئے نظر
کہاں اتنا یارا کہ لب کیجیے وا
صراحی کو دیکھا گلا گھونٹتے
اور اک شور قلقل کے نالوں سے تھا
چنے تھے جو طاقوں پہ شیشے تمام
سیہ فام رنگ ان کا ظاہر ہوا
پہن کر لباس عزا جس طرح
کسی کا کوئی ماتمی ہو بنا
مثال مئے سرخ خون جگر
ہر اک جام کے دیدہ تر میں تھا
خزاں میں گل ورد کا ہو جو حال
گلابی کو اس طور دیکھا پڑا
نظر کی جو پیمانے کی سمت کو
تو آنکھوں کو اس نے دیا ڈبڈبا
جو تھے اپنے مشرب کے احباب انھیں
خبر سر کی، نے ہوش تھا پاؤں کا
جدھر دیکھتا تھا میں پھر کر نظر
کسے ہوش تھا لوٹنے کے سوا
ادھر اور آدھر کی جو میں نے نگاہ
کہ تا مجھ کو معلوم ہو مدعا (۱)
تو ساقی پری چہرہ و حور وش
مجھے ایک جانب نظر آ گیا
یہ جی چاہا اس سے ہی کچھ پوچھیے
کہ ان مے پرستوں کو کیا ہو دیا
وہ اس درجہ بیہوش تھا مطلقاً
کہ اپنی خودی کا نہ کچھ ہوش تھا
اٹھا شیشہ راوق کا بھر جام کو
وہاں آپ میں اپنا ساقی بنا
یہ کیا حال ہے اس شش و پنج میں
مئے پاس کا ایک ساغر پیا
تو کیفیت اصلا نہ حاصل ہوئی
میں بے نشہ جیسا تھا ویسا رہا
گزک کی جگہ (۲) لخت دل بھون کر
غرض (۳) حرص کے منہ کو جھلسا دیا
سرور آیا جب کچھ نہ تو ہر طرف
سراسیمہ سا میں ٹہلنے لگا
جو یاران بزم خرابات تھے
ادھر سے آدھر تک انھیں گن گیا
سبھی یار و احباب آئے نظر
نہ تھے میرزا نوشہ اہل صفا

۱- حاشیے پر بشیر نے "مدعا" کی جگہ "ماجرا" لکھا ہے۔
۲- حاشیے پر "جگہ" کی بجائے "عوض" لکھا ہے۔
۳- حاشیے پر "غرض" کی بجائے "عوض" لکھا ہے۔

ز بس مجھ کو ان کی رہی جستجو
غم و یاس و حسرت کے ہمراہ میں
وہاں جا کے پوچھا تو اک شخص نے
کہ وہ آج میخانۂ دہر سے
یہ سنکر میں رونے لگا زار زار
جو تھی مجھ کو تاریخ کی جستجو
ارم سے ملک آیا اک ناگہاں
کہا کس تفکر میں ہے اے بشیر

ولیکن ملا کچھ نہ ان کا پتا
مکاں مقدس پہ ان کے گیا
بصد نالہ و آہ مجھ سے کہا
گئے جام کوثر کا چکھنے مزا
پس از نالہ و یاس و آہ و بکا
تو اس فکر میں سر بہ زانو ہوا
کہ تھا ان کی جانب سے بھیجا ہوا
"پیا آج غالب نے جام فنا"
۱۲۸۵ھ

بر زمانہ فتاد صد افسوس		صدمۂ مرگ حضرت غالب
از سر اسم ذات شد تاریخ		رشک عرفی و ہمسر صائب
۱۲۸۵ھ

تلامذۂ غالب

آگاہ ، سید احمد مرزا خان

آگاہ تخلص ، سید احمد مرزا خان ، شاگرد مرزا اسد اللہ خان غالب ، مورخ سرود غیبی ۔

ادیب ، محمد سیف الحق

ادیب تخلص ، محمد سیف الحق ابن مفتی احسان الحق ، باشندۂ دہلی، شاگرد مرزا عزیز و مرزا سالک ، (۱) صاحب تذکرۂ شعرا ۔

خالی خیال یار سے دل ایک دم نہیں
رہتے ہیں اپنے گھر میں بھی اک میہماں سے ہم

[بشیر ہی کے بیان سے پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ ادیب نے ایک تذکرۂ شعرا بھی لکھا تھا ۔ "کنز تواریخ" میں اس کے مندرجہ ذیل قطعات تاریخ بھی ملتے ہیں ، جن سے معلوم ہوتا ہے یہ تذکرہ سنہ ۱۲۸۹ھ میں لکھا گیا تھا]

مرتب ساخت در ایام نیکو		ادیب افسانۂ شیریں مقالاں

۱- بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا ۔

بجستم سال اتمامش ز ہاتف　　که هست این قصهٔ صاحب کمالاں
به گفتا کاے بشیر خسته خاطر　　بگو "گلدستهٔ نازک خیالاں"
۱۲۸۹ھ

چوں ایں تذکرہ سیف حق جمع ساخت　　به فضل خدا باد شهرت نصیب
پئے سال تاریخ ترتیب آں　　بگفتا بشیر "اختراع ادیب"
۱۲۸۹ھ

عجب ایں تذکرہ رقم فرمود　　آں ادیب سخن ور دوراں
گو بشیر شگفته دل تاریخ　　"جمع شد گونا گوں بہارستاں"
۱۲۸۹ھ

سخن را تیغ سیف الحق ادیب است　　به اوقات حسن حق کرد تائید
نمود اجماع اوراق پریشاں　　به حسن صحت امعان خوش دید
بشیرش یافت کشت زعفرانے　　مثال غنچهٔ صد برگ خندید
خیال آمد که تاریخش نگارد　　نکات آں ز سر تا پائے فهمید
نبشت ایں سال اوراق نگارش　　"بہارستان رنگا رنگ پیچید"
۱۲۸۹ھ

افضل ، میر افضل علی

افضل تخلص ، میر افضل علی خلف میر قاسم ، سکنہ لکھنؤ ۔ دھلی میں بھی رہتے ھیں ، شاگرد غالب ۔ ۱۲۹۳ھ میں عمر ان حضرت کی قریب چالیس کے ھے ۔ آدمی عاشق مزاج ، فارسی دان ھیں ، اکثر فارسی اشعار کہتے ھیں ، گاہ گاہ ریختہ بھی لکھتے ھیں ۔

بیمار ، محمد مراد علی

بیمار تخلص ، مولوی محمد مراد علی خلف سید کرم علی ، جاگیردار دولت پورہ ، مہتمم مطبع چراغ راجستھان ، اجمیر شریف ۔

ناصحا آپ بھی ھوتے جو مریض الفت
کچھ اثر پھر نہ دعا کا نہ دوا کا ھوتا

دل کو ہوتا نہ اگر فکر معیشت کا گلہ
میرے اشعار میں مضمون بلا کا ہوتا

[بشیر نے ترجمۂ بیمار ، دوسری جگہ ان الفاظ میں لکھا ہے]

بیمار تخلص ، مولوی محمد مراد علی ابن سید کرم علی ، ساکن و جاگیردار سنگھ پورہ ، پرگنہ تہور ، علاقہ بیکانیر - ایڈیٹر اخبار راجپوتانہ ' اجمیر -

پھنسانے کے واسطے مرغ دل بیمار کو
دام سے کیا کم ہے حلقہ زلف عنبر فام کا

اسی کاتب کی غلطی سے مرحوم ہوا - (کذا)

پیر جی [قمرالدین دہلوی]

پیرجی تخلص ، باشندۂ دہلی ، مدرس دہلی -

گو پیر جی سے تم کو محبت نہیں نہ ہو
کیا اعتقاد بھی نہیں آن کی جناب میں

تپش ، میر مدد علی

تپش تخلص ، میر مدد علی متوطن اکبر آباد - ان کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق رحمۃاللہ علیہ تک پہنچتا ہے - یہ گلزار علی اسیر سے مشورہ کرتا ہے (۱) - نغمہ عندلیب [گلستان بے خزاں ، باطن] میں اور اشعار ہیں -

دین و دل عشق میں کھو بیٹھے تھے ہم برسوں سے
طاقت و صبر بھی جانے رہے کل پرسوں سے

تپش ، غلام محمد خان

تپش ، غلام محمد خان ، سوانح نگار ، ایڈیٹر اودھ اخبار - پہلے ریاست پاٹودی...... دہلی میں نواب اکبر علی خاں بہادر کے عہد میں بہ زمرۂ شعرا ملازم تھے ، بعد آن کی وفات کے شعر گوئی ترک کر کے اکثر تکمیل علوم میں مصروف رہے - چنانچہ نظم و نثر اردو فارسی عربی میں اور فن تاریخ میں آپ کو وہ کمال حاصل ہے کہ وہ ملکہ راسخہ کسی کو میسر نہ ہوگا -

---

۱- بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا -

پندرہ برس مختلف مقامات میں رہنے کا اتفاق ہوا - چند سال پہلے منشی نول کشور کے مطبع میں تعلق ... ۱۲۹۱ھ میں ان کی ایک غزل گلدستہ' سخن میں چھپی ...... آپ کے کمالات اظہر من الشمس ہیں -

رتبہ دستار سے یوں سہرے کا بالا تر ہے
نیچے دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

[بشیر نے دوسری جگہ ترجمہ' تپش ان الفاظ میں لکھا ہے]

تپش ، منشی غلام محمد خاں دہلوی ، مالک و راقم اخبار مشیر قیصر ہند -

تفتہ ، منشی ہرگوپال

تفتہ تخلص ، منشی ہرگوپال کایستھ ، متوطن سکندر آباد ، شاگرد رشید مرزا غالب ، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں - ایک دیوان ذخیم [ضخیم] بزبان فارسی مطبع نول کشور میں چھپا ہے اور سنبلستان ، بوستان کے طور پر اور پند نامہ' سعدی کا خمسہ تو بندے کی نظر سے گزرا ہے -

حقیر ، میر چھوٹے صاحب

حقیر تخلص ، میر چھوٹے صاحب······باشندہ' دہلی ، شاگرد شاہ نصیر و مرزا غالب - الور میں راجہ سیوا دا [س] ······ کی سرکار میں ······ ملازم ہیں - مجھ سے کہتے تھے کہ میرا دیوان الور میں چھپا ہے ، میں جاتے ہی روانہ کروں گا ، قیمت بھی لے گئے ، آج تک بھیجتے [ہیں] - پتا آن کا یہ ہے ، مقام الور ، لعل دروازہ ، مکان تندو عامل ، متصل حویلی بخشی رام چند - ان میں یہ بڑا سخت عیب ہے کہ اوروں کے کلام کو اپنا بتاتے [ہیں] - یہ رباعی (کذا) لکھا گئے ہیں ، ۱۲۸۷ھ میں ، مگر مجھ کو یقین نہیں کہ آن کی تصنیف ہے -

عین سے عین عبادت کا سر انجام ہوا
لام وہ لام کہ جس لام سے اسلام ہوا
"ی" بھی یاور ہوا بندے کی ہر اک مشکل میں
صدقے جاؤں میں کہ کیا خوب علی نام ہوا

حیدر ، مرزا حیدر علی بیگ

حیدر تخلص ، مرزا حیدر علی بیگ دہلوی ...... واسوخت مسمیٰ بہ "فغان حیدر" نظر سے گزرا ۔

کفر و بدعت [سے] نہ اسلام سے ہے کام مجھے
دہر فانی میں نہیں چاہیے کچھ نام مجھے

راضی ، جانی بہاری لال

راضی تخلص ، جانی بہاری لال ، دیوان ملک کچھ ، قوم برہمن ناگر ، متوطن اکبر آباد ۔ ہمیشہ جلیل‌القدر عہدوں پر سرفراز رہے ۔ دیوان اُس کا ۱۲۸ صفحوں پر بہ کتابت میاں جی عبداللہ بن میاں جی ابراہیم بہ مطبع دربار کچھ واقع بھونگر [بھاؤنگر] ۱۲۷۷ ہجری میں بہ ماہ ربیع‌الثانی چھپ کر منتشر ہوا ۔ اس میں ایک قصیدہ منشی محمد امین متخلص...... نے فارسی میں تصنیف کر کے چھپوا دیا ہے ، جیسے [جس میں ؟] سوانح عمری دیوان صاحب درج ہے ، طول کے خوف سے چھوڑ دیا گیا ۔

کروں شکوہ میں کیا اُس شوخ کی نا مہربانی کا
دم رخصت دیا مجھ کو نہ اک چھلا نشانی کا

مفت رسوا ہیں چاہ میں تیری
کچھ نہ ٹھہرے نگاہ میں تیری

رضوان ، مرزا شمشاد علی

رضوان تخلص ، مرزا شمشاد علی بیگ خان خلف نواب مرزا عالم بیگ خان شاگرد مرزا غالب ، وطن اُن کا حیدر آباد ، مقیم دہلی ۔ اشعار اُن کے با مزا ہوتے ہیں ، اکثر مشاعرے میں غزل پڑھتے ہیں ، حضرت سالک کے برادر حقیقی ہیں - ۱۲۹۳ھ میں وفات پائی (۱) ۔

مری فریاد سے ظاہر ہے بیان دہلی
دل خوں گشتہ رہے داغ زبان دہلی

۱- آخری جملہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے ۔

رفعت ' محمد عباس شروانی

رفعت تخلص ' مولانا محمد عباس شروانی خلف احمد عرب شروانی ' صاحب تصانیف کثیرہ ' مقیم بھوپال ۔ مرزا ابراہیم خان وزیر و مرزا محمد علی خان مستوفی الملک صدر اعظم ' ان کے اجداد ' نادر شاہ بادشاہ ایران کے وزیر مشہور تھے ۔ فارسی و اردو ہر دو زبان میں شعر کہتے تھے ۔ خصوصاً تاریخ خوب کہتے تھے ۔

پہرا ہے رقیبوں کا چھپر کھٹ کے برابر
دس بیس تئیں ہوں گے یہاں کٹ کے برابر

سالک ' مرزا قربان علی بیگ

تاریخ طبع دیوان :

دیوان چھپا حضرت سالک کا بہت خوب
یہ سیر کے قابل چمنستان سخن ہے
چشمک زن خورشید ہیں ہر لفظ کے معنی
ہر لفظ یہاں اختر تاباں سخن ہے
دیکھا جو بشیر ادب آموز نے اس کو
تاریخ یہ لکھی " گل بستان سخن ہے " (۱۲۸۸ھ)

مضامین سالک میں گرمی ہے کیا
کہ جس سے ہوا گرم بازار نظم
ہر اک سطر ہے اس کی زلف سخن
ہر اک مد ہے ابروئے خم دار نظم
جو تزئین اوراق ہر لفظ ہے
تو ہر نقطہ ہے خال رخسار نظم
بشیر اس کی تاریخ سمبت ہے یہ
چھپا خوب دیکھو یہ گلزار نظم
(سمبت ۱۹۲۷)

[کنز تواریخ]

زکی ' محمد زکریا خان

زکی ' محمد زکریا خان ' نائب میر منشی سررشتہ ڈائرکٹری ممالک مغربی و شمالی ۔ مورخ دیوان سالک ۔

اے خامۂ در فشاں برس جا اے ابر کرم نشاں برس جا

سجاد، سجاد مرزا دھلوی

سجاد تخلص، سجاد مرزا دھلوی، مدرس مدرسۂ زنانہ، واقع نہر سعادت خاں ـ نبیرہ نواب حسام الدین حیدر خاں نامی، شاگرد مرزا قربان علی بیگ صاحب سالک (۱) ـ محرم (۱۲۹۰) بارہ سو نوے ہجری میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا ـ (۲)

یہ جو دیوانہ سا پھرتا ہے، وہی ہے سجاد
شہر میں شہرہ ہے جس شخص کی دانائی کا

سرور، چودھری عبدالغفور

سرور تخلص، چودھری عبدالغفور نام، شاگرد اسداللہ خاں غالب، متذکرہ شبیہ عشرت ـ

محو نظارۂ نوشہ ہو نہ کیوں کر سہرا
گل نرگس سے بنایا ہے سراسر سہرا

سوزاں، حسیب الدین احمد سہارنپوری

سوزاں تخلص، حسیب الدین احمد سہارنپوری، کچھ دنوں دھلی کی عدالت خفیفہ میں سر رشتہ دار تھے، بعدہ ایک مطبع میں گوری سہانے میں (؟) کتابت کیا کرتے تھے ـ اب مفقودالخبر ھیں ـ شاگرد غالب ـ

کس تمنا سے تہ خنجر قاتل آئے
ھائے کیا لطف شہادت دم بسمل آئے

شائق، شاہ سردار

شائق تخلص، شاہ سردار صاحب ولد محمد شاہ صاحب گیلانی، متوطن

۱- بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا ـ

۲- صحیح تاریخ وفات ۱۲۹۳ھ ہے، سادہ تاریخ یہ ہے :
ہے ہے ز پشت اسپ افتادہ

(تلامذۂ غالب، ص ۱۳۶)

لاہور ، قوم سیادت سے ہیں ، نسبت تلمذ مرزا غالب سے رکھتے ہیں - صاحب دیوان فارسی - بارہ سو ترانوے - (کذا)

ندید از عشق خالی لامکاں را ہم نگاہ ...
خدا ہم نیست بے معشوق پیغمبر گواہ ...

تشبیہ .... کا کل پر پیچ و تاب کی
تصویر کیا کھنچی ہے مرے اضطراب کی

شوخی ، نادر شاہ خاں

شوخ (۱) تخلص ، نادر شاہ خاں ، متوطن رام پور ، ناظر عدالت کا کلکٹری بنارس - شاگرد مرزا صابر دہلوی (۲) -

ہوئی حجت جو وصل شوخ پر اس ماہ پیکر سے
گواہی ہم نے دلوائی شکن آلودہ بستر سے

شوکت ، یار محمد خاں

شوکت تخلص ، یار محمد خاں بن نواب فوج دار خاں بہادر بن نواب غوث محمد خاں بہادر خلف نواب حیات محمد خاں بہادر بن نواب یار محمد خاں بہادر بن سردار دوست محمد خاں بہادر ، میرزائے خیل ، قرابت دار نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال سے ہیں - شاگرد مولوی سید عبداللہ ... خوشاب اور اخوند منشی احمد علی ...... سید علی اکبر خاں غازی اور مولانا محمد عباس شروانی و مرزا نوشہ دہلوی ...... کچھ اپنے والد صاحب سے اس فن کو حاصل کیا - ایک تذکرہ مسمی بہ تذکرہ فرح بخش ان کا مطبع نظامی میں اسی صفحوں پر چھپ کر ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۸۸ بارہ [سو] اٹھاسی ہجری میں دستیاب ہوا -

مست ہر شخص اپنے رنگ میں ہے
شیخ تسبیح ، رند بنگ میں ہے
آپ کہتے ہو شعر اے شوکت
فکر تازہ تمھارے ڈھنگ میں ہے

۱- " شوخ " سہو قلم ہے ، صحیح " شوخی " ہے -
۲- بشیر نے تلمذ غالب کا ذکر نہیں کیا -

شہیر ، حافظ خان محمد خان

شہیر تخلص ، افتخارالشعرا حافظ خان محمد خان ، ملازم سرکار دارالاقبال بھوپال ۔ شاگرد ....

صوفی ، سید فرزند علی

صوفی تخلص ، سید فرزند علی صاحب منیری شاہ آبادی ، مورخ سروش سخن ۔

طالب ، احمد سعید خان

قطعہ بشیر ، شادی احمد سعید خان [طالب] خلف نواب ضیاء الدین :

نیر ھند کو یہ شادیٔ فرزند سعید
دل اعلیٰ کو نہ ہو طعنۂ اسفل بھاری
میرے حصے کا بھی تورا وہ عنایت کیجے
بیاہ کے پیچھے ہوا کرتی ہے پتل بھاری

ظفر ، بہادر شاہ

تاریخ روانگی شہر رنگون ، محمد ابو ظفر مرزا سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ دھلی :

بو ظفر را ببرد در رنگون　　چوں نہ عالم سیاہ شد افسوس
گفت ہاتف برائے تاریخش　　شاہ دھلی تباہ شد افسوس

۱۲۷۴ھ

[کنز تواریخ]

قطعات تاریخ وفات :

چوں بہادر شاہ ، شاہ ھند مرد　　در غمش از گریہ نورالعین شد
گفت تاریخ بشیر از جہد ما　　بادشاہ کشور کونین شد

۱۲۷۹ھ

سراج الدین بہادر شاہ غازی　　ز دنیا گشت سوے خلد راہی
بشیر آمد پئے تاریخ آواز　　بملک قدس از حق یافت شاہی (۱)
۱۲۷۹ھ

ز دنیائے فانی بہ ملک فنا　　چو شد شاہ دھلی بعز و وقار
بشیر ... سال فوتش بگفت　　زہے شاہ والا گہر تاجدار
۱۲۷۹ھ

ظہیر ، منشی پیارے لال

ظہیر تخلص ، منشی پیارے لال کا یستھ ، شاگرد مومن خاں مومن - ۱۲۹۰ ہجری میں فوت ہوئے -

شب ہجراں کا اندھیرا نہ گیا ، پر نہ گیا
کام کافور کی آئی نہ اگر کی بتی
خط .... اس کو جلاؤ تو نہیں
خط عاشق کی جو کی آپ نے مل کر بتی

عاقل ، نواب محمد سلطان دھلوی

عاقل تخلص ، نواب محمد سلطان دھلوی ، مقیم بنارس ، شاگرد مرزا صابر -

زمانے میں رھی تعلیم خود بینی سکندر سے
رہے گا سلسلہ جاری یہ آئینے کے جوھر سے

عرشی ، مولوی احمد حسن

عرشی ، مولوی احمد حسن ، برادر کلاں مولوی صدیق حسن ، امیر منشی ریاست بھوپال - بڑے عمدہ و فاضل شاعر تھے ، نوجوان شہر بڑودہ میں فوت ہوئے - قصاید فارسی و عربی اُن کے نہایت فصیح و بلیغ ھیں - ایک غزل اردو کی تذکرۂ فرح بخش میں نظر سے گزری ، جس کا مطلع یہ ہے :

۱- اس مصرع سے مطلوبہ اعداد بر آمد نہیں ہوتے -

اب تو ہم شائستۂ آغوش دل بر ہو گئے
ناتوانی میں جو گل کھائے مشجر ہو گئے

متوطن قنوج، خلف مولوی اولاد حسن خلف نواب سید اولاد علی خان بہادر انور جنگ، امرائے نظام الملک آصف جاہ والیٔ حیدر آباد دکن میں شمار ہوتے تھے...... اجداد تا حضرت سجاد...... اپنے اپنے عہد میں بڑے فاضل و ذی لیاقت گزرے۔

عزیز، میرزا یوسف علی خان

قطعات تاریخ وفات:

جب عزیز سخن سرا کا بشیر	باغ فردوس میں مقام ہوا
اہل معنی کے لب پہ مثل جرس	آہ و نالوں کا اژدہام ہوا
شہرۂ مرگ اوستاد زماں	ہند سے تابہ روم و شام ہوا
روئے صبح الم سے ہے فق فق (کذا)	رنگ شب کا سیاہ فام ہوا
یہی صدمہ جہاں میں حضرت دل	باعث رنج خاص و عام ہوا
فکر تاریخ جب ہوئی مجھ کو	سر بزانو برائے نام ہوا
ناگہاں غیب سے صدا آئی	آج کسب سخن تمام ہوا

۱۲۸۹ھ

چوں عزیز سخنور کامل	در جناں شد ز عالم فانی
کوکب تاریخ رحلتش بہ نوشت	شاعر بے عدیل لاثانی

(۱۲۸۹ھ)

عزیز یوسف مصر معانی	بہ جنت نقل کرد از دار دنیا
بشیر از من سنین رحلتش گفت	امام شاعراں تاج المعانی

۱۲۸۹ھ

[کنز تواریخ

کوکب، منشی تفضل حسین خان

کوکب تخلص، منشی تفضل حسین خان...... شاگرد غالب دھلو

مٹ گئے ہائے مکیں اور مکان دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشان دہلی

محمود ، محمد حسین

محمود تخلص ، محمد حسین دہلوی ، شاگرد حضرت استاد غالب ، ملازم سرکار کنور بکرسان سنگھ والی ریاست کپور تھلہ ، مولف نسخۂ حلوائے بے دود ۔

مسافر کو علم و ہنر چاہیے   پئے رہبری راہبر چاہیے

[دوسری جگہ بشیر نے ترجمۂ محمود ان الفاظ میں لکھا ہے]

محمود تخلص ، محمد حسین ، شاگرد مرزا اسداللہ خان غالب ، باشندۂ دہلی ۔ ان کا حلوائے بے دود جو کنور بکرمان سنگھ برادر والیٔ کپور تھلہ کی فرمائش سے تصنیف کیا ہے ، نظر سے گزرا ۔ اس میں چند غزلیں نصیحت آمیز مضامین کی اپنے اپنے موقع پر درج ہیں ۔

مظہر ، حاجی محمد اسحاق عرف مظہر الحق

مظہر تخلص ، حاجی محمد اسحاق عرف مولوی مظہرالحق خلف اصغر مولوی ظہور علی ظہور ، شاگرد اپنے والد اور مرزا غالب کے ، صاحب دیوان و تذکرہ ، متوطن ہریانہ ، باشندۂ دہلی ، حال اتالیق و تحصیل دار ریاست پاٹودی ، راقم کے احباب ہیں ۔ (کذا)

میکش ، سید احمد حسین

میکش تخلص ، سید احمد حسین خلف سید کرار حسین ، قوم سادات سے ، نواب شائستہ خان کی اولاد میں ہیں ۔ کتب عربیہ آخون فیض احمد [سے] جو مسجد کلاں میں رہتے تھے ، پڑھتا تھا ۔ نواب اسداللہ خان غالب سے اصلاح لیتا تھا ۔ صدر امین اول کی کچہری میں وکالت کرتے تھے ۔ ۱۲۶۳ھ میں بائیس برس کی عمر رکھتے تھے ۔ بیشتر فارسی اور کم کم اردو میں کہتے تھے ۔

ناصر ، امتیازالدولہ عرف یوسف مرزا

ناصر تخلص ، امتیازالدولہ عرف یوسف مرزا ۔

ترشنے سے بتوں کے بڑھ گئی توقیر پتھر کی
صنم بن کر ہوئی مشہور یہ تصویر پتھر کی (۱)

نحیف ، غلام محمد خان

نحیف تخلص ، غلام محمد خاں ، شاگرد غالب ۔

شوق وصل یار ہے اور غم نہیں اغیار کا
گل سے ہم پہلو ہوں میں کیا خار کھانا خار کا

نشاط ، بابو ہرگوبند سہائے

نشاط تخلص ، بابو ہرگوبند سہائے ، ان کا دیوان مسمی بہ نشاط احباب چھپ کر شائع ہوا ۔

نظام ، محمد مردان علی خان

نظام تخلص ، نظام الدولہ منتظم الملک نواب محمد مردان علی خان بہادر قائم جنگ ، سابق دیوان و وزیر اعظم ملک مارواڑ ۔ صاحب تصانیف کثیرہ ، ابتدا میں آپ کا تخلص مضطر تھا ، پھر رعنا ، اب بہ اعتبار خطاب کے نظام ہے۔ جو آپ کے ...... سے ظاہر ہے ۔

آغاز سخن وری میں مضطر تھا نام رعنا تھا شباب شاعری سے ھنگام
ہے زیر نگیں کشور نظم تو اب نواب خطاب اور تخلص ہے نظام

کلیات میں سوانح عمری کل درج ہے ۔

یکتا ، خواجہ معین الدین

بعد غدر بصارت چشم جاتی رہی تھی - ۱۲۸۹ھ [میں] مر گیا ۔
از فکر بشیر : آہ دلا شاعر یکتا بمرد ۱۲۸۹ھ

[" کنز تواریخ " میں قطعہ تاریخ وفات ہے] :

شاعر یکتا ز جہاں شد بہ خلد لطف سخن ہم رہ خویش آہ برد
گفت خرد سال وفاتش بشیر آہ دلا شاعر یکتا بمرد
(۱۲۸۹ھ)

۱۔ ناصر کا یہ واحد شعر ہے جو دستیاب ہوا ہے ۔ ' تلامذہ غالب ' میں لکھا ہے افسوس کہ کلام دستیاب نہیں ہوا ۔ (ص ۲۰۷)

غالب کا آیئنہ فن

ممتاز حسین

جس طرح نفسیات کے پہلو بہ پہلو ایک عمیق نفسیات ہوتی ہے جو نفس کے پاتال کی خبر لاتی ہے ، اسی طرح سیاسی سماجی تاریخ کے پہلو بہ پہلو ایک عمیق تاریخ بھی ہوتی ہے ، جو سیاسی و سماجی رشتوں سے گزرتی ہوئی ، معتقدات ، محسوسات ، جمالیات ، بالفاظ دیگر روحانی دنیا کا پتا چلاتی ہے - یہ دونوں تاریخیں ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں ، ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں - یہ روحانی دنیا خارجی دنیا سے صرف متعین ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کو متغیر بھی کرتی ہے - لیکن جس تیزی سے سیاسی اور سماجی دنیا میں تغیرات رونما ہوتے ہیں ، اسی تیزی سے روحانی دنیا میں جوابی تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں - اس کے درمیان کوئی میکانکی رشتہ نہیں ہے - خیالات بڑی مشکل سے مرتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی داخلیت کے بھی حامل ہوتے ہیں - ہم آج ' تسخیر مکان ' کے عہد سے گزر رہے ہیں ، آج کی تاریخ میں دم تحریر انسان نے ساٹھ میل کے فاصلے سے چاند کو جا کر دیکھا ہے اور چند سالوں میں وہ مریخ ، زہرہ اور دوسرے سیاروں کو بھی اسی طرح دیکھ کر واپس آئے گا اور یہ بتائے گا جیسا کہ وہ آج بتا رہا ہے ، اس کائنات میں نہ تو کوئی عرش ہے اور نہ فرش ہے ، چاند پر جاؤ تو زمین عرش ہے اور وہ زہرہ و مریخ سے بھی زیادہ عشوہ گر ہے -

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو ، اے خدا
آیینہ فرش شش جہت انتظار ہے

لیکن اس عشوہ گری کو کتنے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سیارۂ زمین کا بھی ایک غمزہ ہے - عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ، لیکن ہم سے

کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنا قبلہ یہ کعبۂ ارض درست کیا ہے ۔ زمین بھی آسمان ہے اور سب سے دور ستارے سے اتنی ہی بلند ہے جتنا کہ وہ ستارہ اس زمین سے بلند ہے۔ بہر حال کہنے کا مطلب تو یہ کہ اعتقادات کی جڑیں آسانی سے نہیں ہلا کرتی ہیں ۔ یہی حال ہمارے غالب کا تھا ۔ وہ اس تاریخی سماجی تعیر کی انقلابیت سے با خبر تھے ، کہنگی' تماشا کو بھی اپنی نظر سے دور کر چکے تھے اور اپنی چشم نگراں سے صفات نو کا تماشا بھی کر رہے تھے ۔ لیکن زندگی ، انسان اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں ان کا جو علم تھا وہ قدیم دنیا کا تھا ، اس سے تعلق تھا جو قدیم دنیا کا بہترین سرمایہ تھا، جس کی گرد سے جدید دنیا سترھویں صدی یورپ کی پیدا ہوئی تھی ۔ پھر بھی یہی کہا جائے گا کہ اس کے علم کا تعلق قدیم دنیا سے تھا ، یونان و عجم اور ہند کی سر زمین سے تھا ، اس میں جدید یورپ کا علم شامل نہ تھا ۔ غالب اور سر سید کے درمیان بعد زمانی کچھ بہت زیادہ نہیں ۔ غالب سر سید سے صرف بیس سال عمر میں بڑے تھے، لیکن ' تہذیب الاخلاق ' کے مدیر اعلیٰ سر سید اور غالب کے افکار کے درمیان دو مختلف عہد کا فاصلہ تھا ، اور یہ مغرب کی کارستانی تھی کہ اس نے دونوں کو پیوند کر دیا تھا ۔ معاشرے کی حرکیات تہذیب کی تاریخ کا جو علم سر سید کے یہاں ملتا ہے وہ غالب کے یہاں نہیں ہے ، سرسید نے اسے مغرب سے اخذ کیا ، ولایت کا سفر کیا ، ولایت جانے سے پہلے اتنے بے خبر کہ " ابطال حرکت " پر رسالہ لکھا ، گلیلیو کو جھٹلایا ، اور لوٹنے پر اتنے آزاد کہ اس رسالے کی تردید کا اعلان کیا ۔ غالب نے مشرق کے علم پر بھروسا کیا اور ابدی تغیر و حرکت کا کلمہ پڑھا :

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یاں

آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آینہ دایم نقاب میں

کس نے اس تغیر ابدی کا نظریہ دیا ، یونان کے ہراکلیٹس ، زردشت ، اپنشد کے ابدی تغیر کو دنیائے اسلام میں حکمائے اسلام نے اسے رائج کیا ' اشراقین اسکندریہ نے اسے رائج کیا ' اخوان الصفا کے لوگوں نے اسے رائج کیا اور پھر صوفیوں نے اسے رائج کیا ۔ اسے کارگاہ کون و فساد

کا نام دیا اور یہ بتایا کہ یہ سلسلۂ کون و فساد لامتناہی ہے۔ رومی کہتے ہیں :

پشہ کے داند کہ ایں باغ از کسے است
در بہاراں زاد و مرگش در دے است

اور غالب لکھتے ہیں :

'' گروہا گروہ مردم از دانایان ہند و دانش اندوزان خطا [خطا و ختن] و فرزانگان یونان برآنند کہ آفرینش را از ہر دو سو کرانہ پدید نیست۔ از تا آغاز روز تا انجام جاوید پیوند ، ہمیں نمایش ، ہم بدیں گونہ آرایش درکار است۔ نبودہ است کہ نبودہ است و نخواہد بود کہ نخواہد بود''۔ (دیباچۂ مہر نیمروز)

ترجمہ : دانایان ہند سے بہت سے لوگ ، خطا و ختن اور یونان کے بہت سے دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ تخلیق بے کراں ہے۔ اس کا نہ تو کوئی روز آغاز ہے اور نہ کوئی روز انجام۔ یہ ' تا آغاز روز ' سے ' انجام جاوید پیوند ' تک ہے۔ یہی نمایش اور اسی طرح سے آرایش (کائنات) درکار ہے۔ نہیں ہوا ہے کہ نہیں ہوا ہے ، نہ ہوگا کہ نہ ہوگا۔ ہر شے لازمی سے ہے ' دایم تاہم متحرک ہے۔

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں : '' آرے در کارگاہ کون و فساد ، ہیچ فساد بے کون و ہیچ کون بے فساد نیست ''۔

غالب نے فطرت کے اسی ابدی قانون تغیر کے تحت اس سماجی تغیر کو قبول کیا تھا جو برصغیر کی تاریخ میں پہلا سماجی انقلاب تھا ' اور پوری انسانیت کی آزادی کے لیے ضروری تھا۔ اس سے پہلے برصغیر کے لوگوں کی سماجی زندگی کی کوئی تاریخ بھی نہ تھی ، تاریخ تغیر سے ہے ، ان کی سماجی زندگی میں صدیوں سے کوئی تغیر آیا ہی نہ تھا۔ لشکر جرار موج بہ موج فصیل کوہسار کو توڑتا ہوا آتا ، لیکن طوفان کے مانند ان کے سر سے گزر جاتا، سماجی زندگی غیر متغیر رہ جاتی۔ جات پات کے بندھن ، درجات کے بندھن ویسے کے ویسے ہی رہ جاتے ، جگر ناتھ کے رتھ کا جوا ان کے کندھوں پر ہوتا اور وہ رامو رام کہتے ہوئے اس میں پستے رہتے۔ مغرب سے ایک برق چمکی اور اس نے سماجی حقیقت کو تہ و بالا کیا۔ غالب نے اس کا استقبال کیا۔

خوشم کہ گنبد چرخ کہن فروریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرق من فروریزد

اور اس نے اس چرخ کی جنبش بھی دیکھی ۔ اس نے اس کا استقبال ایک برق آسمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عمل خرد کی حیثیت سے کیا ۔

دیدہ بینا آمد و بازو قوی کہ گی پوشید تشریف نوی

کیا اس بات سے غالب کو مغرب کے علوم سے استفادہ نہ تھا ؟ وہ ایک مشرق کا آدمی تھا ، کلاہ پاپاخ اور چغہ پہنتا تھا ، اور مشرق ہی کے فلسفے میں ڈوبا ہوا تھا ، اس کے خیال کی اہمیت گھٹ جاتی ہے ۔ اگر کوئی شخص ایسا سوچتا ہے تو وہ تاریکی میں ہے ۔ غالب ہی سے سارے نئے خیالات کا رشتہ ملتا ہے ، غالب ہی سے سر سید اور ان کا لشکر ہے ۔ بدگمان بھی بعد میں اس کے ساتھ ہیں ۔ غالب ہی کے سرچشمۂ فکر سے از آن روز تا این زمانہ سب مستفید ہیں ۔ پہلی ضرب کلیم سنگینیٔ حیات پر اسی کی تھی ۔ اسی نے ایک نئی بیداری ، ایک نئی روح ، اپنی ' نوا سنجیٔ قانون راز ہستی ' سے ہماری زندگی میں پیدا کی ۔ جو کڑیاں سلسلۂ فکر کی ، اجتہاد کی ، مدت سے بے آواز تھیں ، انھیں وہ آشوب نغمہ دے گیا ۔ اس جمود فکر کو اپنے جگر کی آگ سے پگھلا گیا جسے جاگیردارانہ نظام نے اپنے قیام زوال کی کوشش میں ہماری زندگی پر صدیوں سے مسلط کر رکھا تھا ۔ اس میں شبہ نہیں اس پر پہلی ضرب اندیشۂ مغرب سے لگی اور ایسی کاری ضرب لگی کہ سلسلۂ وقت کی کڑیاں ٹوٹ گئیں ، ماضی سے رشتہ چھوٹ گیا ۔ اور جب وقت کی کڑیوں کا سلسلہ ہی نہ ملے تو نبض ہستی چھوٹنے لگتی ہے کیونکہ وقت حقیقت کا ایک لازمی حصہ ہے ۔ اس وجودی صورت حال سے دوچار غالب کے عہد کا مشرقی آدمی ، تقلیدی آدمی ، بڑا سراسیمہ ، مضطرب اور بے چین تھا ۔ جن چیزوں پر اس کے وجود کا انحصار تھا ، جو آسمان کہ اس نے اپنے خیال کا تخلیق کیا تھا ، نیچے آرہا تھا ۔ اور جس زمین پر کہ اس کا قدم تھا ، وہ زمین اس کے پیروں تلے سے نکلی جا رہی تھی ۔ اور وہ رسی ایمان اور عقیدے کی بھی ٹوٹ رہی تھی جسے وہ کبھی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا ۔ اسی حالت کی ترجمانی غالب نے اپنے اس شعر سے کی ہے :

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

انسان جو اپنی زندگی کے مادی اسباب کا خالق ہے ، جو اپنے مقاصد کو بروئے کار لاتا ہے ، جو فطرت نامرضیہ کو اپنی مرضی کے تابع کرتا ہے ، اپنے جہان کا خود خالق بنتا ہے ، اور اس جہان کی تحلیل میں ہر شے کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے - ہیرے سے قلم ، سنگ سے شرارے کا کام لیتا ہے ، فولاد کو مثل آب پابند ظرف کرتا ہے - وہ آدمی جس کی گمشدگی کا اعلان میر نے بھی کیا تھا :

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا		خدائی صدقے کی انسان پر سے

وہ مشرق کا آدمی غالب کے عہد میں رسن بستہ ، جہاں شاکی اپنی اس بندگی کا تھا :

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی		بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

وہاں اس احساس ندامت کا بھی حامل تھا وہ جو سرمایۂ نازش وجود تھا ، اب ننگ وجود ہے :

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

اس کا وجود اپنی اس روحانیت و انسانیت کو ضایع کر چکا تھا جس کو فلسفیانہ اصطلاح میں ماورائیت یا عینیت کہتے ہیں - اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان فطرت کو متغیر کر کے اپنی فطرت کو بھی ترقی دیتا رہتا ہے - اس عمل میں وہ صرف اپنے ہی کو بلند نہیں کرتا ہے ، اپنی حدود ذات سے تجاوز کرتا ہے بلکہ کائنات کی ہر اس شے کے جوہر کو بھی جسے وہ اپنے تصرف میں لاتا ہے ، بے نقاب کرتا ہے - وہ ذرے کو آفتاب اور قطرے کو گہر بناتا ہے ، زہے طالع مریخ جو اس کی جبین انسان کے قدموں پر ہو - پھر یہ دیکھیے کہ اس کا جوہر کیوں کر کھلتا ہے - انسان کا یہ عمل اس تضاد کے بغیر نہیں ہے کہ انسان صرف موضوع فطرت نہیں بلکہ معروض فطرت بھی ہے ، وہ فطرت‌خارجیہ کی مخالفت اس کے ایک حصے کی حیثیت سے کرتا ہے - فطرت خارجیہ اسے اپنی طرف بھی کھینچتی رہتی ہے ، رزق خاک بنانے کے درپے ہوتی ہے ، لیکن وہ تاریخی وجود جسے ہم انسان کہتے ہیں ، وہ اپنی معروضیت سے نہیں بلکہ اپنی موضوعیت سے پہچانا جاتا ہے - اس کے وجود کی بنیادی تعریف یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایستادہ جانور ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ صاحب نطق و شعور ، اپنی زندگی کے مادی

ذرایع کا خالق ہے ، اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ حسن آفریں ہے ۔ وہ صرف اپنی جبلت کو دہراتا نہیں جس طرح کہ بیا اپنا گھونسلا یا مکڑی اپنا جالا بنتی ہے ، بلکہ وہ فطرت کے ہر معیار کے مطابق چیزیں خلق کرتا ہے اور ہمیشہ نئی سے نئی صورت حسن کا جویا ہوتا ہے :

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اس کا اطلاق اس کی زندگی کے ہر تخلیقی عمل پر ہے ۔ اسی کو فلسفیوں کی زبان میں انسان کی ماورائیت کہتے ہیں ۔ ہم آپ اسے انسانیت کہتے ہیں ۔ غالب کے زمانے کا مشرقی آدمی اپنی اس ماورائیت یا انسانیت کو صدیوں سے ضایع کر رہا تھا ، رو بہ زوال تھا وہ جو کہ خالق مخلوق نما تھا ، وہ صرف مخلوق رہ گیا تھا ۔ اس سے اس کی ربوبیت چھین لی گئی تھی ۔ وہ ایک بندہ مجبور اس خاکدان کا قیدی تھا ۔ زندگی زندہ رہنے کے لیے رہ گئی تھی ۔ جسم و جان کے پیوند کو برقرار رکھنے کے لیے تھی نہ کہ مقصود بالذات تھی ۔ اور جب اسی چیز کو ہم اس کے اور ظل اللہ کے رشتے سے دیکھتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی کا مقصد ظل اللہ کی مشیت کے تابع رہنا تھا ۔ ظل اللہ جو تن تنہا تنویر ربوبیت کا حامل تھا ۔ محکوم سے بالکل ایک جداگانہ مخلوق تھا ۔ اگر ظل اللہ دن کو رات بتائیں تو وہ ستاروں کی نشاندھی کرے اور اگر ظل اللہ کے غیض و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خون آدم کی حاجت ہو تو وہ تہ تیغ ہو ۔ مطلق العنان شاھوں کے اس دور میں آدمی کی ماورائیت یا اس کی ربوبیت پر نہیں بلکہ اس کی بندگی بیچارگی اور مجہولیت پر زور دیا جاتا رہا ۔ اور اس مشقت زندگی اور اس حبس زندگی سے نکلنے کا ایک ہی دروازہ اس کے لیے کھلا رکھا گیا تھا کہ وہ راحت و مسرت کا خواب اس قفس عنصری سے ، اس زندان خاک سے رہا ہونے کے بعد یعنی بعد المرگ ، دوسری دنیا میں دیکھے ، اگر اس نے واقعتاً یہاں اپنے کو زندگی کی تمام لذتوں سے محروم رکھا ہے ۔ لیکن سر سید کہتے ہیں کہ دین ان کا ہے جن کی دنیا ہے ، جن کے پاس دین حاصل کرنے کی مالی استطاعت ہے ، اور لارڈ مکالے جس کے ہاں معاشرے کی ترقی کا تصور مادی ہے ، اس نے بہشت کے دروازے پر یہ تختی لٹکا دی کہ اس میں غریب داخل نہیں ہو سکتے ، اور وہ تختی الٹ دی جو مسیح نے لکھی تھی کہ دولت مند اس میں داخل نہیں ہو سکتے ۔ ان دونوں تختیوں میں سے کون سی تختی صحیح ہے ، یہ موضوع زیر بحث نہیں ، بتلانا تو یہ تھا کہ جب وہ اپنے عمل کا مسبب نہ رہا ، تو وہ کیونکر راستباز

اور راست کردار بن سکتا تھا جس سے کہ وہ اپنی عاقبت کما سکتا ۔ وہ تو صرف فرمانبردار تھا ، فرماں روائی میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا ۔ وہ تو وہی کرتا جو اس سے کرنے کے لیے کہا جاتا ۔ پاکباز بننے کی اس سے بنیاد ہی چھن چکی تھی ۔ وہ بہشت کا مطالبہ اپنے اعمال پر نہیں کر سکتا ، اختیار چھن چکا تھا ۔ اس سے تو وہ حق انکار بھی لے لیا گیا تھا جو معلم الملکوت کو حاصل تھا ۔ ایسی صورت میں بھلا اس پر شیطان کیوں نہ ہنستا ، کیا یہی میرا مسجود ہے ۔ میر نے اسے بہت پچکارا :

پھر نہ شیطاں سجود آدم سے
شاید اس پردے میں خدا ہووے

لیکن اس حالت میں وہ انسان کو پا کر کیوں کر میر کے بہلاوے میں آتا ۔

یہ اسی کا رد عمل تھا کہ جس طرح دنیائے اساطیر میں کاوا نے ضحاک خوں آشام کے خلاف درفش کاویانی بلند کیا تھا ' اسی طرح تاریخی دور اسلامیہ میں ایک معمولی حلاج نے اپنے محراب قلب سے صدائے انا الحق بلند کی اور سارے انسانوں میں کبریائی تقسیم کی :

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خودنما اتنے
یہ حسن اتفاق آینہ تیرے روبرو ٹوٹا (میر)

تا کہ ہر شخص مقصود بالذات بن سکے اور اپنی ذات کے جلال و جمال دونوں سے لذت یاب ہو ۔ پرامیتھیس کو بھی پہاڑ کی چٹان سے باندھا گیا تھا ' کیونکہ اس نے دیوتاؤں کے خفیہ ہتھیار ، یعنی آگ کو انسانوں میں تقسیم کر دیا تھا ۔ ایسے میں یہ کوئی عجب نہیں کہ حلاج کو بھی دار پر کھینچا گیا ۔ ع : ایکو کو دار کھینچا ایکو کی کھال کھینچی ۔ کیونکہ وہ بھی ایک ایسے ہی جرم کا مرتکب تھا ۔ مگر سوچنے کی بات ہے جب کہ کچھ بھی خدا کے باہر نہیں ، " وہی ظاہر وہی باطن وہی اول وہی آخر " ہے تو پھر انسان اس سے کیونکر باہر ہوسکتا ہے ۔ مگر واہ رے اجارۂ ظل سبحانی ، یہ آیۂ رحمانی بھی اس کے کام نہ آئی ۔ انسان کے اقتدار پر حملہ خدا کا نام لے کر یہ کیا فساد معرفت ہے ۔ ع : سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ۔ یہ آواز ، گنہگار آواز سمجھی گئی ، کیونکہ سوسائٹی کی تشکیل درجات پر تھی ' انسان کو

بہ حیثیت انسان کے نہیں بلکہ اس کے منصب سے پہچانا جاتا تھا ، کس قدر ہاگیر اور کتنی سیاہ ہے ۔ ایک حلاج اور یہ آواز انا الحق ۔ لیکن کسی شاعر کا قول ہے ، اور شعر اپنے قول میں بڑا کھرا ہوتا ہے کہ اس کی کوئی بھی آواز ضایع نہیں ہوتی ، بھلا وہ آواز کیونکر رایگاں جاتی جو محراب دل سے اٹھی ہو، آئینہ ہستی کی تابندگی لیے ہوئے ہو ۔ چنانچہ یہ اسی آواز کی برکت تھی کہ فقہائے سلطنت کی مخالفت کے باوجود بندگان حرم سجدہ عبودیت سے اٹھ گئے اور خدا کی محبت اور رحمت سے ھمکنار ہو گئے ۔ بندگی سے محبت کا راستہ ، ایک نیا راستہ عرفان ذات کا پیدا ہوا ۔ بندگی میں خودی کا زیاں ، محبت خودی آشنا ہے ۔ یہ انصال و گریز ، فراق و وصال کی شے ہے نہ کہ اتصال ذات و صفات کی ۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ نے خدا کو صرف ناز پرور ہی نہیں بلکہ انسان کا نیازمند بھی بتایا ہے ، اسی کے آئینے میں اس نے اپنے کو دیکھا ہے ۔ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں ۔ اقبال کا ایک مصرع ہے ، انسان کی عظمت سے متعلق، کبریا را در سجودش دیدہ ام (جاوید نامہ) ۔ اس ایک اشارے سے اب آگے بڑھ رہا ہوں ۔ اس محبت کے راستے نے جو اشراق فلاطوں کا ہو یا کسی اور کا ' مسیحی نظریہ' تخلیق کائنات کو بھی مسترد کر دیا ۔ اس کی جگہ نظریہ' صدور ، آفتاب سے نور کی وحدت نے لیا ، جس طرح آفتاب سے روشنی، اسی طرح ذات صفات سے متحد ہے ۔

عالم از ذات جدا نبود و نبود جز ذات
همچو رازیکه بود در دل فرزانه نہاں

اور پھر نثر میں اس کی تشریح غالب ان الفاظ میں کرتے ہیں :

'' ھماں ذات مقدس کہ صفات عین اوست و عالم از وے چوں پرتو از مہر جدا نیست در ہر عالم از اعیان ثابتہ تا صور محشورہ از خویش بہ خویش جلوہ گرست ''۔

ترجمہ : وہ ذات مقدس کہ صفات اس کی عین ہے اور عالم اس سے اس طرح پیوستہ ہے جس طرح روشنی آفتاب سے ہوتی ہے ، اور ہر عالم میں ممکن سے واقع تک ، اپنے سے اپنے پر جلوہ گر ہے ۔

رومی بھی یہی کہتے ہیں :

می گفت در بیاباں رند دھن دریدہ
صوفی خدا ندارد او نیست آفریدہ

کہیں یہ گمان نہ ہو کہ انھوں نے یہ ایک 'رند دھن دریدہ' کی زبان سے یہ کہلایا ہے اس لیے اب ان کی زبان سے سنیے -

چہ تدبیر اے مسلمانان کہ من خودرا نمی دانم
نہ ترسا و یہودیم و نہ گبرم نے مسلمانم
نہ از خاکم نہ از بادم نہ از آبم نہ از آتش
نہ ارکان طبیعیم نہ از افلاک گردانم
نہ از دینے نہ از عقبیٰ نہ از جنت نہ از دوزخ
نہ از آدم نہ از حوا نہ از فردوس رضوانم
مکانم لا مکاں باشد نشانم بے نشاں باشد
نہ تن باشد نہ جاں باشد کہ من از جان جانانم
هوالاول هوالآخر ، هوالظاهر هوالباطن
بغیر از ھو و یا من ھو دگر چیزے نمی دانم

غالب بھی اسی آواز کو دھراتے ھیں :

دل ھر قطرہ ھے ساز انا البحر
ھم اس کے ھیں ھمارا پوچھنا کیا

لیکن یہ اتحاد انسان اور خدا کے درمیان بھلا اس وقت تک کیونکر قایم ھو سکتا ھے جب کہ منطقی حیثیت سے یہ ثابت نہ ھو کہ انسان بھی سرمدی ھے - وہ بھی ''از نا آغاز روز تا انجام جاوید پیوند'' ھے - زمانہ' حاضر میں وقت کا تصور بدل چکا ھے - یہ آئنسٹائین کی معرفت کا نتیجہ ھے - آج وقت بھی کائنات کا ایک تکوینی جزو ھے - اب مکان کا تصور ابعاد ثلاثہ کا نہیں بلکہ ابعاد اربعہ کا ھے - جس میں ایک وقت بھی ھے - اس نظریے کے بعد برگساں کے تسلسلاتی (serial) اور غیر تسلسلاتی (آن دایم) وقت کی دوئی ختم ھو چکی ھے ، جس طرح کہ ھستی انقسام پذیر نہیں ھے (ھستی انقسام نپذیرد - غالب بنام رنگین) اسی طرح وقت کی بھی تقسیم نہیں ھے - اس کا نہ تو آغاز ھے اور نہ انجام ھے ، اس کے دونوں سرے بیکراں ھیں ، اسی طرح جس طرح ھستی محض بیکراں ھے - تبھی تو یہ کہا گیا ھے '' لاتسبوالدھر ، انا الدھر'' - وقت حقیقی ھے ، معروضی ھے - پھر بھی اگر تجریدی

حدیت سے کائنات کو دیکھا جائے تو وہ حرکت مسلسل کے باوجود ''ھے'' '' الان کما کان '' حرکت کے باعث نہ تو اس سے کچھ گھٹتا ھے اور نہ اس میں کچھ بڑھتا ھے۔ حرکت اور دوام ان دونوں تصورات میں کوی نقیض نہیں۔

'' نہ حرکت میں ھوتے ھوئے حرکت میں ھے، دور ھے تا ھم نزدیک ھے، سب میں ھے اور سب سے باھر'' (اپنشد)

غالب اپنی اس توحید وجودی میں ھستیٔ محض کی اس تنزیہ کے بھی قایل ھیں '' سب میں ھے اور سب سے باھر ھے''۔

ھر چند ھر ایک شے میں تو ھے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ھے

بہر حال یہاں دیکھنا تو یہ ھے کہ غالب نے اپنی مابعدالطبیعیات میں انسان کی ابدیت کو منطقی حیثیت سے کیونکر ثابت کرنے کی کوشش کی ھے۔ غالب مہر نیمروز کے دیباچے میں یہ روایت نقل کرتے ھیں کہ کسی نے حضرت علی سے یہ سوال کیا کہ آدم سے پہلے کون تھا، آپ نے فرمایا کہ آدم۔ دوسری بار پھر پوچھا کہ ان سے پہلے، آپ نے پھر وھی فرمایا کہ آدم۔ تیسری بار پھر وھی سوال کیا اور وھی جواب پایا۔ اس پر وہ متعجب ھوا، لیکن اس بات سے بھی با خبر ھوا کہ اگر وہ تیس ھزار بار وھی سوال کرے گا تو وہ اس کا جواب وھی پائے گا۔ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد وہ یہ حدیث نقل کرتے ھیں۔ ان اللہ خلق مایتہ الف آدم۔ غالب کے لیے تو خیر مغرب کے علم کا دروازہ بند تھا، اور اس وقت تک ڈاروِن کا نظریہ بھی منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا، لیکن علامہ اقبال کی تو مغرب کے علوم تک رسائی تھی، وہ بھی اپنے خطبے میں انسان کی سرمدیت کو شجرۃالخلد کے حوالے سے ثابت کرتے ھیں۔ لیکن دونوں کے نظریے میں فرق بھی ھے۔ غالب کے یہاں آدم ھمیشہ سے ھے، علامہ اقبال کے یہاں بہشت سے نکلنے پر جاوداں ھوا ھے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

ڈارون کے نظریہ' ارتقائے انسانی میں اور جدید علم الانسان میں ان تصورات کی کہاں گنجایش کہ آدم سے پہلے آدم یعنی آدم ہمیشہ سے ہے -

لیکن مابعد الطبیعیات کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ وہاں انسان کو بھی حقیقت کی وضاحت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے - اگر یہاں یہ سوال ہوتا کہ انسان کیا ہے ، وہ کیوں کر انسان بنا ہے اور کب سے اس روئے زمین پر ہے ، تو اس کا جواب عام الانسان دے سکتا ہے ، ہر چند کہ وہ کوئی حرف آخر نہ ہوگا ، کیوں کہ ابھی تک اس علم میں ارتقائے انسانی کی بہت سے کڑیاں غائب ہیں۔ پھر بھی ہمیں اسی علم پر بھروسا کرنا ہوگا - جہاں انسانی علم کی کوئی حد نہیں ہے وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ کائنات کا کوئی راز ایسا نہیں ہے جو قابل فہم نہ ہو - انسانی جستجو اسی بظاہر ناقابل فہم کو قابل فہم بنانے کی ہے ، لیکن یہ جستجو مطلق سچائی کی حامل نہیں ہوتی ہے - حامد فلاں روز اور فلاں وقت پیدا ہوا ، ایک مطلق سچائی ہے ، لیکن ایسی مطلق سچائی اشیا کی ماہیت ، زندگی کی حقیقت اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں کسی بھی تاریخی دور میں ملنی محال ہے ، مطلق کے قریب تر ہوتی ہے نہ کہ مطلق ہوتی ہے - صحت اور غلطی کے دونوں کونے آپس میں ملتے ہیں ، وہ ایک دوسرے میں بدل بھی جاتے ہیں - چنانچہ معاملہ زیادہ سے زیادہ سچ اور کم سے کم نا سچ کا ہے ، صحت سے قربت اور دوری کا ہے نہ کہ مطلقیت کا - بہرحال تو میں کہہ رہا تھا کہ مابعد الطبیعیات کی دنیا میں انسان کیوں ہے ، یہ سوال اٹھایا جاتا ہے نہ یہ کہ وہ کیا ہے - ایسا کیوں ہے کہ انسان ہے اور ایسا کیوں نہیں ہے کہ وہ نہیں ہے - اس قسم کا ما بعدالطبیعیاتی سوال ، جواب دینے کے لیے نہیں ہوا کرتا بلکہ انسان کی ہستی کی بے مائگی کو روشنی کے حلقے میں لانے کے لیے ہوتا ہے - جب بھی وقت کی کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں اور فرد بشر سے نبض ہستی چھوٹنے لگتی ہے تو ایک شاعر ہمیشہ اسی قسم کے سوالات اٹھاتا ہے :

ہیں آج کیوں ذلیل ؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی' فرشتہ ہماری جناب میں

یہ سوال غالب کے ذہن میں اس لیے نہیں اٹھا کہ وہ اس کا جواب دینا چاہتے تھے ، یا اس کا کوئی جواب ان کے پاس تھا جس سے کہ انھوں نے ہمیں محروم رکھا ہے - یہ ایک خالصتاً مابعدالطبیعیاتی سوال ہے جس کا مقصد اس سے زیادہ نہیں کہ زوال انسانیت کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس سوال

سے مزید سوالات پیدا کیے جائیں ۔ کیا انسانی وجود ایک حادثہ' اتفاقی ہے ۔ اگر ایسا ہے تو اس کا واجب یا لازمی سے کیا تعلق ہے ، کیونکہ جو لازم ہے وہ اپنے کو اتفاقات کے سلسلے کے ذریعے ظاہر کرتا ہے ، ہر اتفاقی حادثے کے پیچھے لازم پوشیدہ رہتا ہے ۔ اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی وہ لازم یا ہستی' محض کے کسی رشتے کے بغیر ہے تو اس کے اس دعوے کی بنیاد کیونکر ہے ع :
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ۔ وہ اس قدر پستی میں کیوں چلا گیا ۔ اس کی ماورائیت کہاں ہے ؟ یہ سوال غالب نے نہ تو پہلی بار اٹھایا ہے اور نہ آخری بار دھرایا ہے ۔ یہ سقوط آدم کا بار بار ظاہر ہونے والا سوال ہے ۔ یہ سوال سارتر نے فرانس میں دوسری جنگ عظیم میں اس وقت اٹھایا جب آزادی غلامی سے بر سر پیکار تھی ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلامی جیت رہی تھی ۔ اس نا امیدی لیکن بے جگری کے عالم میں سارتر نے اپنی داخلیت (قوت ارادہ) کو بروے کار لاتے ہوئے یہ فیصلہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری قوم کے لیے کیا کہ ہم وہ ہیں جو کچھ کہ اپنے کو بناتے ہیں ، کوئی ایسا خارجی قانون نہیں ۔ جس کے تابع ہمارا وجود ہے ، ہستی خالصتاً حادثاتی ہے ، اس کا نہ تو کوئی ماضی ہے اور نہ اس کا کوئی مسبب ۔ کوئی جوہر، کوئی ذات ، کوئی وجود محض ، کوئی عالم گیر نوعی فطرت، کوئی ٹائپ، کوئی کیٹگری موجود سے پہلے نہیں ۔ اس بے معنی زندگی میں راہ نجات صرف ایک ہی ہے ، ایک ہی دروازہ کھلا ہوا ہے جو اس بزدلی اور ذلت وخواری کی زندگی سے تجھے باہر نکال سکتا ہے ، وہ راستہ آزادی کا ہے ۔ یہ " عذاب زیست ہے کہ انسان آزاد ہونے پر مجبور ہے " ۔

میں یہاں سارتر کے فلسفہ' آزادی سے بحث نہ کروں گا ، ہر چند کہ اس کے فلسفے کی جان اسی میں ہے کیونکہ یہاں موضوع بحث صرف وجود ہے ۔ سارتر جب یہ کہتا ہے کہ انسانی وجود اتفاقی ، حادثاتی ہے تو وہ یہ بات کچھ غلط نہیں کہتا ہے ، کیونکہ واجب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے کو اتفاقات کے سلسلے میں ظاہر کرتا ہے ۔ سارتر کی یہ دوسری بات بھی صحیح ہے کہ جس طرح عموم خصوص سے باہر نہیں ، اسی طرح جوہر ہستی بھی ہستی سے باہر نہیں ۔ لیکن جب وہ کہتا ہے وجود قانون بستہ نہیں ، اس کا کوئی ماضی نہیں ، کوئی نوعی ٹایپ نہیں ، وہ کچھ سے کچھ ہو سکتا ہے تو اس کے خیال کی صحت معرض شک میں آجاتی ہے ۔ ہستی اس قدر سیال نہیں کہ وہ کچھ سے کچھ بھی

ہوسکتی ہے ۔ جو لازمی ہے وہ ابھر کر رہے گی خواہ حادثات اسے پیچھے ہی کی طرف کیوں نہ لے جائیں ۔ اسی طرح زندگی کا ایک ماضی حیاتیاتی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے ۔ ہم انسان کی زندگی میں حیاتیاتی جسمانی ارتقا محسوس نہیں کرتے ، ممکن ہے کچھ تبدیلیاں ہوتی ہوں لیکن ہم محسوس نہیں کرتے ۔ اس کے بر عکس اس کی ترقی اس کے سماجی ارتقا میں دیکھتے ہیں ۔ یہ سماجی ارتقا ہی اس کی زندگی کا بنیادی قانون ہے ۔ انسان کو اس سے باہر نہیں دیکھا جاسکتا ۔ چنانچہ انسان کی ایک فطرت جہاں حیاتیاتی سطح پر جبلتوں کی صورت میں ملتی ہے وہاں اس کی ایک سماجی فطرت بھی جو اس کے سماجی اور کائناتی رشتوں سے متعین ہوتی ہے ، نظر آتی ہے ۔ جہاں جبلتیں پائدار ہیں وہاں اس کا سماجی وجود بدلتا رہتا ہے ، اور یہ تبدیلی اس کی جبلت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے ، اس کے حصول کی صورتوں کو تبدیل کرتی رہتی ہے ۔ انسان کی وہ داخلیت جو مقاصد کو بروے کار لانے سے عبارت ہے ، اس کی سماجی زندگی کا عطیہ ہے ، جو ارتقا پذیر اور قانون بستہ ہے ۔ اس کی آزادی اس قانون سے آزاد ہونے میں نہیں بلکہ اس پر دسترس حاصل کرنے میں ہے ۔ جہاں تک زندگی کے نصب العین کا تعلق ہے انسان اپنا کوئی بھی نصب العین وضع کر سکتا ہے ، لیکن وہ صرف اسی نصب العین کو حاصل کر سکتا ہے جس کی رونمائی سماجی زندگی کا تضاد کرتا ہے ۔ اس ارتقا پذیر سماجی زندگی میں جو لازمی ہے وہ تمام حادثات کے باوجود اپنے کو ظاہر کر کے رہتا ہے ۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری ایک فطرت ہے جس کا حصول ہم کرتے ہیں ؟ اس کا جواب ہے ' اور نہیں دونوں ہی میں ہے ۔ ' ہے اور نہیں ' سے کہیں بھی چھٹکارا نہیں ۔ انسان فطرت کا صرف موضوع ہی نہیں بلکہ معروض بھی ہے ۔ اس کی زندگی کا انحصار ' آب و ہوا ، مٹی اور اس سے پیدا ہونے والی اشیا پر ہے ۔ یہ فطرت خارجیہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے وجود پر اثر انداز رہتی ہے ، اسے اپنی طرف کھینچتی ہے ، عالم گیر قانون فطرت کے تابع رکھنا چاہتی ہے ۔ اس کے برعکس وہ فطرت خارجیہ کو اپنے تصرف میں لاتا ہے ، اسے اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے ، انسان اپنی اس کشمکش ہی میں ترقی کرتا ہے ، چنانچہ جہاں وہ فطرت کو اپنے تابع کرتا ہے ، اسے انسانی دنیا کا حصہ بناتا ہے ، اس کی فطرت کو بے نقاب کرتا ہے ، وہاں وہ اپنے کو اس عمل سے فطرت سے قریب تر بھی کرنا چاہتا ہے ۔ شعوری حیثیت سے اس قانون کی روشنی میں

جو عالمگیر ہے، جو ہر طریق حیات پر منبسط ہے، انسان اپنے انہیں متضاد پہلووں کی وجہ سے جو ایک وحدت میں ہے، معما بھی معلوم ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں کوئی حرف آخر کسی زمانے میں بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ وہ سب سے زیادہ عجیب الخلقت ہے۔ وہ اپنی فطرت پر ہے بھی اور نہیں بھی ہے، وہ بدلتا رہتا ہے، لیکن یہ تبدیلی ارتقائی قوت ہے، وہ ساری اقدار جن پر اس کی زندگی کا انحصار ہے، بنیادی ہیں، وہ ارتقا پذیر ہوتی ہیں، نیا اظہار اور نئی قوت حاصل کرتی ہیں نہ کہ مسترد ہوتی ہیں۔ مسترد صرف وہ اقدار ہوتی ہیں جو حادثاتی صورت کی ہوتی ہیں، جو ایک مخصوص نظام معاشرت اور مخصوص سماجی رشتوں کی حامل ہوتی ہیں، نہ کہ وہ اقدار جو اس کی انسانیت اور اس کی آزادی کی سرحدوں کو وسیع کرتی ہیں، وہ نئے سے نئے معنی اور نئی سے نئی قوت حاصل کرتی جاتی ہیں۔ آخر کار تمام بنی نوع انسان کی یہ مشترکہ جدوجہد کا ہے کی ہے، انہیں اقدار کو ترقی دینے کی ہے جو ہر عہد میں اس کی انسانیت کا جوہر رہی ہیں۔ اگر انسان اپنے وجود کے اس جوہر کا نہ حامل ہو جو اس کی مشترکہ انسانیت ہے تو پھر اس کا کوئی مستقبل نہیں اور نہ اس کی کوئی آزادی ہے۔ اس کی آزادی اس کی انسانیت سے ہمکنار ہے۔ وہ ہمیشہ ان دونوں اقدار کی بنیاد کی تلاش میں رہتا ہے۔ جس طرح روسو ایک مفروضہ حیات ماضی کی طرف اس لیے لوٹا تاکہ وہ نیکی کو اس کی سادہ ترین صورت میں دیکھ سکے اور اپنے اس علم سے حال کی اصلاح کر سکے، اسی طرح مابعد الطبیعیاتی مفکرین اور شعرا بھی انسان کی ہستی کو ہستیٔ محض سے نسبت دے کر اس کی کبریائی اور اس کی فعالیت کو ابھارتے ہیں۔ اسے زیادہ سے زیادہ انسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ آئیڈیلسٹ ہوتے ہیں، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ فلسفیانہ آئیڈیلزم ہی نے پرانے مادی فلسفوں کے فعال پہلو کو ابھارا ہے۔ چنانچہ وہ مابعدالطبیعیاتی شعرا انسان کی سرمدیت یا ابدیت پر اس لیے زور نہیں دیتے ہیں کہ یہ کوئی متحقق حقیقت ہے، ایک ناقابل تردید واقعہ ہے، بلکہ اس لیے کہ اس سے انسان کی ذات مستند بنتی ہے، اس کے مشاہدات و محسوسات، تخیل اور خیال سب کو استناد ملتا ہے۔ اس استناد کے بغیر بھی شاعر، شاعر رہ سکتا ہے۔ اس کے محسوسات اس کے لیے کافی ہیں لیکن وہ ولیم بلیک کی طرح یہ کہنے کا استحقاق نہیں رکھتا:

"میں نے قطرے میں دجلہ، ذرے میں آفتاب، کف دست میں مکان بے کراں اور ایک لمحے میں زمان بیکراں کو دیکھا ہے"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسانیت کو شاعر کی اس چشم تخیل اور اس وجدان کی کیا ضرورت ہے ۔ کیا انسانیت اس علم پر قانع نہیں رہ سکتی جو اسے سائینس سے ملا ہے ۔ جیسا کہ آج کل بعض حضرات ادعا کرتے ہیں کہ ہم اب آرٹ سے سائینس کے کلچر کی دنیا میں آگئے ہیں ، ہمیں شاعری کی سچائی کی نہیں بلکہ سائینس کی سچائی کی ضرورت ہے ۔ اس کا ایک جواب جان اسٹورٹ مل نے انیسویں صدی میں یہ دیا تھا جس سے ہمارے حالی اور شبلی دونوں ہی متاثر تھے ۔ سائینس یہ بتاتی ہے کہ کوئی شے کیوں کر ہے اور کیا ہے ؟ اور شاعری یہ بتاتی ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے ۔ یہ انسان کے جذبات اور محسوسات سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کے جذبات اور محسوسات پر اثر انداز ہوتی ہے ، یہ ہمیں اخلاق کی تعلیم دیتی ہے ، نیکی کی طرف مائل کرتی ہے ، اقدار ہستی سے آگاہ کرتی ہے ، اور پھر اس طرح کی جتنی باتیں آپ بڑھاتے چلے جائیں ، سب اس میں ملیں گی ۔ جان اسٹورٹ مل کا یہ نظریہ کہ شاعری ایک بامقصد جذبہ ہے ، ہمیں کیا ہونا چاہیے ، اس کی تعلیم دیتی ہے ۔ وہ ورڈسورتھ کی شاعری کی حمایت میں تھا ، جسے عقل پرست بنتھمی جس میں اس کا باپ جیمس مل بھی شامل تھا ، جذبے کے علم کو غیر مستند اور بے افادہ ثابت کر کے ، اپنی تنقید کا نشانہ بنائے ہوئے تھے ۔ مل نے ورڈسورتھ کی حمایت کر کے شاعری کی حمایت کی ، چنانچہ اس کے اس خیال کی تردید ابھی تک نہیں ہو سکی کہ شاعری کا تعلق اقدار کی دنیا سے ہے اور یہ ایک مقصدی جذبہ ہے ۔ لیکن اس وقت میرے سامنے مسئلہ اس کے خیال کی حمایت یا مخالفت کا نہیں ، بلکہ رومانی شعرا کی فنی روش کا ہے ۔ کیا شاعری صرف اظہار جذبہ ، اظہار شخصیت ہے یا یہ کہ وہ کسی سچائی کا بھی انکشاف کرتی ہے ، خواہ وہ سچائی جذبے اور محسوسات ہی کی کیوں نہ ہو ۔ اول الذکر صورت میں فن شعر ، شاعر کی شخصیت کا ایک پردۂ ساز بن جاتا ہے ، وہ اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لیے اس فن کو اختیار کرتا ہے نہ کہ اس لیے کہ فن نے اسے منتخب کیا ، حسن معنی کی جلوہ گری کے لیے ۔ فرق صرف رویے کا ہے ، جب فن شاعر کی شخصیت کا صرف اظہار ہوتا ہے ، شاعر کی داخلیت اور جذبہ اہم ہو جاتا ہے ، خواہ وہ اس کی سچائی کو بے نقاب کرے یا نہ کرے ، مجھے قبول کرو یا چھوڑو کا مسئلہ بن جاتا ہے ۔ اس کے برعکس آخرالذکر صورت میں شاعر کو اپنی شخصیت کو مقتضائے فن کے تابع کرنا پڑتا ہے جس میں انکشاف حقیقت کو سب سے مقدم حیثیت حاصل

ہے۔ اس روش میں شاعر فن کا پجاری اور منکشف حقیقت ذات ہوتا ہے۔ جب فن اس درجے پر پہنچتا ہے تو قوت ارادی کی مخالفت جو سامع اور شاعر میں ہوتی ہے گھٹ جاتی ہے، کیوں کہ وہ اپنی ارادی شخصیت کو اس میں اہمیت نہیں دیتا، اسے پس پشت ڈالتا ہے، اور اپنے تجربات کی اس سچائی اور اندرونی مغز کو سامنے لاتا ہے جو جوہر ہستی سے ہمکنار ہونے کے باعث اپنی تصدیق ہر دل سے کراتا ہے۔ سامعین کی قوت ارادی تصادم سے مانع رہتی ہے، توجہ اس پر صرف ہوتی ہے، دیکھو سچ کس سفاکانہ حیثیت سے مچلا ہوا ہے۔ پردگی سے بے پردہ ہوا ہے۔ وہ اس وقت اپنے دشمن کو بھی داد دینے پر مجبور ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے جوہر ہستی سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ فن ظاہر سے باطن میں اترتا ہے، زندگی کے پاتال سے، طوفانوں کے سکون سے زندگی کے گوہر نایاب کو برآمد کرتا ہے، زندگی کا اقرار سرچشمۂ حیات کے ساحل پر کرتا ہے۔ اس وقت ظالم اور کاذب دونوں شرمندہ۔ کیا دنیا کا کوئی بھی شاعر جو حقیقی اور سچا ہو، کسی بھی عہد میں ظلم اور باطل کی حمایت کرسکا ہے۔ اور اگر اس نے کبھی ایسا کیا بھی ہے تو وہ کتنے دنوں فریب زدہ انسانوں کے دل میں زندہ رہا ہے۔ یہ نظریۂ فن غیر شخصی ہوتا ہے جہاں فن سچ کا آئینہ ہوتا ہے، فن کار کسی مخصوص سچ کو نہیں بلکہ زندگی کے سچ کو بے نقاب کرتا ہے۔ کسی مجرد صورت میں نہیں بلکہ محسوس اور منفرد صورت میں، اپنے تجربات کے فانوس میں شمع حقیقت کو اجاگر کرتا ہے، وہ عموم کو اپنے تجربے کی منفرد صورت میں جلوہ گر کرتا ہے۔ سائنس کا انکشاف عملی مقصد کے تابع ہوتا ہے، زندگی کو قائم اور باقی رکھنے اور اس کی آرایش کے لیے آسمانوں سے ستاروں کے توڑنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ فن کا انکشاف اپنے کو پانے، توجد ذات کی طرف مائل ہوتا ہے۔

'اللہ اللہ' یہ صدائے تحسین اس وقت بلند ہوتی ہے جب کسی شعر سے تصدیق وجود ہوتی ہے۔ ذات اور ذات کے درمیان جو ہم آہنگی ہے اس کا نغمہ بیدار ہو جاتا ہے۔

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

کون یہ بتا سکے گا کہ موسیقی کی ترکیب آواز یا رقص آواز میں کیا

معنی پوشیدہ ہے ۔ موسیقی کو مختلف ادوار میں مختلف مقاصد کے تابع کیا گیا ہے ۔ شہوت انگیزی سے لے کر جنگ جوئی تک کے مقاصد پورے کئے گیے ہیں ، لیکن کیا ان حادثات کے باوجود کوئی موسیقی ایسی نہیں ہے جو تعینات ہستی کے پردے اٹھادے اور آپ کل سے ہم آہنگ ہو جائیں ۔ گردش سیارہ کی بھی ایک موسیقی ہے ۔ کیا آپ اسے سنتے ہیں ، لیکن موسیقار اسے بھی اپنے ہوش و گوش کا ایک حصہ بناتا ہے ۔ ہیگل لکھتا ہے کہ موسیقی کی معنویت روح کی عمیق ترین داخلی آزاد زندگی میں ہے ' اور ارسطو کہتا ہے کہ ہمارے ادراک میں کوئی بھی ایسی شے نہیں ہے جو ہمارے حواس سے نہ گزری ہو ۔ کیا اس سے نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ دل یا محسوسات کی دنیا ہمارے ذہن ہی کا ایک حصہ ہے ، یہ دل و دماغ کی دوئی بے معنی ہے ، لیکن انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کیا جا سکتا ہے ۔ موسیقی کا بہت کم تعلق ادراک سے ہے ۔ یہ زیادہ تر احساس کی شے ہے ، گوش دل کی تہذیب کی شے ہے ۔ ہر چند کہ شعر کا ایک رشتہ' آہنگ اور ہم آہنگی' صوت الفاظ کے باعث موسیقی سے ہمیشہ قایم ہے ، لیکن شاعری موسیقی سے مختلف شے ہے ۔ شاعری یونانی لفظ لوگس (لغوی معنی جمع کرنے کے ہیں ، مجتمع صورت میں دیکھنا) سخن ، منطق زبان (ثانوی معنی) کی شے ہے ۔ ہمیں زبان کے اصل کا بھی زیادہ علم نہیں ہے ۔ اس علم کے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ یہ حیوانی زیست کے پہلے سگنلز (Signals) کا جن کا تعلق محسوس اور مخصوص سے ہوتا تھا ، دوسرے سگنلز کا نظام ہے ۔ اب یہ اشارے خصوص کی نہیں بلکہ عموم کی نمایندگی کرتے ہیں ۔ اس میں تعمیم اور تجرید غالب ہے ، یہ خیال (Concept) کا حامل ہوتا ہے ، اور خیال یا تصور ادراک کا رشتہ ہے ۔ جس قدر زیادہ ہم تصور سے تصور کا رشتہ ، اشیا کا رشتہ ، اسباب کا رشتہ دریافت کرتے جاتے ہیں ، ہماری زبان ترقی کرتی جاتی ہے ۔ لیکن اس عمل میں زبان مجرد سے مجرد تر بھی بنتی جاتی ہے ۔ شاعری جو محسوس علم ہے ، جو عموم کو خصوص میں دیکھتی ہے ، زبان کی اس ماہیت سے کشمکش میں بھی آتی ہے ، شاعر مجرد کو محسوس صورت میں سوچتا ہے ، اس طرح وہ زبان کو ایک نیا پیکر (Dimension) دیتا ہے ۔ یہ محسوس مجرد ہوجاتی ہے ۔ شاعر کا یہ عمل زبان کے دونوں سروں کو ملانے کا اس طرح کا خارجی نہیں ہوتا کہ شاعر خیال کو زبان میں اس طرح ڈالتا ہو جس طرح کہ کسی خالی ظرف میں کوئی شے ڈالی جاتی ہے ۔ وہ محسوس طریقے سے سوچتا ہے ، امیجز کے ذریعے ، تشبیہ و استعارہ اور علامتوں کے ذریعے سوچتا ہے ۔ زبان خیال

کی حقیقت ہے ' الفاظ کے ذریعے ہم اشیا کو مسمیٰ کرتے ہیں ۔ ہم اپنے خیال کا اظہار کسی دوسرے ذریعہ' اظہار سے بھی کر سکتے ہیں ، لیکن بھرپور گفتگو یعنی مجرد اور محسوس سطح پر بہ یک وقت صرف زبان ہی کے ذریعے کی جا سکتی ہے ۔ شاعر زبان کے ذریعے اشیا کی نمایندگی نہیں کرتا ہے ، بلکہ اس کے تصور کو پیش کرتا ہے ، لیکن اسے اس قدر محسوس صورت میں پیش کرتا ہے کہ آپ کو شے اور اس کا رشتہ یا خیال دونوں نظر آتے ہیں ۔ شاعری کا سحر اسی میں ہے کہ وہ ایک مجرد ذریعہ' اظہار کو ایک محسوس ذریعہ' اظہار میں تبدیل کر دیتی ہے ، لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ زبان کوئی اس قسم کا میڈیم نہیں جیسے کہ پتھر ' کہ اس کو تراشنا فن کار کا کام ہو ۔ زبان کو استعمال کرنے کے معنی ہیں ' محسوس سطح پر ایک تصور کو دوسرے تصور سے نسبت دینے سے ، شاعر انہیں اپنے معنوں میں معنی آفریں ہے ۔ کچھ لوگ اسے خیال بندی سے خلط ملط کرتے ہیں ، خیال بندی شاعری نہیں بلکہ شاعری کی نقالی ہے ۔ یہ بچوں کا ایک کھیل ہے ' دیدہ' بینا کا کام نہیں ۔ شاعر کسی بھی شے کی نقل نہیں کرتا ہے اور نہ کوئی شے ایجاد کرتا ہے ، وہ تو صرف چھپے ہوئے کو بے نقاب کرتا ہے ، حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے ، وہ تو آئینے (پہلے آئینہ فولاد کا ہوا کرتا تھا) سے زنگار کو ہٹاتا ہے تا کہ وہ حقیقت کو صحیح طور سے منعکس کر سکے ۔ غالب کا فن شعر صیقل آیینہ ہے نہ کہ مصوری یا نقالی ۔

یک الف بیش نہیں صیقل آیینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

غالب اپنے ایک فارسی خط میں نواب انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں ۔

" آہ از من کہ مرا زباں زدہ و سوختہ' خرمن آفرید ۔ نہ بائین نیاگان خویش سلطان سنجر دارائے کلاوہ کمری و نہ بفرہنگ فرزانگان پیشیں بو علی آسا علم و ہنری گفتم ، درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم ، ذوق سخن کہ ازل آوردہ بود رہزنی کرد و مرا بداں فریفت کہ آئینہ' زدودن و صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است ۔ سر لشکری و دانشوری خود نیست ، صوفیگری بگزار و بسخن گستری روے آر ۔ نا گزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحر شعر کہ سراب است رواں کردم ، قلم علم شد " ۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی طبیعت میں ایک گونہ تصوف بھی ہے کیونکہ کبھی کبھی وہ تصوف کی زبان میں بھی گفتگو کرتے ہیں :

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن بنیادی حیثیت سے وہ اپنی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک شاعر ، یا پھر ایک مابعد الطبیعیاتی شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں ' انبساط تعقل ' ہے ۔ '' صوفی گری بگزار ، در سخن گستری روے بر آر '' اس ارادے کی گونج ان کی تنقید فن شعر میں بھی ملتی ہے ۔ وہ صوفیوں کے تصور شعر کے خلاف ہیں ۔

نہ از من ز سعدی شنو تا چہ گفت — سخن گفتہ در پردہ اما چہ گفت
رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست — بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست
دگر رہروے گوید از زیر دلق — کہ حق ست محسوس و معقول خلق
خیالے در اندیشہ دارد نمود — ہماں غیب غیبست بزم شہود
نشانہاے راز خیال خودیم — نوا ھاے ساز خیال خودیم
خوشت باد غالب بساز آمدن — نوا سنج قانون راز آمدن
تصوف نہ زیبد سخن پیشہ را — سخن پیشہ رند کژ اندیشہ را

صوفی حقیقت کو مجسم صورت میں دیکھنے کا مدعی ہوتا ہے اس لیے وجدان پر زور دیتا ہے جو برگساں کے الفاظ میں کسی شے کو مجسم صورت میں دیکھنے کا نام ہے ۔ غالب بھی کبھی کبھی وجدان کو استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن وہ اس کا ادعا نہیں کرتے کہ انہوں نے ہستیٔ مطلق کے رخ زیبا کو دیکھا ہے ۔ ان کے یہاں ادراک ہے نہ کہ مشاہدہ جبکہ '' اصل شہود و شاہد و مشہود '' ایک ہو تو پھر مشاہدہ کے کیا معنی ۔

موسیٰ و خضر تماشائے تجلی بر طور
من نہ در بند جہاتم تنہ تا ہو یا ہو
ظلمت کفر مبیں ، روشنیٔ طبع نگر
چشمۂ آب حیاتم تنہ تا ہو یا ہو

چنانچہ یہ اسی ادراک کا نتیجہ ہے جو وہ یہ کہتے ہیں :

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

یہ تشکک محرومیٔ دید سے ہے ، لیکن جب خرد رہنمائی کرتی ہے تو یہ پردہ اٹھ جاتا ہے ، اس وقت وہ صرف اپنے کو دیکھتا ہے ۔ ' نشانہائے راز خیال خودم ' ۔

خرد را سگالم کہ نیرو دھد   خود او را ز من حیرتی رو دھد
چوں پیدا تو باشی ، نہاں ھم توی   اگر پردہ باشد آں ھم توی
عیار وجود آشکارا کنی   نشانہائے جود آشکارا کنی

وہ خدا شناسی میں خود نمائی اور خود نمائی میں خدا شناسی کا جلوہ کرتا ہے ۔ ع: خود نمائی خدا شناسیہاست ۔ خود نمائی حصول ذات ، تکمیل ذات کا جذبہ ہے ۔ اس کا رخ زندگی کے کسی ایک رخ کی طرف نہیں جیسا کہ کانٹ کے یہاں ہے بلکہ زندگی کے جامع پہلوؤں کی طرف ہے ۔ غالب جس کا دل کہ یک شہر آرزو اور یک اھرمستان رنگ و ریو تھا ، بھرپور زندگی کا تمنائی تھا ۔ ان تمناؤں میں کوئی بھی اس کی تمنا گناہ نہ تھی ۔ زندگی جو آرزوؤں اور تمناؤں سے عبارت ہے اور اپنی آفرینش آرزو ھی کے باعث مقدس ہے ، بھلا اس زندگی کی کوئی تمنا کیونکر گناہ ھو سکتی تھی ۔ لیکن زمانے نے انھیں اپنی خواھشات کو پورا کرنے کے ان کے ''اپنے اندازۂ پایست'' سے بہت کم مواقع اور ذرایع مہیا کیے ۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے ۔ ھر عہد کا ایک خاص معیار حصول ذات کا ھوتا ہے اور اسے امرا اور دولتمند لوگوں کے معیار سے دیکھا جاتا ہے ۔ غالب جس عہد سے تعلق رکھتے تھے ، اس عہد کے امرا کے حصول ذات کا معیار ، غربا کے حصول ذات کا پابند نہ تھا ، بلکہ ان کا تو وجود ھی اس لیے تھا کہ وہ ان کے حصول ذات کا ذریعہ بنیں ۔ تونگری اور مفلسی کا فرق نہ ھوتو جود و سخا اور بخشش کا مظاھرہ کیونکر ھو ، چنانچہ منجملہ عیش وعشرت جود و سخا بھی عیش ھی کا ایک جذبہ تھا ۔ غالب اسی امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو بنیوں اور سرمایہ داروں کی طرح خسیس نہ تھا ، دولت سے دولت پیدا نہ کرتے ، بلکہ صارف تھے ، ان سے بڑا کوئی صارف طبقہ دنیا میں آج تک پیداھی نہیں ھوا ہے ۔ امریکہ کے چند یانکی پاشا ان کا مقابلہ کر سکیں

تو کرسکیں ورنہ کوئی اور ان کے مقابلے کا نہ تھا ۔ کیا یہ بدنصیبی نہ تھی کہ پانچ برس کی عمر میں باپ اور نو برس کی عمر میں چچا مر گیا ، جو سترہ سو روپے مہینے کا ملازم اور لاکھ دو لاکھ کی جاگیر کا مالک تھا ، اور وہ اس کے خون بہا کے صرف ساڑھے باسٹھ روپے آٹھ آنے کے حصہ دار تھے ۔ یہ غالب اپنے طبقے کے معیار زندگی اور زندگی کے ارمانوں کا کب تک ساتھ دے سکتا تھا ۔ تلوار ، جو پہلے قسمت آزمائی کا ذریعہ تھی اور جس کے بل بوتے پر دادا سے لےکر چچا تک سب کچھ بنے تھے ، اب ٹکسال باہر ہو چکی تھی ۔ اس کے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کے تیر شکستہ کو اپنا قلم بنالیں ۔

چوں رفت سپہبدی زدم جنگ بشعر
شد تیر شکستہ' نیاگاں قلمم

اب ان کی ساری قوت اسی قلم یا فن کی تکمیل پر مرتکز ہوگئی ۔ لیکن ایسا انہوں نے اپنی صلاحیت کو سمجھے بغیر نہ کیا انہوں نے ' خاتمہ' گل رعنا ' کی عبارت میں اپنے اس ظہور استعداد کو بڑے خوبصورت تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے کہ کیونکر ایک پری خواب میں ظاہر ہوئی اور اس نے ان کو فن کی طرف مائل کیا ۔ اور جب صلاحیت خود کسی چیز کی طرف انسان کو مائل کرے تو پھر اس کے حصول میں زحمت نہیں ہوتی ۔ غالباً اپنی صلاحیت کے انکشاف سے فن کی طرف آئے لیکن اس شد و مد کے ساتھ آئے گویا فن نے ان پر رہزنی کی ۔ فن انہیں اپنی دنیا میں لے گیا ۔ وہ اسد اللہ خاں رہنے کے بجائے قلمرو فن کے شہری ہوگئے ۔ ان کی شخصیت مقتضائے فن کی تابع ہوگئی ۔ اس میں کشمکش بھی رہی ، لیکن آخر کار فن ان پر رہزنی کرکے رہا ۔ اس نے انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ۔ غالب ایک لریکل شاعر ہے ، اور جہاں اس قسم کی شاعری ہوتی ہے جس میں شاعر اپنی خواہشات ، آرزوؤں ، تمناؤں ، دکھ درد اور خوشی کا اظہار کرتا ہے ، شخصی عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ غالب کے یہاں بھی وہ شخصی عنصر موجود ہے اور کیونکر نہ ہو جب کہ شاعر سچ کا انکشاف اپنے محسوسات اور تجربات کی سطح پر کرتا ہے ۔ لیکن جب وہ باشعور ہو جاتا ہے کہ اس کا کام جذبے کی سچائی کو بے نقاب کرنا ہے تو وہ اپنی شخصیت کو فن پر غالب آنے نہیں دیتا ہے ۔ غالب کا فن رومانی شعرا کے فن سے انہیں معنوں میں مختلف ہے ۔ اس کا فن غیر شخصی ہے جو فن کی اصل ماہیت تھی اس سے قریب تر ہے ۔ فن کو تاریخ

میں مختلف مقاصد کے تابع استعمال کیا گیا ہے ۔ کہیں پند و موعظت کا کام لیا گیا ہے تو کہیں تفریح کا ، لیکن فن ہر صورت میں اپنی اصل کی طرف جھکتا رہا ہے ۔ یہ انسان کا پہلا اورریجنل عمل علم تھا ۔ اس نے شاعری ہی سے اشیا کو مسمیٰ کیا ۔ شاعری ہی سے زبان پر مایہ ہوئی ہے ، چنانچہ شاعر ہی زبان بھی خلق کرتا ہے ۔ شعر ایک ہنر تھا ، جادو تھا ' خارج کی دنیا کو داخلی دنیا میں لے کر ، اس کی حقیقت کو بے نقاب کرنے اور اپنی داخلیت کو موثر بنانے کا ۔ لیکن انسان صرف ایک قوت ارادہ ہی تو نہیں' وہ نا امیدی ، مایوسی ، حرماں نصیبی ، بیچارگی اور اندیشہ' موت کے تجربات سے بھی گزرتا ہے ۔ ایسے ہی لمحات میں اسے اپنی روح کی گہرائی کو چھونے اور وجود کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے ، اس وقت یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ بلندی سے پستی میں پہنچ گیا ۔ اور جب اس احساس سے شاعر دو چار ہوتا ہے تو یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا وجود ایک حادثہ محض اتفاقی ہے یا یہ کہ اس کے پیچھے کوئی حقیقت چھپی ہوئی ہے ، وہ لازمی کا جزو اور دائمی ہے ۔ یہ سوال زندگی میں از سر نو اعتماد پیدا کرنے اور انسان کو عمل کی طرف مائل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے ۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ مغرب سے جو روشنی آئی اس کا اس نے خیر مقدم کیا ، لیکن چونکہ یہ روشنی سیاسی غلبے کے ساتھ آئی ، اور وہ سیاسی غلبہ پوری ان کی تہذیبی دنیا کو مٹا رہا تھا ، اس لیے وہ اس سیاسی غلبے سے اپنی روح کی گہرائی میں متصادم بھی تھے ۔ حالی غالب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا ۔ ایک روز اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ '' مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے '' ۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ آزادہ رو تھے ، لیکن جس سوسائٹی کے وہ فرد تھے اس سوسائٹی کی زندگی اور تہذیب سے ان کا تعلق خاطر بہت شدید تھا ۔ اور یہ اسی جذبے کی کارستانی تھی کہ وہ ایک نئی زندگی ، ایک نئے جہان کی تخلیق کی طرف آمادہ ہوئے ۔ لیکن ان کا نقطہ' نظر اصلاحی نہیں بلکہ انقلابی تھا ۔ وہ دین و دنیا ، جسم و جان ، کسی قسم کی دوئی کے قایل نہ تھے ۔ ان کی نظر میں ہستی' محض جس کا دوسرا نام وقت ہے ایک ہے ، کسی انقسام کو قبول نہیں کرتی ، اس کے دونوں سرے بیکراں ہیں ۔ ایک آن ہے ہر چند کہ متحرک ہے ، اس سے کسی

ایسی دنیا کا پیکر تراشنا جو دائمی سکون کا ہو ، جہاں کوئی تغیر نہ ہو ۔ شرک فی‌الوجود تھا ، خواہ وہ دین ہو یا دنیا ہو ۔ وہ غمگین کو لکھتے ہیں :

'' دانم کہ وجود یکے ہست ، و ہرگز انقسام نہ پذیرد ، ہر آینہ اگر دینے یا دنیائے تراشیدہ باشم گرفتار شرک فی الوجود ، کہ اقبح افراد شرک است شدہ باشم ۔ بہ دانست نامہ نگار دین نیز ہمچو دنیا موہوم است و بہ وہم دل نتواں بست '' ۔

بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نظریہ' توحید سے ایک قسم کی منفیت اور بے دلی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آنے کا ۔ بے کسی' ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں ۔ لیکن چونکہ شاعر اپنی ذات کو باطل نہیں کرتا ہے بلکہ اتحاد ذات حاصل کرنے کے بعد آپ خارج کی دنیا سے وہی رشتہ دیتا ہے جو ذات کا رشتہ صفات سے ہے اس لیے وہ اپنے کو ایک جہان نو کی تخلیق میں بالکل آزاد بھی محسوس کرتا ہے ۔ اس جذبے سے اس کی تخلیقی قوتیں زیادہ ابھرتی ہیں اور جو بے اعتباری اپنی ذات سے متعلق اس اتحاد کے قائم کرنے سے پہلے ہوتی ہے وہ جاتی رہتی ہے ۔ فنکار کی آیڈیلوجی کیا ہے اس کا ثبوت اس کے فن میں ہے نہ کہ اس کی آیڈیلوجی میں ۔ اگر فن بولتا ہے ، حقیقت کا غماز ہے ، زندگی کی سچائی کو بے نقاب کرتا ہے اور ہر دل میں اس کی آواز گونجتی ہے تو پھر یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ جس آیڈیلوجی کی عمارت سے اس نے یہ کام لیا ہے وہ ہمارے لیے قابل قبول ہے کہ نہیں ۔ کثرت کو توحید میں پرونے کا ہر شاعر کے یہاں ایک نظام فکر ہوتا ہے ، وہ کہیں مانگے تانگے کا ہوتا ہے تو کہیں خود ساختہ ہوتا ہے جسے وہ خود تخلیق کرتا ہے ۔

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ وعبادت میکنم

یہ آیڈیلوجی زیادہ سے زیادہ اس کے طریق فکر کو متعین کرتی ہے ، چنانچہ اصل شے دیکھنے کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے حقیقت پر کیونکر عمل پیرا ہوا ہے ۔ زندگی کے تضاد کو ، حقایق کے تضاد کو بے نقاب کرتا ہے کہ نہیں ، نئے سوالات اٹھاتا ہے کہ نہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ آیڈیلوجی کا عنصر بھی ، فن میں اسی طرح جھلکتا ہے جس طرح شخصیت کا ، لیکن ایک بڑے فنکار کے یہاں جس طرح شخصیت پس پردہ ہوجاتی ہے ، اسی طرح آیڈیلوجی بھی ۔ غالب نے فن کو کسی آیڈیلوجی کے اظہار کے لیے استعمال نہیں کیا ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ ہو ، یہ اس کا فن ہے جو ہمیں مسحور کرتا ہے ۔

[غالب ایک مطالعہ]

رازداں اپنا

جمیل جالبی

[۱]

جب بھی ہم اپنے گھر کی بیٹھک میں سے گزرتے تو آتے جاتے دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر سے ہمارا آمنا سامنا ضرور ہوتا ۔ میر جالب دہلوی کو یہ تصویر لاہور کے کسی مصور نے بنا کر دی تھی ۔ ہماری خاندانی روایت کے مطابق یہ تصویر جالب صاحب کو بہت عزیز تھی ۔ فراخ پیشانی ، کھلی کھلی آجلی آنکھوں میں سوچ کا بھنور ، روئی کے گالوں جیسی بھری بھری ڈاڑھی ، سیاہ پوستین کی اونچی سی کلاہ پاپاخ ، جامہ وار کا پھول دار رنگین چغہ ، اوپر کا پتلا سا ہونٹ بالوں میں چھپا ہوا ، نیچے کا ہونٹ پھولپن لیے ہوئے نمایاں ، چہرے سے شرافت اور لباس سے رئیسی ٹپکتی تھی ۔ جھریوں سے بڑھاپے کا پتا چلتا تھا ۔ یہ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب کی تصویر تھی ۔ جالب صاحب نے جب شعر و ادب کے میدان میں قدم رکھا تو ' غالب ' کی رعایت سے اپنا تخلص بھی ' جالب ' رکھا ۔ ہمارے ایک چچا تھے جو ' دیوان غالب ' ہردم اپنے ساتھ رکھتے ۔ بات کرتے تو غالب کے اشعار کی زبان میں ، زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتے تو غالب کے اشعار سے ، رات کو پلنگ پر لیٹ کر گاتے تو غالب کی غزلیں ۔ خط لکھتے تو ' خطوط غالب ' جیسے اور بات بات میں غالب کے اشعار اور مصرعوں کے حوالے ۔ سب چھوٹے بڑے انہیں ' چچا غالب ' کہتے تھے اور یہی ان کا نام پڑ گیا تھا۔ اسی طرح بچپن ہی سے غالب ہمارے گھر کی فضا کا ایک حصہ بن گئے تھے ۔ جب پاکستان بنا اور فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکی تو ' چچا غالب ' کے یہ الفاظ کہ " میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان

میں نہ رہوں " ہر وقت دہرایا کرتے - پھر ایک دن بے سرو سامانی کے عالم میں ہم پاکستان آگئے - غالب کی وہ تصویر تو ہندوستان میں رہ گئی لیکن ' چچا ' دیوان غالب اپنے ساتھ لے آئے - یہ دیوان غالب آج میری میراث ہے -

[۲]

غالب کو مرے اب سو سال ہوگئے ہیں - سو سال کے عرصے میں کئی دنیائیں آباد ہوئیں اور ذہن انسانی نے نئے انقلابات اور افکار سے بنتا بگڑتا کہیں سے کہیں پہنچ گیا - نئے پرانے ہو کر مٹ گئے - بہت سے مشاہیر وقت کے بے کراں سناٹے میں گم ہو کر تاریخ کی جھولی میں جا گرے اور ہمیشہ کے لیے ذہن انسانی سے محو ہوگئے - لیکن غالب — غالب آج بھی ہماری رگوں میں خون بن کر گردش کر رہا ہے - وہ شخص جو مرنے کے سو سال بعد بھی زندہ رہے، نہ صرف زندہ رہے بلکہ ہمارے مزاج، ہماری زبان، ہمارے شعور و فکر کا حصہ بن کر ہم پر حکمرانی کرتا رہے، اس میں یقیناً ایسی رنگا رنگ خصوصیات یک جا ہو گئی ہوں گی، جو اس کی اتنی طویل زندگی کی ضامن ہوں - غالب کی تخلیقی شخصیت میں سدا بہار حسن و جمال کے ساتھ یکجا ہونے والی ان خصوصیات کو ہم ایک لفظ ' عظیم ' سے ظاہر کر سکتے ہیں - عظیم شاعر کہیں صدیوں میں جا کر ایک آدھ بار ظہور میں آتا ہے - جب دانش و حکمت نوائے سروش بن کر شاعری کی زبان میں اظہار پاتی ہے تو عظیم شاعر پیدا ہوتا ہے جس میں نہ صرف اپنے ماضی اور اپنے زمانے کا شعور بلکہ آنے والے زمانوں کا شعور بھی گھل مل کر ایک ایسی اکائی بن جاتا ہے جو ہر دور میں ذہن انسانی میں اعتماد کا صور پھونک کر تخلیقی تسکین بہم پہنچاتا ہے - اس طرح عظیم شاعر کی تعریف کرکے غالب کو تلاش کیا جاسکتا ہے اور غالب کی خصوصیات اجاگر کرکے عظیم شاعر کے معنی دریافت کیے جاسکتے ہیں۔

غالب اپنے زمانے کا ایک جزو ہوتے ہوئے بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھا - اسی لیے غالب نے آنے والی نسلوں کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے۔ غالب کی تخلیقی شخصیت میں آنے والے زمانوں کا شعور اس طور پر شامل ہو گیا کہ جب زمانہ قدم قدم چل کر کسی ایک منزل پر پہنچا تو دیکھا کہ نئے روپ، نئے انداز اور نئی تازگی کے ساتھ غالب وہاں پہلے سے موجود ہے - وہ ہم سب سے الگ ہوتے ہوئے بھی ہم سب میں موجود ہے - غالب نے کائنات اور

انسان کی وہ آفاقی اور ابدی صداقتیں دریافت کیں جنھوں نے ذہن انسانی کو وسعت و عظمت عطا کی اور جنھوں نے جذبات کی تہذیب کرکے حسن و لطافت کا ایک ایسا معیار دیا ۔ عظیم شاعر حیات و کائنات کے مسائل کو انسانی جذبات و احساسات کو اپنی فکر کے ساتھ اس طور پر ملاکر ایک کردیتا ہے کہ جیسے جیسے زندگی بدلتی ہے اور فکر ، احساس و شعور کی مختلف سطحیں ابھرتی ہیں اس کے شعور کی روشنی ہر دفعہ ذہن انسانی کو آئینہ دکھا کر گونگے افکار و احساسات کو زبان دے دیتی ہے ۔ اسی لیے غالب ہمارا شاعر ہوتے ہوئے بھی صرف ہماری ہی نہیں بلکہ سارے عالم انسانیت کی میراث ہے — غالب نے یہ طور ، زبان و بیان کا یہ روپ ، فکر و نظر کی یہ روشنی اس وقت دی جب نئی زندگی کی تلاش میں اردو زبان خود اس ایجاد کے لیے بے قرار تھی ۔

[۲]

غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس کے سلسلے میں فلسفی ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ شاعر اور فلسفی ہمیشہ دو متضاد ہستیاں سمجھی جاتی رہی ہیں اسی لیے افلاطون نے شاعر کو اپنی ' جمہوریہ ' میں کوئی مقام نہیں دیا ، مگر ارسطو نے جب یہ کہا کہ شاعری تاریخ سے زیادہ فلسفیانہ ہے کیونکہ تاریخ وقتی چیزوں سے سروکار رکھتی ہے جبکہ شاعری آفاقی چیزوں سے ، تو اس کا مقصد یہی تھا کہ شاعر کو بھی فلسفی کے ہم دوش کھڑا کیا جا سکتا ہے ۔ قرون وسطیٰ میں بنیادی طور پر شاعر کا کام مذہب کے اصولوں کی تبلیغ رہا ۔ لیکن شاعری اور فلسفہ کی ہم آہنگی پہلی بار انیسویں صدی میں گوئٹے سے شروع ہوئی ، جہاں فلسفہ شاعری میں اور شاعری فلسفہ میں جذب ہوکر ایک مکمل اکائی بن گئے اور اس کے بعد بڑا شاعر وہی سمجھا گیا جو فلسفی بھی تھا ۔ مشرق میں ہمیشہ شاعری کا تعلق مذہبی روایات کے ساتھ گہرا رہا ہے ۔ اور دانش و حکمت سب مذہبی تصورات میں شامل رہے ہیں ۔ اسی لیے شاعری نے بھی اپنے صنعیات ، رمزیات ، تلمیحات و کنایات اسی روایت سے اخذ کیے ، اور اپنے مزاج میں سمو لیے ۔ فارسی اردو شاعری میں موضوعات ، اظہار اور مزاج پر اسی فکر کی گہری چھاپ ملتی ہے ۔ کبھی ہمارے شعرا نے دین کی حکمت کو دنیا کے تجربات کے ذریعے بیان کیا ۔ کبھی تصوف کے مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا ۔ ولی دکنی سے پہلے کی کم و بیش ساری شاعری مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہے اور ولی کے ساتھ ہی تصوف اپنے پورے پھیلاؤ

کے ساتھ اردو شاعری کی روایت میں شامل ہو جاتا ہے ۔ غالب کے دور تک شاعری کی یہ روایت اور تہذیب کا وہ نظام جس نے اس روایت کو اپنی کوکھ سے جنم دیا زندہ و سالم تھا ۔ اسی لیے اس روایت میں شاعری کرنے والا شاعر ذوق ، جس کا طرز احساس اور فکری ادراک اسی روایت کی لکیر پر چل رہا تھا ، اس دور کا سب سے بڑا شاعر تھا اور غالب کی شاعری کا چراغ اس کے آگے نہیں جاتا تھا ۔ غالب کی شاعری اس روایت کے دائرے کو توڑ کر ایک نیا دائرہ بناتی ہے جو اس طرز احساس کا دائرہ ہے جس میں نئی دینا کا رنگ و آہنگ ، فکر و احساس ' شعور و ادراک کروٹیں لے رہا ہے ۔ اسی لیے جب تک روایتی طرز احساس کا نظام زندہ رہا ذوق بڑے شاعر رہے اور جیسے ہی جدید فکر کی روشنی نے معاشرے کو متاثر کر کے بدلنا شروع کیا ، غالب کی شاعری کا سورج نصف النہار پر آ کر چمکنے لگا ۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق اور غالب دو مختلف دائروں اور دو مختلف طرز احساس کے شاعر ہیں ۔ اسی لیے ذوق آج بھی پنواڑی ، کبابی کی دوکان سے لے کر روایتی علما ، واعظوں اور خطیبوں کے ہاں روایت کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے جب کہ ہمارے جدید شعور نے غالب کے شعور سے مل کر اس نئے دائرے کو واضح اور مکمل کر دیا ہے ۔ اب جب بھی جدید زندہ شعور کی تلاش میں اہل فکر نکلیں گے تو سڑک کے ایک سرے پر انھیں غالب اور صرف غالب تماشائے اہل کرم دیکھتے ملیں گے اور جب بھی قدیم روایت کی تلاش ہوگی تو وہاں ذوق گولر کا پھول تلاش کرتے نظر آئیں گے ۔ اسی لیے غالب کے اشعار ایک زندہ تجربہ معلوم ہوتے ہیں اور ذوق کے ہاں اب سرے سے تجربے کا احساس ہی نہیں ہوتا ۔ یہی زندہ اور '' متروک '' طرز احساس (یا مردہ طرز احساس کہہ لیجیے) کا فرق ہے ۔

غالب کی شاعری میں قدیم روایت ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوجاتی ہے اور یہ فرزند آذر اپنی روایت کا ایک الگ دائرہ بناتا نظر آتا ہے جس میں ہمارا جدید شعور و ادراک ، ہم آپ سب کھڑے ہیں ۔ یہاں فکر کی وہ علوی سطح نظر آتی ہے جس کے ساتھ ہی شاعری فلسفے کے دائرہ میں داخل ہوجاتی ہے ۔ ہمارے ہاں چونکہ اب تک شاعری کی اس نوع کی روایت موجود نہیں تھی ، اس لیے ہم

شاعر کو فلسفی مانتے ہوئے کتراتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ شاعر اور فلسفی دونوں دائمی اور آفاقی حقیقتوں تک پہنچتے ہیں مگر دونوں کے راستے جدا جدا ہوتے ہیں ۔ شاعر کا راستہ تخیل اور شعور کے ادراک کا راستہ ہے ، فلسفی کا دلیل و بحث کا ۔ مثلاً جس امر پر اسپنوزا نے کائنات کے بارے میں بحث کی اسی پر گوئٹے نے بھی روشنی ڈالی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ بدی کے ساتھ جو صفات فلسفی اسپنوزا نے تحلیل کے ذریعہ پیش کی ہیں وہ گوئٹے نے فاؤسٹ میں میفسٹوفلیس کے کردار میں پیش کردی ہیں ۔ اب لے دے کر شاعر کے فلسفی ہونے کا معیار یہ رہا کہ آیا شاعر ان آفاقی بلندیوں تک پہنچا ہے یا نہیں جن تک فلسفی پہنچا ہے ؟ غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جو اس معیار پر پورا اترتا ہے ۔ غالب کے سلسلے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاں چونکہ منظم فکر نہیں ہے اس لیے اسے فلسفی شاعر کہنا غلطی ہے ۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو کسی فلسفی کا کوئی نظام فکر ایسا نہیں ہو سکتا جو تضاد سے پاک ہو اور ہر اعتبار سے مربوط اور ہموار ہو ۔ ہمیں تو بنیادی طور پر شاعر میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے شعور کو ، ہماری فکر کو کہاں تک آگے بڑھایا ہے اور کن آفاقی اور ابدی صداقتوں کو تجربے کی بھٹی میں کندن بنا کر پیش کیا ہے ۔ اس معیار پر غالب کی شاعری پوری اترتی ہے اور گنجینۂ معنی کے طلسم اس کے اشعار میں بند نظر آتے ہیں ۔ جیسے جیسے ہمارا شعور ترقی کرتا جاتا ہے یہ طلسم بھی کھلتے جاتے ہیں ۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے پہلی بار فکر کو احساس کے ساتھ اس طور پر ملایا کہ اس کے راگ اور رنگ نے آفاقیت کے آہنگ کو اپنے اندر سمیٹ لیا ۔ اس کے ہاں میر کی طرح احساس و جذبہ کے ننھے منے جگنو نہیں چمکتے بلکہ فکر کی حرارت اور شعور و احساس کا ادراک ذوق تماشا بخشتا ہے ۔ غالب کی نظر ایک فلسفی کی نظر ہے اور وہ جن چیزوں کو سامنے لاتا ہے تخیل ، تجربے اور جذبات کے ذریعے (جسے ٹی ایس ایلیٹ فکر کا جذباتی مرادف Emotional equivalent to thought کہتا ہے) ان کی دائمی حقیقت اور گہرائی تک بھی پہنچا دیتا ہے ۔ ہر اس معاملے پر جہاں ہمیں فلسفی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ، غالب کے خیالات ہمیں ملتے ہیں اور بیک وقت فلسفیانہ و شاعرانہ تسکین بہم پہنچاتے ہیں ۔

مشرق میں غالب تقریباً اس زمانے میں زندہ تھے جب کیرک گارڈ اور

نطشے مغرب میں اپنے خیالات سے ذہن انسانی کو متاثر کر رہے تھے - ان لوگوں نے فلسفے کو بے جان پا کر اس میں داخلی پہلو کو خاص اہمیت دی - غالب نے بھی ، ذوق کے برخلاف ، اپنی شاعری میں یہی کام انجام دیا - ان کی شاعری میں وہ تمام فلسفیانہ خیالات موجود ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی کے ہاں ملتے ہیں - وہ ایک طرف مولانا روم اور عرفی کے انداز میں سوچتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف گوئٹے اور براوننگ کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں - اگر ان کے ہاں ایک طرف تصوف کی آئڈیلزم ہے تو دوسری طرف حیات و کائنات کے ذاتی مطالعے کی آئڈیلزم بھی نظر آتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمام کائنات کو ایک علوی درجے سے دیکھ رہے ہیں - یہاں حسن و عشق کا درجہ بھی علوی ہے - یہاں وہ غم کی دلدل میں دھنس کر نہیں رہ جاتے - قنوطیت ان کو ڈھا نہیں دیتی بلکہ ان کی آواز میں بلند حوصلگی اور مردانہ پن کا احساس ہوتا ہے - تمام تنقید حیات میں ان کی خودی اور خود اعتمادی جلوہ گر نظر آتی ہے - اسی لیے ان کے اشعار مختلف موقعوں پر یاد آ کر امید کا سبق دیتے ہیں -

غالب کے ہاں اخلاقیات کا ایک خاص مقام ہے - یہاں وہ زندگی سے بہت قریب اور زندگی پر کامل یقین رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں - شکایت سے بالا تر رہنے کا درس دیتے ہیں - شکایت کرنا چھوٹے نفس کا فعل ہے جس سے ایک طرف ذہانت کی کمی اور دوسری طرف عزم ، صبر اور استقلال کی کمی کا ثبوت ملتا ہے - وہ خدا سے بھی ستم جور ناخدا کی شکایت نہیں کرتے - عزت نفس کا درجہ اتنا بلند ہے کہ سبک سر بن کے سرگرانی کی وجہ پوچھنا بھی پسند نہیں کرتے - وفاداری کو بشرط استواری اصل ایمان قرار دیتے ہیں - رنج و الم کو عارضی چیز بتاتے ہیں اور مردانہ وار اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی تلقین کرتے ہیں - برائی کو نہ سننے کی تلقین ، خطا پر بخشش دینے اور غلط چلنے پر مردانہ وار روک دینے کا سبق دیتے ہیں - سچائی کی تلقین اور ' آزادہ روی ' ان کے اخلاقی فلسفے کا بنیادی مزاج ہے - یہ زندگی کی عام اخلاقیات کی بھی بلند تر سطح ہے اور غالب نے اپنی نظر اور طرز سے اسے ایک ایسی نوعیت دے دی ہے جو انہیں کا حصہ ہے -

غالب کی فکر کا یہ صرف ایک رخ ہے - ان کی شاعری میں فلسفے کی وہ جان و روح ہے جس تک انسان صرف منطق سے نہیں پہنچ سکتا اور جو

صرف و محض نوائے سروش ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ غالب حیات وکائنات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ساز دو عالم انہیں بھی اقبال کی طرح دل کا آیینہ دکھاتا ہے، اسی لیے ان کے پیش کردہ حقائق نئی نئی حقیقتوں کو سامنے لاتے ہیں ۔ اس سطح پر یہ فکری کام صرف شاعر ہی انجام دے سکتا ہے ۔ اگر پیغمبر بھی ' شاعر ' نہ ہوتے تو وہ بھی حقائق کے ادراک کا اظہار اس طور پر نہ کر پاتے کہ ان کے افکار میں بجلی کی سی چمک اور کوندے کی سی لپک پیدا ہو جاتی ۔ منطقی فلسفہ یک رخی ہوتا ہے ۔ اس میں نہ شک کی گنجاش رہتی ہے اور نہ مختلف معانی کی پہلوداری سمیٹنے کی ۔ یہ کام شاعرانہ الہام ہی کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے ۔ برگساں کے الفاظ میں الہام تجربے کے اس مقام پر انگلی رکھ دیتا ہے جو تجربے کی روح کا مرکز ہے ۔ غالب بھی تجربے کی روح کے مرکز پر انگلی رکھ کر اپنی شاعری کو الہامی بنا دیتے ہیں ۔ غالب نے دائمی صداقتوں ، آفاقی تجربات اور حیات و کائنات کے متنوع مسائل کی وہ روح نچوڑ لی ہے جو اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک جدید طرز احساس زندہ ہے ۔

قدیم اردو

یہ کتاب بابائے اردو کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو کے قدیم مصنفین اور کتب سے متعلق ہیں ۔ قدیم اردو کی ادبی اور لسانی خصوصیات کا اندازہ کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں :

* بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان
* حیدرآباد دکن کا ایک شاعر خاندان
* دکنی اردو میں شاہنامے کی داستانیں
* کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ
* شرح تمہید ہمدانی
* " سب رس " از ملا وجہی
* گجری یا گجراتی زبان
* پرانی اردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں
* اردو زبان کا ایک قدیم کتبہ
* مثل خالق باری
* مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ
* سب رس منظوم

قیمت : پانچ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

شمیم احمد

غالب ان معدودے چند مثالوں میں سے ایک ہیں جنھیں قدرت کا اتفاق قرار دیے بغیر چارہ نہیں - وہ شعر و ادب کے ان تمام معروف فارمولوں، تجزیوں اور معاشرتی ، نفسیاتی اور تاریخی حقایق کی تعبیروں پر قائم کردہ کلیوں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں جن سے شعر و ادب کے تنقیدی معیاروں کا بھرم باقی ہے - شاید اسی لیے غالب پر اب تک محققوں کی نظر زیادہ رہی ہے ، ان کی شعری اور فنی خصوصیات ، فکری معنویت اور انفرادی اہلیت پر کسی قابل ذکر ادیب نے کام کرنے کی جرأت نہیں کی ہے اور نہ کوئی قابل ذکر ادبی تحریر اور تنقیدی کتاب ایسی لکھی گئی ہے جس کی بنا پر ہم غالب شناسی کا دعویٰ بجا طور پر کرسکیں ، ایسی تنقید جو دنیا کے بہترین شعرا پر تنقیدی کارناموں کی طرح روشنی ڈال سکے - غالب کے اتنے دھوم دھڑکے کے باوجود اگر ہم سے ایک سوال کرلیا جائے کہ وہ کون سی کتاب ہے جو ہمیں غالب کی فکر ، شخصی عظمت ، فنی انفرادیت اور شعری اہلیت کے بارے میں وہ کچھ بتاتی ہو جو تنقید کا اولین تقاضا ہے تو آپ ایک بھی ایسے کتاب کا نام نہیں لے سکتے جس سے ہمیں غالب کی شعری انفرادیت اور معیار کا اندازہ ہوسکے۔ یہ کیسی بد نصیبی کی بات ہے کہ آج ۱۰۰ سال گزر جانے کے بعد بھی ہماری ساری کاوشیں ' یادگار غالب ' کی حدود میں گھوم رہی ہیں - یعنی یا تو غالب کے حالات زندگی ، واقعات ، استاد ، احباب ، شاگرد ، سفر ، مقدمے ، پنشن ، خاندان ، مباحثوں ، وظیفوں ، مدح خوانی ، انگریز پرستی ، سزا ، لطایف ، تصانیف اور تعلقات پر تحقیق کے انبار لگائے جا رہے ہیں ، دوسری طرف شرحوں کا سلسلہ ہے جو کسی طرح رکنے میں نہیں آتا ، اور ظاہر ہے ان

دونوں کاموں کی داغ بیل حالی نے ہی ڈالی تھی ۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی نئی تحقیقی اعتبار سے زیادہ مکمل ہو یا کوئی شرح غالب کے مفہوم کو زیادہ جامعیت سے پیش کرتی ہو مگر ادب کے کولھو کا بیل حالی کی اس لیکھ سے ذرا نہیں ہٹتا جس پر ایک بار حالی نے اسے چلا دیا تھا۔ اگر کسی نے حالی کے اس اولین کارنامے سے ہٹ کر ادب کی راہ میں قدم رکھنا بھی چاہا تو اس نے صرف اتنا کیا کہ دنیا کے بہترین شعرا کے ساتھ غالب کا نام لکھ کر مبہم مگر شاندار توصیفی اصطلاحوں میں انھیں ایک نابغۂ عظیم قرار دے دیا اور کسی نے غالب کے ایک ایک شعر کے مفہوم پر اپنے پسندیدہ حاشیے چڑھا کر مختلف فلسفیوں کے افکار کے انطباق سے غالب کی ہمسری ان سے ثابت کردی یا پھر دنیا کے بہترین شعرا کے بعض پہلوؤں سے کسی طرح ہم آہنگ کردیا ۔ یہی رجحان جب منفی ہوا تو غالب کی شاعری اور اس کی فکر سے زیادہ اس بات پر زور دیا گیا کہ غالب اگر غزل نہ کہتے تو بڑے شاعر ہوتے ، یعنی غالب سے زیادہ صنف اہم قرار پاگئی ، یا یہ بات کردیا گیا کہ غالب کے ہاں مربوط فکر چونکہ موجود نہیں ہے ، اس لیے وہ ایک سرے سے بڑے شاعر ہو ہی نہیں سکتے ۔ ان سب باتوں کے باوجود غالب کی شرحوں سے پھر بھی پیچھا نہیں چھوٹا ، گویا حالی والی لیکھ سے قدم کسی طرح نہیں ہٹے ۔

یہ تو تھا علمی کاموں کا احوال — تنقید میں اس سے بھی افسوس ناک صورت حال کا سامنا ہے ۔ یہاں اول تو کسی نے غالب پر کوئی مستقل کتاب ہی نہیں چھوڑی ، اور سارا دار و مدار مضامین پر رہا ، جن کے لکھنے والوں میں ہماری تنقید کے صف اول کے نام شامل ہیں ۔ خیر اس کا شکوہ تو اس لیے بیجا ہے کہ انھوں نے کس موضوع پر کون سی کتاب لکھ دی ہے ، مگر ان مضامین کو پڑھ کر ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے نقاد ادب و شعر سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں ؟

ہماری تنقید کی ستم ظریفی یہ رہی ہے کہ اس میں مختلف رجحانات کو ادب و شعر سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ یعنی مختلف رجحانات کے نقاد اپنے اپنے کلیوں ، مفروضات اور رجحانات کو ادب و شعر کا پیمانہ اس طرح بناتے ہیں کہ اس میں شاعری غیر اہم ہو جاتی ہے اور رجحانات زیادہ اہمیت اختیار کرلیتے ہیں ۔ اس طرح ادب کی تعریف ، ادب سے باہر متعین کی جاتی ہے ۔ ہر گروہ اپنے موقف کی دلیل میں چند اشعار تلاش کر لیتا ہے (خواہ ان کی

نفی باقی اشعار سے ہو رہی ہو) اور باقی سارا کام ان مفروضوں کا ہوتا ہے جس کے ذریعے غالب کو اپنے موقف کے لیے زیادہ کامیابی سے استعمال کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے غالب پر لکھی ہوئی تنقیدیں بہت ہی پر لطف اور دل خوش کن لطایف کا موقع فراہم کرتی ہے ۔ ایک گروہ جو معاشرتی حقیقت نگاری کا دعوے دار ہے ، اپنا فرض اس طرح پورا کرتا ہے کہ غالب کے عہد کی معاشرتی تبدیلیوں ، سیاسی حالات ، نئے اور پرانے رجحانات کا تجزیہ کر کے غالب کے خاندانی حالات ، ان کی تربیت اور افتاد طبع پر ان کے خطوط سے روشنی ڈال کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ غالب کی پیدائش ان معاشرتی تبدیلیوں اور سیاسی خلفشار کا نتیجہ ہے جو اس عہد کا طرہ امتیاز ہیں ، لیکن یہ نہیں بتاتا کہ غالب کے کلام میں اس معاشرتی حقیقت نگاری کا پتا کیوں نہیں چلتا جس کا وہ نتیجہ تھے اور ان حالات اور واقعات کی جھلک ان کی شاعری میں کیوں نظر نہیں آتی جس کا بقول ان حضرات کے وہ شعور رکھتے تھے اور جس کا یہ عہد نشانہ تھا ۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ انھی حالات و واقعات اور معاشرت میں پیدا ہونے والے دوسرے قابل ذکر شعرا میں غالب جیسی خصوصیات کیوں نہیں پیدا ہو سکیں ۔ اور اگر وہ غالب کی انفرادیت کا نتیجہ تھیں تو پھر انھیں اس مخصوص ماحول کا آوردہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے ؟ — دوسرا ایک بہت بڑا گروہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ وہ بنیادی طور پر انفرادی صلاحیت ہی کا منکر ہے اور اس عہد کو اور اس کے ہر مظہر کو تاریخی ارتقا اور جدلیاتی مادیت کا تابع بتاتا ہے۔ اس کا بنیادی تصور چونکہ تاریخی جدلیت ہے ، اس لیے وہ غالب کو اس لمحے کی پیداوار بتاتا ہے جس نے اس عہد کو پیدا کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ غالب کو ایک انقلابی قرار دیتا ہے اور اپنے اس نظریے کی تائید میں غالب کے ایسے دو تین اشعار پیش کرتا ہے ، جس پر بے اختیار ہنسی بھی آتی ہے اور رحم بھی ۔ نمونے کا ایک شعر آپ بھی سن لیجیے ۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اگر غالب نے یہ شعر اسی شعور کے ساتھ کہا تھا جیسا یہ لوگ اس سے منسوب کرتے ہیں تو پھر غالب پر خدا کی رحمت ہے ورنہ ان پر — ان حضرات کے کچھ اور دلائل بھی ہیں جن میں سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ

غالب اس لیے بہت ترقی پسند اور انقلابی ذہن رکھتا تھا کہ اس نے جاگیرداری ماحول کا پروردہ ہونے کے باوجود بادشاہت کے دور میں صنعتی نظام کا سب سے پہلے خیر مقدم کیا تھا ، اور انگریزوں کی لائی ہوئی سوغاتوں کو اپنے نظام پر ترجیح دے کر سرمایہ داری نظام میں داخل ہوگیا تھا ۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ غالب جاگیرداروں کا اس سے زیادہ ثنا خواں رہا جتنا برطانیہ کا ، اور آخر وقت تک ہر اس فریق کی مدح و ثنا میں یکساں مشغول رہا جہاں سے اسے روپیا ملنے کی امید ہوتی تھی ۔ انھی میں سے بعض نقاد غالب کو انھی بنیادوں پر رجعت پسند بھی قرار دیتے ہیں ۔ گویا غالب کو ترقی پسند یا رجعت پسند قرار دے کر یہ لوگ اپنا فرض پورا کردیتے ہیں ، اور یہ بالکل نہیں بتاتے کہ غالب کو غالب کس چیز نے بنایا تھا ، اور جس تاریخی جدلیت کا غالب نتیجہ تھے مومن اس سے کیسے صاف بچ نکلے ؟ پھر غالب کی اس صفت میں اس کی انفرادی اہلیت اور صلاحیت کا کتنا ' قصور ' تھا ۔ اور یہ اہلیت اور صلاحیت کس درجے کی تھی اور کیسے پیدا ہوئی تھی ۔؟ کچھ افراد ایسے ہیں جو غالب کو فلسفی قرار دیتے ہیں اور فلسفے کے بعض بنیادی سوالات اور مسائل کی روشنی میں غالب کی فکر کا تجزیہ کرتے ہیں ، اور اپنے مفروضات اور مطالعے کو غالب کے بعض اشارات سے مربوط کر کے اسے اپنے پسندیدہ نظریات اور فلسفے کا موید قرار دے لیتے ہیں ، لیکن یہ ذرا نہیں سوچتے کہ ان اشارات کی شعری قدر و قیمت کیا ہے ؟ بعض افراد نفسیات کو پیمانہ بنا کر غالب کی شخصیت میں سے انا کی دریافت کر لیتے ہیں اور اس کو ان کے ماحول ، زمانے ، عہد ، عصر اور اپنی شخصیت سے متصادم قرار دے کر غالب کی شخصی شکست و ریخت کا افسانہ سناتے ہیں ۔ اور اسی انا کو غالب کا المیہ یا طربیہ قرار دیتے ہیں مگر یہ بالکل نہیں بتاتے کہ کیا غالب کی شعری صلاحیت بھی اسی ' انا ' کا نتیجہ ہے ؟ اور اگر کوئی شخص اسی نفسیات اور شخصیت کا حامل ہو تو کیا اس میں بھی شعری صلاحیت کا ہونا لازمی ہوگا اور کیا کوئی شاعر اسی بنا پر اتنا ہی بڑا شاعر لازمی طور پر بن جائے گا جتنا غالب ہے ؟ مجھے تنقید کے ان تمام رویوں اور کارناموں پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور یہ یقیناً شاعر اور عہد شاعر کی افہام و تفہیم کے لیے بہت مفید ذرایع بھی ہوسکتے ہیں ، مگر آپ نے یہ دیکھ لیا کہ یہ سب شاعری سے زیادہ شاعر کی شخصیت اور اس کے ماحول کو اہم قرار دے رہے ہیں ۔ اور ان میں اصلاً کسی نے بھی تنقید کے سب سے بنیادی

تقاضے، شعری ماہیت، شعری صلاحیت، غالب کی شاعری اور انفرادیت کو موضوع یا معیار نہیں بنایا ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ بڑی اہم ہیں مگر ان کی حیثیت یقیناً غالب کی شاعری کے سامنے ثانوی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں غالب کی شاعری سے دلچسپی ہونی چاہیے نہ کہ غالب کے ماحول اور اس کی شخصی تعمیر سے۔ ادب کی اہمیت اور شعر کی ماہیت کا سب سے بڑا جوہر یہ ہوتا ہے کہ کسی تخلیق سے ہم صدیوں کے سفر کے بعد بھی اتنا ہی محظوظ ہو سکیں جتنا اس تخلیق کا ہم عصر زمانہ ہوا ہوگا۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اگر ہمیں یہ نہ بھی معلوم ہو کہ یہ کس کا شعر ہے اور کس زمانے میں کہا گیا ہے تو اس کی اثر آفرینی اور تاثر پذیری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر یہ معلوم بھی ہو کہ اس کا خالق کون تھا، کس ماحول کا پروردہ تھا اور کس نفسیات کا حامل تھا تو بھی اس کی معنویت اور اثر میں کسی اضافے یا کمی کا امکان نہیں۔ تنقید ادب کے لیے سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کو جاننا چاہیے اور اسی سے واسطہ رکھنا چاہیے۔ اس کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں شعری معنویت، ماہیت اور شعری قدر و قیمت کے بارے میں بتائے۔ یہ چیزیں تو ہم بعد میں بھی معلوم کرلیں گے کہ اس کا مصنف کون تھا اور اس کے ماں باپ کون تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشیات، نفسیات، تاریخ اور فلسفہ، ادراک حقیقت کے لیے اتنے ہی اہم ذرایع ہیں جتنا ادب، مگر تنقید کو براہ راست ادراکِ حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اس فن یا ذرایع پر ہے جس کی وہ تنقید ہے۔ اس کا کام براہ راست ادراک حقیقت کا ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ پہلے ادراک حقیقت کے اس ذریعے یا طریقے اور فن کو پہچانے اور تجزیہ کرے، اس کا معیار مقرر کرے، اس کا فنی اور جمالیاتی ادراک کرے۔ یہ بتائے کہ یہ فن یا ذریعہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اور اس تخلیق کا فنی، جمالیاتی اور اثر آفرینی کا راز دریافت کرے۔ اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جہاں اس حقیقت کا سوال آتا ہے، جس کا ادراک وہ فن یا طریقہ کر رہا ہے۔ ہمارے نقاد اپنے سارے فرایض چھوڑ کر براہ راست حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتے ہیں اور اپنی خطاؤں کا 'ملزم' بیچارے شاعر کو قرار دیتے ہیں۔

اس ساری تمہید سے میرا مدعا صرف اتنا ہے کہ ہمیں اپنی تنقید سے غالب کی شاعری کا امتیاز ، شاعر کی انفرادیت اور اس کے کلام کا فنی ادراک تو ہوتا نہیں ، البتہ نقادوں کے فیصلے ضرور معلوم ہو جاتے ہیں ۔

غالب کی شاعری کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ غالب کا شعری جوہر کس درجے کا ہے ۔ اس کی خلاق شخصیت کا سبب کیا ہے اور اس کی اہلیت و صلاحیت کن چیزوں سے مرکب ہے ۔؟ میں نے مضمون کی ابتدا میں غالب کو انسانی تاریخ کے اتفاقات میں شمار کیا ہے ۔ میری مراد یہ ہے کہ ایسی شخصیت کے ظہور میں آنے سے پہلے عمومی زندگی اور اس کے مظاہر کی تعبیریں ہوتی رہتی ہیں ۔ اس کی تعریفیں کی جاسکتی ہیں ۔ مشترک پیمانے بنائے جاسکتے ہیں ۔ لیکن جب کوئی غیر معمولی شخصیت نمودار ہوتی ہے تو یہ ساری تعبیریں ، تعریفیں اور مشترک پیمانے دھرے رہ جاتے ہیں ۔ ایسی شخصیت سارے مفروضوں کو الٹ کر رکھ دیتی ہے اور ایک نئی حقیقت سامنے آجاتی ہے ۔ گویا وہ اس زمانے کو اپنا زمانہ بنا لیتی ہے ۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ دنیا کی تاریخ میں جب بھی ایسی شخصیات پیدا ہوئی ہیں (جو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں) انہوں نے خوردہ گیروں کے سارے اندازوں اور مفروضات کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور خود تاریخ کے صفحات پر ایک سوالیہ نشان کی صورت میں آویزاں نظر آتی ہیں ۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی تعبیر تاریخی جدلیت سے کی جا سکتی ہے نہ نفسیاتی حقیقت نگاری سے اور نہ فلسفہ طرازی سے ۔ ہم بڑی حد تک میر کو چھوڑ کر ولی سے ناسخ تک کے اردو ادب کے محرکات ، رجحانات ، نتائج اور رویوں کا کوئی مشترک پیمانہ ضرور بنا سکتے ہیں ، لیکن ایک غالب آ کر اس کو بالکل توڑ دے گا اور کسی طرح اس چوکھٹے میں فٹ نہیں ہوگا ۔ ایسا کیوں کر ہوا ۔ اور یہ شخصیت کیسے پیدا ہوئی ، یہ کائنات کا راز ہے اور جب تک اس راز کا جواب تاریخی جدلیت ، نفسیات اور تصور ارتقا کے علوم نہیں دیں گے ، اُن کی ساری کاوشیں کسی شہسوار کے گزر جانے کے بعد اس کے نقوش قدم سے اس کی سمت ، آثار ، انداز اور منزل مقصود کا تعین کرنے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھ سکتے۔ مجھے بعض اوقات بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جب یہ ماہرین زندگی کا اتنا باریک واضح اور گہرا مشاہدہ رکھتے ہوئے کہ ہر چیز کو ۲+۲=۴ کی طرح بیان کر سکتے ہیں ، کوئی غیر معمولی شخصیت بننے یا بنانے میں

کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے ؟

اب میں تنقید کی اُن چند کاوشوں کا ذکر اور کرنا چاھتا ھوں جو ادب کے دائرے میں رہ کر کی گئی ھیں اور انھی کو غالب پر کل سرمایۂ ادب قرار دیا جا سکتا ھے ۔ اُن میں ایک مضمون آفتاب احمد کا ھے ، لیکن مجھے اس پر زیادہ اعتبار اس لیے نہیں ھے کہ آفتاب احمد اس کے بعد اپنی یہ طرزِ فکر ، ادبی شعور ، اسلوب اور انفرادیت خدا جانے کہاں بہا آئے ھیں ۔ البتہ عسکری صاحب نے اپنے چند مضامین میں غالب کے سلسلے میں کچھ بنیادی اشارے کیے ھیں ۔ ان اشاروں میں انھوں نے یہ بات کہی ھے کہ غالب کا تصور عشق اور تصور آدمیت شاعری کے بنیادی رویوں اور موضوعات کے معیار پر بہت پست ھے ۔ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی کا ایک جملہ ایسی تمام تحریروں پر بہت بھاری ھے اور لکھنے اور سوچنے کے لیے ایک مستقل موضوع ۔ اُن کا خیال ھے کہ جس شخص کا تصور محبوب پست ھوگا اس کا تصور خدا بھی پست ھوگا ۔ لیکن عسکری صاحب غالب کے سلسلے میں کافی گمراہ کن نقاد ھیں ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ھے کہ اُن کا مذاق شعر اُن کے مزاج کا تابع ھے جو انھوں نے بہت شعوری طور پر تعمیر کیا ھے ، جس میں بلند آھنگ ، پر تیقن، مردانہ آوازیں اور نشاطیہ لب و لہجہ کو کبھی شرف قبولیت حاصل نہیں ھو پاتا اور انھوں نے ھمارے قومی مزاج کے تشخص کو دریافت کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ھے ، اس میں معنویت اتنی اھم ھوگئی ھے کہ انھیں غالب کے مقابلے پر ذوق زیادہ اھم معلوم ھونے لگے ھیں ۔ میں نے انھیں گمراہ کن نقاد اس لیے کہا ھے کہ چاھے غالب ، شاعری کے بنیادی موضوع عشق اور آدمیت کا جتنا پست تصور رکھتا ھو اور چاھے اس نے ذوق کے مقابلے پر ادراک حقیقت میں کتنا گھپلا کیوں نہ کیا ھو مگر وہ ایک اعلیٰ درجے کی خلاق شعری صلاحیت رکھتا ھے اور اس سلسلے میں اس کا مقابلہ ذوق سے کرنا ممولے کو شہباز سے نسبت دینا ھے ۔ غالب عشق اور آدمیت کا اتنا پست تصور رکھتے ھوئے بھی اتنا بڑا شاعر کیوں ھے ، اس کا جواب عسکری صاحب کو بہر صورت دینا ھے ۔ ورنہ اُن کے پورے احترام کے باوجود اُن کا شعری اور تنقیدی شعور بھی اتنا ھی مشکوک ھو جائے گا جتنا غالب کو ایک تاریخی دور کا آوردہ قرار دینے والے کا ۔

تنقید میں غالب کی انفرادیت کا تجزیہ کرنے والوں میں اس بات پر کامل اتفاق پایا جاتا ھے کہ اُن کے کلام کی سب سے منفرد صفت اور نمایاں

خصوصیت اُن کا فلسفیانہ لب و لہجہ اور تعقل یا فکری طرز اظہار ہے ، جو فارسی الفاظ اور تراکیب کے رمزیہ امتزاج سے پیدا ہوا ہے ۔ اُن کے خیال میں غالب کے کلام کی یہ فلسفیانہ فضا اور فارسی مزاج شعری ہی انہیں اردو شاعری میں ایک مختلف آہنگ اور فضا کا شاعر بناتی ہے ۔ یہ بات بادی النظر میں قرین قیاس معلوم ہوتی ہے ۔ میں آپ کے سامنے غالب کے چند ' نئے اور غیر مطبوعہ ' مصرعے اور اشعار پیش کر رہا ہوں ۔ آیے یہ دیکھیں کہ غالب کی اس انفرادیت پر یہ مصرعے اور اشعار کہاں تک دلالت کرتے ہیں :

چشم نمناک نے از بسکہ بچھایا اس کو

اس ہستیٔ موہوم میں ہرگز نہ کھلی چشم

نہ ہوا سوزن مژگاں سے رفو چاک جگر

دیا وسعت سینہ جو کرے بال کشائی

ممکن نہیں کہ تار نگہ بن ہو یہ رفو

منظور گر ہے قیس کا احوال دیکھنا

برنگ صورت دیوار ہوں میں کشتۂ حیرت

نہیں برداشت ہرگز طبع کو باد مخالف کی

ہوا ہے آہ شرر بار سے تری ثابت

اس خط سبز کی از بسکہ لکھی ہے تعریف

پردۂ داغ جگر کیا چادر مہتاب ہے

ہوں عاشق دل سوختہ جوں سرو چراغاں

میں موسم خزاں میں گل نو دمیدہ ہوں

لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

نفرین خلق و طعن عزیزاں ، جفائے غیر

ہے خط سبز بتاں حاشیۂ مصحف حسن

دست بردار نہیں خون شہیداں سے ہنوز

آلودگی سے دامن عشاق پاک ہے

زنگ آئینے میں جب آیا صفا نایاب ہے

دامن وصل بھی آلودۂ مایوسی ہے

یار کو خون مرا مثل حنا ہو پامال

کیا سرنوشت میری مفقود ہے قلم سے

کچھ نہ معلوم تھا آلودۂ خوں تھا جب تک

غبار خاطر معشوق کب ہے کشتۂ ناز

میری خاطر عزیز کیا نہ ہوئی

پائیں قفس سے رخصت پرواز ہم اگر

کرے ہے تلخ مری زندگی کو ہشیاری

یاں تک میں ہوا خاطر عالم سے فراموش

کل عندلیب رخصت فصل بہار ہے

غیر کا یاں ذکر ہے تیرا کہاں مذکور ہے

کہاں جاتی ہے خوبی حسن کی خط کے نکلنے سے

طالع کہاں جو تیغ نگہ سے شہید ہوں

رکھ قیس قدم وادیٔ لیلیٰ میں سمجھ کر

مقدور جب نہ ہوئے تو مجبور کیا کرے

غیر از دوئی کے مانعٔ دیدار کون ہے

رشتہ کو ہے گہر سے جو ربط یک دلی کا

پر ہے عزیز خاطر آسودگاں مجھے

یہ ہے غلط کہ گرسنۂ ناز سیر ہو

انہیں تو داد ہے منظور مجھ کو نالہ کشی

بجا ہے جوشش دل تیری چشم میگوں سے

مت رکھ خیال ہستیٔ نا پائدار پر

یہ انتخاب میں نے بہت مختصر دیا ہے۔ لیکن ان مصرعوں میں آپ کو غالب کا مخصوص لب و لہجہ، طرز فکر، منفرد انداز اور بعض خیالات اور اشعار کی گونج بھی بہت واضح اور صاف طور پر سنائی دے سکتی ہے۔ یہی وہ غالب کا مخصوص شعری مزاج ہے جس کو ان کے نقادوں نے طرز غالب قرار دیا ہے۔ اب وہ چند 'غیر مطبوعہ' اشعار بھی سن لیجیے۔

گواہ سجدۂ عشاق ہے خاک در الفت
نہیں مٹنے کا ہرگز نقش میری جبہ سائی کا

آیا ہے خط نمود میں اس خوش نگاہ کا
شاید اثر ہوا ہے مرے دود آہ کا

برنگ طائر بسمل موے یہ کشتۂ عشق
کسی نے غم نہ کیا خاک و خوں طپیدوں کا

بہا دیا ہے اسے سیل اشک میں اے چشم
ہمارا سر نہ ہوا کاسۂ حباب ہوا

از بسکہ آبلوں سے یہ معمور ہو گیا
دل تو برنگ خوشۂ انگور ہو گیا

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے
گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

غبار خاطر آزادگاں ہے خواہش فرش
جو بے ریا ہے تو مت نقش بوریا لینا

گزر ہے ناقۂ لیلیٰ کا شاید خاک مجنوں پر
ہوئی اس دشت میں پھر آج گرد کارواں پیدا

توقع کیا رکھے کوئی کسی سے اس زمانے میں
ہوا ہے دشمن جانی وہ میرا دوستدار آخر

یہ امتحاں نہ کر اے مرے مہرباں عزیز
کوئی جہاں میں تجھ سے نہ رکھے گا جاں عزیز

ہے آرزوئے گریہ مجھے چشم تر ہنوز
نکلا نہیں ہے قطرۂ خون جگر ہنوز

وہ کشتنی ہوں میں کہ مرا یار بعد قتل
ضد سے تو کھولتا نہیں اپنی کمر ہنوز

ہوا ہے وا تری شمشیر سے خط تقدیر
شہید عشق ترے یک قلم ہوئے محفوظ

دریائے عشق میں دل بسمل برنگ موج
مارے ہے دست و پا کہیں پہنچے کنار تک

دیکھے اگر تجھے تو نہ پھر دیکھے روئے گل
جاتی رہے دماغ سے بلبل کے بوئے گل

ناصح نہ ہو پشیماں نے پارہ ہو گریباں
گر سوزن مژہ سے چاک جگر رفو ہو

آپ میں خانۂ زنجیر میں رکھتا ہوں قیام
میری وحشت کا ہوا کب در زنداں مانع

برنگ غنچۂ نشگفتہ ہوں دل افسردہ
ہوا نہ چاک گریباں کیا نہ وا مجھ کو

ہے عندلیب رشک محبت سے یہ بعید
کھولے نسیم عقدۂ گل تجھ سے وا نہ ہو

عکس الہی کب شب ہجراں کا تماشائی ہے
ایک میں آپ ہوں یا گوشۂ تنہائی ہے

کس طرح سے رہے مری عریاں تنی کا لطف
رنگیں کرے جو زخم دل خونچکاں مجھے

ان اشعار اور مصرعوں میں غالب کا معروف رنگ سخن اور منفرد فارسی آمیز لب و لہجہ بہت واضح ہے اور وہ رنگ بھی قطعاً نہیں ہے جس کی وجہ سے غالب مطعون ہیں، یعنی ابہام اور دقیق فارسی تراکیب جن کی وجہ سے غالب کے کلام کا ایک حصہ چیستان ہو کر رہ جاتا ہے۔ غالب نے جس آب و رنگ کو اردو غزل میں رواج دیا ہے اس کی نمایاں خصوصیات آپ کو مندرجہ بالا اشعار اور مصرعوں میں نظر آسکتی ہیں۔ لیکن یہ اشعار اور مصرعے غالب کے نہیں ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ اشعار اور مصرعے غالب کے بعد کے کسی شاعر یا اُن کے کسی ہم عصر کے بھی نہیں ہیں جو اُن سے متاثر قرار دے دیا جائے، بلکہ دور میر و سودا کے ایک اہم شاعر فغاں کے ہیں جو غالب سے نصف صدی پیشتر یہ اشعار اور مصرعے کہہ چکا تھا۔ اب آپ ان کو دوبارہ پڑھیے تو اُن میں غالب کے مزاج کے علاوہ ایسے خیالات بھی ملیں گے جو غالب کے یہاں اور زیادہ چمک کر آئے ہیں اور ان سے غالب کے بہت سے شعر ذہن میں از خود اُبھر آئیں گے۔ یہاں میں ایک جملہ معترضہ کی اجازت چاہوں گا کہ اردو غزل کا کوئی موضوع اور رنگ ایسا نہیں ہے جس کے ابتدائی آثار اردو کے قدیم ادوار میں نہ مل جائیں۔ اور غالباً اس کا سب سے بڑا ثبوت میں نے آپ کے سامنے پیش کردیا ہے کہ غالب جیسے منفرد شاعر کا لب و لہجہ (جس کو نقاد منفرد مانتے ہی اس بات پر ہیں) بھی آپ کو فغاں کے یہاں اتنے فطری اور تخلیقی انداز میں مل جاتا ہے جو غالب کے بہترین مقلدین کو بھی نصیب نہیں۔ یہ بات میں نے کوئی برائے تحقیق یہاں بیان نہیں کی ہے بلکہ اس سہارے سے صرف یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا غالب واقعی صرف فلسفیانہ اور فارسی لب و لہجہ اور تراکیب کی وجہ سے منفرد ہے؟ غالباً اب آپ اتنی آسانی سے یہ بات نہیں کہہ سکتے اور مجھے آپ سے یہ توقع ہرگز نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں گے کہ غالب کی انفرادیت ژولیدگی اور ابہام کی صفت سے تعمیر ہوئی ہے کیونکہ پھر اس صورت میں آپ غالب کے بہترین کلام پر خط تنسیخ کھینچ دیں گے۔

غالب کے بارے میں اس کے علاوہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں تین چیزوں کو اُن کے کلام اور غالب کی شخصیت کی بنیادی اساس قرار دیا گیا ہے۔ ایک تخیل، دوسری شوخیٔ فکر اور تیسری ذہانت۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی غالب کی شاعری کا مترادف قرار نہیں دیا

جا سکتا ۔ یعنی صرف تخیل کے ذریعے یہ شاعری ظہور میں نہیں آسکتی تھی یا صرف شوخی غالب کو غالب نہیں بناسکتی تھی ، نہ محض ذہانت یا تیزی' فکر کسی فن کا سبب بن سکتی ہے ۔ مگر مجھے یہ تسلیم ہے کہ غالب کی شاعری میں یہ تینوں عناصر بہت نمایاں نظر آتے ہیں اور اُن کی یکجائی سے غالب کی شعری قوت کی تخلیق بھی ہوئی ہے ۔ چنانچہ اسی سبب سے غالب کی شاعری اردو غزل کے بنیادی مزاج یعنی ' جذبے ' سے بالکل مختلف نظر آتی ہے ۔ یہ تینوں چیزیں خالص فکری ہیں اور اُن کا تعلق ذہن سے ہے ، اس لیے میں نے کہیں لکھا ہے کہ غالب بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہے ۔ اس کی شاعری میں سب سے نمایاں اس کا خلاق ذہن ہے اور اس کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ فکر کو صرف اشارات اور علامات سے ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے ، جسے ہم سوائے وہبی قوت کے اور کیا قرار دے سکتے ہیں ؟ کیونکہ وہ ذہنی عمل جو محض تخیل اور شوخی' فکر سے کام لے سکتا ہو غزل کے مزاج سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا خیال ، جذبے سے ۔ یہ عجیب بات ہے کہ عسکری صاحب نے جس چیز کو غالب کی کمزوری قرار دیا ہے وہی اس کی شہزوری ہے ۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ غالب جذبے کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اسے استہزائیہ انداز سے پیش کرتے ہیں ، لیکن اردو شاعری میں غالب واحد شاعر ہے جو جذبے کو اپنی ذات سے الگ کر کے دیکھ سکتا تھا ۔ یہ اس کے خلاق ذہن کی قوت ہے جو اسے جذبے سے مغلوب نہیں ہونے دیتی ۔ ہر جذبہ اس کے ذہنی معمل گاہ میں اپنی مضحکہ خیزی کو واضح کردیتا ہے ۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے لے کے دل ، دل ستاں روانہ ہوا

یہ لب و لہجہ یوں ہی نہیں آسکتا ۔ اس میں خوب رویوں کی اتنی تحقیر نہیں ہے ، جتنی اس جذبے کی ہے جس کی اصل کو غالب خوب جانتا ہے ۔ ویسے بھی عشق اور تفکر انمل ، بے جوڑ رہے ہیں ۔ لیکن غالب فلسفی نہیں شاعر ہے ۔ اس لیے غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہر خیال کو احساس بنادیا ہے ۔ گویا فکر کو غزل بنادیا ہے ، یہ کام غزل میں کوئی اور نہیں کر سکتا تھا ۔ غالب کی اس منفرد صلاحیت نے شاعری کی افہام و تفہیم اور معیار میں بڑی دقتیں پیدا کر دی ہیں ۔ کیونکہ غالب کے بعد

معمولی نظم ہم سے ہضم نہیں ہوتی - نظم اپنے دو دائرے بناتی ہے - ایک دائرہ وہ جس میں اعلیٰ تر ذہانت اور فکری بلوغت کی بنیاد پر شاعر ایک نظام فکر تعمیر کرتا ہے جس میں وہ حیات انسانی کے بنیادی مسائل کو ایمائی اور علامتی انداز میں پیش کرتا ہے ، سیاہ و سفید کی کشمکش کو ابھارتا ہے ، نظریات اور خیالات کے آن رخوں اور گوشوں کو نمایاں کرتا ہے جن میں فطرت انسانی کائنات سے نبرد آزما ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے - وہ اپنے پیغام عمل سے ایک جہد مسلسل پر آمادہ کرتا ہے اور ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے ، ایسا شاعر قوموں کی زندگی میں ایک آدھ بار پیدا ہوتا ہے - اور دوسرا دائرہ وہ ہے جس میں نظم گو زندگی کے عمومی موضوعات ، انفرادی تجربات اور شخصی زاویہ نظر اور رویوں کا ارتکاز کرتا ہے - نظم کے پہلے دائرے میں اگر اردو شاعری سے کوئی نام آسکتا تھا تو وہ غالب کا تھا ، مگر اتفاق سے غالب نظم گو نہیں ہے - یہی وہ بات ہے جس کو فراق صاحب نے اپنے بے مثال جملے میں کہا ہے کہ شاعر بڑا میر ہے اور فنکار بڑا غالب - تو اب یہ معلوم ہوا کہ تخیل ، شوخی فکر اور ذہانت کے اس امتزاج کے بعد بھی غالب کی دریافت ناپاقت رہتی ہے ، کیونکہ یہ صفات غالب کے عمومی اشعار میں بھی بہت نمایاں ہیں - مثلاً دیوان غالب کے کسی مستعمل نسخے میں سے اگر ہم صرف ردیف الف کی پہلی ہی پانچ غزلوں میں سے ایک ایک مشہور شعر لے لیں تو اسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے -

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

بوئے گل نالہ' دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اشعار کا یہ انداز اسی طرح ردیف ی تک چلا جاتا ہے اور ان میں غالب کی متذکرہ تینوں خصوصیات جن کو ادبی اصطلاح میں ندرت خیال ، شوخی' اظہار اور نیرنگی' فکر سے تعبیر کیا جاتا ہے دیکھی جا سکتی ہیں ۔ لیکن کیا غالب کا تخلیقی جوہر انھی خصوصیات کی وجہ سے اتنا ہمہ گیر محسوس ہوتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ شاعری کی اتنی بڑی سطح نہیں ہے جس کو غالب کی عظمت کا معیار قرار دیا جا سکے ۔ یہ خصوصیات یقیناً بہت غیر معمولی اہمیت کی مالک ہیں لیکن بڑے شاعروں کے یہاں اگر ان تینوں کا امتزاج نہیں ہوگا تو وہ بڑے شاعر نہیں ہو سکتے ۔ اور مجھے اپنے مفروضات اور بڑی شاعری کی خصوصیات کے بیان سے زیادہ اس بات سے دلچسپی ہے کہ میں آپ کے سامنے غالب کو اس طرح سے پیش کر سکوں جس طرح وہ دیوان غالب پڑھتے وقت اپنے قاری کو بے دست و پا کردیتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ غالب کو اس سطح سے بلند کرنے والی اور اس کی تخلیقی عظمت اور انفرادی جوہر کی ناقابل بیان انفرادیت ایسے اشعار سے نمایاں ہوتی ہے جہاں غالب چند آفاقی تجربوں اور اپنے ذہن اور شخصیت کی بے پناہ وسعت ، گہرائی اور اعتماد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس تجربے کو اظہار کے بہترین پیکر میں لے آتا ہے ۔

دیر و حرم آیینہ' تکرار تمنا
واماندگی' شوق تراشے ہے پناہیں

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہوں گرمی' نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آینہ دایم نقاب میں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسون انتظار تمنا کہیں جسے

دام ہر موج میں ہے ، حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تو اور آرائش خم کا کل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز .

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ وہ سطح ہے جہاں غالب ، غالب ہے اور اس کا کوئی مماثل نہیں - اس میں نہ استہزا ہے نہ شوخی نہ صرف فارسی تراکیب اور محض فلسفانہ لہجہ ، نہ فغاں کی گرد - یہی وہ سطح ہے جہاں غالب کا تخلیقی جوہر ایک اتفاق بن جاتا ہے - غالب کی وہ تینوں خصوصیات تخیل ، شوخی اور ذہانت اپنا اعتبار اور گیرائی حاصل ہی اس لیے کرتی ہیں کہ ان قوتوں کے پس منظر میں غالب کی ذہنی سطح کی یہ آفاقیت اور اس کی منفرد تخلیقی عظمت کام کرتی ہے - اس بات کا احساس جتنا غالب کو ہو سکتا تھا اور کسی کو ہونا کیسے ممکن تھا ، چنانچہ آپ دیکھیے کہ غالب اپنی اس انفرادیت اور یگانۂ روزگار فکر کی ماہیت کی طرف کس کس طرح اشارا کرتا ہے اور یہ عام خیال کے مطابق صرف تعلی کا انداز نہیں ہے بلکہ اس میں دلیل اور نظر دونوں شامل ہیں -

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

غالب کو اپنی اس غیر معمولی فکری سطح اور یگانہ روزگار تخلیقی صلاحیت کو غزل جیسی صنف میں پیش کرنے میں کیوں کر کامیابی ہو سکی ، یہی غالب کی سب سے بڑی عظمت ہے - یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے انسانی

سرشت اور کائناتی صداقتوں پر اتنی گرفت حاصل تھی کہ وہ ان کو علامتوں میں پیش کرسکتا تھا ۔ اسے ایمائیت اور اشاریت کا روپ دے سکتا تھا ۔ یہی غالب کی حد کمال ہے اور شاید غزل کی آبرو کا سب سے بڑی محافظ بھی ، جس میں بنیادی صداقتیں اور شعری صداقتیں ایک ہو جاتی ہیں ۔ غالب ان صداقتوں کی طرف اشارا کرتا چلا جاتا ہے جو انسانی سرشت میں یکسانی اور تسلسل کے ساتھ زندہ اور توانا رہتی ہیں اور وہ ان کی حقیقت کو شعری گرفت میں لے آتا ہے ۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

نہ ہو نگار کو الفت مگر نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

نہ ہو بہار کو فرصت مگر بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے
یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

اب آخر میں ایک بات اس خود ستائی کے بارے میں کہنی ہے کہ ہم لوگ غالب کی عظمت کی دریافت کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں ، حالانکہ غالب اپنے زمانے میں کوئی غیر اہم شاعر نہیں تھے - اس وقت کے تمام اردو شاعروں میں ذوق و مومن کے بعد غالب کا شمار یا اس عہد کے تین اہم ترین شعرا میں ان کا گنا جانا ایسی بات نہیں ہے کہ غالب شناسی کو صرف جدید عہد کی دریافت سمجھ لیا جائے - ہر زمانے کے ذوق ادب میں اتنا فرق ہونا ایک لازمی امر ہے - میر کے مقابلے پر سودا کو ، مصحفی کے مقابلہ پر انشا کو ، آتش کے مقابلے پر ناسخ کو یہی حیثیت حاصل رہی ہے - رونا تو یہ ہے کہ غالب شناسی کے اتنے دعووں کے باوجود ایک کتاب ایسی نہیں جس کا موضوع صرف غالب کی شاعری ہو اور جس میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہو کہ غالب کی شعری عظمت کیا ہے اور وہ کیوں اور کیسے پیدا ہوئی ہے -

سب رس

یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے ۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب محنت اور تحقیق کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے ۔ شروع میں بابائے اردو کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہیں ۔

قیمت : پانچ روپے

انجمن ترقی اردو
بابائے اردو روڈ ۔ کراچی

مرزا غالب کی ایک الجھن

ڈاکٹر سہیل بخاری

ادھار کون نہیں لیتا دیتا پر ادھار کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جب ادھار حد سے بڑھ جائے تو لوگ چونک اٹھتے ہیں اور انھیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ غالب کو ادھار اپنے کا ایک روگ سا لگ گیا تھا کہ جب تک جیتے رہے ادھار ہی میں ڈوبے رہے اور مرے تو بھی آٹھ سو روپے کے دین دار نکلے جو ان کی بیوی نے رام پور کے نواب سے مانگ کر چکائے۔ مرزا کو شروع سے ۱۸۵۷ء تک انگریزی سرکار سے ساڑھے باسٹھ روپے مہینا کی پنشن ملتی رہی، پر ایسا لگتا ہے کہ اس میں ان کا گزارا نہیں ہو پاتا تھا، کیونکہ ۱۸۵۰ء میں وہ حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش سے بہادر شاہ کی سرکار میں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر نوکر ہو گئے تھے اور پچاس روپے مہینا تنخواہ پانے لگے تھے۔ اس پر انھوں نے ایک شعر بھی کہا ہے:

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۹ جون ۱۸۵۳ء کو انھوں نے مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھا:

" یہ تمھارا دعاگو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفریں۔ جے پور سے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دوچار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل

جاتا - یہ پان سو تو بھائی تمھاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے ، سو وہ میرے صرف میں آویں گے - مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سو کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے تھے وہ صرف انگریزی سوداگر کے دیے تھے " -

۲۴ جون کو پھر انہیں لکھتے ہیں :

" بھائی جس دن تم کو خط بھیجا تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پان سو کی ہنڈوی پہنچی - تم سمجھے - بابو صاحب نے پچیس روپے ہردیو سنگھ کے دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے - پھر حال ہنڈوی ۱۲ دن کی میعادی تھی - ۶ دن گزر گئے تھے ، ۶ دن باقی تھے - ستی کاٹ کر روپے لے لیے - قرض متفرق سب ادا ہوا - بہت سبک دوش ہو گیا - آج میرے پاس ۴۷ روپے نقد بکس میں اور ۴ بوتل شراب اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں " -

۱۸۵۵ء میں رام پور کے نواب یوسف علی خاں ان کے شاگرد ہوئے تو وہاں سے بھی انہیں کچھ مدد ملنے لگی - منشی غلام غوث بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" نواب یوسف علی خاں بہادر ، والیٔ رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں ، اس سال ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے - ناظم ان کو تخلص دیا گیا - بیس پچیس غزلیں اصلاح دے کر بھیج دیتا - گاہ گاہ کچھ روپیا ادھر سے آتا رہتا ، قلعے کی تنخواہ جاری ، انگریزی پنشن کھلا ہوا ، ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے " -

اس زمانے میں بھی جب کہ تین تین جگہ سے آمدنی ہوتی تھی ، مرزا کے دن شاید ہی اچھے گزرے ہوں کیونکہ ساڑھے باسٹھ اور پچاس روپے سب ملا کر ایک سو بارہ روپے آٹھ آنے مہینا ہوتے تھے - اور نواب صاحب کی رقم گاہ گاہ ہی ملتی تھی - مرزا پیسا بچانا تو جانتے ہی نہیں تھے ، جو ملتا تھا وہ خرچ کردیتے تھے ، پھر اس کے دو ہی برس پیچھے آزادی کی لڑائی ہو گئی تو بہادر شاہ تخت سے اتر گئے - وہاں کی تنخواہ جاتی رہی اور انگریزی سرکار سے جو پنشن ملتی تھی وہ بہادر شاہ کا ساتھ دینے کے شبہے میں روک لی گئی - اس کے بعد ان کے ہندو دوست اور شاگرد ان کی خدمت کرتے رہے ، یہاں تک

کہ جولائی ۱۸۵۹ء سے رام پور کے نواب نے ان کی سو روپے مہینا تنخواہ کردی جو انہیں ہر مہینے ملنے لگی ۔ اس میں ان کی کیا گزر ہوسکتی تھی ۔

مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن کھلی اور تین سال کا اکٹھا روپیا ملا ۔ اس کا حساب ۶ مئی ۱۸۶۱ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں ، جس سے اس بیچ کے زمانے کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے :

" زر سہ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے ۔ سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں ۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے ۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے وہ کٹ گئے ۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے ۔ رہے دو ہزار روپے ۔ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرض‌دار قدیم ہوں ۔ اب جو وہ دو ہزار لایا اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے ۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے ۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا ۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے ، پندرہ اور گیارہ ۲۶ سو ہوئے ۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا ۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو ۔ پان سو سات روپے باقی کے تم لے لو ۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے ، نو سو باقی رہے ، آدھے تو لے ، آدھے مجھ کو دے" ۔

اسی روپے کا حساب مرزا علاوالدین احمد خاں کو بھی لکھا ہے :

" پنشن بےکم وکاست جاری ہوا ۔ زر مجتمعہ سہ سالہ یک مشت مل گیا ۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے "

اس کے بعد مرزا کو سرکاری پنشن اور رام‌پور کی تنخواہ ملا کر ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے ملنے لگے تھے اور رام پور سے انعام الگ ۔ مرزا کی گزر پھر بھی نہیں ہوتی تھی ۔ مہاجنوں سے سود پر روپیا ادھار لیتے رہتے تھے ، یہاں تک کہ جب آخر میں آکر ان لوگوں نے بہت کڑے تقاضے کیے تو مرزا نے ، جو رام پور کے نواب سے اپنے پوتے حسین علی خاں کی شادی کے لیے روپیا مانگنے کو کئی خط بھیج چکے تھے ، گھبرا کر انہیں لکھا کہ مجھے آٹھ سو روپے ہی بھیج دو ، جس سے میرا ادھار چک جائے اور عزت بچ جائے ۔ میں

حسن علی خاں کے بیاہ کے لیے پھر روپیا نہیں مانگوں گا۔

مرزا کی اس پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی آمدنی ان کا خرچ پورا نہیں کر پاتی تھی اور خرچ اس ٹھاٹ باٹ کا تھا جو وہ رکھتے تھے اور رکھنا چاہتے تھے۔ وہ گھر سے باہر پینس میں نکلتے تھے اور گھر میں کتنے ہی نوکر چاکر رکھتے تھے جن کا ذکر اپنی کئی چٹھیوں میں کرتے ہیں۔ وہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

" اب خاص اپنا رونا روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے تین چار آدمی گھر کے۔ گلو، کلیان، ایاز یہ باہر۔ مداری کی جورو بچے گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمدنی نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود "۔

ایک اور خط میں علائی کو لکھتے ہیں :

" انکم ٹیکس جدا ، چوکیدار جدا ، سود جدا ، مول جدا ، بی بی جدا ، بچے جدا ، شاگرد پیشہ جدا ، آمد وہی ایک سو باسٹھ ، تنگ آ گیا ، گزارا مشکل ہو گیا "۔

یہ ٹھاٹ رکھنے کے لیے مرزا کو ادھار سے کام چلانا پڑتا تھا۔ پر سوال یہ ہے کہ وہ آمدنی سے اپنا خرچ کیوں نہیں گھٹاتے تھے اس کا حال ان کے اس خط سے کھلتا ہے جو انھوں نے مرزا قربان بیگ کو لکھا ہے :

" میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے ، کہتا ہوں ، لو غالب کے ایک اور جوتی لگی ، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں ، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا ، ملحد مرا ، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیے ہیں ، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلم رو سخن جانتا تھا ، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیے نجم الدولہ بہادر ، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے ، میں ان سے پوچھ رہا ہوں ، اجی حضرت نواب صاحب ، نواب صاحب

اور خاں صاحب ، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں ، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے ۔ کچھ تو اکسو ، کچھ تو بولو ۔ بولے کیا خاک ۔ بے حیا ، بے غیرت ۔ کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے ، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا ''۔

یہی بات انھوں نے اپنے ایک شعر میں بھی کہی ہے :

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا کی ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ادھار کی ان پریشانیوں میں بھی انھیں اپنے بڑے آدمی ہونے کا برابر دھیان رہتا تھا ۔ اور دھیان کیوں نہ ہوتا جب کہ اپنا بڑاپن اور بڑے پن کا بھرم رکھنے ہی کے لیے وہ یہ سب کھکیڑیں اٹھاتے تھے ۔ اور یہیں اس سوال کا بھی جواب مل جاتا ہے کہ وہ اپنا خرچ کیوں نہیں گھٹاتے تھے جس سے اپنی آمدنی ہی میں پور پڑتی رہتی ۔ مرزا کی پوری زندگی کٹ گئی اور وہ اپنے اونچے گھرانے ، ریاست اور ناموری ہی کے گیت گاتے رہے ۔ ان دنوں میں بھی جب کہ دلی میں سب کو اپنی اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی ، مرزا ایک ہی راگ الاپتے رہے ۔ مولانا حالی نے ' یادگار غالب ' میں جو لکھا ہے کہ مرزا کے دروازے پر لولے لنگڑے اور اپاہج فقیروں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا ، اس کا کارن بھی یہی تھا کہ وہ ایسے لوگوں کی مدد کر کے ہی اپنے بڑے پن کا بھرم رکھ سکتے تھے ۔

جب دھلی کالج میں فارسی پڑھانے والے کی ایک جگہ بڑھائی گئی تو حکومت ھند کے سکریٹری مسٹر ٹامسن نے مرزا غالب کو بلایا ۔ یہ پالکی پر ان کے ھاں پہنچنے ، پر پالکی سے اس لیے نہیں اترے کہ ٹامسن صاحب آپ انھیں لینے آئیں ۔ جب ٹامسن صاحب کو پتا چلا تو وہ باھر آئے اور مرزا سے کہا کہ ''جب آپ گورنر کے دربار میں آئیں گے تو آپ کی آؤ بھگت اسی طرح کی جائے گی ۔ اس گھڑی آپ نوکری کے لیے آئے ھیں ، اس لیے ویسا برتاؤ نہیں ہو سکتا '' ۔ مرزا نے جواب دیا کہ '' گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو ، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی

فرق آئے"۔صاحب نے جواب دیا کہ " ہم قاعدے سے مجبور ہیں"۔ اس پر غالب یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھ کو اس ملازمت سے معاف رکھا جائے۔

کچھ لوگ اسے مرزا کی خودداری کہتے ہیں جیسا کہ ان شعروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

پر مکاتیب غالب پڑھ کر اس خودداری کا کہیں کھوج تک نہیں ملتا۔ انھوں نے رام پور کے نواب سے روپے مانگنے میں ذرا سی بھی جھجک نہیں دکھائی، نہ روپے مانگنے کا کوئی ڈھب ہی چھوڑا۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مانگتے شرم آتی ہے اور پھر مانگتے بھی جاتے ہیں۔ کبھی قصیدے کے بہانے اور کبھی کسی اور بہانے سے انعام مانگتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں کہ تنخواہ میں سے یہ رقم کاٹی نہ جائے۔ اپنے پوتے حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے روپیا مانگنے کو لگاتار چھ چٹھیاں لکھیں، آخر جب ادھار مانگنے والے غالب کی جان کھانے لگے تو گھبرا کے لکھا کہ بلا سے آٹھ سو روپے ہی بھیج دو جس سے میری لاج تو رہ جائے، میں اب حسین علی خاں کے بیاہ کے لیے روپیا نہیں مانگوں گا۔

اس کے لیے ان کے کچھ خطوں سے مثالیں لکھتا ہوں، ذرا مرزا کا لہجہ دیکھیے:

" آپ کے اس تکیہ دار، روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ (خط ۱۰/۵۴ - 'مکاتب غالب')

" ماہ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہوجائے اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیا مل جائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے "۔ (خط ۱۰۳/۵۹ - 'مکاتیب غالب')

" دوسری بات یہ ہے کہ سو روپے آپ کی سرکار سے بطریق خیرات اور ۶۲ روپے ۸ آنے مہینا انگریزی سرکار سے بہ عوض جاگیر پاتا ہوں ۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے " ۔ (خط ۵۳/۹۶ ۔ ' مکاتیب غالب ')

آخری خط سب سے زیادہ مزے دار ہے جس کے ایک ہی جملے میں اپنے آپ کو فقیر بھی بتایا ہے اور جاگیر دار بھی جتایا ہے اور یہی مرزا کی الجھن تھی ۔ مرزا کو اپنے اونچے گھرانے پر بہت گھمنڈ تھا ، منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو ایک بار یوں لکھتے ہیں :

" میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں ۔ دادا میرا ماورا النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا ۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا ۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی ۔ دفتر دیکھا گیا ۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا ۔ ملازمت ہوئی ۔ سات پارچے اور جیغہ ، سرپیچ ، مالائے مروارید ، یہ تین رقم خلعت ملا ۔ زاں بعد جب دلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا ۔ بعد غدر بہ جرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہوگئے ۔ میری بریت کی درخواست گزری ۔ تحقیقات ہوتی رہی ۔ تین برس کے بعد بند چھٹا ۔ اب خلعت معمولی ملا ۔ غرضکہ یہ خلعت ریاست کا ہے ، عوض خدمت نہیں ، انعامی نہیں "۔

ایک چٹھی میں اپنی کتاب چھپوانے کے سلسلے میں منشی شیونراین کو یہ ہدایت لکھی ہے :

" سنو میری جان ۔ نوابی کا مجھ کو خطاب ہے نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں ، بلکہ بعض انگریز بھی ، چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دھلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر نواب اسداللہ خاں لکھا ، لیکن یاد رہے نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے ، خلاف دستور ہے ، یا نواب اسد اللہ خاں لکھو یا میرزا اسد اللہ خاں لکھو اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے "۔

ایک چٹھی میں سید غلام حسنین قدر بگرامی کو اپنے مان سمت کے لیے یوں لکھتے ہیں :

" میر صاحب ماجرا یہ ہے کہ میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا ۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہوگئی لیکن دربار اور خلعت بند " ۔

وہ بار بار لوگوں کو لکھتے ہیں کہ خط پر میرا نام اور دھلی لکھ کر بھیج دیا کرو ، مجھ تک پہنچ جائے گا ۔ خط جس ڈاک خانے سے چلتا ہے وہیں رہ جائے تو رہ جائے دھلی کے ڈاک خانے میں نہیں کھو سکتا ۔ انھوں نے جگہ جگہ یہ جتایا ہے کہ فارسی اور انگریزی کے خط بھی جو انگلستان کے میرے نام آتے ہیں ، دھلی کے پتے پر مل جاتے ہیں جب کہ ان پر محلہ یا ماروں کا نام بھی نہیں ہوتا ۔ وہ کہتے ہیں کہ نامور آدمیوں کے خط میں لمبے چوڑے پتے کی ضرورت نہیں ہوتی، جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی نامور آدمی ہوں ۔ وہ ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

" بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضروری نہیں ۔ میں غریب آدمی ہوں ، مگر فارسی انگریزی خط جو میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے "۔

مرزا علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو ، اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا ۔ پچاس برس سے دھلی میں رہتا ہوں ۔ ہزار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں ۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے ۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں ۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام ۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ مسکن بتا ۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی ، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانا نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتا نہ پائے ۔ آپ صرف دھلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط کے پہنچنے کا میں ضامن"۔

ان کی یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہی نہیں تھے، دوسروں کو بتانا بھی چاہتے تھے ۔ ان کی اس الجھن کا کوئی نہ کوئی کارن ہونا چاہیے کیونکہ اونچے اونچے گھرانوں کے لوگ بھی کبھی کبھی مٹ جاتے ہیں اور پھر زمانے سے سمجھوتا کر کے اپنی روکھی سوکھی ہی پر دن کاٹنے لگتے ہیں ۔ نہ وہ اپنا بڑاپن کسی کو جتاتے ہیں نہ مرزا کی سی شاہ خرچی کر کے ادھار کے دکھوں ہی میں ہنستے ہیں ۔ ان لوگوں کی زبان پر اپنے ' بڑے پن ' کی بات صرف اس گھڑی آتی ہے جب ان کی ساکھ اور آبرو پر چوٹ پڑتی ہو ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا سچ مچ مرزا پر بھی کوئی ایسی گھڑی آئی تھی اور کوئی ایسی بپتا پڑی تھی جس نے ان کی خاندانی عزت میں بٹا لگایا ہو ۔ ان کا ایک شعر ہے :

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

کہنے کو تو یہ ایک غزل کا مقطع ہے اور اس میں کہی ہوئی بے آبروئی کی بات تفریحی سمجھی جاسکتی ہے ۔ پر ہمیں سچ مچ بے آبروئی کی بات کا ذکر ان کے ایک خط میں بھی ملتا ہے ۔ ۱۸۵۲ء میں مرزا کا تعلق جے پور سے قائم ہوا تو مرزا تفتہ نے اس کی تفصیل پوچھی اور لکھا کہ وہاں میرا بھی خیال رہے ۔ اس کے جواب میں ۱۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کو وہ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" جے پور کا امر محض اتفاقی ہے ۔ بے قصد و بے ذکر درپیش آیا ہے ۔ ہوس ناکانہ ادھر متوجہ ہوا ہوں ، بوڑھا ہو گیا ہوں ، بہرا ہو گیا ہوں ۔ سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا ، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا ، پورا خلعت پاتا تھا ، اب بدنام ہوگیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے، کسی ریاست میں دخل نہیں کرسکتا تھا مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں ، کچھ فائدہ اٹھاؤں ، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کردوں ۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے "۔

مرزا کی اس بدنامی کے واقعے کا حال مولانا عرشی نے 'مکاتیب غالب' میں لکھا ہے کہ " ۱۸۴۷ء میں فیض الحسن خاں کوتوال دھلی کے ہاتھوں

قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینے کی با مشقت قید اور دوسو روپے جرمانے کی سزا پائی ۔ اس واقعے کی جزئیات بے حد افسوس ناک تھیں ۔ کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں ان کی وجاہت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا ۔ پولیس اور عدالت کے اس نامناسب سلوک سے ان کی حس غیرت سخت مجروح ہوئی ، خود اپنی نظر میں شرافت خاندان پر دھبا آ گیا اور اپنے کو رسوائے ہندوستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے "۔

اس واقعے سے متعلق مولانا عرشی نے حاشیے میں اخبار " فوائدالناظرین " جلد دوم نمبر ۱۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کے صفحہ ۸۰ پر لکھی ہوئی عبارت نقل کی ہے ۔ " ۲۵ ماہ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی ، چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پاکر وہاں گئے اور جناب میرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کر کوتوالی میں لے آئے ۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں " اور شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشیام لال عاصی دھلوی کی عبارت بھی دھرائی ہے :

" مرزا نوشہ ، شاعر بے بدل دھلی ، رند مشرب ، المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال کو ناحق کی عداوت پیدا ہو گئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرادیا ، جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی :

سر ابجد سے فصلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے
اور اٹھارہ سو سنتالیس میں قید غریباں ہے

' قلق غالب ' نہ کیونکر موش اور گربے کے دل پر ہو
دبی بلی کشاتی کان چوھوں سے بدنداں ہے

رھائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیوں کر ہو
' زن غمخوار ' واں بن کر گیا فیض الحسن خاں ہے

سر بازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے عاصی
اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بہ زنداں ہے

بر وقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے

اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں - اس دھوکے سے اندر داخل ہوگئے اور اندر مکان سے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی، مگر زینے کے اندر جمعیت بہت تھی اور کچھ امدادی برقنداز پہنچ گئے، گرفتار کر کے قید کرادیا - بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برأت کے ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئے "۔

اس بے آبروئی کا مرزا کو جو دکھ پہنچا اور بدنامی کا ان کے دل پر جو گہرا اثر پڑا، اس نے ان کے ذہن میں عمر بھر کے لیے ایک الجھن پیدا کردی۔ وہ اپنے من کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی جو ہو گئی کہ کوتوال نے ان سے اپنا بیر یوں نکالا اور اپنا کمینہ پن دکھایا۔ اس اخلاقی دھبے کو دھونے کے لیے مرزا نے یہ کوشش کی کہ کسی ریاست میں استاد یا پیر یا مداح بن کر پہنچوں اور یہ طریقہ بہت مناسب تھا - جے پور کی ریاست سے تعلق پیدا ہونے کا جو موقع آیا، وہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا اور جب وہاں بیل منڈھے نہیں چڑھی تو انھوں نے رام پور کی ریاست میں استاد بن کر دخل کیا - پر ایسا لگتا ہے کہ اس سے بھی مرزا کے دل کو تسلی نہیں ہوئی، اس لیے انھوں نے آپ ہی اپنے اونچے گھرانے، اپنی ریاست اور ناموری کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیا اور یہ طریقہ غلط تھا کیونکہ اس کے لیے انھیں امیرانہ ٹھاٹ رکھنا ضروری ہوگیا، اور جب ان کی آمدنی نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو انھوں نے ادھار لے لے کر کام چلایا اور مرتے دم تک اس کی پریشانیاں بھگتتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بے عزتی کا یہ نامراد واقعہ ان کے دھیان سے کبھی نہیں نکلا اور ایک روگ بن کر ان کے ذہن سے آخر تک چمٹا رہا۔

خیالات عزیز

یہ مولوی عزیز مرزا (سابق معتمد آل انڈیا مسلم لیگ و انجمن ترقی اردو ھند) کے علمی ، ادبی ، لسانی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ھے۔ بعض مضامین یہ ھیں :

- اکبر اعظم
- سکے کی ابتدا اسلام میں
- ایشیائی شاعری کا موضوع کیا ھے ؟
- دربار بغداد کی ایک جھلک
- کاغذ کی ابتدا اسلام میں
- خطبۂ صدارت اردو کانفرنس بدایوں

اس مجموعے کو پنڈت دیا نرائن نگم (مدیر ' زمانہ ') نے مرتب کیا تھا اور اس پر نواب وقار الملک مرحوم کا دیباچہ ھے۔

قیمت : چار روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی

غالب کے اولین تعارف نگار

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مرزا غالب رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ع میں پیدا ہوئے اور ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق فروری ۱۸۶۹ع میں وفات پائی - گویا سنہ ھجری کے لحاظ سے تہتر سال اور سنہ عیسوی کے لحاظ سے بہتر سال زندہ رہے۔ ان کی زندگی میں بھی ان کی سوانح اور شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی وفات سے لے کر ان کی صد سالہ برسی فروری ۱۹۶۹ع کے درمیانی عرصے میں ان کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب تک اقبال کے سوا اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا - اس سلسلے میں معاً یہ سوال ذھن میں ابھرتا ہے کہ غالب کے فکر و فن کے متعلق سب سے پہلے کس نے رائے ظاھر کی اور کن لوگوں نے انھیں اول اول پہچانا اور کن لوگوں نے ان کی شخصیت اور کلام کو سب سے پہلے دوسروں سے متعارف کرایا - بعض مقالہ نگاروں کا خیال ہے کہ غالب کا ذکر سب سے پہلے سر سید احمد خاں کی مشہور تصنیف 'آثارالصنادید' مرقومہ ۱۸۴۶ع میں ملتا ہے - (۱) لیکن چونکہ یہ جواب تحقیق و استدلال سے عاری ہے اس لیے ادب کے قارئین مطمئن نہ ہوئے اور غالب کے اولین تعارف نگار کے بارے میں ان کا استفسار آج تک جوں کا توں باقی ہے (۲) -

غالب کے سلسلے میں ''ماہ نو'' کے مقالہ نگار یا کسی بزرگ کا یہ خیال

۱- 'غالب اور سرسید' مطبوعہ ماہ نو کراچی ، بابت فروری ۱۹۵۱ع

۲- ھماری زبان ، علی گڑھ ، بابت ۱۵ - اکتوبر ۱۹۶۸ع جس میں ایک مراسلہ نگار نے پوچھا ہے کہ غالب کا اولین تذکرہ نگار کون ہے -

کہ ان کا ذکر سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں کیا ہے، درست نہیں ہے اور کہنے والے کی بے خبری کا پتا دیتا ہے۔ اس لیے کہ آثار الصنادید مرقومہ ۱۸۴۶ع سے بہت پہلے کئی تذکرہ نگار غالب کا تعارف کرا چکے تھے۔ تذکرہ نگاروں کے تراجم سے قطع نظر کئی اور ایسی باتیں ہیں جو غالب کی شاعرانہ شخصیت و عظمت کے متعلق اولین تعارف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی میر تقی میر کی وہ پیشین گوئی ہے جس کا ذکر مولانا حالی نے اس طور پر کیا ہے:

> "جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اردو کا شعر کہنا شروع کیا تھا، قطع نظر اس سے کہ اس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے، اس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی میر نے جو میرزا کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا"۔ (۱)

غالب کا سال پیدایش ۱۲۱۲ھ اور میر تقی میر کا سال وفات ۱۲۲۵ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت میر تقی میر کی نظر سے غالب کے اشعار گزرے ہوں گے یا انھیں سنائے گئے ہوں گے، اس وقت غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۳/۱۲ سال رہی ہوگی۔ ظاہر ہے ۱۳/۱۲ سالہ لڑکے کے کلام کے متعلق میر تقی میر جیسے عظیم المرتبت شاعر و تذکرہ نگار کی رائے اس وقت خاصی وقیع خیال کی گئی ہوگی اور ادبی حلقوں میں غالب کو روشناس کرانے میں میر تقی میر کے فقروں نے ضرور مدد دی ہوگی۔ بعض حضرات میر تقی میر کی پیشین گوئی کو قرین قیاس نہیں سمجھتے۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر نے اس روایت کی صحت سے انکار کرتے ہوئے بطور استدلال ذیل کے چند سوالات اٹھائے ہیں:

> ۱۔ اس کم عمری میں مرزا کا کلام آگرے سے لکھنؤ پہنچا کیسے اور اسے وہاں کون لے گیا اور اس کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔

۱۔ یادگار غالب، ص ۱۳۸، شائع کردہ تاج بک ڈپو، لاہور۔

۲۔ میر اپنی عمر کے آخری دو تین برس مختل الحواس رہے اور چونکہ ان کے یہ ایام بہت وارفتگی حواس اور ھجوم امراض میں گزرے اس لیے وہ کوئی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہے تھے - (۱)

مالک رام نے مولانا غلام رسول مہر کے استدلال کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

" یہ استدلال بہت کمزور ہے، یہ کس نے کہا کہ کلام ضرور آگرے گیا - مرزا کے تعلقات نواب احمد بخش خاں کے خاندان سے معلوم ہی ہیں، وہ سات برس کی عمر سے دھلی آتے جاتے رہے اور ان ایام میں وہ لازماً نواب صاحب کے ہاں ٹھیرے ہوں گے - نواب صاحب کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش معروف کے گہرے دوستانہ تعلقات مہر صاحب کو بھی تسلیم ہیں - تاسی نے مرزا کا کلام خود مرزا سے لیا یا معروف سے اور اس کی ندرت و غرابت کے پیش نظر اسے لے جا کے لکھنؤ میں اپنے استاد میر کو دکھایا کہ دیکھیے حضرت ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا ایسے شعر کہتا ہے -

"پھر میر لاکھ پریشان حال اور وارفتہ اور بیمار رہے ہوں لیکن اتنے بھی نہیں کہ یہ شعر سننے اور ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہ رہے ہوں - وہ کوئی مفصل تنقیدی مضمون تو لکھ نہیں رہے تھے کہ انھیں اپنے خیالات مجتمع کر کے کافی وقت تک یکسوئی اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنے کی ضرورت ہوتی - انھوں نے تاسی سے کچھ شعر سنے اور اپنی رائے ایک آدھ فقرے میں ظاہر کردی" - (۲)

مالک رام کی بات دل کو لگتی ہے - اول اس لیے کہ میر تقی میر کی پیشین گوئی کے سلسلے میں مولانا حالی جیسے نیک نفس اور ثقہ بزرگ کے جھوٹ بولنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی - دوسرے اس سبب سے کہ غالب فی‌الواقع

۱- 'مرزا غالب اور میر تقی میر' مطبوعہ ماہ نو کراچی، بابت فروری ۱۹۵۹ء، ص ۹ - بحوالہ 'ذکر غالب' ص ۴۳ -

۲- ذکر غالب، ص ۴۳، مکتبہ جامعہ دھلی، تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ع

بہت کم عمری سے شعر کہنے لگے تھے اور ان کے کلام نے بہت جلد اعتبار حاصل کرلیا تھا ۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ :

" مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا ۔ انھوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے ، گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا " ۔ (۱)

خود مرزا غالب کا بیان ہے کہ :

" بارہ برس سے کاغذ نظم و اثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں ۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی ، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے " ۔ (۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ :

" در دہ سالگی آثار موزونیٔ طبع ہیدائی گرفت "۔ (۳)

غالب کے مستند محققین نے بھی غالب کے آغاز شاعری کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے ۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ :

" وہ مولوی محمد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کردیا "۔ (۴)

یہی بات انھوں نے دیوان غالب کے دیباچے میں بھی دھرائی ہے ۔ (۵)

۱۔ یادگار غالب ، ص ۱۳۶ ۔

۲۔ خط بنام قدر بلگرامی مرقومہ ۱۸۵۷ء

۳۔ کلیات نثر ، پنج آہنگ ، ص ۲۳۹

۴۔ ذکر غالب ، ص ۳۰

۵۔ مقدمہ دیوان غالب ، مرتبہ مالک رام ، ص ۱۰ ، مطبوعہ آزاد کتاب گھر دھلی ، طبع دوم ۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی بھی مخالف اقوال و بیانات پر بحث کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ :

> ''ان میں سے راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس برس کی عمر سے شعر گو تھے کیونکہ کلیات فارسی کا اظہار جو سب سے قدیم ہے ، یہی ثابت کرتا ہے'' - (۱)

ان حقائق کی روشنی میں بارہ تیرہ سال کی عمر میں غالب کے اشعار کا میر تقی میر کے کانوں تک پہنچ جانا اور میر کا انہیں سن کر ایک دو فقروں میں اپنی رائے کا اظہار کر دینا بعید از قیاس نہیں رہ جاتا -

میر کی پیشین گوئی سے قطع نظر ایک جامع تقریظ کی صورت میں غالب کا اولین تعارف سر سید احمد خاں نے نہیں بلکہ نواب ضیاالدین خاں نیر و رخشاں نے کرایا ہے - اس نثری تقریظ میں نواب ضیاالدین احمد خان نے غالب کو ' سر خیل انجمن نکتہ دانان ' قرار دیتے ہوئے ان کی توصیف میں چند اشعار بھی کہے ہیں جو غالب کے کلام پر اولین تنقیدی خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں - اشعار یہ ہیں :

سخن را از خیالش ارجمندی	معانی را ز فکرش سر بلندی
صریر خامہ اش بس دل پذیر است	بہشتی عندلیباں را صفیر است
سہیں فرزند نہ آبائے علوی	بہیں شاگرد عقل کل عالی
جہاں را بے دریغ آموزگار است	گزیں معنی شناس روزگار است
سراسر دفتر شیوہ بیاناں	در ایں فن افتخار ہم زباناں
بہ جولاں گاہ معنی یکہ تازے	فلاطوں فطرتے حکمت طرازے
بہ کلکش ریزش گنج معانی	جواہر آذری در در فشانی
ز صہبائے سخن سرشار گشتہ	ورق از فکر او گلزار گشتہ

یہ تقریظ کئی صفحات میں پھیلی ہوئی ہے اور اتفاق سے خود سر سید

۱- دیباچہ دیوان غالب اردو ، نسخہ عرشی ، ص ۱۳ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ، علی گڑھ ، ۱۹۵۸ء -

احمد خان کی تالیف آثار الصنادید میں بھی شامل ہے (۱) لیکن آثارالصنادید میں شامل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ یہ تقریظ غالب کے سلسلے میں سرسید احمد خان کے بعد لکھی گئی ہے - ایسا نہیں ہے۔ یہ تقریظ آثار الصنادید سے بہت پہلے وجود میں آچکی تھی اور غالب کے اولین دیوان ریختہ کے لیے لکھی گئی تھی ، یہ اردو دیوان ۱۸۴۱ء میں مطبع سیدالاخبار دھلی سے شائع ہوا تھا - مولانا امتیاز علی خان عرشی رقم طراز ھیں کہ :

" مرزا صاحب کے دیوان کا پہلا مطبوعہ نسخہ ،طبع سیدالاخبار دھلی میں چھپ کر شائع ہوا ، یہ مطبع سر سید مرحوم کے بھائی سید محمد خان بہادر نے دھلی میں قائم کیا تھا اور سید المطابع یا سیدالاخبار کے نام سے مشہور تھا - شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں اس مطبع سے مرزا صاحب کا دیوان چھپ کر شائع ہوا - صولت لائبریری رام پور میں اس اڈیشن کا ایک نسخہ محفوظ ہے "- (۲)

گویا جس مطبع سے ۱۸۴۷ء / ۱۲۶۳ھ میں سر سید احمد خان کی آثارالصنادید شائع ہوئی ، اسی سے غالب کا اردو دیوان نواب ضیاالدین احمد خان کی تقریظ کے ساتھ ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ میں شائع ہو چکا تھا - لیکن نواب ضیاالدین خاں کی تقریظ ۱۸۴۱ء سے بھی پہلے کی ہے۔ یہ تقریظ حقیقتہً اس سے تین سال پہلے دیوان اردو کے قلمی مسودے کے لیے لکھی گئی تھی - مولانا امتیاز علی خان عرشی کا بیان ہے کہ یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں لکھی گئی تھی - (۳)

ان امور کی روشنی میں یہ کہنا کہ غالب کا تعارف سب سے پہلے سر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں کرایا ہے ، درست نہیں ہے - ضیاالدین احمد خان کی تقریظ جو کہ آثارالصنادید میں بھی شامل ہے ، سر سید کی تحریر

۱- آثار الصنادید ، ص ۱۰۲ تا ۱۶۵ ، مطبوعہ سید الاخبار دھلی به اهتمام سید عبد الغفور بقا ، ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء -

۲- دیباچہ دیوان غالب اردو ، نسخہ عرشی ، ص ۹۲ ، ۹۳ -

۳- دیباچہ دیوان اردو ، نسخہ عرشی ، ص ۹۰

سے بہت پہلے کی ہے۔ لیکن نواب ضیاالدین خان کی تقریظ بھی تعارف غالب کے سلسلے کی پہلی تحریر نہیں ہے ، اس سے پہلے غالب کا ذکر مع انتخاب کلام کئی تذکروں میں ملتا ہے ۔ اس سلسلے میں تین قدیم تذکرے :

۱- عیارالشعرا ، مولفہ خوب چند ذکا

۲- عمدۂ منتخبہ ، مولفہ اعظم الدولہ سرور

۳- گلشن بے خار، مولفہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ

خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔

جہاں تک گلشن بے خار کا تعلق ہے ، اسے شیفتہ نے آغاز ۱۲۴۸ھ (جون ۱۸۳۲ء) میں شروع کیا اور اواخر ۱۲۵۰ھ (اپریل ۱۸۳۵ء) میں دو سال کی کوشش کے بعد ختم کیا ہے (۱)۔ گویا گلشن بے خار سر سید احمد خان کی آثار الصنادید سے پورے گیارہ برس پہلے لکھا گیا ہے۔ اس میں غالب کے متعلق شیفتہ لکھتے ہیں :

" غالب تخلص ، اسم شریفش اسد اللہ خان المشتہر بہ مرزا نوشہ ، از خاندان فخیم است و از روسای قدیم ۔ سابقاً مستقرالخلافت اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود ، اکنون دارالخلافتہ شاھجہان آباد بدیں نسبت غیرت افزائے صفاھان و شیراز ۔ طوطیٔ بلند پرواز چمن معانی است و بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی ۔ پیش بلندی خیالش اوج فلک پستی زمین است و در جنب تہ نشینی غورش سرفرازی قارون کرسی نشین ۔ شاھین فکرش جز بشکار عنقا نہ پردازد و اشھب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد ۔ اگر امروز بتلاش متاع نفیس شتابی جز بدکانش در نیابی۔ سالہا است کہ پا بدائرۂ شاعری نہادہ ۔ در اوائل حال بتقاضاے طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن می گفت و دقت آفرینی ھا میکرد، آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ اندازی دیگر مطبوع ابداع نمودہ ، دیوانش را بعد

۱- دیباچہ دستورالفصاحت ، مرتبہ امتیاز علی خان عرشی ، ص ۴۹ ، مطبوعہ ھندوستانی پریس رام پور، ۱۹۴۳ء

ترتیب و تکمیل دیگر نگریست ، فراواں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ قدر قلیلے انتخاب زدہ ۔ مدتہاست کہ بنظام ریختہ سری ندارد ، در زبان فارسی نیز دستگاہی بلند و مایہ وافر بہم رسانیدہ ۔ پایہ اش از فحول استادان کم نیست ۔ غزلش چوں غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفی دل پذیر ۔ مضامین شعری را کما ھوحقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پے می برد و ایں فضیلتی است کہ مخصوص بعض اہل سخن است ۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ میرسی ۔ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر ، خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شربی یافتہ و حظی ربودہ ، بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شد ، دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد اما پیوند معنی مستحکم است ، دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات ازاں منتخب گردید " ۔ (۱)

اتنا لکھنے کے بعد شیفتہ نے ۱۸۳ اشعار بطور نمونہ کلام درج کیے ہیں ۔ چونکہ سارے اشعار غالب کے متداول دیوان میں شامل ہیں ، اس لیے ان کا اس جگہ نقل کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ صرف پہلا اور آخری شعر نقل کیا جاتا ہے :

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

گلشن بے خار غالب کے سلسلے میں یوں اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعے پہلی بار یہ بات سامنے آئی کہ غالب نے اپنے اردو کلام کا بہت سا حصہ حذف کر کے موجودہ دیوان مرتب کیا تھا ۔ گویا نسخۂ حمیدیہ کا سراغ سب سے پہلے شیفتہ نے دیا ہے ۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے جو کچھ

---

۱ گلشن بے خار ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ، ص ۱۳۹ تا ۱۴۳ ، مطبع نول کشور لکھنو ، ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ع

لکھا ہے انہیں کے حوالے سے لکھا ہے۔ (۱)

عمدہ' منتخبہ اور عیار الشعرا میں بھی غالب کا ذکر صراحت سے آیا ہے اور یہ دونوں تذکرے گلشن بے خار سے بھی پہلے لکھے گئے ہیں ۔ ہر چند کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے کے ہیں اور ان کی تقدیم و تاخیر کی تاریخوں کا تعین آسان نہیں ہے، پھر بھی بعض قرائن عیار الشعرا کو عمدہ' منتخبہ پر مقدم کر دیتے ہیں ۔

عمدہ منتخبہ کے آغاز و اختتام پر بحث کرتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء یا ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء کو آغاز تالیف اور ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء کو اختتام تذکرہ کی تاریخ قرار دینا چاہیے ۔ (۲) لیکن مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ، جلد اول کے مرتبین نے عمدہ' منتخبہ کی بعض داخلی شہادتوں کی مدد سے لکھا ہے کہ :

" عمدہ' منتخبہ کی تکمیل ۱۲۲۴ھ میں نہیں ہوئی ۔ اسے تذکرے کے ابتدائی مسودے کی تکمیل کا سنہ کہ سکتے ہیں جس کی نقلیں بھولا ناتھ عاشق کے لکھے ہوئے نسخے سے لی گئیں ۔ اس میں اضافے ۷ ، ۸ سال بعد تک ہوئے "۔ (۳)

اس کے معنی یہ ہیں کہ عمدہ' منتخبہ ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۳۱ - ۱۲۲۳ھ کے درمیانی عہد میں لکھا گیا ہے۔ عرشی صاحب نے ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء اور ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۲ء کے درمیان کی تالیف بتایا ہے ، لیکن ماخذ کا سراغ نہیں دیا ۔(۴)

۱۔ طبقات الشعرا ، مولفہ فیلن صاحب وکریم الدین ، ص ۳۷۷ ، مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دھلی ، ۱۸۴۸ء

۲۔ مقدمہ عمدہ' منتخبہ ' مطبوعہ دھلی یونیورسٹی ، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ، ۱۹۶۱ء

۳۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو ، جلد اول ، ص ۱۳۸ ، مطبوعہ انجمن پریس کراچی ، ۱۹۶۵ء

۴۔ دیوان غالب اردو ، نسخہ' عرشی ، ص ۳۸۳

عیار الشعرا کا عہد تصنیف اشپرنگر نے ۱۲۰۸ اور ۱۲۴۷ ہجری کے درمیان متعین کیا ہے۔ (۱)

عرشی صاحب کی تحقیق ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں شروع ہوا اور تقریباً ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔ (۲)

ان تاریخوں کی روشنی میں اگر تذکروں کے آغاز کو ملحوظ رکھیں تو عیار الشعرا کو عمدہ منتخبہ سے مقدم ماننا پڑتا ہے اور اگر ان کے تکملے کی تاریخیں محسوب کریں تو عمدہ منتخبہ مقدم اور عیار الشعرا موخر ہو جاتا ہے ، لیکن عمدہ منتخبہ میں ذکا کے متعلق لکھا ہے:

''ذکا تخلص، خوب چند نام، قوم کایت، شاگرد میاں نصیر، جوانے سلیم الطبع، مزاحش بہ صلاحیت راغب 'کلامش نمکین' از چندے طبعش از گفتن شعر انحراف ورزیدہ ۔ مشار الیہ هم تذکرة الشعرا تالیف کردہ''۔ (۳)

گویا سرور جس وقت اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے ، ذکا کا تذکرہ لکھا جا چکا تھا اور ان کے علم میں آچکا تھا ۔ اس اعتبار سے عیار الشعرا کو عمدہ منتخبہ سے مقدم تسلیم کر لینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں تذکرے غالب کے سلسلے میں خاصے اہم ہیں ۔ ان کے ذریعے غالب کے بعض ایسے نایاب اشعار سامنے آتے ہیں جو نسخہ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ۔

خوب چند ذکا اپنے تذکرے میں غالب کے متعلق لکھتے ہیں :

'' مرزا اسداللہ خان غالب عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ، ولد مرزا عبداللہ خان عرف مرزا دولہ ، نبیرہ مرزا غلام حسین کمیدان، ساکن بلدہ اکبر آباد ، شاگرد مولوی معظم، شاعر فارسی و ہندی است ازوست :

نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشہ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

۱۔ یادگار شعرا ' ص ۷ ' مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ، ۱۹۴۳ء

۲۔ دیوان غالب اردو ، نسخہ عرشی ، ص ۲۹۲

۳۔ عمدہ منتخبہ ، ص ۳۰۵

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

صبا لگا وہ طمانچے طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچہ گل سوئے آشیاں پھر جائے

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
تھا میں گلدستہ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ ایسا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہرو و فا میرے بعد (۱)

غالب کے سلسلے میں ذکا کے ترجمے کی اہمیت یوں ہے کہ مذکورہ بالا دس اشعار میں سے نمبر ۱ ، ۳ ، ۷ اور ۹ ایسے ہیں جو نسخہ حمیدیہ کے علاوہ کسی اور مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہیں ۔ نسخے کا مسودہ ۱۲۳۷ھ میں مکمل ہوا تھا (۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں اشعار ۱۲۳۷ھ سے

۱- فوٹو اسٹیٹ ص ۳۸۹ تا ۴۰۹ ، نمبر ۱ قلمی ، مخزونہ انڈیا آفس لندن ، مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی

۲- مقدمہ نسخہ حمیدیہ ۔

قبل کے ہیں - لیکن عیار الشعرا کے اشعار میں نمبر ۴ ، ۵ ایسے ہیں جو نسخہ حمیدیہ میں بھی نظر نہیں آتے - گویا یہ دونوں شعر صرف ذکا کے تذکرے کے ذریعے ہمارے سامنے آئے ہیں - مولانا امتیاز علی خان عرشی(۱) اور مالک رام (۲) نے البتہ اپنے نسخوں میں یہ دونوں شعر شامل کر لیے ہیں -

کم و بیش یہی اہمیت اعظم الدولہ سرور کے بیان اور انتخاب کلام کی ہے - مرزا غالب کا مکمل ترجمہ یہ ہے :

" اسد تخلص ، اسداللہ خان، عرف میرزا نوشہ - اصلش از سمرقند ، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد - جوان قابل و یار باش و درد مند - ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ - ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن - غم ہائے عشق مجاز (کذا) تربیت یافتہ غمکدہ نیاز - در فن سخن سنجی متبع محاورات میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند - بالجملہ موجد طرز خودست و با راقم رابطہ یک جہتی مستحکم دارد - اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ بہ مضامین نازک موزوں گشتہ - رویہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد - از نتائج طبع اوست :

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیان اشک
لایا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک

آنسو کہوں کہ آہ سوار ہوا کہوں
ایسا عنان گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

۱- دیوان غالب اردو، نسخہ عرشی ، ص ۳۹۵

۲- دیوان غالب ، مرتبہ مالک رام ، ص ۳۲۳ تا ۳۶۴

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

مجلس شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہ داماں صبا جاتا ہوں
ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزر گاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے ہے سبک رو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بیک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا
دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثار برق مشت خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست بہ ضبط دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خون زاہد کو مباح اور مال صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوز دل
درد جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موج ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکل طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھو دنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصد نگاہ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلال جنس رسوائی
دل خریدار ذوق خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہوں
روز بازار جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

کب سنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلش غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے
پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
بے قراری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل (۱)

ان ۴۰ اشعار میں سے پندرہ اشعار نمبر ۱، ۲، ۵ تا ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۲۰ اور ۲۲ ایسے ہیں جو نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام کے سوا کسی مطبوعہ دیوان حتی کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ہیں۔ گویا اگر یہ اشعار سرور کے ذریعے منظر عام پر نہ آجاتے تو ہم ان سے بے خبر ہوتے۔ ان میں سے اشعار نمبر ۱، ۲، ۵، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۵، ۱۶ اور ۲۲ پہلی بار دیوان غالب اردو نسخۂ عرشی میں شامل کیے گئے ہیں (۲) لیکن چھ اشعار یعنی نمبر ۶، ۸، ۹، ۱۱، ۱۳ اور ۲۰ نسخۂ عرشی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ دیوان غالب مرتبہ مالک رام میں البتہ ان میں سے پانچ اشعار شامل کرلیے گئے ہیں (۳) لیکن شعر نمبر ۲۰ اس میں بھی نہیں ہے۔ عمدۂ منتخبہ کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو عام مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہیں۔ مثلاً شعر نمبر ۳، ۴، ۱۹ صرف نسخۂ حمیدیہ کی زینت ہیں (۴)۔ عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا میں غالب کے جن نایاب اشعار

۱- عمدۂ منتخبہ، ص ۱۱۶ تا ۱۲۰، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، مطبوعہ دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ع

۲- دیوان غالب اردو، نسخۂ عرشی، ص ۲۰۱-۲۰۳-۲۹۷-۲۹۵-۳۰۵

۳- دیوان غالب مرتبہ مالک رام، ص ۲۸۵-۲۸۶-۲۹۳-۲۹۴-۳۲۲-۳۲۳، مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۰ء

۴- نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۵۶-۱۱۱-۹۷، مطبوعہ بھوپال۔

کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ، ہر چند کہ وہ علیگڑھ میگزین (غالب نمبر) ستمبر ۱۹۴۹ء ۱۹۴۸ء مرتبہ مختار الدین احمد آرزو کے ص ۱۰۴ پر بھی شایع ہو چکے ہیں اور مالک رام اور عرشی صاحب نے اس سے یہ اشعار لیے ہیں ، لیکن شعر نمبر ۲۰ میگزین میں بھی نہیں ہے ،گویا اب تک اس کا ماخذ صرف عمدہ" منتخبہ ہے ۔

اعظم الدولہ سرور خوب چند ذکا اور شیفتہ کے یہ تراجم جن کی تفصیل اوپر دی گئی ہے ، سرسید کی کتاب آثارالصنادید سے بہت پہلے کے ہیں ۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی ۔ ان کے علاوہ بھی کئی تذکرے ہیں جن میں غالب کا ذکر آثار الصنادید سے پہلے آچکا ہے ۔ مثلاً گلدستہ نازنیناں کو لیجیے ، یہ کریم الدین کا تذکرہ ہے جو ۱۸۴۴ء میں مکمل ہوا ۔ خود کریم الدین نے دیباچے میں لکھا ہے :

" ماہ ذی الحجہ ۱۲٦۰ھ مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء میں اتمام ہوا اور ماہ صفر ۱۲٦۱ھ ہجری مطابق ماہ فروری، ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع ہو گیا اور نام گلدستہ نازنیناں رکھا گیا " ۔ (۱)

اس تذکرے میں غالب کا ذکر اس طور پر آیا ہے :

"اسد تخلص ، اسم شریف ان کا نواب اسد اللہ خان بہادر ، معروف بمرزا نوشہ ، خاندان فخیم اور روسائے قدیم اکبرآباد نیک بنیاد کے ،مدت سے وارد شاہ جہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں ۔ ادیب و لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی ان کی کے حضیض جہل کا مبتلا مشہور ، سخن فہم و سخن دان اس پائے پر کہ متنبی و کعب باوجود متنبا اور بلند پایگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے ان کے حضور ۔ اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری ۔ مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارات ظہوری ۔ خوان یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ رہا ، خاقانی بجاروب کشی مستعد بسرو رہا ۔ فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا ۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں ۔ مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا ۔ مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصانیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا ۔ اسی سے چند

۱- دیباچہ گدستہ نازنیناں ، مطبوعہ ۱۲٦۱ھ / ۱۸۴۵ء طبع اول ۔

اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ھذا کے کیے گئے ۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ھیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ھیں ، چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ھے ، اس لیے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے "۔ (۱)

یہ تذکرہ دو وجوہ سے غالب کے سلسلے میں اھمیت رکھتا ھے ۔ اول اس لیے کہ اس سے پہلے کسی اور تذکرے میں کلام غالب کا اتنا طویل انتخاب نہیں ملتا ۔ کریم الدین نے اس میں غالب کی گیارہ بارہ غزلیں نقل کی ھیں جو سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ھیں ۔ چونکہ یہ سارے اشعار غالب کے متداول دیوان میں موجود ھیں ، اس لیے ان کے نقل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ دوسری اھمیت یہ ھے کہ اس تذکرے کے ذریعے غالب کی ایک ایسی غزل کا سراغ لگتا ھے جو ان کے کسی مطبوعہ دیوان حتیٰ کہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ھے ۔ غزل یہ ھے :

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ھے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باھر
میں بھی ھوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں

شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ھستی سے ھوں بیزار ، کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ھی سے میں احوال گرفتاریٔ دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں

دل کے ھاتوں سے کہ ھے دشمن جانی میرا
ھوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ھوں اور ایک جہان ھے غماز
گوش ھیں در پس دیوار کہوں یا نہ کہوں

۱۔ گلدستۂ نازنیناں ، کریم الدین ، ص ۲۱۰ تا ۲۲۲ ، مطبع سلطانی دھلی ۱۸۴۵ء ۔

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

الہی بخش معروف نے غالب کی اس غزل پر خمسہ کہا ہے اور یہ خمسہ معروف کے ترجمے کے ذیل میں درج کیا گیا ہے (۱)۔ نسخہ عرشی (۲) میں یہ غزل دیوان معروف کے حوالے سے اور نسخہ' مالک رام (۳) میں دیوان معروف و گلدستہ' ناز نینان کے حوالے سے شامل کی گئی ہے ۔ معروف کے مطبوعہ دیوان میں بھی مذکورہ بالا خمسہ موجود ہے (۴) لیکن یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ غزل مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب کی ہے ۔ اول اس لیے کہ معنی اور اسلوب دونوں لحاظ سے غالب کے رنگ سے بالکل الگ ہے ۔ دوسرے یہ کہ مخمس کے سوا اس غزل کی تصدیق کسی اور ماخذ سے نہیں ہوتی ۔ نسخہ' حمیدیہ بھی اس سلسلے میں خاموش ہے ۔ کیا عجب کہ یہ غزل سید الملک نواب اسداللہ خان یا اسد تخلص کے کسی اور شاعر کی ہو ۔ اس خیال کو یوں تقویت پہنچتی ہے کہ اردو میں اسد اور غالب تخلص کے متعدد شعرا گزرے ہیں اور ان کی غزلوں کو غلطی سے مرزا نوشہ اسداللہ خان غالب سے منسوب کردیا گیا ہے ۔ (۵)

گلدستہ' نازنینان کے ساتھ قطب الدین باطن کے تذکرے کا ذکر بھی اس جگہ ضروری ہے ۔ ' گلستان بے خزاں ' کا تاریخی نام ' نغمہ' عندلیب ' ہے جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۶۴ھ نکلتا ہے ۔ غالباً یہ سال آغاز ہے ۔ حقیقتاً یہ تذکرہ ۱۲۶۵ھ میں مکمل ہوا ہے جیسا کہ خود باطن نے دیباچے میں لکھا ہے ۔ (۶)

۱۔ گلدستہ نازنینان ، ص ۱۹۱ ، مطبع سلطانی دہلی ۱۸۴۵ء

۲۔ دیوان غالب اردو ، نسخہ' عرشی ، ص ۲۹۸ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ، طبع اول ۱۹۵۸ء

۳۔ دیوان غالب اردو ، ص ۲۸۳ ، مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی

۴۔ دیوان معروف ، ص ۱۶۱ ، مطبع نظامی بدایون ، ۱۹۳۵ء

۵۔ علیگڑھ میگزین ، غالب نمبر ، ص ۹۶ ، مرتبہ مختار الدین احمد آرزو ، بابت ۴۸ - ۱۹۴۹ء

۶۔ نگار پاکستان ، ۱۹۶۴ء ، تذکروں کا تذکرہ نمبر ، ص ۷۷ ، مرتبہ راقم الحروف ۔

یہ تذکرہ دراصل گلشن بے خار کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ باطن نے اپنے دیباچے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ پر خاصی لعن طعن کی ہے۔ شیفتہ سے باطن کی مخاصمت کا اصل سبب یہ تھا کہ شیفتہ نے گلشن بے خار میں باطن کے استاد نظیر اکبر آبادی کے متعلق لکھ دیا تھا کہ ان کے جو اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں ، ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں ۔ (۱)

باطن نے اپنے تذکرے میں اس کا انتقام لیا اور شیفتہ کے استاد اور ممدوح حین کو جی کھول کر برا بھلا کہا ۔ شیفتہ نے مومن و آزردہ کی بڑی تعریفیں کی تھیں ۔ باطن نے دونوں کے کلام میں کیڑے نکالے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں غالب بھی ان کے طعن و تعریض کا نشانہ بنے ۔

باطن کا بیان خاصا دلچسپ ہے اور غالب کے کلام اور شخصیت پر جائز و ناجائز ، بہرحال اولین تنقیدی تحریر کی حیثیت رکھتا ہے :

''غالب و اسد تخلص ، اسداللہ خاں نام ملقب بمرزا نوشہ ۔ آپ دو تخلص کرنے ہیں کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں ۔ از نبائر غلام حسن کمیدان ۔ قبل اس سے جد دهلی [آگرہ] میں ان کی سکونت کا مکان ۔ استاد ان باشعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور هادی شعرا [نظیر] جو بے نظیر روزگار تھے، جن سے تعلیم پائی ۔ ایام صبا سے ببرکت انفاس متبرکہ ان استادوں کے بمرتبہ علم پہنچے ۔ تب ان کی فکر رسا نے یہ صورت دکھائی ۔ کیوں نہ خوش گو ہوں جن کے ایسے استاد دو ہوں ۔ متانت فحوائے کلام میں لا کلام ، کلام سے بنیاد سخن کو استحکام ، چونکہ وہ استاد مر گئے ، یہ جد دهلی سے ادھر گئے ۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں ۔ ہاں خود استاد ہیں ، مرغان مضامین کے صیاد ہیں ۔ ہاں ان کا فراخ حوصلہ ہے ، پھر تبختر کا کیا گلہ ہے ۔ گو فارسی میں متین ہیں ، پر اردو میں تو ذوق ہی نکتہ چین ہیں ۔ اب بعد وفات ذوق ان کو شاعری میں کمال ہو ، کلام ان کا سحر حلال ہو ، مگر زمانہ خالی نہیں کیا اور کسی کی طبیعت عالی نہیں ۔ غالباً جو کسی سے مقابلہ ہو تو حاکمان محکمہ شعر کے روبرو معاملہ ہو ۔ بندے کے والد مرحوم سے کمال ملاقات تھی اور از حد اتحاد کی بات تھی ۔

۱۔ گلشن بے خار ، ص ۲۳۱ ، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ، ۱۹۱۰ء

انتخاب زبان میں یکہ' دوراں ہیں ۔ جس طرف طبیعت آئی، اسی کی خاک اڑائی ۔ چنانچہ دختر رز سے جو تاک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ مینائے گردوں میں شراب شفق قاضی آفتاب بادب پیش کش لایا اور خمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میر بساط اور بکھڑے داؤں کھانے لگے ۔ ایسا کمال پایا ، شعر کم قدر ان کا کبھی کسی کی زبان سے نہ سنا ، نہ اپنی آنکھ سے دیکھا ۔ لفاظی اور جودت زبان فیض ترجمان سے عیاں ہے ، کلام شیریں وصف سرمہ چشم فرہاد میں ، جس نے سنا حلاوت سخن اور گلو گیری سرمہ سے یارائے صفت شعر نہ رہا ، گویا کہ وقت امتحان ہے ۔ کثرت عذوبت سے ہونٹ چپک گئے ۔ سرمے کی خاصیت سے زبان سیہ گو لال ہوئی ، عدو تھک گئے ۔ جو شخص ان کے کلام سے بہرہ ور ہوا ، بے ساختہ آفرین اور سبحان اللہ اس کی زبان پر ہوا ۔ چونکہ یارائے کام و دہان نہیں کہ منزل وصف میں قدم سر کرے ، لہذا راقم لجام توسن سبک تک کلک سوئے بادیہ مطلب پر کرے ۔ اب یہ دھلی والے ہیں اور بڑے ارادے والے ہیں ۔ شاید قدیم کی نظم و نثر کو خفیف جانتے ہیں ۔ غرور کی راہ چاہیں ، سو فرمائیں ، پر دل میں تو ان کا لوہا مانتے ہیں ۔ دھلی والے صاحب کسی کو اپنے روبرو خاطر میں نہیں لاتے ۔ مارے خودی و تبختر کے جی میں پھولے نہیں سماتے ، پر جب کسی سے مقابلہ ہو تو دم بھر میں فیصلہ ہو ۔

" ان کو شراب و کباب چاہیے ۔ خلاف شرع کا بے حساب چاہیے ۔ روزے کے نام سے انھیں کیا کام ، نماز کو ان کا ہر دم سلام ۔ اصحاب تذکرہ کی تحریر دیکھی اور ان کی تقریر دیکھی ، کیا غرور ہیں ، اپنے نزدیک کتنے دور ہیں ، یاران ہم صحبت ان سے زیادہ غرور میں چور ہیں ، گویا ان کے یار خوشامد کے مزدور ہیں ۔ دھلی والے صاحبوں کے تذکرے جو عبارت رکھتے ہیں ، متاع خیریت شعرائے ماضی و حال و مصنف کو غارت رکھتے ہیں ۔ ہیں ہیں باطن کدھر گیا ۔ جوش میں بھر گیا ۔ خبر دار ہوشیار ان کے اسد فکر کا نخچیر مضمون پر غلبہ ہے ، خمسہ ان کا شعر کا پنجہ ہے ، دیوان فارسی ضخیم ہے مگر اردو کا دیوان مانند آسد نامہ قلیل و قدیم ہے ۔ اسد فکر ایستان کاغذ میں ڈکارتا ہے ۔ روباہ مضامین کو نا حق جان سے مارتا ہے " (۱)

۱۔ گلستان بے خزان معروف بہ نغمہ' عندلیب ص ۱۷۱ تا ۱۷۳ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء

باطن نے نمونۂ کلام میں ذیل کے چودہ اشعار درج کیے ہیں:

یار غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

جراحت تحفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غم خوار جان درد مند آیا

کاوے کاوے سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

اسد زندانیٔ تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (۱)

تذکرۂ بہار بے خزاں (مولفہ احمد حسن سحر) میں بھی اسد تخلص کے ساتھ غالب کا ذکر آیا ہے۔ افسوس کہ اس کے تراجم اس وقت ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ نسخہ مولوی عبدالحی مولف ' گل رعنا ' کی ملکیت تھا، جسے ان کے بیٹے مولانا عبدالعلی ندوی نے کتب خانے کو دے دیا تھا۔ فہرست کتب میں اس کا نمبر ۳۴۳ ہے۔ اس کے ساتھ مصنف کا دوسرا تذکرہ ' طور معنی ' بھی مجلد ہے۔ اس تذکرے میں دیے ہوئے ایک قطعۂ تاریخ سے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۶۱ھ نکلتا ہے۔

مذکورہ بالا تراجم اور مباحث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آثار الصنادید مولفہ سر سید احمد خان سے بہت پہلے غالب کا ذکر ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد تذکروں میں آ چکا ہے۔ چنانچہ غالب کے اولین تعارف نگاروں میں سر سید نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر صراحت کی گئی ہے، علی الترتیب میر تقی میر، خوب چند ذکا، اعظم الدولہ سرور، مصطفیٰ خان شیفتہ، نواب ضیاالدین احمد خان نیر و رخشاں، کریم الدین، قطب الدین باطن اور احمد حسین سحر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ غالب کے سلسلے میں مختلف تذکرہ نگاروں کے تراجم اور سر سید کے ترجمے کی تاریخوں کی چھان بین کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ اور کئی تراجم سر سید کے ترجمے سے مقدم قرار پائیں۔

غالب کے بارے میں آثار الصنادید کا ترجمہ اس لحاظ سے البتہ نہایت

۱۔ گلستان بے خزاں معروف بہ " نغمۂ عندلیب " ص ۱۷۳، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ۱۲۹۱ھ

وقیع اور اہم ہے کہ یہ انیسویں صدی عیسوی کے ممتاز ترین ادیب اور مرزا غالب کے ایک معاصر دوست کا لکھا ہوا ہے ۔ لیکن افسوس کہ سر سید کا بیان غالب کے سلسلے میں یکسر رسمی ہے اور اس میں غالب کی زندگی یا کلام کے بارے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کی کسی معاصر تذکرہ نگار سے توقع کی جاتی ہے ۔

غالب اور سبک ہندی

لطیف اللہ

غالب کا ادبی عقیدہ تھا کہ ہندی نژاد فارسی شعرا و نثر نگار ایرانی نژاد شاعروں اور ادیبوں کے ہمسر اور ہم پلا نہیں بن سکتے - ان کے ذہن میں اس کی وجہ یہ تھی کہ اول الذکر صرف زبان دان ہیں جب کہ موخرالذکر اہل زبان ہیں ، ہندیوں نے کتابی فارسی پڑھی ہے اور ایرانیوں کے گوشت پوست میں فارسی زبان رچی بسی ہوئی ہے ، لہذا ہمسری و ہمتائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - اپنے بارے میں ان کا خیال تھا کہ فارسی سے ان کی طبیعت کو ایسے ہی تعلق تھا جیسے فولاد میں جوہر ہوتا ہے - انہوں نے اپنے متعدد خطوط میں اس ادبی عقیدے اور فارسی سے مناسبت طبعی کا ذکر کیا ہے - ' قاطع برہان ' کی اشاعت کے بعد سے ان کے عقیدے اور دعوے میں زیادہ شدت پیدا ہوگئی تھی - چنانچہ مرزا رحیم بیگ مولف " ساطع برہان " کو تحریر کرتے ہیں :

> " اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے ، میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے :
>
> ہر چہ از دست گہہ پارس بہ یغما بردند
>
> تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند
>
> زبان دانی فارسی میری ازلی دست گاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے - فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے - مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے - ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوشگو اور معنی یاب ہیں لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ

دعوی' زبان دانی کے باب میں ؟ رہے فرہنگ لکھنے والے ، خدا ان کے پیچ سے نکالے ' اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے ۔ وہ بھی نہ کوئی ہم قدم نہ ہمراہ ، بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ ۔ رہنما ہو تو راہ بتائے ، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے ۔ نہ آپ شیرازی نہ استاد اصفہانی ، زہے گردن و خمے دعوی' زبان دانی "۔

(خطوط غالب از مہر ، ص ۶۱۶)

زیر نظر مضمون میں غالب کے اس عقیدے اور دعوے کا مطالعہ کیا گیا ہے کہ وہ کس حد تک ان امور میں حق بجانب تھے اور اگر نہیں تو ان کی فارسی شاعری اور نثر کو بہ اعتبار زبان اور اسلوب کیا مقام دیا جا سکتا ہے ۔

جہاں تک اہل زبان اور زبان دان کے مسئلے کا تعلق ہے ، اس کا ایک پہلو خالص جذباتی نوعیت کا ہے ، جس کی اساس کسی علمی یا اصولی استنباط پر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اس کی بنا وہ قومی عصبیت ہے جس کا اظہار وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبے کے زیر اثر ہوتا رہتا ہے ۔ چونکہ اس رجحان کی بنیاد استدلال ، معقولیت اور علمی اصول پر نہیں ہوتی ، اس پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے ۔ دوسرا پہلو واقعتہً علمی نوعیت رکھتا ہے اور اس پر علمی انداز میں گفتگو کی جا سکتی ہے ۔

اصولی طور پر یہ امر کسی تکلف و تذبذب کے بغیر تسلیم کیا جاتا ہے کہ کسی خاص ملک کے باشندے اس ملک کی زبان کے رموز و غوامض سے جس قدر آگاہ ہوتے ہیں اور اس زبان کے لغات کا استعمال جس قدر صحت کے ساتھ کرتے ہیں ، دوسرے ملک کے باشندے ان خصوصیات کے حامل نہیں ہوتے ۔ یہی وہ فرق ہے جو اہل زبان اور غیر اہل زبان میں ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان کی تحریر و تقریر میں سادگی ، آمد اور حلاوت ہوتی ہے ۔ زبان کے بارے میں ان کا علم داخلی ہوتا ہے ، خارجی نہیں ہوتا ۔ اس کے برعکس غیر اہل زبان یعنی زبان دان کی تحریر و تقریر میں وہ خصوصیات نہیں ہوتیں جس کے باعث اسے مافی الضمیر بیان کرنے میں لا محالہ تصنع اور تکلف سے کام لینا پڑتا ہے اور زبان کے استعمال میں اس سے اصولی غلطیاں سر زد ہو جاتی ہیں ۔

اس خصوص میں غالب کے عقیدے کی بنیاد اصولی بھی ہے اور جذباتی بھی ۔

جذباتی رجحان میں شدت کا اظہار ' قاطع برہان ' پر اعتراضات کے بعد بار بار ہوا ہے اور اس رد عمل سے مترشح ہوتا کہ وہ اس مسئلے میں اہل ایران کی قومی عصبیت سے بڑی حد تک متاثر تھے اور ان ارباب قلم کی ہمنوائی کرتے رہے جنھوں نے برصغیر کے فارسی شعرا اور ادیبوں کو ایرانی شعرا اور ادیبوں سے کم تر خیال کیا ہے ۔ لیکن اصولی غور و فکر کے باوصف انھوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ برصغیر میں فارسی زبان کا چلن زبان اول کی حیثیت سے رہا ہے ۔ صدیوں تک یہاں فارسی زبان میں درس و تدریس ، تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں کوئی قرن ایسا نہیں گزرا جب ایران سے اہل سخن اور ارباب فضل و کمال کا برصغیر میں ورود ، مسدود ہوگیا ہو ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہزاروں خاندان اپنی آبائی زبان اور خاندانی روایات کے ساتھ دیار فارس سے وارد ہند ہوئے اور یہاں کی ادبی اور تہذیبی زندگی پر اثر انداز ہوئے ۔ زندگی کے انھی شعبوں میں فارسی شعر و ادب ، فارسی کی تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف کے شعبے بھی شامل ہیں ۔ اگر اس سماجی عمل کی گہرائی اور گیرائی کا مکمل غور و فکر کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو برصغیر میں فارسی زبان کا مسئلہ اس نوعیت کا مسئلہ نہیں رہتا کہ ایک خاص ملک کا باشندہ دوسرے ملک کی زبان کا علم حاصل کرنے کے باوجود زبان داں ہی رہتا ہے ۔ اگر یہ حقیقت صرف اس حد تک ہوتی تو برصغیر کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کا ہیولا قطعی طور پر بدلا ہوا ہوتا ، لیکن اصل حقیقت اس صورت حال سے یکسر مختلف ہے ۔

برصغیر ہند و پاک کی عملی و فکری تاریخ کا یہ بھی ایک روشن پہلو ہے کہ یہاں کے ارباب علم و فضل میں سے بیشتر کی زبان فارسی تھی جو انھیں نسلاً بعد نسل ورثے میں ملی تھی ۔ ان کی مجلسی زندگی میں تحریر و تقریر کی زبان بھی یہی تھی ۔ اردو کی حقیقی نشو و ارتقا سے قبل فارسی ہی زبان اول کی حیثیت سے رائج تھی ۔ یہاں کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بھی وہی تھا جو صدیوں تک خراسان اور فارس کے مکاتب میں رائج رہا ۔ ان حالات کے پیش نظر برصغیر میں فارسی زبان کا صحیح ذوق و وجدان پیدا ہوجانا ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے محالات عقلی میں شامل کیا جائے ۔ اس اعتبار سے ہندی نژاد فارسی شعرا اور ادیبوں کے باب میں غالب کا یکسر منفی نقطۂ نظر زیادہ غور و فکر پر مبنی نہیں ہے ۔ اصول کی حد تک اس خصوص

میں ایک نوع کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

ملک الشعرا محمد تقی بہار نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے ، وہ فرماتے ہیں :

" بنا برین در دهلی دربار بزرگ تر می شد که باید آن را دربار ثانی ایران نامید بلکه دربار اصلی ایران چه رواج فارسی زبان و ادبیات و علوم ، در دربار دهلی زیاده از دربار اصفهان بوده است و ظاهراً که در دربار اصفهان پادشاه و خاصان درگاه بزبان ترکی صحبت می فرموده اند ۔ ولے در دربار دهلی شاه دربار و حرم سرائیان همه به فارسی گفتگو می کرده اند و در آن عهد زبان فارسی در هند زبان علمی و زبان مترقی و دلیل شرافت و فضل محسوب می شد و دربار اصفهان هرگز زبان فارسی این اهمیت را پیدا نه کرد "۔
(سبک شناسی ، جلد سوم ، ص ۲۵۷)

ملک الشعرا بہار کی یہ رائے واضح اور ہر قسم کے ابہام سے معرا ہے ۔ اس قطعی رائے کے پیش نظر پاک و ہند میں فارسی زبان کی حیثیت سے متعلق بہت سے پہلو واضح ہوجاتے ہیں ۔ ہر چند کہ بہار نے پاک و ہند کے اہل علم و دانش کو زبان فارسی کا عیار کامل قرار نہیں دیا ہے ، تاہم بین السطور میں اس ذوق و وجدان کا حال معلوم ہوجاتا ہے جو پاک و ہند کے ارباب علم میں پیدا ہوگیا تھا ۔ اور اگر ذوق و وجدان زبان کے باب میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے تو غالب کا یہ ادبی عقیدہ کہ ہندی نژاد شعرا و نثر نگار (بہ استثنائے خسرو) پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں ، تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی تفہیم کے لیے معقول وجوہ درکار ہوں گی ۔

غالب نے یہ کہہ کر کہ " بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے " بہت بڑا دعوا کیا ہے اور اگرچہ انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اپنی نظم و نثر کے متعدد شاہکار پیش کیے ہیں با این ہمہ اہل زبان لے خواہ وہ عصر رفتہ میں پیدا ہوئے ہوں یا عصر حاضر میں موجود ہوں ، ان کے " ہندی مولد اور پارسی زبان " ہونے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے ۔ یہ نا پرسی ہنر غالب ہی پر موقوف نہیں بلکہ اہل زبان کی نظر میں برصغیر کے کسی بھی سخن ور اور ادیب کو جائے اعتبار حاصل نہ ہوسکی ۔ البتہ عہد حاضر میں تجدید روابط کے بعد دانشوران ایران نے اقبال کے فکر و فن کی ضرور پذیرائی کی

ہے لیکن خسرو، فیضی، بیدل، مظہر جان جاناں اور غالب نمایاں طور پر تحسین کے مرحلے میں نہیں آئے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے 'شعرالعجم' میں امیر خسرو سے متعلق ایک ایرانی شاعر عبید کا شعر نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر کے یگانۂ روزگار اہل کمال عرض ہنر کے باب میں کس قدر سوختہ اختر تھے:

غلط افتاد خسرو راز خامی	کہ سکباپخت در دیگ نظامی

حالانکہ ملا عبدالرحمان جامی نے 'بہارستان' میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ (شعرالعجم، حصہ دوم، ص ۱۲۸، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ء)

اس عصبیت کی تازہ ترین مثال دیوان امیر خسرو میں ہے جو حال ہی میں ایران سے شایع ہوا ہے اور جس میں فاضل مقالہ نگار نے " یکے از بزرگ ترین شعرائے فارسی " کے بجائے " یکے از بزرگ ترین شعرائے فارسی ہند " لکھا ہے۔

فیضی اپنی شاعرانہ استعداد اور خلاقانہ صلاحیت کے اعتبار سے فارسی شعرا میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کے قصائد و غزلیات حکیمانہ مضامین کے ساتھ ساتھ اپنا ایک خاص آہنگ اور لب و لہجہ رکھتے ہیں لیکن جلا لائے طبا طبائی نے عہد شاہجہانی کے مشہور ادبی نزاع سے متعلق فیضی کا جو خاکہ اڑایا ہے، وہ اس تعصب کو قطعی طور پر نمایاں کردیتا ہے جو اہل زبان کو غیر اہل زبان سے ہوتا ہے۔ یہ خط جلالائے طباطبائی نے شیدا ہیکروی کو تحریر کیا ہے جس نے حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے کلام پر بعض اعتراضات کیے تھے۔ غالب نے اردو خطوط میں دو جگہ (مرزا رحیم بیگ اور چودھری عبدالغفور سرور کے نام) اس خط کا حوالہ دیا ہے۔

طباطبائی کے خط سے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

" اے مدعی! پارۂ ایں قدر دریافت خود باید داشت کہ بر گفتۂ خرد منداں دلیرانہ گرفت کردن بے خردی است۔ و در سخن بزرگاں بے تامل سخن کردن کودک منشی و خردی۔ سامری گردیدن کلیم کلاماں سروش سرشت کہ ید بیضا از جیب دوات و آستین قلم بر می آرند، دلیل گو سالگی است۔

" ایں لہجہ دری از زبان پارسی ست۔ از افواہ پارسی داناں

بایدآموخت و چراغ سخن دانی از مشکواۃ اندیشہ' اینان باید افروخت ۔ از مطالعہ فرہنگ ہا تنہا فارسی زبان نہ توان شد ۔ و از تتبع دواوین قدما از پیش قدمان این وادی نہ توان گشت ۔ ظاہرا دریں معنی پیروی' یکے از سیاہ باطنان بوالفضول اس تیرہ مغاک نمودہ ، بہ زبان دہی و سر' بزرگی' دنیا با استادان سخن و امام الائمہ این فن مولانا عرفی شیرازی می گفتہ کہ ' ملا ما پارسی زبان از انوری و خاقانی آموختہ ایم و شما از پیر زالان مسکین ' و ندانستہ کہ انوری و خاقانی نیز از اینان سخن آموزی کردہ اند '۔

(دربار ملی ، مرتبہ شیخ اکرام ، ص ۲۸۰ - ۲۸۳)

اصولی طور پر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان سے متعلق فیہ اول میں اہل زبان کو معیار تسلیم کیا جائے گا اور ان کا فرمودہ مستند بھی ہوگا لیکن فیصلے کی صحت اس امر پر موقوف ہوگی کہ حکم متعصبانہ جذبات کی گرفت سے آزاد ہو اور یک طرفہ فیصلہ کرنے میں بے باک نہ ہو ۔

اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ ایران کے دانشوروں اور سخنوروں نے پاک و ہند کے فارسی شعرا اور نثر نگاروں کو وہ مقام نہیں دیا جس کے در حقیقت وہ مستحق تھے ، اور یہ انداز نظر اس حد تک بڑھتا گیا کہ دیار ہند کی فارسی نظم و نثر ایران کی فارسی نظم و نثر سے علاحدہ سمجھی گئی اور اسے ایسے خانے میں رکھا گیا جہاں تحسین کی نگاہ اور پسندیدگی کی نظر ڈالی ہی نہ جا سکے ۔ حضرت امیر خسرو اور فیضی سے متعلق دو مثالیں نظر سے گزر چکی ہیں ، خود غالب کے باب میں ایک شیرازی صاحب کا جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے سفر حج میں ہمسفر تھے اور جنھیں نواب موصوف نے غالب کا فارسی دیوان مطالعے کے لیے دیا تھا ، یہ خیال تھا :

" دریں خرافات اوقات ضائع نہ کنیم ۔ ما نمی دانیم کہ درکدام زبان این دیوان گفتہ شدہ است "۔ (۱)

جیسا کہ عرض کیا گیا ابتدا ہی سے اس مسئلے میں نمایاں تعصب کارفرما رہا ہے اور اسی سبب سے برصغیر کی فارسی نظم و نثر کے طرز اسلوب کو ' سبک ہندی ' کہا جانے لگا ۔ ملک الشعرا بہار اور ڈاکٹر رضا زادہ شفق

۱۔ محمد حسین آزاد ، حیات اور تصانیف ، ڈاکٹر اسلم فرخی ، ص ۳۰۳

نے سبک ہندی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ، وہ من و عن پیش کی جاتی ہیں ۔
بہار نثر ہائے ہندی کے زیر عنوان لکھتے ہیں :

" این بوده حالت نثر در ایران و بعینه همین بود حالت نثر در هندوستان ۔ جز این که فضلا و علمائے هندی در اظهار فضیلت زیاد تر از منشیان و نویسندگان ایران می کوشیده اند ۔ در مناشیر و مکاتیبے که رجال هند به رجال ایران نوشته اند و در سفینه ها یافت می شود معلوم است که نویسندهٔ مقیم هند بیشتر می خواهد ، اظهار فضل کند و کمتر مطلب بیان کردنی دارد ۔ یا اگر دارد بجائے این که حرفے خود را نویسد از در و دیوار صحبت داشته و کلماتِ مناسب فضل فروشی خود بدست آورده است نه مناسب مطلبے که باید نویسد ۔ همین حالت را در شعر هندی می بینیم و به جز صائب که گاہے از واقعات سخن می گوید باقی شعرا مخصوصاً متاخران از قبیل بیدل و غنی مقصد شان آوردن عباراتِ است که با صنعت و مضمون جو بیاید نه با مقصودے که دارند و غالباً مقصودے هم نه داشته اند " ۔

(سبک شناسی ، جلد سوم ، ص ۲۰۹)

ڈاکٹر رضا زادہ شفق تحریر فرماتے ہیں :

" سبک غیر طبیعی دورهٔ مغول در زمان صفویه به نهایت انحطاط رسید ۔ استعمال ترکیبات غریب و کلمات نامانوس و جناس هائے تو در تو و نکته گوئی ها مرعج و نازک کاری و مضمون آفرینی و معانی پیچیده باریک بیشتر رائج گشت ۔ مخصوصاً شعرائے مقیم هند در این طرز افراط کردند و در نتیجه سبک متکلف مضمون پرست مصنوعی به میان آمد که آن را برخے سبک هندی می نامند ۔ ولے سبک هندی در مقابل این افراط هنر نمائی هم کرد و اکثر مضامین پیچیده مصنوعی مبالغه دارند ۔ مانند بیتے که در ذیل می آید ، ایجاد نمود مضامین لطیف دل نوازے هم نظیر مثال هائے که در ذکر صائب و معاصرینش درین کتاب آروده شد بوجود آورد ۔ مثلاً در این بیت که نمونه ایست از سبک مذکور ۔

شمع را بر سر نمی دانم هوائے روئے کیست
بوئے گل می آید از دود پر پروانه هم

محبوب به قدرے گل اندام است که تنہا ہوائے او در سر شمع آں را بطورے معطر می کند که دود ہر پروانه که در آتش آں سوخته بوئے گل می آید ۔ انصافاً در ایں بیت باوجود ایں که مضمون لطیفیست در نازک کاری و باریک اندیشی اغراق و مبالغه پیش از حد به کار رفته با ایں حال چناں که اشارت رفت لطائف و ہنر نمائی شاعران ایں سبک را نباید از نظر دور داشت " ۔

(تاریخ ادبیات ایران ، ص ۳۸۵)

ان طویل اقتباسات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اسلوب اور طرز ادا کے بارے میں ہے ۔ زبان سے متعلق ان میں کوئی وضاحت یا اشارہ تک نہیں ہے ۔ اسلوب اور طرز ادا کے باب میں اگر غور کیا جائے تو جن معائب کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی شاعران ہند کے پیدا کردہ نہیں ہیں ۔ نثر ہائے منشیانہ یا مثالیہ اور خیال بند شاعری کی بدعت ایران سے ہندوستان پہنچی اور اہل ہند نے جیسا کہ بہار اور شفق نے خیال ظاہر کیا ہے ، اس میں افراط نہیں کیا بلکہ اس اسلوب خاص کے جملہ امکانات اجاگر کیے ۔ اب یہ علاحدہ بات ہے کہ جس اسلوب کی ابتدا ایران میں ہوئی وہ اپنی ساخت میں غیر طبیعی یا مصنوعی تھا ۔ پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ سعدی ، حافظ اور خسرو ایک ہی طرز کے سخن ور تھے ۔ بابا فغانی ، عرفی ، نظیری اور فیضی کا اسلوب شعر جدا جدا نہ تھا ۔ ملا نورالدین ظہوری ، طغرا مشہدی ، ابوالفضل اور بیدل کی انشا کی خصوصیات اصلیت کے اعتبار سے یکساں ہیں (غالب سے متعلق بحث آگے آئے گی) کلیم ہمدانی ، طالب آملی ، صائب تبریزی ، جلال اسیر ، شوکت بخاری ، غنی کاشمیری ، ناصر علی سرہندی ، غنیمت کنجاہی ، عبدالقادر بیدل ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ ایک ہی طرز و انداز کے عادی تھے ۔ تاریخ ادبیات فارسی کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں ہے کہ سعدی ، حافظ ، بابا فغانی ، عرفی ، نظیری ، ظہوری ، طغرا مشہدی ، کلیم ، طالب اور صائب سب کے سب خاک ایران سے اٹھے تھے ۔ ان کے شیوۂ سخن و انشا کو ہندیوں نے نہ صرف اپنایا تھا بلکہ اس میں امکانی حد تک اضافے بھی کیے تھے ۔ ان اہل سخن کے عہد میں جو طرز ادا مقبول ہوئی وہی ایران اور بر صغیر میں رائج رہی ۔ ان حقائق کے پیش نظر ' سبک ہندی' کی تخصیص منصفانہ اور معقول نہیں ہے ، بلکہ اصل مسئلہ فارسی نظم و

نثر کے مختلف اسالیب بیان کا ہے ۔

نثر ہائے منشیانہ میں تصنع ، مضمون آفرینی ، نازک کاری اور فضل فروشی کا مسئلہ تاریخی اور تہذیبی نوعیت کا ہے ، اسے محض سبک ہندی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔

تاریخ ادبیات میں یہ امر مسلمات متعارفہ سے ہے کہ دور اول میں نظم و نثر میں سادگی ، اصلیت اور بے ساختہ پن ہوتا ہے، جذبات و خیالات کامل خلوص اور صداقت کے ساتھ معرض اظہار میں آتے ہیں اور یہی خصوصیت متقدمین کا طرہ امتیاز ہوتی ہے ، اس کے بعد متوسطین کے دور میں ابلاغ و اظہار کے سانچے بدلتے ہیں ۔ اگلے جن مضامین کو باندھ گئے ہیں ، متوسطین انھی مضامین میں جدتیں پیدا کر کے اپنے دور کی خصوصیات متشکل کرتے ہیں ۔ اس دور میں زبان ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اپنے اندر وسعت پیدا کرتی ہے اور ہر قسم کے مضمون کو نئی نئی صورتوں سے پیش کرنے کے امکانات ظاہر کرتی ہے ، متوسطین کے دور کی نمایاں خصوصیت ندرت اظہار اور جدت بیان ہوتی ہے جو متاخرین کے عہد میں درجہ دوم کے شعرا اور ادیبوں کے ہاں مضحکہ خیز انداز اختیار کرلیتی ہے ۔ اس بظاہر ناہموار پہلو کی وجہ بھی یہی ہے کہ متاخرین کے دور میں کہی ہوئی باتوں میں جدتیں پیدا کرنا سخت مشکل ہو جاتا ہے جسے وہ تکلف اور تصنع کے زور سے پورا کرتے ہیں اور یہ حالت بھی دوامی نہیں ہوتی ۔ بعد کے آنے والے ادیب و شاعر زبان اور اسالیب میں انقلاب لاتے ہیں اور اسے ہر لمحہ بدلتے ہوئے سماج کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں ۔ فارسی ، اردو اور ہندی ادب ان تمام مراحل سے گزر چکے ہیں اور اب زندگی کے تقاضوں کو خوش اسلوبی سے پورا کر رہے ہیں ۔ اگر ملک الشعرا بہار اور ڈاکٹر رضا زادہ اس نقطہ نظر سے ہندوستان میں فارسی ادب کے مسئلے پر غور کرتے تو شاید ان کا نتیجہ فکر بدلا ہوا ہوتا ۔

علاوہ ازیں دانشوران مذکور کے نتیجہ فکر کو بعینہ تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سبک منشیانہ میں افراط کا سبب ہندیوں کی بے راہ روی نہیں ہے ، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ عہد صفویہ میں فارسی زبان کا مستقبل ایران کی بجائے بر صغیر سے وابستہ ہو گیا تھا ۔ خود بہار کے قول کے مطابق صفوی شاہان ایران اور ان کے عمائد دربار ترکی زبان کے دلدادہ تھے ۔ اس کے برعکس زبان فارسی شاہان ہند اور امرا کی مجالس کی

زینت بن گئی تھی ۔ اس لیے ایران کے شعرا اور ادیب دیار ہند کا رخ کرنے پر مجبور ہوئے جہاں ان کی خاطر خواہ قدر دانی اور سر پرستی ہوئی ۔ کبھی ان کے منہ کو بیش بہا زر و جواہر سے بھرا گیا اورکبھی ایک قصیدے کے صلے میں شاعر کو روپوں میں تلوا کر سارے روپے انعام کردیے گئے ۔ اگر ظہوری ، عرفی ، نظیری ، طالب اور کلیم کی ایسی ہی قدر و منزلت ایران میں کی گئی ہوتی تو ظاہر ہے نہ وہ اتنا رنج سفر اٹھاتے نہ خاک ہند کا پیوند بنتے ۔ ایسی صورت میں ان کے اسالیب بیان خاک ایران کی ادبیات ہی کا حصہ رہتے ۔ ان حالات کے بعد برصغیر میں فارسی نظم و نثر کی جو صورت ہوتی وہ خالصاً بر صغیر کے فارسی ادب کا نمونہ کہلاتی ۔

غالب کے سلسلے میں یہ طویل بحث اس لیے ناگریز تھی کہ ان کا تمام سرمایہ نظم و نثر اسی زبان میں ہے جو شاہان ایران اور مغولان ہند کے درباری شاعروں اور ادیبوں کے اظہار فن کا ذریعہ تھی ۔ انہوں نے ان تمام اسالیب میں طبع آزمائی کی جو سعدی اور حافظ کے عہد سے عرفی ، نظیری اور صائب کے دور تک معروف و مقبول سمجھے گئے ۔ اس ذوق و وجدان کے توازن کو انہوں نے ملکہ فطری اور عطیہ خاص من جانب اللہ کہا ہے ۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ غالب کو ' فارسی نویسان ہندی ' سے جو کد اور اختلاف تھا اس کا سبب بھی یہی تھا کہ ان میں سے بیشتر حضرات فارسی زبان کے مزاج اور خمیر سے گہری واقفیت نہ رکھتے تھے اور ان سے فارسی روزمرہ اور محاوروں کی غلطیاں سرزد ہوجاتی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ غالب جیسے مزاج کا شاعر اور ادیب اس بے تکے پن کا کیسے روا دار ہوسکتا تھا ، البتہ غالب کے حد سے بڑھے ہوئے منفی رویے کو معقول اور مناسب نہیں کہا جاسکتا ، ورنہ جہاں جہاں انہوں نے معقول انداز اختیار کیا ہے اور علمی سطح پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے ، وہاں ان کی ذہانت اور عرفان فن کی داد دینی پڑتی ہے ۔ اس خصوص میں غالب نے اپنے شاگردوں ، دوستوں اور استفسار کرنے والوں کو بہت سے خطوط لکھے ہیں ۔ اس مقام پر ان کا اعادہ طوالت مضمون کے باعث نظر انداز کیا جاتا ہے ، تاہم اگر کوئی صاحب اس بحث کے تکملے کے لیے ان تحریروں کو دیکھنا چاہیں تو غلام حسنین قدر بلگرامی ، صاحب عالم مارہروی اور چودھری عبد الغفور سرور کے نام خطوط ملاحظہ فرما سکتے ہیں ، جن میں غالب نے فارسی نویسان ہندی بالخصوص قتیل کی زبان

اور شیوے کے بارے میں غلطیوں کی نشاندھی کی ہے اور لغت نگاروں کے قیاس کی ' ھندی کی چندی ' بیان کی ہے ۔

اس امر کا اعادہ بھی ضروری نہیں ہے کہ غالب فارسی زبان و ادب کا ستھرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے طبیعت بھی معنی یاب پائی تھی۔ وہ عمدہ نثر لکھنے اور اچھا شعر کہنے کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے ۔ عمدہ نثر اور اچھے شعر سے مراد وہ نظم و نثر ہے جو اپنے عہد کے فنی معیار کے مطابق ہوں ، جنھیں پڑھنے کے بعد قاری کو حیات و کائنات کے بارے میں بصیرت حاصل ہو اور جس کے اظہار میں شاعر و ادیب کی ذات ' شخصیت اور اس کا منفرد انداز فکر نمایاں ہو۔ غالب اپنے فن اور اسلوب کا گہرا ادراک رکھتے تھے اور انھیں اپنے فن کے اظہار پر غیرمعمولی قدرت حاصل تھی۔ زیادہ تفصیل تو غیر ضروری ہوگی ، صرف چند مثالوں سے غالب کی فارسی نظم و نثر کے لب و لہجہ اور اسلوب کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس مطالعے کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ چند ایرانی اور ھندی نژاد شاعروں اور نثر نگاروں کے کلام سے اقتباس اور اشعار درج کیے جائیں ، اس کے بعد غالب کا نمونۂ کلام پیش کیا جائے اور معانی و بیان کی بحث سے قطع نظر ، لب و لہجہ اور آھنگ سے متعلق اظہار خیال کیا جائے ۔ یہ اس لیے کہ اس جانچ کے بعد غالب کے ادعا کا فیصلہ ہوسکتا ہے ۔ پہلے نثر کے نمونے ملاحظہ ہوں :

ملا نورالدین ظہوری ، دیباچہ کتاب نورس :

" سرود سرایان عشرت کدہ' قال ، کہ بہ نورس سرابستان حال، کار کام و زبان ساختہ ، بہ شہد ثنائے صانعی عذب البیان اند ، کہ چاشنیء نغمہ ھائے شیریں در رگ و پے نے دوانیدہ و خوانفسان چمن نشاط کہ بسط بساط انبساط پرداختہ ، بہ زلال حمد خالقی رطب اللسان اند ، کہ گل ترانہ ھائے تر از شاخسار صوت و صدا دمانیدہ ، محمل شوق حجازیانش بہ صدائے تال ھندیاں رنگہ بند ، و زخم جگر عراقیانش بہ نمک تار عنبور ترکاں در شکر خند ۔ جلاجل اوراق درختاں بہ ھوائے او ترانہ ریز و بلبلاں منقار ھلیلاں بہ نوائے او نغمہ خیز "۔ (دربار ملی ، ص ۲۲۷)

طغرا مشہدی ، تخت طاؤس ، رسالہ جلوسیہ :

" حبذا تختے کہ چوں زرگر قضا بہ جواھر کاریش دست بردہ ۔

فیروزۂ جوہری پسند نہ چرخ را مصالح یک پایۂ آں شمردہ ۔ اگر موج گوہرش بہ طوفان نوح قطرۂ آشنائی داشت ، از بیگانگی تنزل آب او را بہ خاک یکساں نمی گزاشت ، طائران ایں گلشن جواہر ، چوں بال و پر افشانی کشایند در صحن ہوائے بارگاہ ارم ذات العماد طرح نمایند ۔ آفتاب کہ درہمہ جا بہ کیمیاگری انگشت نما گشتہ است عمرش در طلا سازیٔ ایں تحت آسماں پایہ گزاشتہ است ۔ اگر ماہ جہاں بیں را پائے بوسیٔ ایں سریر معلیٰ دست داد ، نیلمش را بہ جہت اوج روشنی چوں مردمک بر چشم می نہاد "۔

(دربار ملی ' ۷۸ - ۲۷۷)

فیضی ، مکتوبات بہ مولانا عبدالحق محدث :

" خط محبت نمط ، مسرت پیرائے خاطر مستہام شد و رائحہ آشنائی بہ مشام وداد آمد ۔ چہ بہ خدمت اخوت پناہ اتقیا کہ بہ فضائل کسبی و کمالات وہبی متجلی اند نسبت ارتباط صوری و معنوی در درجہ علیا واقع است ۔ و ازیں خط سر کمال جوہر ذاتی و صفاتی فطری ظہور یافت ۔ و از ورقات اشعار احتظاظ روئے نمود ، مناسبت تمام یافت ۔

مسافران طریقت ز من جدا مشوید
کہ دور بینم و چشمم بہ منزل افتاد است

چور یگ بادیہ گم باد آں کہ قافلہ را
نشان منزل مقصود دور دور دھد

" بہ مرغان بستان معنی ہمداستان بودن لازم است ۔ گرد ایں راہ خال رخسارۂ طالبان ایں منزل باد ۔ استفسار از احوال برادر گرامی نمودہ اند ۔ بصحت و حضور و عشرت و سرور از بزم نشینان نواب مستطاب سپہ سالارے امیرالامرائے خان خاناں اند ۔ عجب کہ جاذبۂ محبت ایشاں نمی کشند البتہ خود را بہ رسانند و کامیاب نعم ظاہری و باطنی شوند "۔

(دربار ملی ، ص ۱۷۸)

مرزا محمد حسن قتیل ، رقعات قتیل ، بنام خواجہ امامی :

"منشی صاحب والا قدر سلکم اللہ تعالیٰ ۔ عجب مسودہ نوشتہ اید

کہ ملا ظہوری باید کہ درس آن از خدمت صاحب استفادہ نماید ۔ بہ شرط فرصت در یک روز تماشش را می توانم دید و اصلاح کرد ۔ لیکن دریں روز ہا کہ ضیق فرصت ست ، دو سہ روز خواہد کشید ۔ مختصر آن کہ غزل عمومیٔ شما می رسد ۔ باید رسانید و دو غزل نو کہ دی روز چاویدہ ام بہ خدمت فرستادہ شد ۔ نقل آن بردارید و ایں کاغذ را نگاہ دارید و بر کاغذ جداگانہ ایں دو غزل و سہ غزل دیگر کہ پیشتر بہ خدمت رسیدہ است اوشتہ بگزارید ۔ من از دست مرزا جی نجات یافتہ نزد شما می آیم و ایں کاغذ و آں کاغذ ہر دو را خواہم گرفت ۔ و جناب برائے شما وقت شام شیر فالودہ درست کردہ اند ۔ شاید دو گھڑی پیش از شام برسد" ۔

(رقعات قتیل ، ص ۲۳ ، مطبوعہ نول کشور ، ۱۸۸۷ء)

غالب ، مہر نمیروز :

" اگر چناں کہ بہ دوران توام ، بہ روزگار فرزانہ جمشید بودمے ، جمشید روزگار را آفریں گفتے ۔ و اگر بداں ساں کہ ثنا خوان شہر یارم ، فرخ فریدوں را ستودے فریدوں چرخ و ستارہ را گرد سر گشتے ۔ دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت و ژند آورد اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے آذر از بیم من زبانہ نزدے ۔ و از دلفریبیٔ بیان من کس بہ شنیدن ژند لہ پرداختےمن بدیں فرخی بخت کہ چوں تو خداوندگار فرمائے دارم ہر قدر برخویشتن بنازم جا دار و سرت گردم تو نیز بدیں گرمیٔ ہنگامہ بناز کہ ہم چو غالب آتشیں نوائے داری ۔ اگر بہ اندازۂ ہنر داد التفات می دہی جائے مردمک دیدہ بہ من باز گزار و در دل بروئے من بکشائے ۔ گویند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی بہ فرمان آں خسرو دریا دل کلیم را صدرہ بہ سیم و زر و لعل وگوہر سفتہ اند من آں خواہم کہ دیدہ و راں را دستوری دہی تا از کشش نرنجند و یک بار گفتار مرا با کلام کلیم بہ سنجند"۔

(مہر نمیروز ، ص ۱۶ - ۱۵ ، لاہور ۱۹۱۴ء)

اس تقابلی مطالعے میں دو ایرانی اور غالب سمیت تین ہندی نژاد

انشا پر داز شامل ہیں ۔ اس ' بزم مقابلہ ' میں ان ادیبوں کے علاوہ دیگر اہل کمال بھی شریک ہو سکتے تھے لیکن انہیں محض اس خیال سے چھوڑ دیا گیا کہ غالب کے ادعا سے متعلق اس محدود شمولیت سے وہی مدد لی جاسکتی ہے جو غیر مشمول حضرات کے شامل کرنے سے لی جاسکتی تھی ۔

مذکورہ نثری اقتباسات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہوری اور طغرا مشہدی کا نثری اسلوب اپنے لب و لہجہ اور آہنگ کے اعتبار سے ولولہ انگیز اور عصری تہذیب کے رجحانات اور ادبی ذوق کی غمازی کرتا ہے ۔ ایک خاص قسم کی صنعت کاری اور پیچیدگی خیال کے باوجود یہ اسلوب اپنی ادبی قدرو قیمت رکھتا ہے ۔ با ایں ہمہ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ظہوری اور طغرا کا فن ذہنی انبساط کے علاوہ قلبی کیفیات کا آئینہ دار نہیں ہے ۔ لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ یہ دونوں انشا پرداز اہل زبان ہیں اور اس لیے ان کے لب و لہجہ کے معیاری ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ فیضی کی نثر اپنے توازن اور اعتدال کے با وصف اس کی پر وقار اور عالمانہ شخصیت کو نمایاں کرتی ہے ۔ اس کے لب و لہجہ میں سنجیدگی اور متانت کا ادراک کیا جاسکتا ہے ۔ فیضی کے اسلوب میں نثر منشیانہ کی وہ قباحتیں بھی محسوس نہیں ہوتیں جو ارباب نقد و نظر کو تنقیص پر آمادہ کریں ۔ فیضی ہندی نژاد ہونے کے باوجود فارسی زبان کے مزاج سے آشنا معلوم ہوتا ہے ۔ قتیل کی نثر ٹھیٹھ ہندیت کی عکاس ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیالات اردو زبان سے فارسی زبان میں تبدیل کیے گئے ہیں ، قتیل کی نثر میں وہ فطری روانی اور لغمگی بھی محسوس نہیں ہوتی جو شخصی اسلوب اور لب و لہجہ کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ یہ نثر انتہائی بے رنگ ، بے کیف اور خیال کی رعنائی سے معرا ہے ۔

غالب کی نثر میں اُن تمام روایات کا عکس نظر آتا ہے جو بر صغیر میں ظہوری کے عصر سے خاص رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہوئی آگے بڑھیں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کو ورثے میں ملیں ۔ ان کی نثر میں مختلف اسالیب کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ انفرادی رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے ۔ ان کا لہجہ اہل زبان کے لہجے کی مانند فطری ہے اور اس مشق و ریاض کی غمازی کرتا ہے جس کے بغیر فن کار کو عظمت دوام حاصل نہیں ہوتی ۔ غالب کی نثر فارسی زبان کے مزاج سے کلی طور پر ہم آہنگ ہے اور ان کی

آزاد فکر کی نشاندھی کرتی ہے ۔ ان کے لب و لہجہ سے ان کی جاذب نظر شخصیت کا اظہار ھوتا ہے ۔ ان کی آواز بلند ، باوقار اور توانائی کا احساس دیتی ہے ۔ یہ غالب کا ذاتی آھنگ و اسلوب ہے جو عہد مغلیہ کی تہذیبی زندگی اور ادبی روایات کا امین ھوتے ھوئے نئے تجربوں کی جانب راہ نمائی کرتا ہے ۔ یہ عظمت فن جہاں تک عہد مغلیہ کا تعلق ہے غالب کے علاوہ ھندی نژاد نثر نگاروں میں کسی کے ھاں نظر نہیں آتی ۔ اس حد تک غالب کا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے ۔

آخر میں عہد مغلیہ کے چند فارسی شعرا کا نمونہ کلام تقابلی مطالعے کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے ۔

جمال الدین عرفی شیرازی :

کوئے عشق است ھمہ دانہ و دام است اینجا
جلوہ مردم آزاد حرام است اینجا

ھر کہ بگزشت دریں کوئے بہ بند افتاد است
طائر بے قفس و دام کدام است اینجا

در حرم ذکر بت دیر نشیں خاص من است
للہ الحمد کہ ایں زمزمہ عام است اینجا

بیا اے شوق و دست رغبتم سوئے گریباں بر
کہ بے تابانہ پیراھن دریدن آرزو دارم
بیا اے عشق و رسوائے جہانم کن کہ یک چندے
نصیحت ھائے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

حرم پویاں درے را می پرستند فقیہاں دفترے را می پرستند
گروھے زشت خویند اھل دانش کہ زیب وزیورے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ابوالفیض فیضی :

ھوائے عشق مرا تازہ در دل افتاد است
نظر کنید کہ دریا بہ ساحل افتاد است

مسافران طریقت زمن جدا مشوید
که دور بینم و چشمم به منزل افتاد است
نگاه همت فیضی به سوئے صید کهیست
که صد هزار همانیم بسمل افتاد است

اے هم نفسان محفل ما　　رفتید وائے نه از دل ما
ما دست ز غم نهاده بر سر　　غم هائے فشرد در گل ما

این چه مستی ست که بے باده و جام است اینجا
باده کز جام بنوشند حرام است اینجا
اے که از بادهٔ عشق خبر می پرسی
هائے بردار که کونین دو گام است اینجا
زاهدا منتظر چشمهٔ کوثر منشیں
که به یک جرعهٔ مے کار تمام است اینجا

محمد حسین نظیری نیشاپوری :

از کف نمی دهد دل آسان ربوده را
دیدیم زور بازوئے نا آزموده را
من در پئے رهائی و او هر دم از فریب
بر سر گره زند گره ناکشوده را
تامنفعل ز رنجش بے جا نه بینمش
می آرم اعتراف گناه نه بوده را

کجا ز عشوهٔ آں چشم نیم باز رهیم
که فتنه خاسته از خواب و هائے ماخفت است
شب امید به از صبح عید می گزرد
که آشنا به تمنائے آشنا خفت است

چه خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن
سخن گزشته گفتن گله را دراز کردن

گہے از نیاز پنہاں نظرے بہ مہر دیدن
گہے از عتاب ظاہر نگہے بہ ناز کردن
تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بہ ما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

مرزا عبدالقادر بیدل :

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سروسمن در آ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن در آ
پئے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمت جستجو
بہ خیال حلقۂ زلف او گرہے خور و بہ ختن درآ
نفست اگر نہ فسوں دہد بہ تعلق ہوس جسد
زہے دامن تو کہ می کشد کہ دریں رباط کہن درآ

بہ گلشنے کہ نگاہت نشاند دامن ناز
چو لالہ دیدۂ نرگس ز سرمہ لبریز است
ز فیض چاک دل انداز نالۂ داریم
چو غنچہ تنگ مشو مرغ ما سحر خیز است

مرزا محمد حسن قتیل :

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت
خود سوئے ما نہ دید و حیا را بہانہ ساخت
دستے بدوش غیر نہاد از رہ کرم
مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت
رفتم بہ مسجدے پئے نظارۂ رخش
دستے بہ رخ کشید و دعا را بہانہ ساخت

غم عشق تو پایانے نہ دارد چہ درد است ایں کہ درمانے نہ دارد

جنوں را گو کہ سوئے ما نیاید کسے اینجا گریبانے نہ دارد
اثر در گریۂ مجنوں مجوئید کہ لیلیٰ چشم گریانے نہ دارد

غالب :

بہ وادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت ست
بہ سینہ می سپرم راہ گر چہ پا خفت ست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت ست
دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفت ست

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامید نیم
ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر

بہ جنگ باج ستانان شاخساری را
تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم
بہ صلح بال فشانان صبح گاہی را
ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم
بہ من وصال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

مذکور الصدر شعرا کے کلام پر اظہار خیال سے قطع نظر کرتے ہوئے غالب کے فارسی کلام سے متعلق وہی باتیں کہی جاسکتی ہیں جواں کی نثر کے اسلوب کے بارے میں کہی گئی ہیں ۔ غالب کا فارسی کلام اپنے آہنگ اور اسلوب کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس اسلوب کی سب سے

نمایاں خصوصیت الفاظ کا صحیح اور بر محل انتخاب ہے۔ غالب ایسے الفاظ منتخب کرتے ہیں جو ترنم ، نغمگی اور موسیقیت سے لبریز ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ اس اعتبار سے غالب کا لب و لہجہ بناوٹی اور مصنوعی معلوم نہیں ہوتا۔

با ایں ہمہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کا مولد و منشا بھی وہی ہندوستان ہے جس میں ناصر علی، غنیمت ، واقف اور قتیل پیدا ہوئے لیکن غالب نے جس انداز سے فارسی زبان کے ذوق اور مزاج سے آگاہی کا ثبوت مہیا کیا ہے ، یہ حضرات اس انداز سے ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس قبیل کے ہندی شعرا پر غالب کا اعتراض غلط معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ غالب ، سعدی و حافظ کی سی اہمیت اور منزلت کے شاعر نہیں ہیں لیکن انھیں فارسی شعرا کی اس صف میں ضرور جگہ دی جاسکتی ہے جہاں بابا فغانی ، عرفی ، نظیری اور ظہوری نظر آتے ہیں۔ یہ استحقاق تو خود انھوں نے بھی ظاہر کیا ہے:

نہ گویم تازہ دارم شیوۂ جادو بیانان را
ولے در خویش بینم کارگر جادوئے آنان را

مضامین سلیم

مولانا وحیدالدین سلیم کے وہ تمام علمی ، ادبی اور مذہبی مضامین جو مختلف علمی و ادبی جرائد میں شائع ہوئے تھے اور اب تک کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آئے تھے ، انھیں مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے تین جلدوں میں مرتب کر دیا ہے ۔ چند اہم مضامین یہ ہیں :

جلد اول :

—— اردو شاعری کا مطالعہ
—— سچی شاعری
—— زندہ قوم کی علامت
—— فلسفۂ تاریخ پر ایک سرسری نظر
—— مسلمانوں کا تمدن

قیمت : چار روپے پچاس پیسے

جلد دوم :

—— ابن جبیر اور اس کی سیاحت
—— شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم
—— طبیعیات اور اہل اسلام
—— جنگ طرابلس کی ایک دلچسپ کہانی
—— یونانیوں کی بہشت

قیمت : چار روپے

جلد سوم :

—— شاعرانہ خیالات
—— تنہائی کے فوائد
—— حقیقی خوش نصیبی
—— عجائبات قدرت

قیمت : چار روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ ، کراچی

غالب کا الحاقی کلام — ایک داستان

جلیل قدوائی

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک
(حالی)

غالباً ۱۹۲۳ع کا واقعہ ہے، میں علی گڑھ میں ایف اے کی جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے عزیز دوست خواجہ مسعود علی ذوقی (۱) اور میں چھٹیوں میں عموماً ایک ساتھ سفر کرتے تھے۔ میں راستے میں اناؤ اپنے سابق وطن یا کانپور جہاں میرے اعزا رہتے تھے، ٹھہر جاتا اور وہ آگے براہ لکھنؤ اپنے مستقر گونڈہ چلے جاتے۔ کبھی وہ کچھ دن میرے ہمراہ ٹھہر کر گونڈہ جاتے، کبھی ہم دونوں اپنے اپنے مستقروں پر کچھ دن قیام کرکے لکھنؤ میں جمع ہو جاتے۔ اسی زمانے میں انہوں نے مجھے وصل بلگرامی مرحوم سے ملایا (۲)

۱- اپنے زمانے کے بے حد ذہین طالب علموں اور ترقی پذیر افسانہ نگاروں اور شاعروں میں تھے۔ غزل سے زیادہ نظم سے دل چسپی رکھتے تھے۔ اب منقار زیر پر ہیں۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے، پھر یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں رہے۔ اب وہیں شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔

۲- ویسے غالباً ۱۶ - ۱۹۱۵ء میں جب میں گیارہ بارہ برس کا تھا اور ہردوئی (اودھ) کے ہائی اسکول میں چوتھی یا پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، انہیں مولوی نورالحسن نیر، وکیل (بعدہٗ صاحب نوراللغات) کے ہاں جہاں میں

(جاری)

جو کچھ دن پہلے گورکھپور میں مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم (۱) کے حسن سلوک سے فیض یاب ہو کر لکھنؤ آئے تھے اور انھوں نے نظیر آباد میں ایک خوش قطع ، دو منزلہ مکان کرایہ پر لے کر اپنا ماہنامہ ' مرقع ' نکالنا شروع کیا تھا ۔

کوئی پچاس برس کا سن ، لانبا قد ، گول سرخ و سفید چہرہ (جس پر خشخشی سے قدرے زیادہ بڑی ، گول ، کھچڑی داڑھی تھی) ، ہونٹ ہمہ وقت مسکراہٹ کے سبب خاصے کھلے ہوئے (جن کے اندر پان کھانے کے باوجود سفید چمکدار بتیسی نمایاں رہتی تھی) ، موٹا مگر ڈھیلا بدن ، چوڑی مہریوں کا سفید پاجامہ ، بغیر بنیان کے سفید ھی ڈھیلا ڈھالا کرتہ (جس کے اندر اُن کا سرخ بدن جھلکتا تھا اور شیروانی نہ پہنے ہونے کی صورت میں وہ ہاتھ ڈال کر

(جاری)

اپنے ایک عزیز مولوی یاسین علی مرحوم کے ساتھ جو اُن دنوں میری تعلیم کے نگران تھے اور وھائٹ گنج میں نیر صاحب کے ہم محلہ تھے جایا کرتا تھا ، دو ایک بار دیکھ چکا تھا ۔ اُس وقت وصل صاحب کیا کرتے تھے ، یہ یاد نہیں آتا ۔ نیر صاحب ہردوئی کی ایک آنہ فنڈ کمیٹی (برائے فلاح مساجد) کے صدر یا معتمد تھے اور سالانہ جلسوں میں وصل صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ وہ جلسے بھی کیا شاندار ہوتے تھے جن میں علاوہ دوسرے مشاہیر علما کے مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی یادگار تقریریں ہوتی تھیں ۔ موصوف ضعیف تھے اور ڈائس پر آرام کرسی رکھ دی جاتی ، تھی اسی پر لیٹے لیٹے تقریر فرماتے تھے ۔

۱- رئیس اعظم گورکھپور ، بیگم سروری عرفان اللہ اور میرے مرحوم دوست معین الحق ، ایڈوکیٹ کے خسر ، جن کی علم دوستی اور دریا دلی کا ثبوت وہ شان دار اور گراں بہا کتب خانہ ہے جو موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نذر کردیا ۔ حضرت ریاض خیر آبادی کو مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں آف محمود آباد کی سر پرستی کے علاوہ مولوی صاحب کی بھی اس حد تک قدردانی حاصل تھی کہ اُن کے اس مطلع پر آپ نے مبلغ دو ہزار روپے عطا کیے تھے ۔

شکل معشوق کی ، انداز ہیں دیوانوں کے
گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے !

بدن کھجاتے اور باتیں کرتے رہتے تھے) ، ڈھیلی شیروانی ، ترکی ٹوپی ، ذہانت کم مگر عام سمجھ بلا کی ، مزاج میں متانت سے زیادہ ٹھٹھول، جلد جلد باتیں کرنے کا انداز ، شعر گوئی واجبی مگر شعرا کے لیے ہمیشہ کشادہ آغوش ، خاطر مدارات میں طاق ، مجلس آرا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ تھے وصل بلگرامی مرحوم!

پہلی ملاقات کے بعد ہی اُن سے بے تکلفی کے تعلقات قایم ہو گئے ۔ اُن کی ذات دوسروں کو خواہ مخواہ اپنی طرف کھینچتی تھی ۔ دیر آشنائی اُنھیں چھو نہیں گئی تھی ۔ چنانچہ کبھی میں تنہا ، کبھی میں اور ذوقی دونوں اُن کے ہاں جانے اور ٹھہرنے لگے ۔ پھر ان سے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ ہمارے خانگی معاملات میں دخیل ہونے لگے ۔ رسالہ ' مرقع ' تو نکالتے ہی تھے ، خاص بات یہ تھی کہ ان کے ہاں وقتاً فوقتاً اچھے اچھے شعرا اور اہل علم آتے اور ٹھہرتے رہتے تھے اور مقامی شعرا تو تقریباً ہر شام کو جمع ہوتے اور سخن آرائی کا سلسلہ رات گئے تک رہتا ۔ وصل صاحب کا دستر خوان وسیع تھا۔ ہر کھانے پر اُن کے مہمان اور وقتی طور پر آئے ہوئے آٹھ دس احباب ضرور ہوتے اور ناشتہ اور چائے وغیرہ کا تو کوئی حساب نہ تھا ۔ قابل ذکر مہمانوں میں کبھی کبھی رام پورے ہوش بلگرامی آتے تھے ۔ ایک بار علی گڑھ سے واپسی پر اصغر صاحب بھی مہمان رہے مگر غالباً دو ہی ایک روز (۱) ریاض صاحب (۲) کو بھی وہاں مہمان دیکھا ۔ عزیز ، صفی (مگر ایک ساتھ نہیں) ،

۱- اسی قیام کے دوران اثر صاحب نے اصغر صاحب کے اس شعر کی انھیں یوں داد دی تھی " آپ نے غالب کو غالب ہی کی زمین میں شکست دی ہے " ۔

میں ہوں ازل سے گرم رو عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اور اسی صحبت میں اثر صاحب نے ' مرقع ' میں ' نشاط روح ' پر اپنے تحسینی مضمون شائع کرنے کا پروگرام بنایا جس پر عمل بھی کیا ، اگرچہ اس شعر کی داد اس مضمون میں میرے بیان کردہ الفاظ کے مطابق نہیں ہے ۔ بعد میں بعض اثرات کے تحت مخالفانہ تبصرہ بھی لکھا ۔

۲- حضرت ریاض خیرآبادی ۔

(جاری)

اثر (لکھنو میں ہوئے تو)، صفدر مرزا پوری، اسید امیٹھوی، سراج، امین سلونوی، حکیم آشفتہ، آسی وغیرہ شام کے آنے والوں میں تھے، خصوصاً موخرالذکر جو مطبع منشی نول کشور میں ملازم تھے اور اپنا کام ختم کرکے اپنے بعض شاگردوں یا عقیدت مندوں کے ہمراہ وہاں سے سیدھے وصل صاحب کے ہاں آجاتے۔

ایک بار شام کی نشست میں آسی صاحب کا کلام سننے کے بعد کسی نے ان سے اچانک کچھ اس قسم سوال کا کیا "کہیے آسی صاحب، غالب کا غیر مطبوعہ کلام کچھ ہوا"؟ میں نے یہ سمجھا کہ مروجہ دیوان غالب کے بعد جو کلام دستیاب ہوچکا ہے، موصوف اس پر کچھ کام کر رہے ہوں گے یا مزید غیر مطبوعہ کلام کی تلاش میں ہوں گے، اس کے بارے میں پوچھا جارہا ہے۔ مگر جس آسانی، برجستگی نیز سنجیدگی اور تبسم کے ملے جلے انداز میں جواب دیا گیا اس نے مجھ پر معاملے کی حقیقت کچھ کچھ واضح کردی۔

(جاری)

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

خیر، نطق نے میری زبان کے بوسے لیے ہوں یا نہ لیے ہوں، نطق حضرت ریاض کا منہ چومتا تھا۔ نثر ہو یا نظم ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ بات کرنے کا ' آہستہ خرام بلکہ مخرام ' جیسا نرم، دھیما، رازدارانہ لہجہ، شستہ و رفتہ کوثر سے دھلی ہوئی زبان، لبوں پر تبسم، پان کی پیک باچھوں تک آئی ہوئی، بڑھاپے میں بھی سرخ و سفید اورانی چہرہ، سفید بھک نورانی ڈاڑھی، نور کی آواز۔ ان کا مطلع یاد آ گیا:

کہاں وہ نور کی صورت، وہ نور کی آواز
ریاض کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

اپنے بعض اشعار کا پس منظر کچھ ایسے دل آویز انداز سے بیان کرتے کہ داستان کا لطف آتا اور سننے والا، مہدی افادی کے الفاظ میں یہ سمجھتا ' گویا میری جوانی کے قصے ہیں '۔ ان دنوں اپنے دیوان ' ریاض رضواں ' کی، جس کی داستان قاضی تلمذ حسین مرحوم نے کیا خوب رقم کی ہے، ترتیب و اشاعت میں، شاورت کے سلسلے میں مقیم تھے۔

آسی صاحب نے اس طور پر جواب دیا " جی کیوں نہیں؟ پچھلے دنوں تھوڑا بہت ہوا ہے وہ پیش کرتا ہوں "۔ یہ کہا اور ایک آدھ غزل یا اشعار ایسے سنائے جن پر بلا شبہ غالب کے فن کی چھوٹ پڑتی معلوم ہوتی تھی۔ میری نوجوانی کے زمانے میں بعض احباب غالب کی تقلید میں مزاحاً بے معنی، مغلق قسم کے اشعار ضرور کہتے تھے مگر غالب کے رنگ میں سنجیدگی کے ساتھ کہے ہوئے اور بامعنی اشعار سننے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ میں شبے میں پڑ گیا مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سبھی حاضرین نے اس کو وقت گزاری اور تفنن طبع کے طور پر ایک لطیفہ سمجھا اور بس۔

اس کے بعد دو ایک بار پھر لکھنؤ جانا ہوا۔ وصل صاحب کے ہاں قیام یقینی تھا اور آسی صاحب سے ملاقاتیں اس سے بھی زیادہ یقینی، جن میں ان سے غالب کا غیر مطبوعہ کلام بھی ضرور سنا جاتا۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ ادھر آسی صاحب داخل ہوئے ادھر ان کے نیازمندوں نے (جن میں اب راقم بھی شامل ہوچکا تھا) بے تاب ہوکر فرمایش کی "آسی صاحب! کچھ غالب کا غیر مطبوعہ کلام "؟ اور انھوں نے حسب معمول، بلا کسی رسمی تکلف کے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ سنانا شروع کر دیا۔

۱۹۲۰ء کے وسط میں پھر لکھنؤ گیا۔ ذوقی کو ساتھ لیا۔ اس سال دسمبر میں ہماری یونی ورسٹی کی تاریخی جوبلی منائی جانے والی تھی اور اس موقعے پر بشیر صدیقی صاحب (۱) کو اور مجھے بہ حیثیت ایڈیٹر و جائنٹ ایڈیٹر علی گڑھ میگزین جوبلی نمبر (۲) شائع کرنا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کے اس

۱- رشید صدیقی صاحب کے برادر نسبتی، بعد میں شبلی کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل ہوگئے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کراچی کے سکریٹری ہوئے۔ اب عرصے سے پنشن لے کر کراچی میں گوشہ گیر بلکہ صحیح معنوں میں 'پناہ گیر' ہیں:

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

۲- یادگار چیز تھی، اب نایاب ہے، میرے پاس بھی نہیں۔ اس میں علامہ اقبال کی وہ تصویر شامل تھی جس میں شاعر مشرق نظریہ تکوین اضافت کا (جاری)

سفر کا مقصد وہاں کے شعرا و اہل قلم سے اُن کے نمونہ ہائے کمالات ' تصاویر ، دیگر نوادر وغیرہ حاصل کرنا تھا اور اس کام میں خاصی کامیابی ہوئی ۔ اس مرتبہ بھی حسب معمول وصل صاحب کے ہاں قیام ہوا ۔ آسی صاحب سے ملاقات ہوئی اور غالب کا غیر مطبوعہ کلام سنا گیا ۔ اس بار آسی صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ چکنے چپڑے ، مانگ پٹی سے آراستہ ، منہ میں پان کی گلوری کے باوجود گالوں میں گڑھے ، دبلے پتلے اور لانبے ، لانبی ھی نکیلی مونچھیں ، ستا ہوا چہرہ ، چمک دار آنکھیں جن میں کاجل کی باریک تحریر ، قدرے میلا سفید چوڑی دار پاجامہ ، مٹیالے رنگ کی شیروانی ، ہاتھ میں اس بٹیر کی کسر تھی ، مسکراتے ہوئے ملے بلکہ ملائے گئے ۔ معلوم ہوا ڈاکٹر عظمت اللہی ہیں ، طلا فروشی کرتے ہیں (۱) اور ' میگزین ' کے جوبلی نمبر میں اپنے کاروبار کا اشتہار شائع کرانا چاہتے ہیں! حضرت نے پچاس روپے بھی پیش کیے مگر ظاہر ہے ہم نے فی الفور معذوری کا اظہار کیا ۔ ان سے عرض کیا " جناب ! آپ میگزین میں اپنا اشتہار شائع کراتا چاہتے ہیں یا ہمیں یونی ورسٹی سے نکلوانا چاہتے ہیں " ؟

ایک مدت کے بعد جب میں طالب علمی کا زمانہ ختم کرکے زندگی کی مکروہات میں پھنس گیا ، وہ زمین رہی نہ وہ آسمان ، میرا علی گڑھ کا قیام ترک ہوا ، لکھنؤ آنا جانا ختم ہوا اور دھلی ، شملہ ، لاہور وغیرہ میرے مستقر رہنے لگے تو انھیں ڈاکٹر عظمت اللہی کی ایک خاندانی بیاض کے حوالے سے

(جاری)

مطالعہ فرما رہے ہیں ۔ چھوٹی تصویر تھی مگر سب سے اصلی ۔ اس کی بڑی تصویریں بعد میں شائع ہوئیں ۔ علامہ نے میری درخواست پر سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے ذریعے ، جنھوں نے سفارش کی تھی ، اس نمبر کے لیے اپنی تصویر خاص طور پر بھیجی تھی ، مع خط اور ایک فارسی غزل کے ۔ ان دونوں چیزوں اور تصویر کے بلاک ایک ھی صفحہ پر شائع ہوئے تھے ۔ خط میں راقم کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا ۔ غزل کا مطلع تھا :

نہ یابی در جہاں یارے کہ داند دل نوازی را
بہ خود گم شو ، نگہدار آبروئے عشق بازی را

۱۔ طلا یا اسی قبیل کے کسی چکر میں ماخوذ ہوئے ، سزا پائی اور اسی حالت میں موت واقع ہوئی ۔ خدا غریق رحمت کرے ۔

آسی صاحب کی دریافت کے طور پر نیاز صاحب (۱) نے ' نگار ' میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام شایع کیا ۔ بعد میں کچھ اور چیزیں شامل کرکے آسی صاحب نے اسے کلام غالب کا ایک مستقل حصہ بنا دیا - پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا اور تقسیم ھند کے بعد جناب عرشی رامپوری نے بھی اپنے مرتبہ ' دیوان غالب ' میں یادگار نالہ کے ذیل میں آسی کے حوالے سے اس تمام کلام کو شامل کرلیا ۔ اس کے معتبر ہونے میں ضرور شبہہ ظاہر کیا مگر کن اسباب کی بنا پر ، یہ انھوں نے نہیں لکھا ۔

سوال پیدا ھوتا ھے کہ اتنے دنوں تک ایک ایسے اھم علمی واقعے کے بارے میں میں نے ' کتمان حقیقت ' سے کیوں کام لیا اور ادبی دنیا میں یہ دھاندلی ھوتی رھی اور میں اپنے ھونٹوں پر مہر سکوت لگائے کیوں بیٹھا رہا ؟ مگر معاملہ صرف اتنا نہیں ھے - اس سلسلے میں مجھے سے تفصیل اپنے ذاتی حالات و واقعات بتانے ھوں گے ، مگر میں دیکھتا ھوں کہ اس مضمون میں پہلے ھی اصل موضوع کے علاوہ بہت سی ضمنی ' اگرچہ خاصی ضروری اور معلومات افزا باتیں جمع ھوگئی ھیں ۔ مختصراً صورت حال یوں ھے کہ بعض نہایت سنگین اسباب اور زندگی کی نا انصافیوں اور محرومیوں کی وجہ سے میں عرصے تک اُردو شعر و ادب سے بیزار رھا حتی کہ کوئی سولہ سترہ برس تک میں نے اردو کی باقاعدہ خدمت

۱- ' مرقع ' کے شباب ھی کے زمانے میں ' نگار ' کو بھوپال سے لکھنؤ لے آئے تھے بلکہ ابتدائی ایام دفتر ' مرقع ' اور وصل صاحب ھی کے ھاں گزارے تھے ۔ کچھ دن یہ مسئلہ بھی زیر غور رھا کہ دونوں رسالے ایک ھی انتظام کے تحت آجائیں ، مگر جہاں تک یاد ھے صرف طباعتی امور کی حد تک ' نگار ' وصل صاحب کی زیر نگرانی رھا وہ بھی چند ماہ تک ، جس کے بعد نیاز صاحب ان سے کلیتاً علاحدہ ھوگئے ۔ پھر آھستہ آھستہ ' نگار ' جمنے اور ترقی کرنے لگا اور ' مرقع ' نے دم توڑ دیا ۔ لکھنؤ میں وصل صاحب کا جیسا شاندار آغاز ھوا تھا ، اُن کا انجام اُتنا ھی حسرت ناک ھوا ۔ کاروبار ختم ھوگیا ، احباب نے ساتھ چھوڑ دیا اور قیصر باغ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیکسی و تنہائی کی حالت میں کمر اور پشت کے ایک نہایت گہرے زخم کی بدولت ، جو سردی سے بچنے کے لیے چارپائی کے نیچے رکھی ایک دھکتی ھوئی انگیٹھی کی وجہ سے پڑ گیا تھا ، ختم ھوگئے ۔

سے کنارہ کشی اختیار کر لی ۔ ان ناموافق حالات نے پاکستان کے قیام کے کچھ عرصے بعد پلٹا کھایا ، چنانچہ جب ہی سے مجھے ادب کی طرف واپس آنے کی توفیق ہوئی ، اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کہ قلم زنگ آلود ہو گیا تھا اور اس کی روشنائی خشک ہو چکی تھی ۔

اگر میں نے اب تک یہ واقعہ کسی ' مقالے ' کی شکل میں قلم بند نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اسے اپنے نہاں خانۂ دل ہی میں مقید رکھا ۔ اس دوران میں جن جن اہل قلم سے بات چیت ہوئی میں نے اُن سے اس کا تذکرہ کیا ۔ محبی مالک رام نے اسکندریہ سے اس کے بارے میں تحریری طور پر دریافت کیا تو میں نے انھیں بے کم و کاست صورت حال سے مطلع کردیا ۔ جناب عرشی سے بھی اس مسئلے پر خط و کتابت ہوئی ، اگرچہ سوء اتفاق سے اُن کے تاریخی نسخے کی اشاعت کے بعد ۔ نادم سیتاپوری صاحب پاکستان آئے تو ان سے اس موضوع پر بات چیت ہوئی اور بعد میں انھیں اس واقعے کا حال لکھ کر بھی بھیج دیا ۔ آج کل حامد اللہ افسر کا کراچی میں قیام ہے ۔ ان سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی ۔ انھوں نے نہ صرف اس واقعے کی مکمل تائید کی بلکہ ڈاکٹر عظمت الٰہی کے مقدمے اور موت کا قصہ انھی سے معلوم ہوا ۔ اصل میں میرے علاوہ اُس دور کے متعدد اشخاص کو بشمول ذوقی جن کا ابتدائے مضمون میں ذکر کیا گیا ، یہ واقعہ معلوم ہے مگر تعجب ہے کہ کسی اور اہل قلم نے بھی اس کے بارے میں اب تک کچھ نہیں لکھا ۔

۱۹۶۰ء میں اپنے مخدوم سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی مشاورت سے بابائے اردو کی مجوزہ نود سالہ جوبلی کے موقع پر ان کی خدمت میں اپنی طرف سے پیش کرنے کے لیے میں نے غالب کا نئی ترتیب کے ساتھ ایک انتخاب شائع کیا ۔ اس کا تاریخی نام ' کلام غالب ۔ نسخۂ قدوائی ' اور ذیلی فقرہ ' پیش کشی جشن نود سالہ بابائے اردو' ہاشمی صاحب ہی کے عطا کردہ ہیں ، جن سے علی الترتیب ۱۹۶۰ء اور ۱۳۸۰ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ۔ یہ انتخاب سارے کا سارا ان کی نظر سے گزرا ہوا بلکہ ان کا منظور کردہ ہے ۔ انتخاب کی غایت اصلی یہ تھی کہ شاعر کو اعلیٰ تحقیقی اور علمی حلقوں ہی میں محدود رہنے دیے جانے کی بجائے عام قاری حضرات میں بھی زیادہ سے زیادہ مقبول بنایا جائے تا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر چھوٹا بڑا ، پڑھا لکھا شخص غالب سے مستفید اور لطف اندوز

ہو سکے ۔ اسی لیے انتخاب بنیادی طور پر صرف اردو کلام ، وہ بھی شاعری کی مقبول عام صنف غزل تک محدود رکھا گیا ۔ اس کے دیباچے میں بھی 'غیر مطبوعہ کلام ' غالب سے اپنی واقفیت کے بارے میں اشارتاً کچھ عرض کردیا تھا ۔

اس وقت ہمارے سامنے یہ بڑا سوال تھا کہ چوں کہ غالب کے تمام اردو غزلیہ کلام کو سامنے رکھ کر انتخاب کرنا تھا ، غیر مطبوعہ غزلیات کے اس حصے کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے ۔ ہم نے بہت غور کیا اور ہماری متفقہ رائے یہ ہوئی کہ اس کلام پر بھی ضرور نظر ڈال لی جائے مگر چونکہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد میرے لیے ایک ایک شعر کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ یہ معتبر ہے اور وہ غیر معتبر ، بالخصوص جب کہ میرے سنے ہوئے کلام کے علاوہ اور کلام بھی آسی سے منسوب ہو چکا تھا ، اصول یہ طے ہوا کہ جو میرا سنا ہوا کلام یاد آئے اسے ترک کرکے باقی کے سلسلے میں آسی اور نیاز کو شبہ کا فائدہ دے کر اس کلام سے بھی انتخاب کرلیا جائے ، چنانچہ یہی کیا گیا ۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ سو فیصد معقول طریق کار نہ تھا مگر اس کے سوا چارہ کار بھی کیا تھا ؟

عرشی صاحب کو بہ حیثیت مجموعی یہ انتخاب پسند آیا۔ مگر غیر مطبوعہ کلام کے انتخاب کے سلسلے میں ، شاید اس لیے کہ اس سے پہلے میں انھیں آسی سے منسوب کلام کو غیر معتبر بتا چکا تھا ، جب انھیں اس اصول سے مطلع کیا گیا تو ان کی خاطر خواہ تشفی نہیں ہوئی ۔ میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اس احتساب میں موصوف نے میرے ساتھ قدرے سختی روا رکھی ہے ، اس لیے کہ خود اپنے مرتبہ دیوان غالب میں اس امر کا اقرار کرتے ہوئے بھی کہ انھیں بعض اشعار کے بارے میں الحاق کا شبہ ہے ، انھوں نے ایسے سارے اشعار شامل کرلیے ہیں ۔

اصطلاحات علمیہ

انجمن ترقی اردو نے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کثیر تعداد میں وضع کی ہیں اور ہر علم کی اصطلاحات علاحدہ طور پر کتابی شکل میں میں شائع جارہی ہیں - ان فرہنگوں میں انگریزی اصطلاحات کے مقابل اردو مترادفات دیے گئے ہیں - اصطلاحات کے جمع کرنے کے لیے متعلقہ علوم اور زبان کے ماہرین پر مشتمل کمیٹیاں بنائی گئیں جنھوں نے بابائے اردو مرحوم کی نگرانی میں اس کام کو مکمل کیا - اب تک حسب ذیل فرہنگیں شائع کی جا چکی ہیں :

فرہنگ اصطلاحات بنکاری	قیمت : چار روپے ۵۰ پیسے
فرہنگ اصطلاحات فلکیات	: ایک روپیہ پچاس پیسے
فرہنگ اصطلاحات کیمیا	: دو روپے پچیس پیسے
فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ	: ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی

غالب کے سفارش نامے

مسلم ضیائی

ملنے کو تو حالی بھی غالب سے ملتے تھے اور مجروح بھی ، غالب کے مرنے پر حالی نے بھی استاد کا مرثیہ کہا اور مجروح نے بھی ۔ دونوں نے ایک ھی صنف یعنی ترجیع بند میں اپنے جذبات کا اظہار کیا لیکن دونوں ترجیع بندوں کے مطالعے سے معلوم ھوتا ھے کہ ان میں وھی فرق ھے جو غالب اور مجروح میں ھے ۔

بات یہ ھے کہ فن کار ھمیشہ اپنے فن میں اپنی افتاد طبع اور رنگ طبیعت کا نادانستہ طور پر اظہار کردیتا ھے لیکن افتاد طبع میں فطرت اور تربیت دونوں شامل ھیں ۔ اس لیے ھر فن پارے سے فن کار کے علم ، تجربے اور ماحول کے اثرات کا بھی اظہار ھوتا ھے ۔

غالب کے خطوط کثیر بھی ھیں اور متنوع بھی ۔ وہ اسی قدر پہلو دار ھیں جس قدر غالب کی شاعری یا شخصیت ۔ ان کے خطوط میں علمی بحثیں بھی ھیں ، خوش طبعی بھی ھے ، زندگی کی داستان بھی ھے اور ان کے دور کی سماجی تاریخ بھی ۔ ان سے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ وہ ایک ھزار چشم اور ھزار خیال انسان تھے اور یہ بھی اندازہ ھوتا ھے کہ قلمرو سخن میں لاکھوں نگاھیں ان کی طرف اٹھی ھوئی اور ان کی تحریروں کی منتظر رھتی تھیں ۔ حیدرآباد دکن کے بارے میں مجھے معلوم ھے کہ غالب کا خط کسی کے پاس آتا تو غالب دوست وھاں کی مکہ مسجد میں جمع ھوتے اور وہ خط سب کو سنا کر ایک اور غالب دوست کے پاس مدراس بھیج دیا جاتا تھا ۔ ان کے بعض خطوں کی عبارتوں سے قیاس کیا جاسکتا ھے کہ انوارالدولہ شفق ، صاحب عالم مارھروی اور مہدی مجروح کے ھاں بھی کچھ اسی قسم کی محفلیں آراستہ ھوتی تھیں اور ان کے احباب دلی سے آنے والی ڈاک کے منتظر رھتے تھے ۔

وہ اپنے دور کے ممتاز لوگوں میں سے تھے ۔ مغل دربار کے ملازم ہونے کی حیثیت سے انھیں پچاس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ ان کی عزت بھی پچاس روپے کے برابر تھی ۔ ان کا رتبہ آسمان کے برابر ہی نہیں اس سے بھی بلند تھا ۔ شاہی ملازم کی حیثیت سے نہیں ، نجم الدولہ، دبیرالملک ، نظام جنگ کہلانے سے نہیں بلکہ ان کے علم ، ان کی شاعری ، ان کی مکتوب نگاری ان کی شائستگی اور انسان دوستی کے باعث ۔

جاگیرداری دور کے معاشرے سے لے کر اس وقت تک انسان محض اپنی قابلیت کی بنا پر ذرا مشکل ہی سے اپنے معاشی مرتبے پر پہنچا ہے کیونکہ ہماری معاشی زندگی میں اب تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی اور انسان سود و زیاں کے چکر میں گرفتار رہا ہے ۔ مرغی بیار و مربہ بخور کی مثل مدتوں سے چلی آرہی ہے اور آج بھی اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ، یعنی سفارشیں آج بھی پروانہ' حصول معاش ہیں ۔

غالب نے جاگیرداری دور کی بدترین افراتفری کو شاہ عالم ، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہدوں میں دیکھا ۔ مغل سلطنت کی تباہی نے معاشی زندگی میں سخت ابتری پھیلا دی تھی ۔ بے روزگاری عام تھی ۔ ایسے زمانے میں روزگار حاصل کرنے کے لیے ممتاز آدمیوں کی تحریروں کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ یہ تحریریں عموماً خطوط ہی کی شکل میں ہوتی ہیں ۔

غالب سے پہلے عموماً فارسی میں خط لکھے جاتے تھے ۔ ان میں بہت زیادہ صناعی اور لفظی بازی گری ہوتی تھی ۔ انتہا یہ کہ تعزیت نامے بھی ان سے بری نہ تھے ۔ غالب نے ابتدا ہی سے غالباً انگریزی خطوط سن کر اور ان کی روش دیکھ کر خطوط نگاری کے لیے چند اصول متعین کرلیے تھے ۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں انھوں نے علی بخش رنجور کے لیے پنج آھنگ کے آغاز میں لکھا کہ جب میں خط لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس کے مرتبے کے لحاظ سے مخاطب کرکے بیان مدعا پر آجاتا ہوں ۔ القاب و آداب اور خیریت کی اطلاع دینا بے ضرورت سمجھتا ہوں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں کتنی ساحری کی جاسکتی ہے اور سخن گستری کی کتنی گنجایش ہے ۔

آج کی پیچیدہ دنیا میں تعلقات بھی پیچیدہ ہوگئے ہیں اور مسائل بھی ، چنانچہ بعض اوقات کسی عزیز یا دوست کو ایک طرف سفارش نامہ ہاتھ سے لکھ کر یا ٹائپ کرا کے دیا جاتا ہے اور دوسری طرف اس شخص کے مرسل الیہ

کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی ٹیلیفون بھی کردیا جاتا ہے کہ اس شخص کو، جسے تمہارے پاس بھیجا جارہا ہے، کسی بہانے ٹال دو اور اس جگہ پر میرے بیٹے (داماد، بھتیجے یا بھانجے، جیسا موقع ہو) کا تقرر کردو۔

غالب کے زمانے کا معاشرہ نہ اتنا پیچیدہ تھا اور نہ ایسا کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص مروتاً یا اخلاقاً سفارش کر کے اس کے خلاف کہتا بھی تو غالب کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ بے غرض اور انسان دوست ایسا نہیں کرتے۔ حالی، غالب کے کردار کے گواہ ہیں اور حالی کی شرافت پر ایمان لا کر ان کی راست گفتاری کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

غالب چونکہ اپنے دور کے ممتاز آدمی تھے، اس لیے لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے مدد چاہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے لیے دوسرے معاملات کی مانند سفارش کے لیے بھی چند اصول مقرر کر رکھے تھے اور وہ ہر شخص کی سفارش نہ کرتے تھے۔ سب سے پہلے ان کے سامنے یہ بات رہتی تھی کہ جس شخص کی سفارش کر رہے ہیں، وہ سفارش کا مستحق بھی ہے یا نہیں، اس کے ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی خیال رہتا تھا کہ جس شخص سے سفارش کی جا رہی ہے، وہ اس سفارش کے مطابق کرے گا بھی یا نہیں۔

اگر حاجت مند اور متعلقہ شخص دونوں سے ان کے مراسم ہوتے تو خاموشی اختیار کرتے، راست نہ لکھتے اور کسی دوسرے شخص سے مراسلت کے ذریعے حالات معلوم کرتے رہتے، لیکن ان کی ہمدردیاں ہمیشہ حاجت مند کے ساتھ رہتیں، راست گفتگو ہوتی تو حاجت مند کی تائید کرتے تھے۔

مثال کے طور پر قربان علی بیگ سالک اور شمشاد علی بیگ رضوان، دونوں بھائیوں سے غالب بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہتے اور ان کی بہتری چاہتے تھے، چنانچہ رضوان کو ایک خط میں فرزند دل بند لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان شرفا کی حالت نہایت خستہ و خراب ہوگئی تھی۔ سالک اور رضوان دونوں بے روزگار تھے اور پریشان، اس لیے ایک خط میں علائی کو لکھتے ہیں:

"کل شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین کہتے

تھے کہ نواب صاحب (امین الدین احمد خاں) فرماتے ہیں ، لوہارو
چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے ، میں نے کہا کہ میں
دال روٹی چاہتا ہوں مگر پیٹ بھر کے" ۔ غالب کہتا ہے کہ
اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ سالک سے سلوک منظور نہیں ۔
تنہا ہوائے شمشاد د سراست ۔

رموز مملکت خویش خسروان دارنند
گدائے گوشہ نشینی ، تو حافظا مخروش "

دیکھیے اس محروش میں کس قدر خروش ہے ۔ کتنی آرزو ہے کہ دونوں
بھائی (سالک و رضوان) روزگار سے لگ جائیں ۔ امین الدین احمد خاں غالب کے
برادر نسبتی ہیں اور لوہارو کے نواب ، لیکن غالب انھیں راست نہیں لکھتے ،
اس خیال سے کہ کہیں بات رد نہ ہو جائے ، کہیں ان کی ہیٹی نہ ہو جائے ۔
چنانچہ ایک اور خط علائی کو لکھا :

" مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو
کچھ تم نے لکھا ہے اور آیندہ جو کچھ لکھو گے ، میری طرف سے وہی
جواب ہوگا جو آگے لکھ چکا ہوں ، یعنی میں تماشائی محض رہوں گا ۔
اگر بھائی صاحب (امین الدین احمد خاں) مجھ سے ذکر کریں گے تو
بھی نہ کہوں گا "۔

اور جب رضوان لوہارو پہنچ گئے تو انھی علائی کو غالب نے لکھا :

"جان غالب ، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان ۔ قیامت کو دوبارہ
ملنے کی توقع ہے ، خدا کا احسان ، مرزا قربان علی بیگ تمھاری
کشش سے مجذوب کیوں بنتے ، وہ تو خود سالک ہیں ۔ مگر ہاں ،
یہ صاحب زادۂ سعادت مند رضوان ! سو اس کے آپ مالک ہیں ،
نواب صاحب کا ہم مطبخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہوگا ۔
کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا مقرر ہوا ۔

اثنا عشری ایک تم ہو ، سو تمھیں اختیار ہے ، البتہ عشرۂ
مبشرہ کی اولیت پر مدار ہے ۔ باپ تمھارا خلاف قاعدہ اہل سنت و
جماعت عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا ۔ رضوان نے نہ مانا ،
وہ کیونکر مانتا ، وہ ثلثہ کا دم بھرتا تھا .... رضوان کو دعا

پہنچیے ، نواب صاحب کی عنایات اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو ۔

یہ بڑا دلچسپ خط ہے ۔ میرے دوست قدرت نقوی نے اثنا عشری سے شیعہ مراد لیا ہے (۱) لیکن یہاں معاملہ صرف تنخواہ کا تھا ۔ علائی ، رضوان کو بارہ روپے دلوانا چاہتے تھے ۔ امین الدین احمد خاں سات روپے دینا چاہتے تھے (عشرہ سے ثلثہ کم) اور رضوان دس روپے کے طالب تھے ۔ اس کی وضاحت ، علائی کے نام ایک اور خط سے ہو جاتی ہے ، جس میں لکھتے ہیں :

" بچارے مرزا (رضوان) کا معاملہ علی حسین خاں بہادر کی معرفت طے ہوگیا ۔ یہاں پندرہ کا سوال ، وہاں دس میں سے تین کم کرنے کا خیال ...... مرزا قانع و متوکل ہیں ۔ نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس ۔ اللہ بس ماسوا ہوس "۔

اب ذرا مرزا علی حسین خاں سے متعلق ایک سفارش نامہ ملاحظہ ہو ۔ ان کا تعلق دلی کے ایک ذی مرتبت خاندان سے تھا اور نواب امین الدین خاں کے متوسل تھے ۔ بیوی کی بیماری اور شاید کچھ خاندانی جھگڑوں کے باعث رخصت لے کر لوہارو سے دلی آئے اور جلد واپس نہ جاسکے ، اس لیے علائی نے بار بار غالب کو خط لکھے ، جن میں علی حسین خاں کے واپس نہ آنے کی شکایت کی گئی تھی ۔ مرزا علی حسین خاں ، غالب سے جاکر ملے اور حالات سنائے تو غالب نے علائی کو ان کے بارے میں لکھا :

" مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے ، میں نے خطوط مرسلہ تمھارے یک مشت ان کو دیے ۔ اب تمھارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے ۔ علی حسین خاں سے آنے کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت پوچھی گئی ۔ جواب پایا کہ ایک مہینے اور دس دن کی رخصت لے کر آیا ہوں ۔ بی بی بیمار ہے ۔ اس کا استعلاج منظور ہے ۔

میری جان بھی علی حسین کے کام آئے تو دریغ نہ کروں ۔ بھلا یہ

۱- ماہ نو ، فروری ۱۹۶۲ء

مبالغہ سہی بلکہ بے شک تبلیغ و غلو ہے لیکن قریب قریب اس کے یعنی جو چیز امکان سے باہر ہو۔ مگر سوچو کہ آئین غم خواری و اندوہ گساری کیا ہوگا۔

مرزا بد وضع و بد روش نہیں کہ پند و بند کا محتاج ہو۔ رہے امور خانگی یعنی بی بی اور اس کے آبا و اخوان کے معاملے ، ان میں نہ تم کو دخل نہ مجھ کو مداخلت ، تم علی حسین خاں کو اس پیوند پر کیا چھیڑتے ہو ، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا دادا کتنا بڑا آدمی تھا! اور اس کی سسرال ایک ہے۔ یہ ذریعہ فخر ہے اس کو اور اس کے طفیل سے تم کو بلکہ تھوڑی سی نازش اگر مجھ ننگ اقربا کے حصے میں بھی آجائے تو کچھ بعید نہیں "۔

دیکھا آپ نے کہ غالب نے ایک شریف اور پریشان حال شخص کی جس کے بزرگوں سے ان کے مراسم تھے ، کس طرح تائید سفارش اور ہمدردی کی ہے اور کس طرح اس کی پریشان حالی کے زمانے میں علائی سے چاہا ہے کہ اسے اس پریشانی کے وقت میں نہ چھیڑیں اور اس وقت تک انتظار کریں کہ وہ شخص جو ' بد وضع ' بھی نہیں اور بد روش بھی نہیں ، معاملات سے فراغت پاکر اپنی خدمت پر رجوع ہو جائے۔

علائی کے چچیرے بھائی اور ضیاالدین احمد خاں نیر کے بیٹے ، شہاب الدین احمد خاں ثاقب تھے ، گویا غالب کے پوتے - ۱۸۶۱ء کا زمانہ تھا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے اثرات چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لوگ تلاش روزگار میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک سید حسن علی ، غالب کے پاس بھی پہنچے اور غالب نے ثاقب کو سفارش نامہ لکھا۔

" نور چشم شہاب الدین کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ یہ جو رقعہ لے کر پہنچتے ہیں ، ان کا نام حسن علی ہے اور یہ سید ہیں ، دوا سازی میں یگانہ ، رکاب داری میں یکتا۔ جان محمد ان کا باپ ملازم سرکار شاہی تھا۔ اب ان کا چچا ، میر فتح علی پندرہ روپے کا الور میں نوکر ہے۔ بہرحال کہا گیا کہ پانچ روپے مہینا ملے گا اور لوہارو جانا ہوگا۔

انکار کیا کہ پانچ روپے میں کیا کھاؤں گا ! یہاں زن و فرزند کو کیا بھیجواؤں گا ؟ جواب دیا کہ سرکار بڑی ہے۔ اگر

تمھارا کام پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا ۔ اب وہ کہتا ہے کہ خیر توقع پر یہ قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں ۔ بغیر اس کے کسی طرح جا نہیں سکتا ۔

سنو میاں ! حق بجانب اس غریب کے ہے ۔ روٹی بغیر بات نہیں بنتی ۔ یقین ہے تم رپوٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم کا آجائے گا ۔ یہ قصہ فیصل ہوا ۔ اب وہ کہتا ہے کہ دو ماہ مجھے پیشگی دو تاکہ کپڑا لتا بنواؤں اور کچھ گھر دے جاؤں ، راہ میں روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں ۔ تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا ، خیر ، تم یہ میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو " ۔

غالب نے یہ سفارش نامہ شہاب‌الدین احمد خاں کو حسن علی رکابدار کے ساتھ اس کی ملازمت کے لیے بھیجا ۔ پہلے اس کا سماجی مرتبہ بتایا کہ یہ سید ہیں ، پھر اس کی لیاقت کا حال بتایا کہ دواسازی میں یگانہ اور رکابداری میں یکتا ہیں ۔ پھر باپ اور چچا کے معاشی درجے کا ذکر کرکے تنخواہ کا تعین کیا اور اس کے بعد تنخواہ کے ساتھ کھانا ، گھر کے انتظامات کے سلسلے میں کچھ پیشگی رقم اور آخر میں جانے کا کرایہ لکھا ، اور ان سب معاملات میں حق بجانب سائل قرار دیتے ہوئے اپنی مجبوری بھی ظاہر کردی کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ یہ ملے گا یا نہیں ۔ اور چونکہ خود کوئی فیصلہ نہ کرسکتے تھے اس لیے یہ بھی لکھ دیا کہ تم یہ رقعہ علائی کو بھیج دو تاکہ مصلحت کے مطابق میری سفارش اور علی حسن رکابدار کے مسئلے پر غور کر کے فیصلہ کریں ۔

لالہ چھج مل سے غالب کے دیرینہ تعلقات تھے ۔ ساتھ بیٹھتے اور کھیلتے تھے ۔ ممکن ہے ناو نوش کا سلسلہ بھی رہتا ہو ۔ ان کے دونوں بیٹوں ، جواہر سنگھ جوہر اور ہیرا سنگھ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے ۔ اس زمانے میں بڑے اور چھوٹے بھائیوں کے بارے میں یہ مثل مشہور تھی کہ ' سگ باش برادر خورد مباش ' کیونکہ بڑے بھائی باپ کے برابر تصور کیے جاتے تھے ۔ بات بات پر چھوٹے بھائی کی سرزنش ہوتی ، جو ان کے احکام بجا لانے پر مجبور کیے جاتے تھے ۔ جواہر سنگھ نے ہیرا سنگھ سے کچھ قطعے منگوانے اور پندرہ

روپے بھیج دیے کہ ان میں خریدلو ۔ ھیرا سنگھ نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور پچیس تیس روپے اور صرف کر کے قطعے خریدے ۔ اس عرصے میں شاید جواھر سنگھ نے غالب کو ھیرا سنگھ کی شکایت لکھ بھیجی کہ وہ مطلوبہ قطعے حاصل کر کے بھیجنے میں بے پروائی برت رھا ھے ۔ اس پر غالب نے جواب دیا :

" قطعے جو تم کو مطلوب تھے ، ان کے حصول میں جو کوشش ھیرا سنگھ نے کی ھے ، میں تم سے کہہ نہیں سکتا ۔ نری کوشش نہیں ، روپیا صرف کیا ۔ پندرہ روپے جو تم نے بھیجے تھے وہ اور پچیس تیس روپے اور صرف کیے ۔ پانچ پانچ اور چا چار اور دو دو روپے کے قطعے مول لیے اور بنوائے ۔ خرید میں روپے جدا دیے اور بنوانے میں روپے جدا لگائے ، دوڑتا پھرا ۔ حکیم صاحب کے پاس کئی بار جا کرحضور والا کا قطعہ لایا ، اب دوڑ رھا ھے ولی عہد بہادر کے دستخطی قطعے کے واسطے ، یقین ھے کہ دو چار دن میں وہ بھی ھاتھ آئے اور بعد اس قطعے کے ھاتھ آنے کے وہ سب کو یک جا کر کے تمھارے پاس بھیج دے گا ۔ مدد میں بھی اس کی کر رھا ھوں لیکن اس نے بڑی مشقت کی ۔ آفریں صد آفریں ۔ پندرہ روپے میں سے ایک روپیا اپنے صرف میں نہیں لایا اور ماں کو عاجز کر کے اس سے بہت روپے لیے ۔ جب سب قطعے تمھارے پاس پہنچیں گے ، اس کا حسن خدمت تم پر ظاھر ھوگا "۔

غالب نے اس خط میں چھوٹے بھائی کے حسن کارکردگی کا ذکر کرتے ھوئے اس کی محنت اور دوڑ دھوپ کی تعریف ھی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتایا ھے کہ اس نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ھے اور کس طرح بادشاہ کا اپنا دستخطی قطعہ لایا اور کس طرح ولی عہد کا دستخطی قطعہ حاصل کرنے کی کوشش کر رھا ھے ۔ ساتھ ھی ان قطعات کی قیمتیں بھی بتادیں اور جو زائد صرفہ ھوا ھے وہ بھی جتا دیا ، جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ جواھر سنگھ وہ رقم روانہ کردیں جو زائد صرف ھوئی ھے ۔

۱۸۵۷ء کے ھنگامے میں دھلی کے اھل علم تتر بتر ھو گئے ۔ ان میں حکیموں کا ایک خاندان پٹیالے پہنچا ۔ ان میں حکیم غلام مرتضی خاں اور ان کے صاحبزادے حکیم غلام رضا خاں بھی تھے ۔ غالب نے ' نور چشم اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں ' کو اردوئے معلی کا حق اشاعت بخش دیا تھا ۔

موجودہ سفارش نامہ حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام ایک ہندو ملاقاتی کے لیے ۱۸۶۵ء میں لکھا تھا :

" خاں صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب کو غالب درد مند کا سلام پہنچے ۔ خوب یاد کیجے کہ میں نے کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی ۔ اب ایک عنایت کا سائل ہوں ۔ حامل ہذالمکتوب ، پنڈت جے نرائن ، میرا یہ خط لے کر حاضر ہوتے ہیں ۔ ان کے بزرگ نواب احمد بخش خاں کی سرکار میں مناصب عالیہ اور عہدہ ہائے جلیلہ رکھتے تھے ، اب موقع آیا ہے کہ جستجوئے نوکری میں پٹیالے آتے ہیں ۔

آپ کو میرے سر کی قسم ، جہاں تک ہوسکے ، سعی کر کے ان کو موافق ان کی عزت کے کوئی منصب ، کوئی عہدہ دلوا دو گے تو میں یہ جانوں گا کہ تم نے مجھ کو نوکر رکھوایا ہے ، بڑا احسان مند ہوں گا "۔

اس خط سے مرسل اور مرسل الیہ دونوں کے تعلقات کا علم ہوتے ہوئے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے پرانے واقف کاروں کا کس قدر خیال رہتا تھا ۔ نواب احمد بخش خاں کے ہاں ملازمت کے تعلق سے غالب ، پنڈت جے نرائن سے واقف تھے ۔ ان کی پریشاں روزگاری دیکھ کر انھوں نے حکیم صاحب کو پہلی بار زحمت دینے کا ذکر کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بار بار کی سفارش واجب التعظیم رہ جاتی ہے ، واجب التعمیل نہیں رہتی ۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی سفارش کو نظر انداز نہ کیا جائے اور کسی نہ کسی طرح سائل کو روزگار سے لگا دیا جائے ۔

آخر میں معاملے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے مرسل الیہ کو اپنے سر کی قسم بھی دلا دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ ان کو ملازمت دلوانا گویا مجھے ملازمت دلوا کر مجھ پر احسان کرنا ہے ۔

آگرے میں منشی نبی بخش حقیر غالب کے دوست اور غالب شناس تھے ۔ سکندرہ کے رہنے والے ، صاحب عالم مارہروی کے شاگرد حکیم الہی بخش نے غالب سے ملازمت کے لیے سفارش چاہی تو غالب نے حقیر کو لکھا :

"... ایک خط حکیم الٰہی بخش صاحب کو دیتا ہوں - یہ صاحب شرفائے سکندرہ میں سے ہیں اور دوست اور شاگرد اس کے ہیں جس کا میں بغیر دیکھے عاشق ہوں یعنی جناب صاحب عالم مارہروی سلمہ اللہ تعالے -

یہ ان کا خط میرے نام لائے تھے - کئی مہینے یہاں رہے اور حکیم امام الدین خاں صاحب سے مفرح القلوب پڑھی - بہت خوب اور مہذب آدمی ہیں، حسن طبع بھی رکھتے ہیں - یہاں ان کی نوکری کا کہیں اسلوب نہ ہوا اور زمانے نے مساعدت نہ کی - اب یہ اپنے گھر جاتے ہیں کول میں پہنچ کر آپ سے ملیں گے - ان کی توقیر کیجیے گا اور ان کو اپنا دوست دیرینہ تصور فرمایئے گا اور اس کا خیال آپ کو رہے کہ اس ضلع میں ٹھیکیدار اور مال گزار بہت ہیں، اگر کسی کی خواہش طبیب کی ہو تو ان کو اس سے بخوبی ملوا دیجیے گا اور اس باب میں جلدی نہیں ہے، خیال رہے"۔

غالب اپنے خطوں میں غیر ضروری باتیں نہیں لکھتے اور اپنے مطلب کو کم سے کم الفاظ میں لیکن جامع طور پر لکھ دیتے ہیں - ان کے خطوط سے نہ صرف مرسل الیہم سے ان کے حقیقی تعلقات کا پتا لگتا ہے بلکہ اسی سلسلے میں دوسرے دوستوں سے بھی تعلقات کا علم ہو جاتا ہے - متعلقہ شخص کی لیاقت اور کردار کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے نیز اس کے معاشی حالات کا بھی - مثلاً اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کے معاشی حالات ایسے خراب نہ تھے کہ ان کے لیے فوری طور پر ملازمت کا انتظام کیا جاتا، اس لیے آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ ' اس باب میں ایسی جلدی نہیں، ہے خیال رہے '۔

انھی کو ایک اور خط میں یاد دھانی کرتے ہیں کہ " حکیم الٰہی بخش آپ کے پاس پہنچے ہیں - بہت نیک بخت اور معقول آدمی ہیں - ان کی پرورش کا خیال رہے اور شیخ رحمت اللہ صاحب جو آگے آپ کی بدولت کامیاب رہے، اگر وہاں ہوں تو ان کا بھی خیال رہے...... اگر وہاں نہ ہوں تو ان کا حال مجھ کو لکھیے" -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو ان لوگوں کا، جن کی سفارش کرتے تھے، کس قدر خیال رہتا تھا -

ان کے مقابلے میں شیخ وزیرالدین کے بارے میں لکھا کہ " شیخ وزیرالدین بہت تباہ اور خراب ہے۔ اس کا دادا بہت معزز آدمی تھا اور میرا بڑا دوست تھا۔ یہ تمھارا بھی نیازمند ہے۔ حتی الوسع خیال دوڑاؤ اور گنجائش نکالو۔ اگر کہیں نوکری قرار پا جائے تو گویا مجھ پر احسان ہوگا ... عرضی شیخ کی پہنچتی ہے۔ اس کا مناسب جواب لکھیے اور کوشش کیجیے"۔

اس خط میں بعض دوسرے مطالب لکھنے کے بعد لکھا کہ " ایک بار میری سن لو ، پھر غزل پڑھو ۔ شیخ وزیرالدین بیمار ہو کر کرانچی ڈاک سے کول کو روانہ ہوا ہے۔ میں اگرچہ خدمت گزار خلق ہوں پر ان کی کچھ خدمت بجا نہ لا سکا اور ان سے شرمندہ رہا ۔ تم ان کی دل جوئی کرنا ۔ آدمی ان کے گھر بھجوانا اور ان کی خبر پوچھنا اور بھائی اگر ہو سکے تو کسو کے یا اپنے علاقے میں مختار کاری ، سرشتہ کی عرایض نویسی ، کچھ نہ کچھ ان کے واسطے کر دینا ۔ ضرور ۔ ضرور ۔ لو ! اب غزل پڑھو "۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ وزیر الدین کے دادا بہت معزز آدمی اور غالب کے دوست تھے ۔ اس وقت ان کی حالت بہت سقیم تھی۔ غالب کے پاس اکثر لوگ مدد اور سفارش کے لیے آتے تھے ۔ وہ اپنے آپ کو خدمت گزار خلق سمجھتے اور ہر شخص کی مدد کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے ۔ اس خط میں انھوں نے بار بار شیخ وزیرالدین کی طرف اپنے دوست حقیر کو توجہ دلائی ہے تاکہ وہ حالات کی اہمیت سمجھ کر جلد سے جلد شیخ وزیرالدین کی ملازمت کا انتظام کریں ۔

انھی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں مطلع کرتے ہیں :

" مرزا نجف علی خاں مرحوم تمھارے دوست ہوں گے ۔ وہ یہاں مر گئے ۔ ان کے فرزند ارجمند مرزا یوسف علی خاں کو میں اپنے فرزند کی جگہ جانتا ہوں اور ان کی سعادت مندیاں اور خوبیاں کیا بیان کروں کہ میں ان کا عاشق ہوں ۔ وہ اب کول کو گئے ہیں ۔ تم کو لازم ہے کہ ان کے وہاں جاؤ اور فاتحہ پڑھو اور ان کا حال ان کی زبانی سنو ۔ وہ صاحبزادے ناز پروردہ ، گرم و سرد زمانہ نادیدہ ہیں ۔ دو ایک حویلیاں ان کے والد ماجد کی وہاں ہیں ۔ خدا جانے وہ کیا کریں گے ۔ آپ کو ان کی مربی گیری کرنی چاہیے

مگر وہ پنج شنبے کو روانہ ہونے (پہنچنے ؟) والے ہیں - آج دو شنبے کو یہ خط میں تم کو بھیجتا ہوں - یقین ہے کہ کل پہنچے گا - بمجرد اس کے پہنچنے کے آپ ان سے ملیے گا، ماتم زدہ کا بلانا مناسب نہیں - آپ کو بہ تقریب تعزیت جانا چاہیے، یہ خط جو آپ کے نام ہے، ان کو پڑھا دیجیے" -

اس خط سے جو کسی ملازمت کے لیے نہیں، بلکہ محض ہمدردی کی بنا پر لکھا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے دوستوں اور ان کی اولاد کا کس قدر خیال رہتا تھا - مرزا یوسف علی خاں کے والد منشی نبی بخش حقیر اور غالب، دونوں کے دوست تھے - غالب نے ان کے انتقال کی خبر، حقیر کو دیتے ہوئے بتایا کہ مرزا یوسف نوجوان ہیں، حالات زمانہ سے نا واقف - ساتھ ہی آگرے میں ان کی حویلیوں کا ذکر کرتے ہوئے اشارہ کردیا کہ ایسا نہ ہو نوجوان یوسف، انھیں اونے پونے بیچ دیں - اس لیے لکھ دیا کہ تم ان کے دوست کی حیثیت سے ان کے مربی بن جاؤ، تاکہ نقصان نہ اٹھائیں -

ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا نہ ہو نبی بخش اپنے آپ کو بزرگ سمجھ کر مرزا یوسف کے پاس جانے کے بجائے انھیں اپنے پاس طلب کریں - اس لیے لکھ دیا کہ ماتم زدہ کا بلانا مناسب نہیں، آپ کو بہ تقریب تعزیت جانا چاہیے - خط پڑھوا دینے سے مقصد یہ تھا کہ یوسف مرزا حقیقت حال سے واقف ہو جائیں اور نبی بخش حقیر کو غالب کی جگہ جان کر اپنا مربی و سرپرست سمجھیں اور ان کے حسب ہدایت کام کریں -

---

میر غلام حسنین قدر بلگرامی، اپنے دور کے فضلا میں سے تھے لیکن بیروزگار تھے اور پریشان حال، غالب اس سے واقف تھے، ان کا دل اپنے شاگرد کی پریشانی پر کڑھتا تھا، سوچتے تھے کہ کیا کروں اور کس طرح اپنے شاگرد کو اس کی پریشانیوں سے نجات دلاؤں - اسی زمانے میں منشی نولکشور سے غالب کے تعلقات پیدا ہو چکے تھے - وہ دلی آکر غالب سے ملے اور ان کی کتابیں چھاپ رہے تھے - غالب کو نولکشور کی فارغ البالی اور قدر کی لیاقت کا خیال آیا، اس لیے انھوں نے لکھا -

" صاحب ! تم بہت دن سے بیکار ہو - ایک جگہ مساعدت روزگار کی صورت ہے - بے تکلف یہ رقعہ میری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ -

مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی، یعنی منشی نولکشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ انھیں پڑھوادو۔ اپنی نظم و نثر اُن کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم آن پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کار گزار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمھارے سپرد کردیں گے۔ مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا۔ معزز و مکرم رہوگے۔ زندگی کا لطف آٹھاؤگے لیکن شرط یہ ہے کہ جلد چلے جاؤ۔ لکھنؤ تم سے نزدیک ہے۔ اتنی راہ قطع کرنا کچھ دشوار نہیں، اگر نوکر نہ ہوجاؤگے پھر چلے آنا۔ بخت آزمائی ہے''۔

غالب اپنے دوسرے اوصاف کے علاوہ نہایت موقع شناس آدمی تھے۔ اس خط میں انھوں نے راست نولکشور کی بجائے قدر کو مخاطب کرکے اپنے ' شفیق دلی منشی نولکشور ' سے جلد جا کر ملنے کے لیے لکھا، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ نولکشور کے پاس وہ کام ہورہا ہے جو قدر کے مزاج کے مطابق تھا، یعنی علمی کام۔ دوسرے یہ کہ غالب کے تعلقات چونکہ منشی نولکشور سے خوشگوار تھے، اس لیے انھیں یقین تھا کہ وہ غالب کے بھیجے ہوئے شخص کو ٹالیں گے نہیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ انھیں قدر بلگرامی کی علمی لیاقت پر اعتماد تھا۔ چوتھی بات یہ کہ وہ چاہتے تھے کہ قدر کو خاطر خواہ مشاہرہ ملے۔ اسی لیے انھوں نے لکھا کہ منشی نولکشور سے مل کر یہ رقعہ انھیں پڑھوادو۔ اپنی نظم و نثر ان کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو۔ آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ اگر نوکری نہ ملے فکر نہ کرنا۔ اس کوشش کو بخت آزمائی سمجھنا اور مایوس نہ ہونا۔ ملازم ہوجاؤ تو بہتر ہے۔ نہ ہو تو کوئی نقصان نہیں۔ بلگرام سے لکھنؤ کچھ دور بھی نہیں، صرف تھوڑا سا کرایہ صرف ہوگا لیکن کامیابی کی توقع ہے، اس لیے جانا ہی بہتر ہے۔

منشی امیر احمد امیر مینائی ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ غالب سے عمر میں ۳۲ سال چھوٹے اور اسیر کے شاگرد تھے، ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھنؤ میں اپنی شعر گوئی سے عزت اور ناموری حاصل کرچکے تھے۔ رام پور اس وقت دھلی اور لکھنؤ سے نکلے ہوئے شاعروں کا مرجع اور مرکز تھا۔ اس لیے امیر بھی وھیں پہنچ گئے اور انھوں نے منشی شیو نرائن کے پندرہ روزہ رسالے ' معیار الشعرا '

میں چھپنے کے لیے غزلیں بھیجیں لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا ، جس پر شیو نرائن نے ' معیار الشعرا ' میں لکھا :

" امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں ۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ، ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے "۔

امیر مینائی کو غالب اورشیو نرائن کے تعلقات کا علم تھا ، دستنبو کا پہلا اڈیشن انھی کے مطبع ، مفید خلایق سے شایع ہوچکا تھا ۔ اس لیے انھوں نے اپنی غزلیں غالب کے پاس اشاعت کے لیے بھیجیں ۔ وہ 'معیار الشعرا' میں امیر سے متعلق شیو نرائن کا نوٹ پڑھ چکے تھے ، اس لیے انھوں نے فوراً شیو نرائن کو لکھا : (۱۲ جون ۱۸۵۹ء)۔

" اب تم یہ بتاؤ کہ رئیس رام پور کے ہاں بھی تمھارا اخبار یا ' معیار الشعرا ' جاتا ہے یا نہیں ۔ اب کے تمھارے 'معیار الشعرا ' میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں ، ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ، ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے "۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں ، لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں ، میں ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں ۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو ۔ یعنی یہ غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور حال وہ جو میں اوپر لکھ آیا ہوں ، اس کو اب ' معیار الشعرا ' میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چہار ورقہ رام پور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامے پر لکھو : در رامپور ، بر دو دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد"۔

اس خط سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے باعث ۱۸۵۹ء میں بھی ' معیار الشعرا ' جیسے گل دستوں میں ، شاعر کے بارے میں تفصیلات معلوم کیے بغیر ، غزلیں بھی چھاپتے ہوئے ڈرتے تھے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ امیر مینائی نے 'معیار الشعرا' میں چھپنے کے لیے راست غزلیں بھیجی تھیں اور جب شیو نرائن نے شایع کرنے کی بجائے متذکرہ نوٹ لکھا تو

امیر مینائی نے اپنی غزلیں ، غالب کے پاس بھیجیں کہ وہ شیو نرائن کو اپنی طرف سے بھیج کر ، شایع کرادیں -

تیسری بات یہ کہ امیر منیائی غالباً نواب رام پور کے محل ہی کے کسی حصے میں رہتے تھے ، علاحدہ قیام نہ تھا - اگرچہ نواب کی قیام گاہ کا پتا لکھنے سے یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ شیو نرائن کا گل دستہ شعر یعنی 'معیار الشعرا' بھی نواب کی نظر سے گزرے اور امیر کا کلام بھی ، جس سے ممکن ہے دونوں کو فائدہ پہنچ سکے -

---

آخر میں ایک اور سفارش نامہ ملاحظہ ہو - اس میں حکیم مرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان کی سفارش کی گئی ہے - یہ وہی حکیم آغا جان ہیں جن کا تخلص عیش تھا اور جنھوں نے ایک طرحی مشاعرے میں غالب کو مخاطب کرتے ہوئے پڑھا تھا :

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

عیش نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے چند روز بعد انتقال کیا - اس زمانے میں دلی کے اہل علم مارے مارے پھرنے لگے - ان میں عیش کے بیٹے حکیم مرزا جان بھی تھے - سنہ ۱۸۶۳ء میں غالب کے محبوب شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر بلب گڑھ کے تحصیلدار ہو گئے تھے - اس زمانے میں کسی دیسی باشندے کے لیے تحصیلداری بہت بڑا عہدہ تھی - حکیم مرزا جان وہاں صیغۂ طبابت میں ملازم تھے ، اس لیے غالب نے جواہر سنگھ کو لکھا :

"برخوردار کامگار ، سعادت و اقبال نشان منشی جواہر سنگھ کو بلب گڑھ کی تحصیلداری مبارک ہو - پہلی سے نوح آئے اور اوح سے بلب گڑھ گئے - اب بلب گڑھ سے دلی آؤ گے - ان شاء اللہ -

سنو صاحب ! حکیم میرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان صاحب کے ، تمھارے علاقۂ تحصیل داری میں بصیغۂ طبابت ملازم

سرکار انگریزی ہیں ، ان کے والد ماجد میرے پچاس پچپن برس کے
دوست ہیں ، ان کو اپنے بھائی کے برابر جانتا ہوں ۔ اس صورت میں
حکیم مرزا جان میرے بھتیجے اور تمھارے بھائی ہوئے ۔

لازم ہے کہ ان سے یک دل و یک رنگ رہو اور ان کے
مددگار بنے رہو ۔ سرکار سے یہ عہدہ بصیغہٴ دوام ہے ۔ تم کو کوئی
نئی بات پیش کرنی ہوگی ۔ صرف اسی امر میں کوشش رہے کہ
صورت اچھی بنی رہے ۔ سرکار کے خاطر نشان رہے کہ حکیم میرزا
جان ہوشیار اور کارگزار آدمی ہے " ۔

غالب کے اس سفارش نامے میں کسی نئی جگہ پر تقرر کے لیے
نہیں لکھا گیا ہے بلکہ جواہر سنگھ کو ایک بیٹے کے مانند ہدایت کی گئی
ہے کہ وہ ایک دیرینہ دوست کے بیٹے کو اپنے بھائی کی طرح سمجھیں ،
یک دل و یک رنگ رہیں اور حسب موقع ان کی تائید کرتے رہیں تاکہ وہ
اپنی ملازمت پر قائم رہیں اور سازشیوں کی شرارتوں سے بچ کر اپنی مفوضہ
خدمات انجام دے سکیں ۔

غالب کے یہ سفارش نامے بھی ان کے دوسرے خطوط کی طرح ان کے
مزاج ، ان کے علم ، ان کی ہمدردی ، انسانیت اور دوست نوازی کی غمازی
کرتے اور ان کی بلند شخصیت کو بے حجاب کرتے ہیں ۔

غالب و مجروح کی مکاتبت

سید معین الرحمان

میر مہدی حسین مجروح دھلوی (۱۸۳۳ء-۱۹۰۳ء) غالب کے عزیز شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ ۱۸۹۹ء میں ان کا دیوان ' مظہر معانی ' کے تاریخی نام سے شائع ھوا۔ میر مہدی مجروح " غالب کے تلمذ پر فخر کرنے والوں میں لائق ترین گنے جاتے تھے"۔ (۱) ۱۸۸۰ء میں نواب ضیاء الدین احمد خان نیر و رخشاں کے انتقال پر دلی میں ایک یادگار مشاعرہ ھوا۔ اس میں حالی ، داغ ، مجروح اور دوسرے بہت سے اکابر شعرا نے شرکت کی۔ حالی نے اس مشاعرے میں مجروح کو داد دیتے ہوئے سامعین سے یوں خطاب فرمایا تھا :

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ھرگز

مجروح محض قادر الکلام شاعر ھی نہ تھے ، نثر میں بھی استادانہ قدرت رکھتے تھے۔ مالک رام لکھتے ھیں کہ مجروح نے :

" دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے۔ ایک حضرت رسول کریم کے معجزات کے بیان میں ' انوارالاعجاز ' اور دوسرا ائمہ کے بیان میں ' ھدیۃ الائمہ '۔ دونوں اب کمیاب ھیں۔ ایک تذکرہ ' طلسم راز ' بھی لکھا تھا ، یہ بھی اب نایاب ہے۔ اس پر غالب

۱- سرشیخ عبدالقادر ' مخزن ' لاھور ' مئی ۱۹۰۳ء ' ص ۵۵ -

نے جو تقریظ فارسی میں لکھی تھی ، وہ ان کی کلیات نثر میں موجود ہے "۔

[تلامذۂ غالب ، طبع اول ، ص ۲۰۳]

ان نثری یادگاروں کے علاوہ ' تاریخ گنج غرائب ' (۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء) بھی مجروح سے منسوب ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اردوے معلیٰ کا دیباچہ بھی مجروح کا لکھا ہوا ہے۔ غالب نے اپنے ایک سے زیادہ خطوں میں مجروح کے اردو عبارت لکھنے کے ڈھنگ کی داد دی ہے اور اس پر رشک کیا ہے اور یہ بہت بڑی سند ہے اس بات کی کہ مجروح کو نثر میں خاص مہارت حاصل تھی۔

اردوئے معلیٰ اور عود هندی میں مجروح کے نام غالب کے پچاس کے لگ بھگ خط شامل ہیں اور ابھی بہت سے خط ایسے ہوں گے جو سامنے نہیں آئے۔ خود غالب کے نام (۱) مجروح کے خطوں کا ایک بڑا ذخیرہ خوبیٔ قسمت سے محفوظ لیکن اشاعت کا منتظر ہے۔ چودہ برس ہوئے آفاق حسین آفاق دہلوی نے اپنے ایک مضمون میں ' مکتوبات غالب و مجروح ' کے اس ذخیرے کی نشان دہی کی تھی (۲)۔ مولوی مہیش پرشاد (۳) اور فاضل زیدی (۴) بھی مختلف مواقع پر مجروح کے متفرق مکاتیب شائع کر چکے

۱- غالب کے نام خطوں کی تلاش ایک دل چسپ موضوع ہے۔ اسی طرح کا ایک مجموعہ ' بنام غالب ' اکبر علی خاں نے آٹھ دس برس کی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ غالب کے مکتوب الیہم کے کئی سو خطوط جو غالب کے نام لکھے گئے ، اس مجموعے میں شریک کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے خط ایسے ہیں جن کا علم غالب دوستوں کو نہیں اور جن سے خود غالب کے خطوط کے مفاہیم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جن لوگوں کے خطوط اس میں شامل ہیں ان میں مجروح ، بے خبر، شیفتہ ، تفتہ ، بے صبر ، ناطق مکرانی ، ذکا حیدرآبادی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

۲- ماہ نو کراچی ، فروری ۱۹۵۵ء

۳- اردو ادب علی گڑھ ، جنوری - اپریل ۱۹۵۱ء

۴- طوفان ، نواب شاہ ، فروری ۱۹۵۲ء

ہیں۔ اس موقع پر اسی سلسلے کی ایک نادر کڑی کے طور پر " غالب و مجروح کی مکاتبت " پیش کی جاتی ہے۔ اس عنوان سے یہ مکاتیب آج سے پچپن برس پہلے مولوی عبدالحق مرحوم کی مختصر تمہید کے ساتھ رسالہ ' الناظر ' لکھنؤ بابت یکم مئی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئے تھے اور اب بالعموم نظر سے اوجھل تھے۔ ان خطوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔	نامۂ غالب	:	هفتم مارچ ۱۸۵۹ء
	جواب مجروح	:	مارچ ۱۸۵۹ء
۲۔	نامۂ غالب	:	۲۷ - مارچ ۱۸۵۹ء
	جواب مجروح	:	اپریل ۱۸۵۹ء
۳۔	نامۂ مجروح	:	جون ، جولائی ۱۸۵۹ء
	جواب غالب	:	۶ - جولائی ۱۸۵۹ء
۴۔	نامۂ غالب	:	۲ - دسمبر ۱۸۵۹ء
	جواب مجروح	:	دسمبر ۱۸۵۹ء
	جواب الجواب از غالب	:	۱۳ - دسمبر ۱۸۵۹ء
۵۔	نامۂ غالب	:	۱۸۶۱ء
	جواب مجروح	:	مئی ۱۸۶۱ء
	جواب الجواب از غالب	:	۲۳ - مئی ۱۸۶۱ء

میں نے غالب کے ان خطوں کا ' خطوط غالب ' مرتبہ مالک رام (مطبوعہ علی گڑھ ۶۳ - ۱۹۶۲ء) سے مقابلہ کیا تو کہیں کہیں متن میں فرق پایا۔ بعض صورتوں میں ان خطوں میں فقرے کے فقرے زیادہ ہیں ، ایک آدھ موقع پر یہاں غالب کے خط پر تاریخ و سنہ درج ہے لیکن ' خطوط غالب ' میں موجود نہیں اور یہ ان خطوں کی بڑی وجہ اہمیت ہے۔ اس طرح کے سارے قابل ذکر اختلافات حواشی میں ظاہر کر دیے گئے ہیں۔ ' الناظر ' میں یہ خط بغیر کسی ترتیب کے درج تھے۔ میں نے اس ترتیب کو بجنسہ قائم نہیں رکھا۔ اب یہ خط سلسلہ وار مع جوابات درج کیے گئے ہیں۔

مولوی عبدالحق کی تمہیدی عبارت: (۱)

" میرن صاحب (۲) مرحوم نے جنھوں نے مرزا غالب کی آنکھیں دیکھی تھیں اور مرزا غالب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے جیسا کہ ان کے واقعات [رقعات ؟] سے ظاہر ہے ، میرے لیے چند رقعے جناب مرزا صاحب کے مع میر مہدی مجروح (۳) مرحوم کے جوابات کے نقل بھیجے تھے - بیچارے میرن صاحب تو اپنے گھر سدھارے مگر ان کی یہ یادگار میرے پاس رہ گئی - اگرچہ ان میں سے بعض رقعے چھپ چکے ہیں مگر میر مہدی مجروح کے رقعات کے ساتھ ان کا لطف دوبالا معلوم ہوگا - نیز اس زمانے کی حالت ، باہمی تعلقات و محبت اور ان کے خیالات کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا -

اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ محبت و اخلاص ، البتہ ان کی باتیں یاد

۱- الناظر لکھنؤ ، جلد ۰ ۱ ، نمبر ۵ ۹ ، یکم مئی ۱۹۱۳ء ص ۱ - ۱۰

۲- میرن صاحب کے تعارف کے لیے رجوع کیجیے ، مضمون مولوی عبدالحق :

(i) اردو ، اورنگ آباد ، جولائی ۱۹۳۶ء ، ص ۳۷۰ - ۳۸۳

(ii) چند ہم عصر ، طبع کراچی ۱۹۵۹ء ، ص ۲۰۷ - ۲۲۳

۳- میر مہدی مجروح کے حالات کے لیے رجوع کیجیے :

۱- گل رعنا ، حکیم سید عبدالحی ، طبع ثانی اعظم گڑھ ۱۳۵۳ھ ، ص ۴۳۲ تا ۴۳۶ - ۲- تاریخ ادب اردو، سکسینہ، مترجمہ عسکری ، طبع لکھنؤ ۱۹۵۲ء، ص ۳۳۰ ، ۳۳۱ - ۳- تلامذۂ غالب ، مالک رام ، طبع اول ۱۹۵۷ء، ص ۲۵۲ تا ۲۵۵ - ۴- مضمون : سر شیخ عبدالقادر ، مخزن لاہور ، مئی ۱۹۰۳ء ، ص ۵۴ تا ۵۶ - ۵- حسرت موہانی ، اردوے معلی ، علی گڑھ جولائی ۱۹۰۳ء ، ص ۵۴ تا ۵۷ - ۶- وجاہت علی صدیقی جھنجھانوی ، مخزن لاہور ، مئی ۱۹۰۷ء ، ص ۹۵ تا ۹۶ - ۷- سید محمد فاروق ، العصر لکھنؤ ، جون ۱۹۱۲ء ، ص ۱۸۶ تا ۱۹۵ - ۸- محمد یحییٰ تنہا ، زمانہ کانپور ، ستمبر ۱۹۳۰ء - ۹- قضا جالندھری ، عالمگیر لاہور ، اکتوبر ۱۹۳۷ء - ۱۰- فرحت شاہ جہان پوری ، صحیفہ لاہور اگست ۱۹۵۹ء ، ص ۱۹۵ تا ۲۲۱ - ۱۱- فاضل زیدی ، پگڈنڈی امرتسر ، مارچ ۱۹۶۰ء -

رہ گئیں - شاید آپ کے ناظرین انہیں پڑھ کر مزا لیں اور دیکھیں کہ جس کے زور قلم اور قوت تخیل سے نہ صرف اُردو کو بلکہ خود صنف شعر کو ناز ہے ، معمولی سے معمولی باتوں میں بھی ایک بات پیدا کرتا ہے اور اپنے ملنے والوں سے کس محبت اور پیار سے پیش آتا ہے - یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی معمولی چیزیں ہیں جن سے انسان کے اصل کیریکٹر کا پتا لگتا ہے "۔

عبد الحق (۱)

۱- غالب ، تصانیف و نگارشات غالب یا تصانیف متعلق بہ غالب کے بارے میں مولوی عبدالحق مرحوم کے بعض بیانات کے سلسلے میں دیکھیے :

۱- رپورٹ انجمن ترقی اُردو، بابت جنوری ، مارچ ۱۹۱۴ء در ضمیمہ الناظر ، لکھنؤ مئی ۱۹۱۴ء - ۲- ایضاً ، بابت اپریل ۱۹۱۴ء در ضمیمہ الناظر لکھنؤ جون ۱۹۱۴ء ، بہ بعد صفحہ ۴۵ - ۳- اُردو ، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۱ء ص ۹ - ۴- اُردو ، اکتوبر ۱۹۲۱ء، ص ۶۳۹ - ۵- اُردو ، جنوری ۱۹۲۳ء ص ۱۴۸، ۱۴۹ - ۶- اُردو ، اپریل ۱۹۲۴ء، ص ۳۵۹ تا ۳۶۳- ۷- اُردو ، جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۵۰۱ تا ۵۰۴ - ۸- اُردو ، اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۳۷۹ - ۹- اُردو ، جولائی ۱۹۲۸ء، ص ۳۲۷ تا ۳۲۹ - ۱۰- اُردو، جنوری ۱۹۲۹ء، ص ۱۶۳ تا ۱۶۷- ۱۱- اُردو ، اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۱۷۹ - ۱۲- اُردو ، جولائی ۱۹۲۹ء- ص ۵۸۱، ۵۸۲ -۱۳- اُردو ، اکتوبر ۱۹۲۹ء، ص ۷۹۳، ۷۹۴- ۱۴- اُردو ، جنوری ۱۹۳۳ء، ص ۲۲۸ تا ۲۳۰ - ۱۵- اُردو ، جنوری ۱۹۳۴ء، ص ۱۹۴، ۱۹۵- ۱۶- اُردو ، اکتوبر ۱۹۳۵ء، ص ۴۱۴ - ۱۷- اُردو ، ۱۹۳۶ء، ص ۷۰۱ تا ۷۰۵- ۱۸ - اُردو ، جنوری ۱۹۴۰ء ، ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ - ۱۹ - اُردو ، اپریل ۱۹۴۲ء ، ص ۱۵۱ ، ۱۵۲ - ۲۰- اُردو ، اپریل ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۲ تا ۱۷۰ - ۲۱- اُردو ، اکتوبر ۱۹۴۴ء ، ص ۵۵۸ ، ۵۵۹ - ۲۲ - سرنامہ ، نادرات غالب (آفاق) ، طبع اول ، کراچی ۱۹۴۹ء ، ص ۳، ۴ - ۲۳- اُردو ، کراچی ، اپریل ۱۹۵۰ء ، ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ - ۲۴ - اُردو ، جولائی ۱۹۵۰ء ، ص ۳۰۷- ۲۵- اُردو، جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۴۱۴، ۴۱۵- ۲۶- اُردو ، جنوری اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۲۲۵ تا ۲۲۷- مقدمات عبدالحق (مرتبہ عبادت بریلوی)، لاہور ۱۹۶۴ء ، ص ۳۵۲ ، ۳۵۳-۲۸ - قومی زبان ، کراچی ، فروری ۱۹۶۷ء، ص ۷ تا ۹-

نامۂ غالب : (۱)

میر مہدی ! جیتے رہو ۔ آفرین ، صد ہزار آفرین (۲) ۔ اُردو عبارت لکھنے کا کیا (۳) اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ۔ سنو ، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے ۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی ، سو ایک ظالم ، پانی پتی ، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا ۔ میں نے اُس کو بحل کیا ، اللہ برکت دے ۔ میری (۴) پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کماحقہ سمجھ لو ۔ وللرحمٰن الطاف خفیہ ۔ ایک طرز خاص پر تحریک ہوئی ۔ سر رشتہ کی پابندی ضرور ہے (۵) ۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں

۱۔ رسالہ الناظر لکھنؤ ، جلد ۱۰ ، نمبر ۵۹ ، یکم مئی ۱۹۱۴ء (= الناظر) میں غالب و مجروح کے خطوں پر نمبر شمار ، مسلسل درج ہے ۔ الناظر میں با اعتبار ترتیب یہ تیسرا خط ہے ۔

۲۔ مجروح کے جس خط کی عبارت کی داد دی گئی ہے اور جس کے طرز تحریر پر غالب نے رشک کیا ہے ، افسوس کہ وہ ادب پارہ منظر عام پر نہیں آیا ۔ اسی خط کے بارے میں حالی نے لکھا ہے : '' اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں ، کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے ، مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے نا واقف ہیں ، وہ غلطی سے اُس کے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں ۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے ، ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر اُن کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے ، میری نسبت نہیں لکھا ، اُسی قدر اُن کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں از راہ کسر نفسی کے لکھتا ہوں ''۔ (یادگار غالب ، ص ۷۸ - ۱۷۷ ، طبع کانپور ، ۱۸۹۷ء)

۳۔ خطوط غالب ، مالک رام ، علی گڑھ ، ۱۹۶۳ء (= خم) میں ' کیا ' ندارد ۔

۴۔ خم : میرے ۔

۵۔ خم : '' سر رشتہ کی پابندی ضرور ہے '' ندارد ۔

شخص کی پنشن کے کل چڑھے ہوئے روپے (۱) یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ روپیہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر ، اپنی منظوری لکھ کر ، ہمارے پاس بھیج دو ، تا کہ ہم حکم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں ۔ یہاں (۲) اس کی تعمیل فوراً (۳) بطرز مناسب ہوگئی ۔ کم و بیش دو مہینے میں روپیہ سب مل جائے گا ۔

اور ہاں ، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو ۔ میں نے کہا : '' صاحب ، یہ کیسی بات کہ اوروں کو برس برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو ''۔ فرمایا کہ '' تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا ، اوروں کو یہ بات شاید (۴) برسوں میں میسر آئے گی ''۔ میں چپ ہو رہا ۔

آج دو شنبہ ، یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے ۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپیہ منگالوں ۔ ہر بار ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے ۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو ۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم ، یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں ۔

حاکم پنجاب کو گورنر بہادر کا یہ بھی حکم (۵) ہے کہ ' دستنبو ' منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے ۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب (۶) مجھ سے بھی کہہ کر مانگی اور میں نے دے (۷) دی ۔ اب دیکھوں ، حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے ۔

اس وقت تمھارا ایک خط ، اور یوسف میرزا کا ایک خط آیا ۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا ۔ اب میں

۱- خم : روپے کے ۔		۲- خم : سو یہاں ۔

۳- خم : ' فوراً ' ندارد [حاشیہ ع = تعمیل فوراً]

۴- خم : ' شاید ' ندارد ۔

۵- خم : پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے ... ۔

۶- خم : کتاب یہی کہہ کر ۔		۷- خم : ' دے ' ندارد ۔

روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میرن صاحب ، میر سرفراز حسین (۱) ، میر نصیرالدین کو دعا ۔ ۱۲ ۔ غالب ۔

[دو شنبہ ، یکم شعبان (۱۲۷۵ھ)، ہفتم مارچ (۱۸۵۹ء)] (۲) ۔

جواب مجروح : (۳)

قبلہ و کعبہ آداب بجا لاتا ہوں ۔ بھلا حضرت یہ آپ کیا فرماتے ہیں ، آپ کے طرز پر لکھ سکوں ۔ توبہ استغفراللہ — چہ نسبت خاک را با عالم پاک ۔ مہر عالم افروز کے سامنے ذرہ ناچیز کی کیا نمود اور بحر بیکراں کے روبرو قطرہ تنک ظرف کا کیا وجود ۔ یہ دعوی میاں ظہوری کریں ۔ یہ اندیشہ نظیری کو آوے ۔ میں بیچارہ کس حساب میں ہوں ۔ اللہ تعالی نے آپ کی ذات منبع کمالات کو اس فن میں یکتا پیدا کیا ہے ۔ ہاں ، اگر دو چار برس قدموں میں پڑا رہوں اور فضل و کمال کی طرح دروازے پر حاضر رہوں تو البتہ کچھ راہ پر آجاؤں ۔ سو یہ چرخ تفرقہ پرداز کب کسی کو اپنی مراد پر پہنچاتا ہے اور کب چاہتا ہے کہ دو آدمی حسب دلخواہ ایک جگہ مل بیٹھیں ۔

کچھ ان دنوں میں آپ ہی آپ جی گھبراتا ہے اور شوق قدم بوسی یہ ولولہ افگن ہے کہ چل اور خاک قدم کو صندل پیشانی کر ۔ اگر حضرت ، یہی صورت ہے تو دو چار دن میں حاضر ہوتا ہوں اور اختصاص قدم بوسی پاتا ہوں ۔ زیادہ حد ادب ۔ میر مہدی (۴)

۱- خم : میر سرفراز حسین مقدم ، میرن صاحب مؤخر ۔

۲- خط پر تاریخ سنہ وغیرہ درج نہیں ، لیکن خط میں کتاب 'دستنبو' کا ذکر آیا ہے جو پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپی ۔ دن ، ماہ اور تاریخ کا تذکرہ خط کے متن میں آ گیا ہے ۔

۳- الناظر میں باعتبار ترتیب چوتھا خط ۔

۴- میر مہدی مجروح کے اس خط پر بھی تاریخ درج نہیں ۔ غالب نے پچھلے خط [ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء] میں مجروح کی انشا پردازی کی داد دیتے ہوئے ، اپنے خاص اپنا طرز بتایا تھا ۔ مجروح نے اس کے حوالے سے جواباً انکسار کا اظہار کیا ہے ، گویا مجروح کا یہ خط ، نامہ غالب مورخہ ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء ہی کے جواب میں ہے ۔ اسی سے اس کا زمانہ تحریر قیاس کیا جا سکتا ہے ۔

نامہ ٔ غالب : (۱)

سید - خدا کی پناہ ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے (۲) کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے - ایک غریب سید مظلوم کے چہرہ ٔ نورانی پر مہاسا نکلا ہے ، تم کو سرمایہ ٔ آرائش گفتار پہنچا (۳) ہے - میری اُن کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو -

بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے - سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے - اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی - آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی - اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے - آج ۲۷ مارچ کی ہے ، پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں - آنچ ویسی ہی تیز ہے - خدا اپنے بندوں پر رحم کرے -

مجھ پر اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی ، اور کیسی بڑی خوشی دی ہے ! تم کو یاد ہوگا کہ ایک ' دستنبو ' نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر اور دوسری گورنر جرنل (کذا) بہادر کلکتہ (۴) کی نذر بھیجی تھی - آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا - وہ ہی کاغذ افشانی ، وہی القاب قدیم ، کتاب کی تعریف ، عبارت کی تحسین ، مہربانی کے کلمات - کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا -

پنشن کے ملنے کا بھی حکم آجکل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع بڑی ہے

۱- النّاظر میں باعتبار ترتیب آٹھواں خط -

۲- مجروح کا وہ خط ، یعنی جس کے جواب میں غالب انھیں یہ لکھ رہے ہیں کہ " سید ، خدا کی پناہ ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے ... " دیدنی ہوگا ' افسوس کہ منظر عام پر نہیں آیا -

۳- خم : ' بہم پہنچا ' -

۴- خم: " ... اور دوسری گورنر جرنل بہادر کلکتہ کی نذر بھیجی تھی " ندارد -

کہ گورنر جرنل (کذا) بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے - میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں - میر سرفراز حسین (۱) کو دعا کہہ دینا (۲) - غالب -

[۲۷ - مارچ ۱۸۵۹ء] (۳)

جواب مجروح : (۴)

قبلہ و کعبہ - کیا آپ نے میرن صاحب کو سچا بنایا ہے کہ مہاسا نکلے گا - پوڑے منہ ، مہاسے ، لوگ آئے تماشے - وہ ماشرا سادہ تھا کہ ان کے چہرے پر آگیا تھا - یہاں کے حکیموں نے تو جواب ہی دے دیا تھا کہ یہ دو چار دن کے مہمان ہیں ، مگر اللہ نے اچھا کیا کہ حکیم میر اشرف علی آئے ہوئے تھے ، انھوں نے دو فصدیں کھلوائیں ، ضمادات رادع کا استعمال کیا ، جب کچھ آدمیوں کی صورت میں آئے ہیں - آپ نے یہ ھنسی سمجھی ہوگی جو فرماتے ہیں کہ تم کو سرمایہ آرائش گفتار بہم پہنچا - لیجیے حضرت ، اب تو وہ اچھے ہو گئے ، چلتے پھرتے ہیں — اور حضرت گورنر جنرل بہادر کی سلسلہ جنبانی کا حال جو تحریر فرمایا ہے ، اس سے دل کو مسرت و فرحت بے اندازہ حاصل ہوئی -

اب اللہ یہ امید برلائے کہ اب کے خط میں یہ خبر آپ تحریر فرمائیں کہ روپیہ پنشن کا تو آکر خرچ ہرج میں آگیا اور عطیہ ملکہ معظمہ بھی صبح و شام آنے والا ہے - زیادہ حد ادب - میرن صاحب و میر نصیر الدین آداب عرض کرتے ہیں -

میر مہدی (۵)

۱- خم : میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین -

۲- اضافہ در خم : اور یہ خط دکھا دینا -

۳- تاریخ ۲۷ - مارچ کا ذکر متن میں آگیا ہے ، سال : ۱۸۵۹ء

۴- الناظر میں باعتبار ترتیب نواں خط -

۵- مہدی مجروح خط پر تاریخ درج کرنے کے عادی ہی معلوم نہیں ہوتے - ان کے خطوط کی تاریخوں کا تعین غالب کے خطوں کی روشنی ہی میں ہو پاتا ہے - یہ خط ، غالب کے خط مورخہ ۲۷ - مارچ ۱۸۵۹ء کے جواب میں ہے ، اس لیے ظاہر ہے اس تاریخ کے بعد کی کسی قریبی تاریخ کا ہوگا -

نامہ مجروح (۱) :

قبلہ و کعبہ سلامت ۔ بعد گزارش آداب ، عرض رسا ہوں ۔ حضرت ، نیام بے شمشیر ، کمان بے تیر ، چشم بے تنویر ، نغمہ بے تحریر ، قالب بے جان ، یعنی آپ کا بے خط کا عنوان پہنچا ۔ جس قدر لفافہ سر بستہ دیکھ کر دل کھلا تھا اتنا ہی کھول کر دل بند ہوا ۔ ادھر ٹٹولا ، ادھر الٹولا ، کچھ نہیں ۔ خط اصلاحی کو الٹا پلٹا ، شاید کہیں ایک دو سطریں لکھیں (کذا) ہوں ، وہ بھی ندارد ۔ یا اللہ یہ کیسا خط ، کہ خط ہے اور خط نہیں ۔ معلوم ہوا کہ یہ ظاہری کا لفافہ ہے اندر کچھ نہیں اور یہ صورت حامل معنی نہیں ۔

میرن صاحب کہتے ہیں جناب میرزا صاحب کا خط دکھاؤ ۔ میر اشرف علی کہتے ہیں مطلب سناؤ ۔ جن کو اردو کا شوق ہے ، اُن سے کہتا ہوں ، فارسی خط ہے کیا مزا اٹھاؤ گے ، جو فارسی کے خواہاں ہیں اُن سے کہتا ہوں اردو ہے ، دیکھ کے کیا نفع پاؤ گے ۔ واہ واہ حضرت ، خوب ہنسی کی ۔

اب یہ فرمائیے کہ آپ نے واقعی میں خط نہیں لکھا یا لفافے میں رکھنا فراموش کیا ۔ شق اول ، آپ کے الطاف بزرگانہ سے بعید ہے کہ اتنی مدت کے بعد میرا عریضہ جائے اور آپ سا شخص ، اُس کے جواب میں دریغ فرمائے اور شق ثانی میں اُمیدوار و منتظر ورود نوازش نامہ سمجھیے اور جلد ارسال کیجیے۔ زیادہ اور کیا سمع خراشی کروں ۔ فدوی میر مہدی مجروح ۔ (۲)

جواب غالب : (۳)

برخوردار کامگار میر مہدی ۔ قطعہ تم نے دیکھا ؟ سچ مچ میرا حلیہ

۱۔ الناظر میں باعتبار ترتیب یہ دسواں خط ہے ۔ ماہ نو کراچی ، شمارہ فروری ۱۹۵۰ء میں سید آفاق حسین آفاق دھلوی نے مجروح کے اسی خط کا قلمی عکس شائع کرایا ہے ۔ یہ متن قلمی عکس کے مطابق پیش کیا جارہا ہے ۔

۲۔ مجروح کے اس خط کے جواب میں غالب نے چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء کو خط لکھا (یہ آگے آتا ہے) ۔ مجروح کا یہ خط گویا اواخر جون یا اوائل جولائی ۱۸۵۹ء کا مکتوبہ ہے ۔

۳۔ الناظر میں باعتبار ترتیب گیارھواں خط ۔

ہے ۔ واہ ، اب کیا شاعری رہ گئی ہے ! جس وقت وہاں (۱) بھیجنے کے واسطے لکھا ، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں ۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان ، چلو کھانا تیار ہے ، ہمیں بھوک لگی ہے ۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے ۔ میں نے کہا ، اب خط (۲) کیوں لکھوں ۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر ، ٹکٹ لگا ، سرنامہ لکھ ، کلیان کے حوالے کر ، گھر میں چلا گیا ۔ اور ہاں ، ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے ۔ سو ، وہی ہوا تم نے جلے (۳) پھپھولے پھوڑے ۔ لو ، اب بتاؤ ، خط لکھنے بیٹھا ہوں ، کیا لکھوں ۔ یہاں کا حال ، زبانی میرن صاحب کی (۴) سن لیا ہوگا ۔ بے اصل (۵) باتیں ہیں ۔ پنشن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جرنل (کذا) بہادر کے پیش نظر ، یہاں کے حاکم نے اگر ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی ، میرا اس میں کیا ضرر ۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آگئے ۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا ۔ میں نے بکس بند کیا ، باہر تختوں پر آبیٹھا ۔ شام ہوئی ، چراغ روشن ہوا ۔ منشی میر (۶) احمد حسین سرھانے کی طرف مونڈھے پہ بیٹھے ہیں ۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیرالدین آیا ۔ ایک کوزا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ ۔ اس کے سر پر ایک ٹوکرا ۔ اس پر گھانس ہری بچھی ہوئی ۔ میں نے کہا ۔ اہا ہا ہا سلطان‌العلما ۔ مولانا سرفراز حسین دھلوی نے دوبارہ رسد (۷) بھیجی ہے ۔ بارے ، معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے ، یہ کچھ اور ہے ۔ فیض خاص نہیں ، (۸) لطف عام ہے یعنی (۹) شراب نہیں ، آم ہے ۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے ، بلکہ نعم‌البدل ہے ۔

۱- خم : جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں... ۔

۲- خم : کہ اب ، کیوں... ۔

۳- خم : ' جلے ' ندارد ۔   ۴- خم : کے ۔

۵- خم : مگر وہ جو کچھ تم نے سنا ہوگا بے اصل... ۔

۶- خم : ' سید ' بجائے ' میر ' ۔

۷- خم : ' رسید ' بجائے ' رسد ' ۔

۸-۹ خم : ' نہیں ' اور ' یعنی ' ندارد ۔

ایک ایک آم کو ، ایک ایک سر بمہر گلاس سمجھا ، لکور (۱) سے بھرا ہوا ۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے ! میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے ، پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے ، تا اُن کی برائی اوروں میں سرایت نہ کرے ، ٹوکرے میں سے پھینک دیے ۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہیں ؟ مگر میں تمھاری تکلیف و تکلف سے خوش نہیں ہوا ، تمھارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے ۔ خانہ آباد ، دولت زیادہ ۔

لکور کے معنی تم نہ سمجھے ہو گے ۔ (۲) ایک انگریزی شراب ہوتی ہے ۔ قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا ۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے ۔ ہاں فرہنگ سروری میں ہوں تو ہوں ۔ مجتہدالعصر کو (۳) اور حکیم میر اشرف علی کو دعا کہہ دینا (۴) میرن صاحب پوچھیں تو کہنا تمھیں کچھ نہیں لکھا ۔ مرقومہ' چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۰۹ء ۔(۵)
غالب ۔

نامہ' غالب : (۶)

بھائی ، کیا پوچھتے ہو ؟ کیا لکھوں ؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے (۷) ۔ قلعہ ، چاندنی چوک ، ہر روز (۸) مجمع بازار مسجد

۱- یعنی Liquor
۲- خم : "... کے معنی تم نہ سمجھے ہو گے" ندارد ۔
۳- خم : ' کو ' ندارد ۔
۴- خم : "... میر اشرف علی کو کہ وہ اُن کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں ، میری دعا کہہ دینا " ۔ میرن صاحب کا ذکر ندارد ۔
۵- خم : تاریخ ندارد ۔ اس طرح الناظر کے اس خط کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے کہ اس کی مدد سے غالب کے ایک خط کی تاریخ معلوم ہوتی ہے ۔
۶- الناظر میں ترتیب کے اعتبار سے پہلا خط ۔
۷- خم : ' ہے ' کی جگہ ' تھی ' ۔
۸- خم : 'روزہ' بجائے ' روز '

جامع کا ، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی ، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں ۔ پھر کہو ، دلی کہاں ؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا ۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے ۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں ۔ آگے کے دربار میں سات سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا ۔ جھجر، بہادرگڑھ ، فرخ نگر ، دوجانہ ، پاٹودی ، لوھارو ــ چار معدوم محض ہیں ، (۱) جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوھارو تحت حکومت ھانسی حصار ، پاٹودی حاضر ۔ اگر ھانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئیں (۲) تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس ۔ (۳) دربار عام والے ، مہاجن لوگ ، سب موجود ۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں ۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خان (۴) ، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خان ، (۵) بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد ۔ (۶) تینوں مردود و مطرود ، محروم و مغموم :

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو ، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

۱- خم: ' ہیں ' ندارد ۔

۲- خم: "... ھانسی حصار کا کمشنر ان دونوں کو یہاں لے آیا "۔

۳- خم : ' دربار ' سے پہلے ' اس ۔ رہے '۔

۴- نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی (۱۸۰۶ء - ۱۸۶۹ء) غالب کے مخلص دوست ، ممدوح اور تلمیذ ۔ رک: تلامذۂ غالب ، مالک رام ۱۹۵۷ء، ص ۱۷۷ تا ۱۹۱ ۔

۵- مفتی صدر الدین خان آزردہ (۱۷۸۹ء - ۱۸۶۸ء) مفتی اعظم ، صدر الصدور دھلی ۔ " ھندوستان نے اس جامعیت کے بہت کم شخص پیدا کیے ہیں "۔ [تلامذۂ غالب ، ص ۸۰]

۶- غالب کو دربار کا حق بعہد لارڈ ولیم بنٹنک (۱۸۲۸ء میں) اور خلعت کا اعزاز لارڈ الن برا کے عہد (۱۸۴۲ - ۱۸۴۴ء) میں حاصل ہوا ۔ [مالک رام ، ذکر غالب ، طبع چہارم ۱۹۶۴ء ، ص ۱۰۲]

تم آتے ہو ، چلے آؤ ۔ جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک ، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ ۔ بلاقی (۱) بیگم کے کوچے کا ڈھینا ، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ ، چلے جاؤ ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا ، حکیم الملک میر اشرف علی کو دعا ، قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا ، یوسف ھند میر افضل علی کو دعا ۔(۲)
غالب

جواب مجروح : (۳)

قبلہ و کعبہ ۔ آداب بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں ۔ حضرت اتوار نہیں ہوتا نہ ہو ، پھول والوں کی سیر موقوف ہو گئی ، بلا سے ۔ گزری نہیں جمتی ، چاندنی چوک کی وہ گرمیٔ بازار نہ رہی ، نہ سہی ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے ، دلی کی ہستی تو آپ کی ذات پر منحصر ہے ۔ جب آپ کو دیکھ لیا سب کو دیکھ لیا ۔ اگر غم ہے تو اس کا ہے اور گردش روزگار سے شکوہ ہے تو یہ ہے کہ آپ کی قدم بوسی سے محروم رکھا اور ملاقات ہر روزہ سے مایوس کیا ۔ نہ کسی کی صحبت خوش آئے ، نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہے ۔

ہر روز وہی ہنگامے پیش نظر رہتے ہیں اور وہی یاران جلسہ آنکھوں میں پھرتے ہیں ۔ ادھر یوسف میرزا غل مچاتے ہیں ، اُدھر سے یار عزیز چلے آتے ہیں ۔ کسی کونے میں اسد برج کھڑے ہیں ، کسی گوشے میں میاں موش خاموش بیٹھے ہیں ۔ برھما کے پتر کچھ الجھ الجھ کے سبق پڑھ رہے ہیں ۔ ادھر ادھر کے لوگ آئے ہوئے اطراف و جوانب کی خبر کم رہے ہیں ۔ میر احمد حسین میکش (۴) شوخی و ثقاہت میں ابریز گفتگوے بین بین میں سرگرم ، کسی کے چھیڑنے کے لیے نئی نئی تمہیدیں اٹھاتے ہیں ، کسی کو صاحب و قبلہ کم کے پاس بٹھاتے ہیں ۔

۱- خم : ' بولاقی ' ۔ ۲- خم میں وقت ، یوم اور تاریخ موجود : " مرقومہ ، صبح جمعہ ، ٦ جمادی الاول ، ۲ دسمبر سال حال [۱۲۷٦ ھ ، ۱۸۵۹ء]

۳- الناظر میں باعتبار ترتیب دوسرا خط ۔

۴- غالب کے شاگرد رشید ۔ ' فتح دھلی ' کے بعد ۱۸۵۸ء میں پھانسی کی سزا پائی ۔

کیوں حضرت وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیا خوب بسر ہوتی تھی ۔ ہر روز ہنسنے بولنے کا ہنگامہ گرم ، نہ کوئی اندیشہ نہ کوئی غم ۔ اب ان مزوں کا یہ بدلہ ہے کہ ہر ایک کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں اور ہر ایک کی جدائی میں بن آئے مرتے ہیں ۔ نہ یہ امید کہ پھر ایک جگہ مل بیٹھیں گے نہ یہ توقع کہ پھر ان صورتوں کو دیکھیں گے ۔ اب سیر و تماشا کی آرزو کسے ، اور وہ دل و دماغ کجا ۔ ایسا زمانے نے خاک میں ہمیں ملایا کہ پھر ہنسنے بولنے کی امید ہو :

تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں   ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں

خدا شاہد ہے کہ پہروں اسی فکر میں پڑا رہتا ہوں کہ پھر بھی وہ دن ہوگا کہ ایک جگہ چار ہم صورت اکھٹے ہوں ، کہ یہ چند روز حیات کے ، اگر بفراغت نہیں تو بغم ہی بسر ہوں ، مگر کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی ۔ اللہ مسبب الاسباب ہے ، اگر کوئی سبب نکالے تو کیا عجب ہے ۔

خیر حضرت یہ رونا تو تمام عمر کا ہے ۔ اب عرض یہ ہے کہ نواب گورنر آنے والے ہیں ، کچھ آپ کے مقدمے کی سلسلہ جنبانی ہوئی ؟ پنشن ملنے کی صورت نکلی ؟ یہ عقدۂ لاینحل بھی کبھی حل ہوگا یا میری خاطر کی طرح منعقد رہے گا ۔ میر اشرف علی اور میر نصیر الدین اپنے اپنے القابوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تسلیم بصد تعظیم بجا لاتے ہیں ، سوائے میرن صاحب کے ۔ انھوں نے اپنے خطاب سے بہت آنکھ بھوں چڑھائی اور کہا کہ جناب میرزا صاحب قبلہ بھی الھیں پرانی تشابیہ مستعملہ کا استعمال رکھتے ہیں ، جس کی سیکڑوں نے اپنے دوست آشناؤں کو نسبت دی ہے ، پھر میری خصوصیت کیا ہے — اور اس پر بھی لرا یوسف ہند ، اگر یوسف زمانہ یا یوسف کشور لکھتے تو بھی مضائقہ نہ تھا ۔ فقط زیادہ حد ادب ۔ فدوی ، سید مہدی مجروح ۔ (۱) از دھلی ۔ (۲)

۱۔ مجروح کے خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ، غالب کے جواب منقولہ بالا کی روشنی میں اسے ۲۔ دسمبر کے بعد اور ۱۳۔ دسمبر ۱۸۵۹ء سے چند روز پہلے کا خیال کرنا چاہیے ۔

۲۔ ' از دھلی ' محل نظر ہے ۔ ' پانی پت ' چاہیے ، جہاں مجروح انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد برائے چندے جا رہے تھے ۔

نامہ غالب : (۱)

میر مہدی :

صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں ، آگ تاپتا جاتا ہوں - آگ میں گرمی سہی ، مگر ہائے ، وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے ، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی - دل توانا ہوگیا ، دماغ روشن ہوگیا - نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا - ساقیٔ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب ! ہائے غضب ، ہائے غضب ! !

میاں ، تم پنسن ، پنسن ' کیا کر رہے ہو ؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں ! ڈپٹی کمشنر ، صاحب کمشنر ، لفٹننٹ گورنر بہادر ، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو ، تو اس کا مرافعہ گورمنٹ میں کروں - مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں ، تم کو پنسن کی فکر ہے - یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا - میں نے اس کا اپیل لفٹننٹ گورنر کے ہاں کیا ہے ، دیکھیے کیا جواب آتا ہے — بہر حال جو کچھ ہوگا ، تم کو لکھا جائے گا -

اجی ، وہ یوسف ہند نہ سہی ، یوسف دہر سہی ، یوسف عصر سہی ، یوسف ہفت کشور سہی — ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے - مجھے تو خبر نہیں ، کہیں حضرت کم گئے ہیں کہ ساڑھے سات روپیہ مہینا بھیجے جاؤں گا - اب اس کا تقاضا ہے - رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپی جان بھوکی مرتی ہیں ، خرچ جلد بھیجو ، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا - بہر حال میرن صاحب کو یہ حال پڑھوا دینا -

---

۱- مجروح کے خط کے جواب میں ، غالب نے جو خط لکھا وہ الناظر میں نقل نہیں ہوا - یہاں خم صفحہ ۳۱۱ و بعد کے حوالے سے درج کیا جاتا ہے - مجروح کے خط کے ساتھ ، غالب کا یہ جواب دو گونہ لطف دیتا ہے :

بے مے نکند در کف من خامہ روانی
سرد است ہوا ، آتش بے دود ! کجائی ؟

میر سرفراز حسین کو دعا ، میر نصیر الدین کو دعا ، حکیم اشرف علی کو دعا ، یوسف ہفت کشور ' کو دعا ۔ سہ شنبہ ، ۱۳۔ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء ۔

نامہ۶ : غالب (۱)

جان غالب ۔ تمھارا خط پہنچا ۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے (۲) ۔

ہر اک سے پوچھتا ہوں ، وہ کہاں ہے (۳)

مصرعہ بدل دینے سے یہ شعر کس رتبے کا ہوگیا ہے ۔ اے میر مہدی ، تجھے یہ کہتے (۴) شرم نہیں آتی ۔

میاں یہ اہل دھلی کی زباں ہے

اہل دھلی یا (۵) ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے (۶) ۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا ۔ ریاست تو جاتی رہی ، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں ۔

سنو (۷) خس کی ٹٹی ، پروا ہوا ، اب کہاں ، وہ لطف تو اسی مکان میں

۱۔ الناظر میں باعتبار ترتیب چھٹا خط ۔

۲۔ مجروح کے دیوان ' مظہر معانی ' طبع اول سرفراز پریس دھلی (ص ۱۶۷ ، ۱۶۸) میں سترہ اشعار کی یہ غزل موجود ہے ۔

۳۔ شعر یہ ہے :

نہیں لیتا ہوں ازرہ رشک سے نام
ہر اک سے پوچھتا ہوں ، وہ کہاں ہے

۴۔ خم : ' یہ کہتے ' ندارد ۔

۵۔ خم : '' ارے ، اب اہل دھلی '' ۔

۶۔ استاد کی اس تنبیہ پر مجروح نے شعر بدل کر مقطع کو یوں بنا دیا :

سخن گو ، یوں تو اک عالم ہے مجروح
مرے استاد کی پر کیا زباں ہے !

۷۔ خم : ' سنو ' ندارد ۔

تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگزرد ۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا ۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے ۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے ، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر کنووں کا حال دریافت کرنے گیا تھا ۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا ۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے ۔ یاد کرو میرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا ۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا ۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں ، باقی سب اٹ گیا ۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو ۔ اب (۱) کاکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک ایک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی (۲) واڑہ، رام‌جی داس گنج (۳) ، سعادت خاں کا کٹرہ ، جرنیل کی بی بی کی حویلی ، رام جی داس گودام والے کے مکانات ، صاحب رام کا باغ ، حویلی ، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا ۔

قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا ، اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی دوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا ، صحرائے کربلا ہوجائے گا — اللہ اللہ، دلی نہ رہی اور دلی والے تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد ۔ ارے بندۂ خدا ، اُردو بازار نہ رہا اُردو کہاں ؟

دلی ، واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کمپ ہے، چھاونی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر ، نہ لہر، رہے نام اللہ کا (۴) ۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام ؟ الگزنڈر ھڈرلی کا کوئی خط نہیں آیا ۔ ظاھراً اُن کی مصاحبت نہیں ، ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رھتا ۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیرالدین اور میرن صاحب (۵) کو دعا ۔ ۱۸۶۱ء۔

۱۔ خم: '' اب آھنی سڑک کے واسطے کاکتہ دروازے... ''۔

۲۔ خم: دھوبی ۔

۳۔ خم: رام جی گنج ۔

۴۔ خم: '' رہے نام اللہ کا '' ندارد۔

۵۔ خم: میرن صاحب مقدم ، نصیرالدین مؤخر۔

جواب مجروح : (۱)

قبلہ و کعبہ — آداب بجا لاتا ہوں ۔ بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے، اگر شرم آئے تو رجب علی سرور کو آئے، جس نے وہ لاف و گزاف کیا ہے کہ جیسا لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر ہی نہیں ۔ اُن سے کہنا چاہیے کہ ارے مرد خدا ، خدا سے ڈر ۔ لکھنؤ کس بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے، کون سی تاریخ میں وہاں کے لوگوں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے ؟ ماہیت تو اس کی یہ ہی ہے ناکہ مضافات صوبہ' اودھ میں کا ایک شہر ہے ۔ یہ دلی سے کیوں کر مقابلہ کرے گا کہ اگر پانچ سو برس کی تصنیفات دیکھو گے ، اُس میں سے بھی لکھا پاؤ گے ۔

حضرت دھلی کنف عدل و داد   جنت عدن ست کہ آباد باد

اُس پر یہ غرہ کہ جو یہاں کی زبان ہے ، وہ کہیں کی نہیں ۔ باوجودیکہ تفاخراً یہ شعر ناسخ نے لکھا ہے :

سن چکے ہیں خوب اردوے معلیٰ کی زبان
سالہا صحبت رہی ہے ہم کو ناسخ ، میر سے

اور یہ بات ظاہر ہے کہ میر ، دلی کے تھے ۔ مگر افسوس کہ ان کے پیرو اس بات پر خیال نہیں کرتے ۔

اے حضرت ، میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کو وہاں کی کون سی ایسی بات پسند آئی کہ ایسی طرف داری فرمائی ۔ قطع نظر زبان سے' تراش و خراش لباس بھی وہاں کی نرالی ہے ۔ واہ ری دلی ، تیرے قربان ، کیا حد اوسط پر سب کا عمل تھا کہ سب چیز افراط و تفریط سے مائل بحد وسط تھی ۔ کیوں نہ ہو ، خیر الامور اوسطہا پر سب کا عمل تھا ۔

بھلا حضرت ، یہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ وہاں سب طرح کے اہل کمال موجود ہیں ۔ بھلا دلی سے بھی زیادہ کہیں اہل کمال ہوں گے ۔ میاں امیر کے برابر لکھنؤ میں کون سا خوش نویس تھا ؟ حضرت غالب کی سی نظم و نثر کس کی ؟ امام الدین خان سا حکیم ، مولانا صدر الدین خان سا عالم، محمد اعظم

۱- الناظر میں ترتیب کے اعتبار سے ساتواں خط ۔

سا مصور ، بدرالدین خان سا مہر کند کہاں ہے۔ دستنبو کی طرح نواب گورنر بہادر نے کس کی تصنیف طلب کی ۔ بدرالدین خان کے مانند ملکہ' معظمہ کی مہر کھدنے لکھنؤ میں کون سے مہر کند کے پاس آئی ۔ خانم کے بازار کے وہ کاریگر جنھوں نے انگریزی اسباب بدل ڈالا اور نہ کسی کو معلوم ہوا ، یہ لوگ کہاں ؟ ۔ گو دلی اب اجڑ گئی اور سارا شہر برباد ہوگیا ، مگر اس شہر سے جس کی تعریف میں پہلے ہی میر حسن ، صاحب مثنوی یہ فرما گئے ہیں ، بہتر ہی ہے ۔

ز بس یہ شہر ہے پہاڑ پہ بستا کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

سیہ گل سے گلی یوں تر رہے ہے بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے

اگر دلی کی شہریت اور خوش قطعی کی تعریف کروں تو ایک کتاب بن جائے، خط سمجھ کر موقوف کیا ۔ فقط (۱)

میر مہدی مجروح

جواب الجواب از غالب : (۲)

او میاں سید زادہ' آزادہ ، دلی کے عاشق دلدادہ ، ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے ، حسد سے لکھنؤ کے برا کہنے والے ۔ نہ دل میں مہر و آرزو (۳) نہ آنکھ میں حیا و شرم ۔ نظام الدین ممنون کہاں ! ذوق کہاں ! مومن خان کہاں ! ایک آزردہ سو خاموش ، دوسرا غالب وہ بیخود و مدھوش، نہ سخنوری رہی نہ سخندانی ، کس برتے پر تتا پانی ۔ ھائے دلی ، وائے دلی ، بھاڑ میں جائے دلی ۔

۱- غالب کے اگلے پچھلے خطوں کی روشنی میں اس خط کو مئی ۱۸۶۱ء کا خیال کرنا چاہیے ۔

۲- الناظر میں باعتبار ترتیب پانچواں خط ۔

۳- خم : ' آزرم ' بجائے ' آرزو ' ۔

منشی صاحب ، پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خان ، ولد سردار خان ، ولد دلاور خان اور نانا اس احمد حسین خان کے ، غلام حسین خان ، ولد مصاحب خان ۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح و مفصل لکھو ۔ قوم کیا ہے ، معاش کیا ہے ، طریق کیا ہے ، لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے ، طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے ۔ بھائی ، خوب چھان کر لکھو اور جلد لکھو ۔ پنج شنبہ ۲۳- مئی ۱۸۶۱ء۔

غالب

غالب اور اس کا ماحول

ڈاکٹر وحید قریشی

غالب کی 'انا' شعری تصورات ، عشقیہ روایات اور عام زندگی کے مظاہر میں نمودار ہوتی ہے۔ ان کی اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ تیس برس کی عمر تک مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد اس میں قلیل اضافہ ہوا۔ مرزا کی فارسی شاعری کا آغاز پچیس برس کی عمر کے قریب ہوا لیکن اس میں کا غالب حصہ قیام کلکتہ کے بعد کی یادگار ہے۔ اردو کلام کو عنفوان شباب کا اور فارسی شاعری کو بعد کے ادوار کا حاصل سمجھنا چاہیے۔ فارسی شاعری میں ان کے مزاج کی ہمواری اور استواری کے نشان زیادہ ملتے ہیں۔ ابتدائی اردو کلام میں ان تماثیل اور استعارات و تشبیہات کی کثرت ہے جو بیدل اور صائب ، ناصر علی ، جلال، اسیر وغیرہ کا سرمایۂ خاص ہیں۔ آئینہ ، طوطی ، آسیا ، سیلاب ، پنبہ ، پروانہ ، شمع ، لگن ، سرو چراغاں ، شعلہ و آتش ان کی فکری متاع کے اظہار کے خارجی پیرائے ہیں۔ غالب سے قبل کا ادبی ماحول در اصل زندگی اور اس کے اظہار کے مخصوص سانچوں کا دور ہے۔ جب تحریک شعری ایک پیچیدہ فکری نظام سے متصادم اور مرتے ہوئے معاشرے کی افتاد سے نبرد آزما اور خارج از ذات وہمی اور حسی تشبیہوں کے تار و پود کو بنانے سنوارنے میں مصروف تھی ، ایسے میں کہ خارجی زندگی مثبت عمل سے محروم ہو رہی تھی ، عمل و حرکت کا واحد وسیلہ غیر ذات کا ادراک اور معاشرے کے تصوراتی اور مثالی نمونے کے بیان تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ بیدل کے مابعدالطبیعیاتی تصورات، غنی کاشمیری کے اخلاقی درس اور صائب کی مقولہ سازی کی تہ میں خارجی زندگی کی بے پناہ یورش سے بچ نکلنے کا رجحان قوی ہے۔ یہ اخلاقی درس و تدریس ، سعی و عمل کو یا تو فرد کی روحانی ترقی پر صرف کرنے کے کام آرہی تھی یا پھر زندگی کی خارجی بے عملی کو داخلی عمل کے

واسطے سے پہچاننے کی مجبوری قرار دی جا سکتی ہے۔ ان شعرا میں بیدل زیادہ بیدار شعور کا مالک ہے لیکن بیدل کا زندگی کے جمود کو عمل اور حرکت کے پیمانوں میں پیش کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ در اصل ایک ایسے آدرشی معاشرے کی نشان دہی کر رہا ہے جس کا رشتہ خارج سے بہت کمزور ہو چکا ہے۔ معاشرتی زندگی کی یہ تصویر در حقیقت خارج میں اپنا وجود کھو چکی ہے، اس کا عمل اور اس کی قوت نمو کا دائرہ کار محض در و دیوار کا تحرک اور اس کا اضطراب فقط سیلاب کا اضطراب ہے۔ سیلاب و آسیا کے استعارے انسانی زندگی کو کائنات سے الگ کرکے انسان کو مجبوری و بے چارگی کے ساحل پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ طوطی و آئینہ زندگی کی متصوفانہ توجیہ کے علاوہ حیرت و حیرانی کا استعارہ ہے۔ یہ حیرت اور یہ حیرانی روحانی ارتقا کا اشارہ ہی نہیں، خارجی زندگی کی حیرت و حیرانی کا ایک داخلی جواز بھی ہے۔ اس خوفناک صورت حال کو بیدل جیسے حساس اور بیدار شاعر نے جب اپنی گرفت میں لیا تو اس کی تصویر کاری حقیقی زندگی کا بدل ہو کر رہ گئی۔ انسان کی قوت تسخیر حقیقی زندگی میں قابل عمل نہ تھی، تخیلی زندگی میں اس کے لیے متحرک تصاویر و تماثلات کا مرکز بن گئی۔ حیرت و حیرانی کی یہ حالت انسان کو گرد و پیش پر نگاہ ڈالنے پر مجبور کرتی ہے تو اس کے کام وہ ذخیرہ الفاظ آتا ہے جس کا تعلق انسانی نظر کے ساتھ ہے۔ دیدہ و نگاہ کی کافر سامانیوں کے وسیلے سے متحرک تصاویر (Motor Imagery) شاعر کی کارگاہ خیال میں نمودار ہوتی ہیں۔ غالب کے ہاں بھی دید، دیدہ، عید نظارہ، جلوہ گل، دیدہ یعقوب، چشم حسود، نگاہ آفتاب، بہار نظارہ کی کثرت اسی فکری سانچے میں خلق ہوئے ہیں۔ انسان اپنی ذات کو خارجی عوامل کے وسیلے سے پہچانتا ہے، غالب نے بھی جس مخصوص ماحول میں ایغو (Ego) کی تشکیل کی۔ اس میں ان شعری روایات کا حصہ بھی ہے جو غالب کے زمانے سے قبل کی ادبی فضا میں زندہ تھیں اور جن میں خود غالب نے پرورش پائی۔ غالب زندگی کی حرکت اور عمل کو بیدلیت کی سطح سے دیکھتا ہے جس میں شعری تمثالات (Images) کا تحرک خارجی زندگی کی بے عملی کی تلافی کرتا ہے۔ غالب کی یہ تلافی خارجی حالات کے خلاف شدید مقاومت کا داخلی بیان ہے:

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیٔ عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے

عمل اور حرکت سے متعلق ذخیرۂ الفاظ کی کثرت غالب کی 'انا' کو مثبت راستوں پر بھی گام زن کرتی ہے۔

مرزا کی ابتدائی زندگی ایک یتیم بچے کی زندگی ہے جو کبھی چچا کے ہاں پرورش پاتا ہے، کبھی نانا کے دسترخوان کا زلہ ربا ہے، کبھی سسرال کا دست نگر ہے۔ اپنی ذات کی حفاظت کے لیے نئے حصار تعمیر کرنے کی ضرورت بہر حال ہر انسان کو پڑتی ہے۔ غالب کی 'انا' اپنے حقیقی زمانے سے نکل کر ماضی کی طرف رجوع کرتی ہے تو اجداد کی عظمت کا احساس انہیں کچھ زیادہ ہی شدت پر مجبور کرتا ہے۔ وہ جس متوسط طبقے میں پیدا ہوئے، اس کے لیے ان کی پنشن کافی تھی، لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ عمر بھر انھیں اپنے اجداد بعید کی عظمت، خاندان کی قدیم دولت، رتبے کی از دست رفتہ وقعت اور شان و شوکت کا بہت پاس رہا۔ اس دھندے میں ان کی اپنی مالی حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ آخر عمر تک وہ معاشرے میں اپنی اصلی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس سے ان کی زندگی اور ان کی آرزو کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ یہی ان کی بدنصیبی کا سبب بھی ہے اور اسی میں ان کی عظمت کا راز بھی مخفی ہے۔

آرزو کو بلند سے بلند تر مقام پر فائز کرتے ہوئے مثبت حالت میں غالب اپنی 'انا' کے لیے اعتماد کی دولت، طنز و مزاح کی چاشنی اور نشاطیہ کیفیات کی جلوہ گری کو اپنی نفسی توانائی کے لیے ایک حفاظتی والو (Safety Valve) کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اس مثبت روش نے ان کی شاعری میں خلوص و اعتماد، زندگی پر گہری نظر ڈالنے اور تجربات کی نوعیت متعین کرنے، کٹھن حالات میں زندگی کو بسر کرنے کا شعور، اپنے تجربات کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی سکت آ گئی :

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

غالب کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے حسب نسب نے بہت حصہ لیا ہے ۔ ان کے اجداد ترک تھے ۔ بیدل کے اجداد بھی ترک تھے ، امیر خسرو بھی ترک تھے ، ابو ظفر بہادر شاہ کے آبا و اجداد بھی ترک ۔ غالب کی اس پسند کے دوسرے عوامل بھی یقیناً ہوں گے لیکن غالب کو ان شخصیتوں سے ایک لگاؤ تھا ۔ دیگر شخصی اور غیر شخصی عوامل کے علاوہ ان کی پسند کا رخ متعین کرنے میں اس مناسبت کو بھی دخل معلوم ہوتا ہے ۔ وہ پاک و ہند کے فارسی شاعروں میں صرف خسرو کو سند مانتے ہیں ، آخر کیوں ؟ وہ ہندی نژاد شاعروں میں سے بیدل کی طرز کو اپناتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں ، آخر کس لیے ؟ وہ بادشاہوں کی تعریف کو بھٹی گری جانتے ہیں ، لیکن ابو ظفر بہادر شاہ کی تاریخ نویسی کی خدمت کو محض سرکاری نوکری کے طور پر نہیں بجا لاتے بلکہ اس کے وسیلے سے ترکوں کے نظریۂ تاریخ کو بیان کرتے ہیں اور اپنے

نسلی تعصب کے بھرپور اظہار سے بھی نہیں باز آتے (۱) - مہر نیم روز صرف مغلیہ تاریخ ہی نہیں ترکوں کے علم الانساب کی دستاویز اور غالب کے تعصب نسلی کی واضح شہادت بھی ہے - غالب کے ان اثرات کو قبول کرنے میں دوسرے عناصر کو بھی دخل ہوگا لیکن اپنے مزاج سے ہم آہنگی کے لیے انہوں نے ان اثرات کا ایک داخلی رشتہ اپنی ذات سے بھی استوار کیا - نسلی برتری پر فخر و ناز غالب کے مزاج کا خاصہ ہے -

محمد شاہی عہد میں غالب کے دادا دلی میں وارد ہوئے - وہ ترکی جانتے تھے لیکن اس کے بعد محمد شاہ فرمان روائے عہد کی طرح اس خاندان پر بھی ترکی تمام ہوگئی - فارسی زبان اور مقامی روایات نے خاندان کی تربیت کی - غالب تک آتے آتے آبائی وراثت کا تھوڑا حصہ باقی رہا تھا - غالب کی تربیت جس معاشرے میں ہوئی وہ آگرے اور دلی کی فضا ہے ، اس میں ابھی فارسی کی ساکھ باقی تھی - غالب نے اسی فضا میں آنکھ کھولی اور فارسی اور اردو کے علمی و ادبی سرمائے سے استفادہ کیا - اس زمانے میں فارسی ادب میں دو مکتبہ ہائے خیال موجود تھے - ہندی ایرانی نزاع نے مقامی اور ایرانی کا امتیاز قائم کیا - غالب کے حلقۂ احباب میں نواب حسام الدین حیدر کا گہرانا اثر انداز معلوم ہوتا ہے ، شاید اسی خانوادے کے زیر اثر غالب اپنے آبائی فرقے کو چھوڑ کر شیعیت کی طرف راغب ہوئے - غالب مقامی سے زیادہ ایرانی عناصر کے والہ و شیدا تھے - ان کے شعری نظریات پر اس نقطۂ نظر کا نمایاں اثر ہے - ایران پرستی کلکتے میں جا کر اور بھی تیز ہوئی ، جب وہاں ہندی دبستان کے شیدائی غالب کے فارسی کلام پر معترض ہوگئے - غالب کی انا نے اس کا انتقام یوں لیا کہ آیندہ کے لیے اردو کو تقریباً ترک کرکے فارسی شاعری میں عمر کا بیشتر زمانہ صرف کر دیا - وہ اردو کی بجائے فارسی پر ناز کرتے ہیں :

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

انہیں فرزند آذر کہلانے پر بھی فخر ہے اور دین بزرگان سے گریز ان کے نزدیک ایک اعلیٰ قدر ہے :

۱- اردوے معلیٰ ، غالب نمبر ، فروری ۱۹۶۰ء ، حصہ اول ، ص ۴۷ تا ۵۹ ، مقالہ بعنوان " غالب اور مغل شاہان دہلی کا تاریخی نظریہ " از ڈاکٹر محمد اشرف -

با من میاویز اے پدر، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگاں خوش نکرد

ایران کی طرف رغبت کا یہ مسلک صرف مذہبی عقاید کی حد تک نہیں، غالب نے اسے زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی کر رکھا ہے۔ اردو اور فارسی کلام میں آگ اور اس کے متعلقات کی یہ کثرت غالب کے فکری نظام میں بہت دور تک جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شمع، شعلہ، زبانہ، لالہ، خون، ناخن، خون شہیداں، بسمل، دست حنا، سرخ رنگ سے یہ لگاؤ غالب کی زندگی کے بعض جذباتی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے:

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری' قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

موج خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

بزم ترا شمع و گل خستگیٔ بو تراب　　ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

بیخود بوقت ذبح تپیدن گناہ من　　دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

عجب نشاط سے جلاد کے، چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو
جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

غالب کے ہاں بعض الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ رنگوں میں ان کی Fixation سرخ ، سبز اور سیاہ رنگ کے ساتھ ہے۔ ان میں سرخ و سیاہ کو بہت اہمیت ہے ۔ خون اور اس کے متعلقات کا غالب کی جنسی زندگی سے کیا رشتہ ہے؟ ان کی جنسی زندگی کی تفصیلات معلوم نہیں ، اس لیے ان علامتی الفاظ کے جنسی سیاق و سباق سے قطع نظر شہدائے کربلا کی شہادت اور اپنی مظلومی کے درمیان معنوی رشتے کی تلاش و جستجو غالب کو سرخ رنگ سے وابستہ رکھتی ہے۔ غالب کی خود رحمی کی یہ ایک رفیع صورت ہے جس میں وہ اپنی زندگی کے معمولی واقعات کو واقعات کربلا سے مماثل کر دکھاتے ہیں ۔ شہادت ، خون شہیداں ، بسمل کے تلازمات غالب کے ذاتی کرب کا وہ اظہار ہے جس کی جھلکیاں ہمیں لکھنوی دبستان کے شعرا کی غزلوں میں ملتی ہیں ۔ لیکن غالب کی سرخ رنگ سے چسپیدگی اس کے علاوہ بھی توجہ طلب نکات رکھتی ہے۔ ان کے ہاں سرخ رنگ کا ایک رشتہ سیاہ رنگ کے ساتھ بھی ہے، وہ سرخ کو سیاہ میں تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں ۔ سرخی کا انجام روشنی نہیں تاریکی ہے۔ لہو کا شہادت تک ، بسمل کا مرگ تک ، حنا کا داغ تک ، گل لالہ کی چمک دمک کا داغ لالہ سے ، روشنی کا دھوئیں سے ربط اور خون کا تاریکی سے ایک سلسلہ قائم ہے:

ہزاروں دل دیے جوش جنون عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

شمع کی لو غالب کو اس لیے اچھی لگتی ہے کہ وہ بالآخر بجھ جاتی ہے یا جل جاتی ہے۔ بجھنا اور جل کر رہ جانا غالب کے نزدیک ہر زندہ شے کا مقسوم اور ہر التہاب کا انجام ہے:

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے(۱)

محبوب کے سراپا میں بھی انھی رنگوں کی آمیزش غالب کے لیے دلچسپ
کا سامان ہے۔ ان کی ' انا ' اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اپنے کلام مے
محبوب کے پیکر سے انسانی اور گوشت پوست کا تعلق رکھتے ہوئے بھی اس
پوری تصویر قاری کو کبھی نہیں دکھاتے۔ کبھی کبھی تو محبوب غال

۱۔ نفسیاتی طور پر تاریکی رحم مادر کی علامت بھی ہے۔ قفس اور ک
قفس کے تلازمات بھی غالب کے ہاں زندگی اور زندگی کے اس تعلق کا اشارہ ہیں

نشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

بیضہ آسا تنگ بال و پر یہ ہے کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

اس تاریکی کا رشتہ غالب کی نفسیاتی چسپیدگی (Fixation) سے ب
ہے۔ کیا غالب کے ہاں یہ علامت محبوب کی زلف سے غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ
ہے یا خون ہی کی ایک حالت متغیرہ سے لگاؤ کا نتیجہ ہے؟ یا محبوب کی س
رنگت سے اس کے بارے میں قطعیت سے اس وقت تک کچھ کہنا ممکن نہ
جب تک غالب کی زندگی کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل نہ ہوجائیں
رحم مادر، خون اور تاریکی کا باہمی تعلق جس صورت حال کی طرف اشارہ کر
ہے، زیر نظر مقالے میں اسی کو ممکنہ صورت حال قرار دیا گیا ہے۔

کی ذات کی Projection کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ محبوب خارجی وجود رکھتا ہے ، اس کے جسمانی پہلو اور حرکات و سکنات غالب کو مرغوب ہیں ۔ اس کے خرام ناز ، اس کے اعضا ، اس کی نزاکت اور حیاداری ، اس کا چہرہ ، اس کے گال ، اس کی زلفیں ، اس کی آنکھیں غالب کو پسند ہیں ۔ وہ اس کے شباب کی دل آویزی کے بھی قدر دان ہیں ، لیکن کلام غالب کی مدد سے اگر آپ غالب کے محبوب کی تصویر بنانا چاہیں تو وہ ازحد دھندلی اور مبہم ہوگی (۱) ۔ غالب عشق و محبت میں اپنی ذات کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔ وہ محبوب کے سراپا سے زیادہ اس کے بارے میں تعمیمی رویے کو اہم جانتے ہیں ۔ محبوب کے احساسات کو بیان کرنے کی بجائے محبوب کو محض اپنے داخلی کوائف کے سہیج کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ ان کی ' انا ' آپ اپنی رقیب بھی ہو جاتی ہے :

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

وا کردیے ہیں شوق نے بند قبائے حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اسی سیاہی کی وجہ سے غالب کو نامہ بر اور نامہ وغیرہ سے بھی تعلق خاطر ہے :

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے : نقد غالب ، مقالہ بعنوان ''غالب کا تصور حسن و عشق'' از حمید احمد خاں، ص ۷۶ تا ۱۱۸ ۔

سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

غالب کا محبوب اس کے جذبات و ہیجانات کا عکس ہے۔ اس عکس میں غالب اپنا چہرہ دیکھتے رہتے ہیں ۔ ایسے میں وہ صرف وہی نقش ابھارتے ہیں جو ان کے ذاتی میلانات سے مطابقت رکھتے ہیں ۔ انھیں سرخ رنگ پسند ہے۔ یہ سرخ رنگ اپنی رو بہ تغیر صورت میں سیاہ رنگ میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

غالب محبوب میں بھی سرخ و سیاہ کی فراوانی تلاش کرتے ہیں ۔ خون بسمل ، پنجۂ مرجان اور شرار و سنگ بھی علامتی حیثیت رکھتے ہیں ۔ فرد کی جذباتی زندگی سے ایک سے زیادہ رشتے علامت کا بنیادی وصف ہے۔ یہاں بھی ان علامات کے کئی رخ ہو سکتے ہیں ۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ان کا ایک غیر محسوس رشتہ متضاد رنگ یعنی سیاہی سے بھی ہے۔ خون بسمل کا شہادت سے ، موت کا قبر سے ، لالے کا داغ سے ، دل کا داغ دل اور سویدائے دل سے ، نرگس کا چشم سے مردمک چشم کی مناسبت سے ، خوشی کا غم سے ، نشاط کا رلج سے ایک ایسا رابطہ ہے کہ غالب اکثر دونوں حالتوں کا ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں ۔ غالب کی ایران پرستی ثنویت کے جس پیچاک میں اسیر ہے ، اس کا لازمی رشتہ تقابل اور تضاد کی اس دھوپ چھاؤں کے ساتھ ہے۔ غالب سرخ رنگ کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ اس میں سیاہ رنگ میں تحلیل ہو جانے کی صلاحیت ہے۔ اس لحاظ سے سرخ و سیاہ کا یہ باھمی ربط جنسی زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ روشنی انھیں عزیز ہے کہ وہ تاریکی سے دست و گریباں ہے۔ جنسی روابط کا مرکز سرخی سے سیاہی کی طرف ایک علامتی سفر ہے اور غالب کا کلام ان کی زندگی کے اس پہلو کا عکاس ہے :

رخسار یار کی جو کھلی جلوہ گستری زلف سیاہ بھی شب مہتاب ہوگئی
موج تبسم لب آسودۂ مسی میرے لیے تو تیغ سیہ تاب ہوگئی

ان جنسی علامتوں کا تعلق غالب کے تہذیبی افق سے بھی ہے ۔ ان کے ہاں یہ علامات اپنے تضاد کی وجہ سے بھی پرکشش ہیں ۔ ایران دوستی ان کے تصورات کی متضاد کیفیتوں کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔ غالب کے

تصورات حسن و عشق بھی روایتی راستوں سے ہٹ کر ' انا ' کے داخلی مسائل سے ہم آہنگ ہیں ۔ فارسی اور اردو کے مروجہ تصورات حسن کو خیر باد کہہ کر غالب محبوب میں سرخ و سیاہ کے ڈانڈے یوں بھی ملاتے ہیں کہ ان کا محبوب روایتی محبوب کی بجائے ایک ستم پیشہ ڈومنی ہو جاتا ہے ۔ کیا غالب کے ہاں محبوب کا رنگ ان کے نفسی رجحانات کا مرکزی نقطہ ہے ؟ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بظاہر حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے :

رچ گیا جوش صفائے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ ، اے ظالم سیہ فامی تری

غالب کا تصور محبوب سیاہی اور تاریکی سے کسب حسن کرتا ہے ۔ غالب کو محبوب کی زلفیں اس لیے عزیز ہیں کہ وہ سیاہ رنگ کی ہیں ۔ مژگان بھی سیاہ ہیں ، آنکھ کی پتلی سیاہ ہے ، سایہ بھی سیاہ ہے ، چشم دنبالہ دار بھی اپنی سیاہی کی وجہ سے پسندیدہ ہے ، اس لیے محبوب کے سراپا کی جو معمولی سی جھلک کلام غالب میں ملتی ہے ، اس میں تاریکی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے :

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

غالب، تصور محبوب روایت سے نہیں اپنی خارجی زندگی اور داخلی نفسی کوائف سے حاصل کرتا ہے ۔ اس طرح اس کی انا کو صحت مند راستہ مل گیا ۔

غالب روایتی تصورات حسن و عشق کا مخالف ہے ۔ وہ عشقیہ تصورات کو بھی اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک ذاتی تجربے کی مدد سے اس کے حسن و قبح کا جائزہ نہیں لے لیتا ۔ وہ بنے بنائے شعری تصورات کا مخالف ہے ۔ غالب کی قوت مقاومت کا میدان خاصا وسیع ہے :

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شنیدہ ام کہ بہ آتش نسوخت ابراہیم
بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

تماشائے گلشن ، تمنائے چیدن　　بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم

حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری آہ بہ سینہ بنگری

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے　　نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

ماحول سے مسلسل بر سر پیکار رہ کر غالب نے اپنی ' انا ' کو یوں مستحکم کر لیا کہ آرزوؤں اور امنگوں کی سطح گرد و پیش کی میسر شدہ آسایشوں سے بہت بلند اور ارفع ہو گئی :

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مری ہستی فضائے حسرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

بیاو جوش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

اپنے ماحول سے آمادۂ جنگ رہنے کی وجہ سے غالب کی زندگی مسلسل کشمکش، مسلسل اضطراب اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ اس سے ان کی ایغو (Ego) کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی آبیاری ہوتی رہی۔ کچھ رجحان سقیم ہیں اور کچھ صحت مند۔

غالب ۱۸۲۶ء میں کلکتے گئے۔ ان کی ابتدائی دھلوی زندگی معاشی آسودگی میں بسر ہوئی تھی۔ جاگیردارانہ نظام کی مہیا کردہ آسایشیں اور لہو و لعب کے وہ سارے حیلے جو جسمانی اور ذہنی تسکین کے لیے فرد کو اس کے معاشرے سے ہم کنار کرنے کا باعث ہو سکتے ہیں، غالب کو بھی میسر تھے۔ عیش و عشرت میں جوانی کو بسر کرکے غالب نے اپنے لیے امارت اور فارغ البالی کا جو نمونہ تراش لیا تھا، وہ انھیں عمر بھر ایک آسیب کی طرح پریشان کرتا رہا۔ نواب احمد بخش خان کی گوشہ نشینی (۱۸۲۶ء) اور خانگی معاملات کی پیچیدگی نے غالب کو زندگی کی جدوجہد کے دوراھے پر لا کھڑا کیا۔ ان میں بزور اپنا حق طلب کرنے کا احساس بیدار ہوا اور اس فعال قوت نے ان کے ھاں ذھنی اور عملی دونوں لحاظ سے ایک طوفانی سرگرمی کا آغاز کر دیا۔ وہ قانونی چارہ جوئی کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے۔ اس سے قبل وہ جذباتی آشوب سے دو چار ہو چکے تھے۔ ایسے میں کلام میں بے چارگی، بے بسی، خود رحمی اور غم کی فضا جھلکنے لگی تھی۔ ۱۸۲۶ء کے گرد و پیش کی غزلوں میں حالات کے سامنے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اعتراف اور ناکامیوں پر آنسو بہانے کا طریق زیادہ جاذب ہے:

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

غم کی تلخی کو اس انداز میں قبولنے کے لمحات بھی غالب پر اپنا اثر چھوڑ گئے جب پنشن کے مقدمے میں ناکام ہوئے اور انھیں قرض کے ایک مقدمے میں خانہ نشینی پر مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح کا شدید دور آخری عمر میں بھی آیا تھا جب انھیں ۱۸۵۷ء کے بعد طرح طرح کے مالی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ قاطع برہان کے قضیے میں الجھنا پڑا اور قرض خواہوں کے ھاتھوں سخت عذاب کا سامنا ہوا۔

ان تین ادوار میں غالب کی شخصیت انھیں بے بسی اور بے چارگی کے حصار میں مقید کر دیتی ہے اور وہ اپنے کلام میں گریہ و شیون کا سا انداز اختیار کرتے ہیں، لیکن عام طور پر ان کی ' انا ' انھیں مثبت انداز میں

مقاومت کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اپنی ذات سے اس طرح کی نفرت کا احساس صرف وقتی ہے:

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت میں اوقات سے ہے

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ایسے میں بعض اوقات غالب اپنے غم کو دوسرے کا غم قرار دے کر تسکین کا موقع ڈھونڈتے ہیں:

شورش باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ وہ
شیون دل یک سرود خانۂ ہمسایہ ہے

لیکن بالعموم غالب کی قوت مدافعت حالات سے ٹکرانے اور برسر پیکار ہونے ہی میں مسرت محسوس کرتی ہے۔ وہ عموماً زندگی سے مفاہمت کی بجائے مقابلے کی خواہش رکھتے ہیں۔ عمل، حرکت اور حرارت انہیں زندگی کا حاصل معلوم ہوتی ہے۔ وہ حیات میں حرکت و تموج کے خواہاں ہیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

گرد باد رہ بے تابی ہوں   صرصر شوق ہے بانی میری

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا غالب کی 'انا' مجموعی اعتبار سے انہیں حزن و یاس کے سمندر میں غرق کر دیتی ہے یا وہ زندگی کی ہر مثبت قدر کی نفی کرتے ہوئے زندگی کے بارے میں ایک معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔ غالب کی زندگی سیدھے خط سے عبارت نہیں، اس میں مد و جزر ہیں۔ غالب اپنے اردو اور فارسی اشعار میں عقلی سطح کو جذباتی سطح پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں زندگی کو تعقل کی مدد سے سمجھنے کا شعور پایا

جاتا ہے ۔ یہ ہوش مندی غالب کو مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں گم نہیں ہونے دیتی ۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو ایک با شعور شخص کی طرح دیکھتے ہیں، اس سے ان کے تجزیات میں گہرائی اور ان کے نقطۂ نظر میں ہوش و خرد کا رنگ زیادہ ظاہر ہوتا ہے ۔ لیکن میری دانست میں عقل کی یہ کارگزاری کسی ٹھوس فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ نہیں ۔ غالب بنیادی طور پر جذباتی شخص ہیں ۔ ان کی عقلی سطح در اصل ان کی زندگی کی جذباتی افتاد ہی کی ایک منقلب صورت ہے ۔ میرا قیاس یہ ہے کہ غالب زندگی کو جذبات کے راستے سے دیکھتے ہیں اور اس کی فلسفیانہ تعبیر اور تشریح بعد میں کرتے ہیں ، اس لیے ان کے ہاں جذبات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ عقلی فیصلے بھی مختلف ادوار میں مختلف طرح بیان ہوئے ہیں ۔ آپ اسے ان کی فکر کا تضاد کہیے یا ان کی متحرک زندگی کا سیماب یا لاوا ۔ وہ کسی منطقی فیصلے کو زندگی کا آخری فیصلہ نہیں جانتے ۔ جب حالات کے دباؤ سے ان کی انا کو صدمہ پہنچتا ہے تو وہ بھی زندگی کو آنی و فانی مانتے ہیں اور اپنے غم کو کبھی غفلت کے رویے سے ، کبھی فرار سے، کبھی تسلیم و رضا سے ، کبھی نفرت و حقارت یا طنزو ظرافت سے ، تاری پر چھا جاتے ہیں ۔ وہ در اصل کیفیات (Moods) کے شاعر ہیں ۔ ان کی جذباتی زندگی جوانی کی ابتدائی منزلوں میں جذبات کی تہذیب کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کے ابتدائی بے دلانہ کلام میں زندگی کو قبول کرکے اس سے کام لینے کا جذبہ قوی نظر آتا ہے ۔ لیکن یہ حالت پھر تغیر سے دو چار ہوگئی ۔ اسی جوانی کے ایک حصے میں انھیں حالات سے مقابلہ بھی کرنا پڑا ۔ اب ' انا ' کو صدمہ پہنچا ۔ اس زمانے کی غزلوں میں غم کی گرفت زیادہ مضبوط ہے ۔ یہ دور ان کی مالی حالت کی ابتری کے علاوہ ان کی جذباتی ابتری کا دور بھی ہے ۔ کچھ مدت کے لیے ' انا ' غیر صحت مند راستے پر ذرا دور تک چل نکلی ۔ اب انھیں دلی کا ہر باشندہ اپنا دشمن نظر آنے لگا ۔ کلکتے سے واپسی کے بعد ۱۸۳۰ء تک ان کی جذباتی توانائی پارہ پارہ رہی:

" در عرض ایں سہ سال رسم و راہ اعیان دھلی برگشتہ و نام مہر و وفا در نہاد یاراں نماندہ ... گراں مایگان و صاحب دلان در زوایائے خمول خزیدہ و سفلگان و سفیھاں رونق عرصۂ دار و گیر گردیدہ "۔ (۱)

۱۔ مکتوب بنام مولوی سراج الدین ، مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء ، متفرقات غالب ، ص ۲۔

"چہ گویم از بخت خود چقدر گلہ مندم و از ہجوم اندوہ چہ مایہ نژندم - خلقے سر آزار من دارد و عالمے تشنۂ خون من است"- (۱)

"حقا کہ مہرو آزرم در نہاد مردم دہلی نیست " (۲)

"دہلویان حسد پیشہ چوں مرا مخلص صادق الولائے مولوی دانستند ، رنگ آں ریختند کہ در ہر روزے دو بار سہ بار پراگندہ گوئے نزد من آید و آنچہ خواہد از پیش خود بتراشد و بیان نماید" - (۳)

"منت خدائے را کہ نامرادی و ناکامی بر من آسان است اما برخے از خندۂ عوام و ملامت خواص آزار می کشم "- (۴)

"ملول بودن از کلکتہ چہ غضب است واللہ کہ دہلی شائستگی آں ندارد کہ آزادۂ در وے خاک نشیں تواند بود - خاص و عام ایں بقعہ بے سبب آزار و مرد و زن ایں تیرہ بوم مردم خوار ، بخاطر دارد کہ چوں ایں داوری بپایاں رسد بہ بہانۂ ازیں شہر بر آیم و کلکتہ را در یابم"- (۵)

"تا کجا شکیب ورزم و خود را بہ ہیچ شادمان دارم از در و دیوار شاہجہان آباد بلا می بارد "- (۶)

یہ خط ۱۸۲۹ء سے لے کر ۱۸۳۰ء کے درمیان مختلف اوقات میں لکھے گئے - اس دور میں پنشن کے مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف ہوا ، قرض کے ایک مقدمے میں گوشہ نشین ہوئے ، ولیم فریزر کا قتل ہوا اور غالب ایک محسن سے محروم ہوئے - غالب کے حالات میں سارے دلی والے ملوث نہ تھے - ان کی نرگسیت مریضانہ راستے پر مصروف سفر ہو چلی تھی لیکن انا نے انہیں بھر سعی و کوشش کے راستے پر ڈال دیا اور ۱۸۵۷ء تک وہ اس مریضانہ

۱- مکتوب بنام مولوی سراج الدین ، متفرقات غالب ، ص ۳۵ -
۲- ایضاً ، ص ۵۰ -
۳- ایضاً ، ص ۵۴ -
۴- ایضاً ، ص ۶۲ ، مکتوب بنام مرزا احمد بیگ خان -
۵- مکتوب بنام مرزا احمد بیگ ، متفرقات غالب ، ص ۶۶ -
۶- مکتوب بنام مرزا علی بخش ، مجموعہ نثر غالب ، ص ۳۳ -

صورت حال سے بچ گئے۔ یہی زمانہ ان کی فارسی شاعری اور نثر نویسی کے عروج کا ہے۔ اس دور میں غالب نے فارسی شاعری پر زیادہ توجہ کی اور یہ کلام ان کی شخصیت کو زیادہ مربوط اور ان کی جذباتی زندگی کو زیادہ استوار پیش کرتا ہے۔ غالب پھر صحت مندی سے روشناس ہو گئے ۔

اس مستحکم اور پروقار جذباتی زندگی میں آخری طوفان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے پیدا کیا ۔ غالب کی نجی زندگی بھی کچھ زیادہ کامیاب معلوم نہیں ہوتی ۔ بے اولادی کا احساس انہیں شدت سے رہا ۔ اور آخر عمر میں اس کا احساس زیادہ شدید ہو گیا تھا ۔ کلکتے سے واپسی تک وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے ۔ اپنی انا کے استحکام سے وہ ان ذاتی محرومیوں کا مقابلہ طنزیہ و مزاحیہ پیرائے سے کرتے رہے۔ ان کی شوخی اور شوخ بیانی شعری سرمائے کا نادر حصہ ہے ۔ آرزو کی شدت ، جدوجہد کی کثرت ، مقاصد کی بلند آہنگی ، غالب ان وسائل سے اپنی توانائی کو بحال کیے ہوئے تھے :

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خصر دراز

لیکن ۱۸۵۷ء میں ان پر گزرنے والے صدمات نے انا کو ایک بار پھر سقیم راستوں پر ڈال دیا ۔ برھان قاطع کے سلسلے میں غالب کی جوابی کارروائیاں صحت مند انسان کے مزاج کو پیش نہیں کرتیں ۔ اعصاب کی کمزوری کے ساتھ شخصیت کا تار و پود بھی بکھرنا شروع ہو گیا ۔ اس زمانے میں قرض خواہوں کے ہاتھوں بھی غالب پریشانی میں گرفتار رہے۔ قربان علی بیگ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں ، مخلوق کا کیا ذکر ؟ کچھ بن نہیں آتی ۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں ۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں ۔ یعنی میں نے اپنے کو غیر تصور کیا ہے ۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی ۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں ، آج دور دور تک میرا جواب نہیں ۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے ۔ سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ، بڑا کافر مرا ۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے ' جنت آرامگاہ ' اور ' عرش نشین ' خطاب دیتے ہیں ، چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا ، ' سقر مقر '

اور 'ہاویہ زاویہ' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ ستا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا"۔ (۱)

یہ لب و لہجہ اپنی شخصیت کی شکست و ریخت کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔

غالب کی شخصیت ایک ٹیڑھی لکیر ہے جس میں جذباتی مد و جذر نے رنگا رنگی اور تنوع پیدا کر رکھا ہے۔ اس کے پیچھے کسی مستقل اور مرتب نظام فکر کی جستجو ممکن نہیں۔ وہ شاعر پہلے ہیں' فلسفی یا کچھ اور بعد کو ہیں۔

لارڈ لیک کے قبضہ' دہلی (۱۸۰۳ء) سے پہلے غالب پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ کا دور دیکھا۔ وہ جس معاشرے کے فرد تھے۔ اس میں پرانا تہذیبی ڈھانچا ختم ہو رہا تھا۔ اقدار کی شکست کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ نئے معاشرے نے پرانے معاشرے کی جگہ ابھی نہیں لی تھی۔ نئی اقدار جن کا چلن ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا، ابھی محض سایہ وبز تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی پالیسی نے نئے متوسط طبقے کے وجود میں آنے کے فطری عمل کو روک رکھا تھا۔ شہری زندگی اور صنعتی کاروبار کو ختم کرکے پاک و ہند کو زرعی معیشت کی طرف لے جانے کی شعوری کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ سیاسی اور اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ تہذیبی عمارت کا شیرازہ بھی بکھرتا چلا گیا۔ قدیم نظام معیشت کے خاتمے کے ساتھ قدیم اقدار پر زد پڑی۔ روحانی تقاضوں کی جگہ ابھی مادی مقتضیات نے نہیں لی تھی۔ ایک خلا کی کیفیت تھی۔ نئے علوم اور نئے سائنسی انکشافات کو معاشرتی زندگی میں کسی حد تک محسوس کیا جا رہا تھا لیکن

۱۔ محاسن خطوط غالب، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ص ۔ ۱۱۰

زندگی اور نظریات زندگی کے درمیان فاصلے بڑھ چکے تھے - عقیدے اور عمل میں تباین کی حالت تھی - اقدار کی مثالی صورتیں صرف ذہنوں میں تھیں ، عملی زندگی ان سے محروم ہو چکی تھی - مختلف عوامل کا یہ تصادم غالب کے سامنے تھا - حساس اور با شعور انسان کی طرح انھوں نے اسے دیکھا - زندگی کے تضاد نے ان کی شوخی اور شوخ بیانی کے لیے مواد فراہم کیا - کبھی کبھی وہ اس تضاد کو بہت نمایاں شکل میں بھی دیکھتے ہیں :

فرصت اگرت وقت دهد مغتنم انگار　　ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
ز انہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

بے عملی اور جمود کی جگہ غالب کی شاعری حرکت اور عمل کی نقیب ہے -

نئی زندگی کے تقاضے اور اس کی خارجی شکل ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئی تھی - غالب کے ہاں زندگی کی مثبت قدروں کا احساس خفی ہے - ان کی معین صورتیں نہیں ہیں - یہ صورتیں آگے چل کر سر سید احمد خاں اور حالی کی تحریروں میں پہلی بار نکھر کر سامنے آتی ہیں ، جب شعر و ادب کا تعلق زندگی کے گہرے شعور کے ساتھ استوار ہو گیا - غالب کے زمانے تک یہ منزل نہیں آئی تھی -

غالب کا رویہ انفعالی رجحانات کے خلاف ایک احتجاج تو ہے ، بغاوت نہیں - اس کی شعری فضا وہی معاشرتی زندگی ہے جو ذوق اور شاہ نصیر کی زندگی تھی - بس اتنا ہے کہ غالب نے منفی رجحانات کی تائید سے اپنی شاعری کا چمن نہیں سجایا - اس نے ذاتی تجربے کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا اور اپنے عقیدے پر عمل پیرا ہو کر اردو ادب کو زندہ اور پائیدار طرز احساس عطا کیا - یہ طرز احساس آج بھی اردو شاعری کے لیے سرمایۂ افتخار ہے -

بوستانِ خرد

غالب کی ایک غیر معروف شرح

ڈاکٹر عبدالغنی

مولانا الطاف حسین حالی کی 'یادگار غالب' کو کئی لحاظ سے اولیت کا مقام حاصل ہے۔ یہ مرزا غالب کی سیرت بھی ہے، ان کے کلام پر تنقید بھی ہے اور ان کے کلام کی شرح بھی۔ کلام غالب کی خصوصیات کو مولانا حالی نے اپنی اس یادگار تصنیف میں اس عمدگی سے ذہن نشین کرایا ہے کہ کیا کہنا ۔ اس کا سال طباعت ۱۸۹۷ء ہے۔ یعنی میرزا غالب کی وفات کے اٹھائیس سال بعد یہ بے نظیر علمی و ادبی کارنامہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آیا ۔ لیکن یادگار غالب کو کلام غالب کی پہلی شرح نہیں کہا جا سکتا ، کیوں اس سے پہلے مولوی عبدالعلی والہ پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کی ' وثوق صراحت ' ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں مکمل ہو چکی تھی، اس کا نام تاریخی ہے، یہ ۱۳۱۳ھ میں چھپی تھی ۔ یہ صرف اشارات پر مشتمل ہے۔ طلبہ کے استفادے کے لیے لکھی گئی تھی مگر اشارات ایسے مختصر اور بعض اوقات اس قدر عالمانہ ہیں کہ ان کی مزید شرح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شرح طباطبائی سب سے زیادہ مفصل ہے۔ اهل علم اسے وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی تھی ۔ لیکن سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ شرح مولانا حسرت موهانی کی ہے ، اسی لیے کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ آج ہم کلام غالب کی ایک اور شرح کو نیازمندان غالب سے متعارف کرانا چاہتے ہیں ۔

اس شرح کی طرف اشارہ تلامذۂ غالب میں مالک رام نے بھی کیا ہے ، لیکن انھوں نے اس کا نام نہیں لکھا ۔ صرف یہ کہہ دیا ہے کہ خواجہ قمرالدین

خان عرف خواجہ مرزا خان مرحوم دہلوی نے دیوان غالب کی ایک شرح بھی لکھی تھی جو نہیں چھپی، لیکن یہ ذکر زمانۂ حال سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کام کرتی ہیں، اس شرح کے متعلق سب سے پہلے مرزا رفیق بیگ نبیرۂ خواجہ قمرالدین خان راقم نے 'اردو' بابت جولائی سنہ ۱۹۲۲ء میں ذیل کی سطور لکھیں :

"راقم نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور مسودہ صاف کرکے حیدرآباد اپنے ساتھ لائے تھے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے جو رشتے میں راقم کے بھتیجے ہوتے ہیں، اتفاقاً ذکر آیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور راقم سے کہا کہ وہ مسودہ مجھے دے دیجیے، میں اس کو چھپواتا ہوں۔ راقم نے مسودہ ان کے حوالے کردیا اور واپس جے پور چلے گئے۔ اس کے بعد کئی سال تک اپنی زندگی میں نواب صاحب پر تقاضے کیے اور راقم کے انتقال کے بعد ان کے فرزند خواجہ امیرالدین خان صاحب آثم نے بھی جو اوصاف میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے (افسوس کہ سنہ ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) بہت کوشش کی، لیکن وہ شرح نواب صاحب کے پاس سے غالباً کہیں گم ہوگئی۔ اس شرح کا پہلا مسودہ جو بہت کٹا پھٹا ہے، اب نکلا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہے اور اس قابل نہیں کہ شایع کیا جا سکے۔ البتہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامۂ غالب دستیاب ہوا ہے جو اس شرح کا دیباچہ ہے اور اب رسالۂ اردو میں طبع ہوتا ہے"۔

اس بیان میں شرح کا نام درج نہیں کیا گیا۔ راقم کا سال وفات سنہ ۱۹۱۰ء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا نبیرہ ان کی وفات کے بارہ سال بعد ان کی لکھی ہوئی شرح غالب کا ذکر کر رہا ہے۔ اور یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں اس شرح کے اصل مسودے کا ذکر کیا جا رہا ہے، جس سے صاف کرکے ایک اور نسخہ تیار کیا گیا تھا جو مصنف نے اپنے بھتیجے نواب ذوالقدر جنگ بہادر کو حیدرآباد (دکن) میں دیا تھا۔ اس نسخے کا بعد میں ذکر آئے گا۔ اس کرم خوردہ اصل مسودے کے متعلق ایڈیٹر 'اردو' لکھتے ہیں :

"شرح کے متعلق جس کا ایک بوسیدہ مسودہ دستیاب ہو گیا ہے، امید ہے کہ رسالہ اردو میں آیندہ ہم تفصیل سے کچھ لکھ سکیں گے"۔

جولائی ۱۹۲۲ء کے بعد 'اردو' کے جس قدر پرچے ہمیں ملے ہیں، ان میں ایڈیٹر اردو نے اس شرح کے متعلق کوئی روشنی نہیں ڈالی - ممکن ہے اس کے بعد انھوں نے اس شرح کی بابت کچھ بھی نہ لکھا ہو یا اگر لکھا تھا تو ہمیں ان کی وہ موعودہ تفصیل نہیں مل سکی - نہ اس بات کا کھوج کہیں سے لگ سکا ہے کہ وہ بوسیدہ مسودہ اب کہاں ہے، آیا اسے محفوظ کرلیا گیا تھا یا ضایع ہو چکا ہے-

اس شرح کا ذکر بعد میں رسالہ اسلامک کلچر (Islamic Culture) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے صفحات ۱۰۴، ۲۰۴ پر ہوا، جہاں حیدرآباد دکن کے ثقافتی مشاغل پر تبصرہ کیا گیا ہے- پہلے تو اس امر کا ذکر ہوا ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء کے رسالہ 'اردو' میں ایک شرح غالب کے متعلق مرزا رفیق بیگ نے کچھ لکھا ہے- اس کے بعد انگریزی میں وہ معلومات درج کردی گئی ہیں جو ہم نے یہاں اقتباس کے طور پر دے دی ہیں - یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہاں تک کارپردازان مجلہ 'اسلامک کلچر' کو علم ہے یہ شرح ابھی تک طبع نہیں ہوئی- یہ معلومات بہم پہنچانے کے بعد اس شرح کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے- اس لیے یہاں اس کا ہوبہو درج کردینا از بس ضروری ہے:

> A copy of it (150 pages) is safely lodged in the Yafai Collection. In its introduction (Muqad - dama) there is a discussion on the ancestry of Ghalib. One also finds a difference between this note and the one published in the Urdu Quarterly. The name of the Sharh is Bostan - i - Khirad dated 1323 A. H. It is written in a peculiar style and the commentator gives us an insight into the working of the poet's mind when he composed verses .

یہاں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا شرح اس وقت کہاں موجود ہے، اس کا کیا نام ہے- نسخے کی تسوید کب ہوئی اور شرح کی کیا اہمیت ہے - معلوم ہوتا ہے یہ وہی نسخہ ہے جو نواب ذوالقدر جنگ بہادر کے حوالے کیا گیا تھا - اصل مسودے کے ساتھ جو نسب نامۂ غالب تھا وہ جولائی

۱۹۲۲ء کے اردو میں ملتا ہے ، یہاں بتایا گیا ہے کہ اس محفوظ نسخہء شرح کا مقدمہ اس سے کچھ اختلاف رکھتا ہے ۔ اس بات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شرح کا یہ نسخہ اصل مسودے کی نسبت زیادہ کامل ہے ۔ رسالہ اسلامک کلچر کے اس بیان کے بعد مزید اندراجات بھی ہیں لیکن انھیں زیر بحث لانے سے پہلے ہم اس شرح کے مصنف کے متعلق کچھ بتا دینا ضروری تصور کرتے ہیں ۔

مالک رام اپنی تالیف تلامذہء غالب میں ہمیں بتاتے ہیں کہ اس شرح کے مصنف یعنی خواجہ قمرالدین خان راقم کی شادی میرزا غالب کے بھانجے میرزا عاشق بیگ کی صاحبزادی سنگی بیگم سے ہوئی تھی ۔ اب آگے چلیے ۔ خود میرزا غالب خواجہ قمرالدین راقم کے والد خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان کے متعلق ' اردوئے معلیٰ ' میں رقم طراز ہیں :

" میرا برادر زادہ سعادت تو امان خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان "۔

اب ' برادر زادہ ' کی توضیح کے لیے ہم مولانا غلام رسول مہر کی گراں قدر تصنیف ' غالب ' سے استفادہ کرتے ہیں ۔ اس میں انھوں نے صفحہ ۲۰ پر جیون بیگ کمیدان کا شجرہء نسب دیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ جیون بیگ کمیدان کے لڑکے اکبر بیگ کی شادی میرزا غالب کی بہن چھوٹی خانم سے ہوئی تھی اور جیون بیگ کی ایک دختر کی شادی خواجہ حاجی خان سے ہوئی تھی ۔ اس نسبت سے خواجہ حاجی میرزا غالب کے بھائی ٹھہرے ۔ اس شادی سے خواجہ حاجی خان کے دو لڑکے پیدا ہوئے ، ان میں سے ایک کا نام بدرالدین خان عرف خواجہ امان تھا ، اسی لیے بدرالدین کو میرزا غالب اپنا برادر زادہ کہتے تھے ۔ اور اس بنا پر خواجہ قمرالدین راقم ابن خواجہ بدرالدین خان میرزا غالب کے پوتے ہوئے ۔ اس لیے یہ شرح غالب یعنی بوستان خرد میرزا غالب کے اپنے پوتے کی لکھی ہوئی ہے ۔ اس نقطہء نگاہ سے بھی اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔ خواجہ راقم خود بھی شاعر تھے ۔ تلامذہء غالب میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ اور پھر ان کی تاریخ ولادت ۱۸۳۲ء ہے ۔ انھوں نے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے تیر اندازی سیکھی اور کچھ عرصہ میرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر کے دامن سے بھی وابستہ رہے ۔ بعد میں مہاراجہ جے پور کے بیٹے کے اتالیق بنے ، گویا جہاں خواجہ راقم بڑے پائے کے آدمی تھے وہاں میرزا غالب کے قریبی اعزا میں سے بھی تھے ۔ وہ ۳۷ سال کے تھے جب میرزا غالب فوت ہوئے ،

اس طرح ایک طویل عرصے تک میرزا غالب کو وہ قریب سے دیکھتے رہے ۔ میرزا کے بھانجے کی صاحبزادی سے شادی کے باعث قرابت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ۔ اس لیے ایسے قریبی رشتہ دار کی لکھی ہوئی شرح غالب کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے ۔ رسالہ اسلامک کلچر کے فاضل ایڈیٹر لکھتے ہیں کہ اس شرح کے مطالعے سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ شعر کہتے ہوئے میرزا غالب کے شعور کی کیا کیفیت ہوا کرتی تھی ۔

قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہم نے میرزا غالب اور خواجہ راقم کی رشتہ داری کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا ہے ، اس کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو یا تو خود میرزا غالب نے ہم تک پہنچائی ہیں یا ان کے نامور سیرت نگاروں مالک رام اور مولانا غلام رسول مہر کی تحریرات سے حاصل کی گئی ہیں ۔ اگر ہم اس شرح کے مقدمے کو بھی زیر نظر رکھیں تو وہاں اس بات کا دعویٰ بھی موجود ہے کہ خواجہ قمرالدین راقم کا میرزا غالب سے جدی رشتہ تھا ، میرزا غالب کے مورث اعلیٰ ترسم خان کا ایک بھائی رستم خان تھا اس کی اولاد سے خواجہ قمرالدین راقم ہیں ، لیکن اس رشتے کو تسلیم کرنے میں اہل علم اس لیے متامل ہوتے ہیں کہ خواجہ قمرالدین راقم کے دادا خواجہ حاجی خان کو میرزا غالب نے مقدمہ پنشن میں اپنے خاندان کا ایک ملازم بتایا تھا ۔ میرزا غالب کی پنشن کا جھگڑا اسی خواجہ حاجی خان کی وجہ سے پیدا ہوا تھا ۔ لیکن ہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ خواجہ حاجی خان عجیب ملازم تھا کہ ' افراسیاب ' کی اولاد سے میرزا غالب کی بہن چھوٹی خانم جس اکبر بیگ سے بیاہی گئی ، اسی اکبر بیگ کی ہمشیرہ کی شادی اسی ' ملازم ' سے ہوئی اور پھر اسی ' ملازم ' کا پوتا قمرالدین راقم میرزا غالب کے بھانجے میرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی سنگی بیگم سے شادی کرتا ہے ۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قمرالدین راقم نے مقدمہ شرح میں یہ جو کہا ہے کہ میرزا غالب نے پنشن کا مقدمہ لوگوں کے بہکانے سے شروع کیا تھا ، اتنا بے بنیاد نہیں ۔ خواجہ حاجی خان بھی ایک با وقار امیر نظر آتا ہے اور اس نے وقار یہاں ہندوستان مین آکر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ بخارا اور بدخشاں کی طرف رہتے ہوئے بھی وہ با وقار تھا ۔ کیونکہ جس جیون بیگ کمیدان نے اپنی لڑکی کا نکاح خواجہ حاجی خان سے کیا تھا وہ بھی میرزا غالب کے دادا قوقان بیگ اور خواجہ حاجی خان کے ساتھ اسی طرف سے آیا تھا۔ اگر جیون بیگ اس کے حسب نسب سے مطمئن نہ ہوتا تو دختر کا رشتہ دینے پر

ہرگز آمادہ نہ ہوتا ۔ جیون بیگ کمیدان ، خواجہ حاجی خان اور میرزا غالب کے خاندان والوں کے باہمی رشتے ناتے ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب کم از کم ایک دوسرے کے ہم پایہ تھے ۔ یہاں پہنچ کر ہمیں تو یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ جس طرح خواجہ قمرالدین راقم نے دعویٰ کیا ہے ، عین ممکن ہے خواجہ حاجی خان میرزا غالب کا جدی رشتہ دار ہو ۔ جناب مالک رام کو اس بات سے اتفاق نہیں ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے رسالہ' اردو بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء میں اس دعوے کی تائید کی تھی ، لیکن جناب مالک رام اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ ایک تو مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان میں واقعات اور سنین کی فاش غلطیاں ہیں ، دوسرے خواجہ قمرالدین راقم ان کے ماموں ہیں ۔ اگر حالات یہی کچھ ہوتے تو ہم بھی جناب مالک رام سے متفق ہو جاتے لیکن مندرجہ بالا تمام کوائف کے ہوتے ہوئے ہم سخت متامل ہیں ۔ میرزا غالب کا یہ بیان بالکل بے جان ہے کہ خواجہ حاجی خان ان کے خاندان کا ایک ملازم تھا ۔ جب میرزا غالب اس قسم کے بیانات دیتے ہیں تو ہمیں دوسرے فریق کی بات پر مجبوراً غور کرنا پڑتا ہے، اسی لیے ہماری نگاہ میں میرزا قمرالدین راقم کی شرح غالب بوستان خرد کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ۔ اس کے مطالعے سے ایسی معلومات حاصل ہونے کی توقع ہے جن کی وجہ سے غالبیات میں قابل قدر اضافہ ہوگا ۔

اب ' بوستان خرد ' کے مطالب کی طرف آئیے ۔ جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے اس کا ایک اہم باب تو اس کا مقدمہ ہے ، جس میں میرزا غالب کے نسب نامے کا ذکر ہے ۔ مندرجہ بالا حالات و کوائف کے ہوتے ہوئے اس سلسلے میں مزید تحقیقات ضروری ہے ۔ قضیہ' پنشن جو میرزا غالب کی زندگی کا المیہ بن کر رہ گیا تھا ان تحقیقات کی روشنی میں ہمارے لیے زیادہ قابل فہم ہو جائے گا ۔ اس شرح کی بدولت میرزا غالب کی زندگی کے متعلق مزید حقائق کے دریافت ہونے کی بھی امید کی جا سکتی ہے ۔ مثال کے طور پر میرزا غالب کے مندرجہ' ذیل شعر :

کس سے محرومی' قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سووہ بھی نہ ہوا

کی شرح کرتے ہوئے خواجہ راقم لکھتے ہیں :

''یہ شعر قصہ طلب ہے جس کو کوئی نہیں جانتا کہ شاعر کیا کہتا ہے اور مقصود کیا ہے ۔ یعنی غالب مغفور نے اپنے برادر زادوں خواجہ شمس الدین خان اور خواجہ بدرالدین خان پدر و عم راقم سے جاگیر لینی چاہی ، کئی برس جھگڑا طے نہ ہوا ۔ حضرت کلکتہ گئے وہاں سے ناکام آئے ۔ انجام کار جاگیر ضبط ہوگئی اور اس کی نقدی سرکار انگریزی نے خاندان میں نام بنام تقسیم کردی ۔ اسی زمانۂ تہیدستی اور پریشاں حالی کا حال بیان کیا گیا ہے ۔ واقعی خاندان میں تا انفصال مقدمہ بہت محتاجی رہی ہے کہ مغفور اسی محتاجی میں پراگندہ حواس رہے ۔ یہاں تک کہ جینے سے بیزار ہوئے ، کتنے ہی دن پینے کو شراب نہ ملی ، آخر اس غم میں ایک دن شام کو صندوقچہ سے سنکیا کی ڈلی نکالی اور کھا گئے ۔ اس کے اوپر ایک گلاس برانڈی شراب کا پی لیا اور پلنگ پر دراز ہوگئے ۔ رات بھر حقہ پیتے رہے اور نشے کی حالت میں اجل کی راہ دیکھا کیے ، اب آتی ہے ، اب آتی ہے ، مگر اجل خود اس دلیری سے دبک گئی ۔ حضرت صبح کو چاق و توانا اٹھ کھڑے ہوئے ۔ صرف کان بہرے ہوگئے ، جان سلامت رہی ۔ بس اس شعر میں یہ ہی تلمیح ہے ''۔(۱)

اس شعر کی یہ تشریح پڑھیے اور غور کیجیے کہ اسے کس قدر اہمیت دینی چاہیے ۔ یہ تو غالب کا ہر سیرت نگار تسلیم کرتا ہے کہ پنشن کا جھگڑا میرزا غالب کے اعصاب پر سوار ہوگیا تھا اور میرزا کلکتہ سے سخت مایوس اور غمزدہ لوٹے تھے ۔ لیکن یہ زہر کھانے والا معاملہ بالکل نئی بات ہے ۔ اسے تسلیم کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں ۔ ایک تو وہ دعویٰ ہے جو میرزا غالب کو اپنی عالی حوصلگی کے متعلق تھا ، کہتے ہیں :

ز من جو در بد نکو زیستن		جگر خوردن و تازہ رو زیستن

دوسرے خواجہ راقم نے جس شعر کی شرح کی ہے وہ دیوان غالب اردو مرتبہ مولانا عرشی کے مطابق نسخۂ بھوپال میں موجود ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شعر ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء سے پہلے کہا گیا تھا جب میرزا غالب کی عمر پچیس سال سے کم تھی اور قضیۂ پنشن بعد کی بات ہے ۔ میرزا غالب کو

۱- رسالہ ' اردو ' بابت جولائی ۱۹۲۲ء

پوری طرح مایوسی اس وقت ہوئی جب ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو انہیں لکھا گیا کہ گورنر جزل باجلاس کونسل پنشن کے موجودہ انتظام میں ردو بدل کرنے پر تیار نہیں ۔ اگرچہ انھوں نے ولایت میں بھی اس کے متعلق اپیل کی جس کا فیصلہ ان کے خلاف ۱۸۴۲ء کے شروع میں ہوا لیکن ان کا دعویٰ دراصل ۱۸۳۱ء میں ہی خارج ہو گیا تھا ۔ اس لیے اگر زہر کھانے کا واقعہ درست (۱) ہے تو یہ ۱۸۳۱ء کے ایام میں ہو سکتا ہے ۔ جب وہ مکمل طور پر مایوس ہو گئے تھے اور یہ بھی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کسی والیٔ ریاست کی ملازمت کرلیں ۔ اس کا تعلق مندرجہ بالا شعر سے نہیں جو میرزا غالب نے ۱۸۲۱ء سے پہلے کہا تھا ۔

دوسری طرف خواجہ راقم کے بیان کو داستان طرازی قرار دینا بھی مشکل ہے ۔ اگر خواجہ راقم اس شعر اور زہر کے واقعے کا تعلق قائم نہیں کر سکے تو خود میرزا غالب کا یہی حال ہے ۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ واقعات ذہن میں ایک تاثر سا چھوڑ جاتے ہیں لیکن بعد میں ان کی کڑیاں باقی حالات سے ملانا محال ہو جاتا ہے ۔ میرزا غالب فرماتے ہیں کہ ان کے دادا قوقان بیگ شاہ عالم کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے ۔ حالانکہ یہ غلط ہے اور اب اس بیان کی یہ تعبیر کی جاتی ہے کہ میرزا غالب نے شاہ عالم کی شاہزادگی کے زمانے کو ان کی باد شاہت کا زمانہ تصور کر لیا ہے ۔ خواجہ

۱۔ اگر یہ واقعہ غلط نہیں تو ہمارا خیال ہے کہ اس کی صدائے باز گشت مندرجہ ذیل شعر میں سنائی دیتی ہے :

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یہ شعر نسخۂ رامپور میں موجود ہے جو ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں مرتب ہوا تھا ۔ اس واقعے کے بعد گھر والوں نے اہتمام کر لیا ہوگا کہ زہر میرزا غالب کو دستیاب نہ ہو سکے اور بعد میں جوں جوں وقت گزرتا گیا ہوگا میرزا مقدمۂ پنشن میں ناکامی کے اثرات کا بلند ہمتی سے مقابلہ کرتے رہے ہوں گے ۔ اس کا اظہار انھوں نے مثنوی ابر گہر بار کے مغنی نامہ میں کیا ہے ۔ یہ مثنوی بعد کی تصنیف ہے ۔

راقم کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی تعبیر کی جاسکتی ہے کہ زہر کا واقعہ درست تو ہے مگر اس کا تعلق اس شعر سے نہیں، علاوہ بریں پنشن کا جھگڑا ختم ہونے کے بعد خواجہ راقم کے والد کو میرزا غالب نے برادر زادہ کہنا شروع کردیا تھا - آپس میں صلح ہو گئی تھی ، باہمی رشتہ جس قدر قرب رکھتا تھا ، وہ سطور بالا سے ظاہر ہے - نیز خواجہ راقم کو میرزا غالب کی شاعرانہ عظمت پر ناز تھا - میرزا کی شاگردی پر فخر تھا اور میرزا کی یادگار ہونے کا ادعا تھا ، کہتے ہیں :

یادگاروں میں اسد کی ہے یہ بندہ راقم

کیا ہوا بزم سخن میں نہیں شہرت میری

ظاہر ہے میرزا غالب کی عظمت کو خواجہ راقم اپنی بڑائی سمجھتا ہے- ظاہر ہے کہ ایسا شخص زہر کا واقعہ کیوں کر گڑھ سکتا ہے - خواجہ راقم نادان نہیں تھا کہ جس شاعر کے نام پر اپنے فخر کی بنیاد قائم کرتا ہے، اس طرح داستان طرازی کر کے اسی کو بدنام کرے- خواجہ صاحب کی سیرت کا جس قدر علم ہو سکا ہے، اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دروغ گوئی اور الزام تراشی پر مائل نہیں ہو سکتے تھے -

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی ہے- جب میرزا غالب کی سیرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت سے ان کی زندگی کو بے داغ نہیں کہا جاسکتا - وہ عطار، رومی اور جامی کی طرح کے شاعر نہیں جن کی سیرت چاند کی چاندنی سے بھی زیادہ پاکیزہ تھی اور نہ میرزا غالب کو اسی بات پر اصرار ہے کہ لوگ انہیں اس معیار پر جانچیں - وہ تو بر ملا کہتے ہیں :

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام آشکارا دم ز عصیاں می زنم

آدم زادہ ہونے کی حیثیت سے اپنے عیوب کو وہ عام انسانی کمزوری قرار دیتے ہیں - اگر کسی ایسے لمحے جب خاندانی اور ذاتی وقار کو انھوں نے ختم ہوتے دیکھا اور حالات کے مقابلے میں انھوں نے اپنے آپ کو بے بس پایا اور اس کمزوری کے بھی مرتکب ہو گئے تو ہم اسے بھی ان کی آدم زادگی پر محمول کریں گے- تاریخ بتاتی ہے کہ بڑے بڑے مقتدر اور محترم لوگ ایسی کمزوری کے مرتکب ہوئے ہیں ، اس واقعے سے میرزا غالب کی شاعرانہ

عظمت میں فرق نہیں پڑتا ۔ ان کی بداعت تخییل اسی حسن وجمال کے ساتھ موجود رہے گی جس کے ساتھ وہ اب ہے اور ہم ان کو بدستور دنیائے ادب کے ایسے نابغوں میں شمار کرتے رہیں گے جن پر ساری نوع انسانی کو ناز ہے ۔

بہرحال ان صفحات میں میرزا غالب کی ایک غیر معروف و نامعلوم شرح 'بوستان خرد' کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی اہمیت ظاہر ہے، اس سے جہاں نئی معلومات حاصل ہوں گی وہاں نئے مباحث کے دروازے بھی کھلیں گے ۔ جناب مالک رام لکھتے ہیں کہ اس شرح کا مسودہ غالباً ضایع ہو چکا ہے، لیکن وہ تو مجموعۂ باقمی میں محفوظ ہے ۔ اگر بھارت میں رہنے والے محبان غالب اسے حاصل کر کے طبع کرا دیں تو کم از کم وہ ذہنی الجھن ضرور کوئی استوار راہ اختیار کر سکتی ہے ، جو رسالہ اردو اور مجلہ اسلامک کلچر کے محولہ بالا شماروں نے پیدا کردی ہے ۔

غالب اور شیفتہ

سید مرتضیٰ حسین فاضل

غالب کے سینکڑوں شاگرد ہیں مگر غالب کو جس قدر عارف پر ناز ہے کسی پر نہیں، وہ عارف کو کبھی 'شمع دودماں' کہتے ہیں کبھی 'غم گسار مزاج داں'۔ 'جان من' بھی کہا ہے اور 'گنج شایگان من' بھی:

جائے دارد کہ خویش را نازم	کہ فلانے ز پیروان من ست
جاوداں باش اے کہ در گیتی	سخنت عمر جاودان من ست
اے کہ میراث خوار من باشی	اندر 'اردو' کہ آن زبان من ست
از معانی ز مبدء فیاض	باد آن تو ہر چہ آن من ست

لیکن عارف جوان ہی مر گئے اور غالب نے وہ درد بھری غزل لکھی جسے مرثیہ کہنا بجا ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف کے بعد شیفتہ اور میر مہدی مجروح سے محبت ہے، خاص کر اردو خطوں میں جو پیار مجروح کے یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال نہیں۔ معلوم ہوتا ہے مجروح شاگرد ہی نہیں ان کے عزیز ترین اور بے تکلف دوست بھی ہیں جنہیں رتبہ فرزندی حاصل ہے۔ مجروح کے نام بہ کثرت خطوط کی اشاعت نے غالب کے فن کی خوبیاں اجاگر کی ہیں اور غالب کی جذباتی تصویر کشی بھی کی ہے۔ غالب کے نام لیوا بزرگوں میں مجروح آخری دور میں اپنی غزل کے ساتھ

ساتھ غالب کی شاگردی کے سبب بڑے احترام کی نظر سے دیکھے گئے، جس کے وہ مستحق بھی تھے۔

ہر گوپال نرائن تفتہ، مرزا کے قدیم ترین شاگرد اور مرزا کے بہت بعد تک جینے والوں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے انہیں لالہ دیوالی سنگھ ثم مرزا محمد حسن قتیل کے جواب میں مرزا ہرگوپال نرائن تفتہ بنایا تھا۔ اور لکھتے تھے 'کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ' یا:

میرزا تفتہ، کہ پیوستہ بہ دل جا دارد

ہر کجا ہست، خدایا! بہ سلامت دارش

یہ تفتہ صرف فارسی کے شاعر تھے، موصوف نے چار ضخیم دیوان لکھے، قصیدے اور قطعے وغیرہ مستزاد۔ بڑے پرگو، بڑے زود نویس، بے حد خوش فہم اور اپنی فارسی نویسی پر نازاں تھے۔ ایک ایک نشست میں سو سو شعر کہہ ڈالتے اور ایک ایک زمین میں ہزار شعر لکھنا کھیل جانتے تھے۔ کبھی جلال اسیر کا جواب لکھنے پر آئے تو دیوان تیار کرلیا، نظیری و عرفی، کلیم و ظہوری، غرض ہر شاعر کی طرح میں کہا اور خوب کہا۔ مرزا ان کی زود گوئی سے گھبراتے تھے، مگر نازبرداری میں دریغ نہ کرتے تھے۔ جوانی کے شاگرد اور برابر کی عمر کے دوست تھے۔

رندی اور نوابی میں بھی غالب کے مقلد تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کم و بیش چالیس برس تک مرزا غالب سے اصلاح لی اور زندگی بھر غالب کو کلام دکھایا کیے۔ مرزا کے شاگردوں میں تلمذ کے لحاظ سے تفتہ کا رشتہ سب سے زیادہ طویل نظر آتا ہے۔ ہمیں غالب و تفتہ کے مراسلات سب کے سب تو نہیں ملے مگر ایک سو بائیس کے قریب اردو اور ایک فارسی خط بھی کم نہیں۔ تعجب ہے کہ ان خطوں میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جو ان دونوں کے راہ و رسم کی ابتدا بتائے، کوئی ایسا نکتہ نہیں جو شاگردی کی تاریخ سجھائے۔ اردو، فارسی اشعار میں تفتہ کا ذکر نہیں۔ ہاں خطوں میں محبت و بے تکلفی کے صدہا پہلو ملتے ہیں۔ اس کے برعکس تفتہ کے کلام میں غالب سے محبت و ارادت پر جو مواد ملتا ہے وہ کہیں اور نہیں ہے۔ ان کے اشعار متعدد اشارے کرتے ہیں اور کئی سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ اتفاق سے غالب پر کام کرنے والوں نے ابھی ان نکتوں کی چھان بین نہیں کی۔

مالک رام نے تفتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا ہے کہ :
"واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا "۔ راسی تخلص رکھا اور فارسی میں مشق کرکے ترقی کر گئے ۔ " جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ ، اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا " ۔

مہر صاحب نے یہ سوال اٹھایا اور کسی حد تک تاریخ تلمذ بتانے کی کوشش بھی فرمائی ، موصوف نے تحریر فرمایا :

" غالب سے تلمذ کا سلسلہ کب شروع ہوا ؟ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے ۔ فارسی خطوں میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جو فروری ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا ، یعنی اس سے پیشتر تفتہ شاگرد بن چکے تھے" ۔

(خطوط غالب)

مہر صاحب نے جس فارسی خط کی طرف اشارہ کیا ہے وہ غالب کے پنج آہنگ، طبع دھلی و لکھنؤ میں موجود ہے مگر تمام ایڈیشنوں میں دو باتیں صاف صاف درج ہیں :

الف ۔ " دیروز کہ آدینہ پانزدھم ربیع الاول و نہم فروری بود "۔

ب ۔ " شنبہ ۱۰ ۔ فروری سنہ ۱۸۴۹ء " ۔

تقویم کی روسے بھی یہ مطابقت درست ہے (جنتری پنجاہ سالہ ، مرتبہ مولوی صفی الدین ، طبع حیدرآباد دکن ، سنہ ۱۳۱۰ھ) ۔ بظاہر اس خط سے زیادہ پرانے خط ' اردوے معلیٰ ' اور ' خطوط غالب ' مرتبہ مہیش پرشاد میں موجود ہیں ۔ جن میں سے ایک مئی سنہ ۱۸۴۸ء کا قطعی حیثیت رکھتا ہے ۔ مگر ان خطوں میں جب کوئی اشارہ یا قرینہ موجود نہیں تو تفتہ کے کلام کو ٹٹولنا چاہیے ۔ دیوان دوم اور سنبلستان اور ترجیع بند بر وفات غالب کے علاوہ مجھے اور کوئی مبسوط چیز ایسی نہیں ملی جسے میں اس وقت بحث میں پیش کرتا ۔ ان تین ماخذوں میں بظاہر ایسے حوالے ہیں جو تفتہ و غالب کے تعلقات کی ایک مدت معین کرتے ہیں اور اس کی مدد سے تاریخ بھی نکالی جا سکتی ۔ مثلاً ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء کے مطبوعہ دیوان میں کہتے ہیں :

بسر پنجاہ و ہشت اندر سخن شد

یعنی اٹھاون سال سے شعر و شاعری میں لگا ہوا ہوں - اب اگر ہم ۱۲۷۲ھ سے اٹھاون نکال لیں تو ۱۲۱۴ باقی بچتے ہیں - سری رام اور مالک رام صاحبان نے یہی سنہ ولادت لکھا ہے - ظاہر ہے کہ تفتہ نے پیدا ہوتے ہی شعر نہیں لکھے - مگر جس گھر میں پیدا ہوئے وہاں کا ماحول ایسا تھا کہ گھٹی میں شاعری پلانا کہا جا سکتا ہے - اس مصرع کے بعد مطبع اور دیوان کی تعریف کرتے ہوئے اپنے تعارف میں اساتذہ ایران سے دل چسپی کا ذکر کیا ہے - ایرانی شاعروں کے دیوان پڑھنے کا بیان ہے - سنائی سے محتشم تک مشاہیر شعرا سے استفادے کا اعتراف ہے - غالب کے فکر و فن کی مدح کی ہے اور پینتالیس سال کی مشق کا دعویٰ کیا ہے اور وضاحت سے بتایا کہ بیس سال سے مرزا کے شاگرد ہیں - اس طویل قطعے سے چند ضروری اشعار یہ ہیں :

بہر حال خوں تفتہ بسیار خورد — ز دیوان ایرانیاں بہرہ برد
چہ ایرانیاں، نام آں ہا شنو — کہ بردند از جملہ عالم گرو
ظہوری، کہ از خود نظیر خود است — سنائی، خودش در ضمیر خود ست
سخن سنج عرفی، کہ چوں او کسے — نہ سنجد سخن، گو خورد خوں بسے
دگر نکتہ ور طالب آملی — بہ گیتی سمر طالب آملی
اسیر، آں کہ بود است مرزا جلال — جلال کلامش بروں از خیال
حزیں، آں مشیخت مآب جہاں — کہ عالی دماغیش نبود نہاں
بجز سیلی و وحشی و محتشم — وگر چند خوش گو کہ دانی تو ہم
چہ حاجت کہ آرم بلب نام شاں — می عیش تا حشر در جام شاں
ازیں جملہ، برتر یکے اہل دل — خوش آزاد مردے بحق مشتغل
اسد نام، غالب تخلص ہمی — ز آگہ دلی ہا نہ غافل دمی
لقب میرزا نوشہ، او را دگر — وزیں نام در دہر مشہور تر
بود مرشد تفتہ، از بست سال — نہ رفت از دل و دیدہ در ہیچ حال
رقم ہرچہ زد، اول او را نمود — ازاں پس بہ اہل جہاں وا نمود
نمود ایں خضر گوئی از التفات — بہ گم کردہ رہ، راہ آب حیات
صفاتش فزوں از بیان ست و بس — نہ من، صد چو من بے زبان ست و بس

سخن مختصر ایں کہ چوں تفتہ یافت چنیں راہ و دنبال ایناں شتافت
دگر کرد محنت چل و پنج سال بہ تحصیل ایں نے بہ تحصیل مال

اگر یہ اشعار ۱۸۵۵ء میں لکھے ہیں تو ۱۸۳۰ء کے قریب غالب سے شاگردی کا سلسلہ قائم ہوا - اور پینتالیس برس کی شاعری کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۸۱۰ء سے شعر کہہ رہے ہیں - سنہ اٹھارہ سو دس میں تفتہ کی عمر تقریباً گیارہ بارہ سال تھی - جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۷۹۹ یا ۱۸۰۰ء میں ولادت ، ۱۱ - ۱۸۱۰ء میں شاعری کی ابتدا ، ۱۸۳۰ء کے قریب غالب کی شاگردی اختیار کی -

تفتہ نے وفات غالب پر جو ترجیع بند لکھا ہے اس میں ایک شعر سے تلمذ پر روشنی پڑتی ہے جو یہ ہے :

در من و او ، بہ یاری بختم تا چہل سال ماند صحبت ھا

یعنی تفتہ اور غالب کی ملاقات و صحبت کو ۱۸۶۹ء کی فروری میں چالیس سال ہوگئے تھے - موٹے حساب سے اڑسٹھ سے چالیس کم کیے جائیں تو اٹھائیس باقی بچتے ہیں - لیکن ۱۸۲۸ء میں مرزا غالب سے رشتہ تلمذ استوار ہونا قرین قیاس نہیں ، یہ سال غالب کی بے وطنی کا سال ہے - وہ اگست ۱۸۲۶ء سے پہلے بےحد پریشان تھے ، پنشن کے لیے آخری تدبیر سوچ چکے تھے ، انتظام سفر کلکتہ کے لیے کمر بستہ ہو رہے تھے ، اگست کے قریب انہوں نے دھلی سے کوچ کیا اور قریب قریب تین برس کی طویل غیر حاضری کے بعد ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو دھلی آئے - حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تھے ، لہذا یہ سال پورا افراتفری ھی میں گزرا ہوگا - ممکن ہے ۳۲ - ۱۸۳۰ء میں تفتہ سے رابطہ قائم ہوا ہو - اگر یہ صورت مان لی جائے تو دونوں شعروں میں اندازہ و خیال پر بنیاد رکھنا ہوگی ، یعنی پہلا شعر ۵۰ - ۵۵ء کے درمیان لکھا گیا :

بود مرشد تفتہ از بست سال نہ رفت از دل و دیدہ درھیچ حال

سنہ ۳۰ء سے ۵۰ء تک کی مدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے -

دوسرا شعر ۱۸۶۹ء میں لکھا :

در من و او بہ یاری بختم تا چہل سال ماند صحبت ھا

یعنی سنہ ۲۹ - ۱۸۲۸ء کا زمانہ تھا جب تفتہ نے اصلاح شروع کی -

میرے خیال میں محتاط اندازہ یہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ کا زمانہ وہ ہے جب غالب و تفتہ میں سلسلہ' استادی و شاگردی قائم ہوا - باوجودے کہ غالب دہلی میں تھے اور تفتہ آگرہ و الور و سکندرہ راؤ میں ، لیکن محبت و خلوص میں فاصلہ نظر نہیں آتا - غالب کے اردو خط تفتہ سے محبت کا آئینہ ہیں اور تفتہ کے فارسی اشعار عشق غالب کی تصویر - دیوان کے آغاز میں غالب کی مدح کے چند شعر آپ نے ملاحظہ فرمائے - اس کے بعد تفتہ نے اشعار گلستاں کی تضمین لکھنا شروع کی (۱) ، یہ کتاب در حقیقت پیتمبر سنگھ کے لیے لکھنا چاہتے تھے مگر وہ لڑکا بارہ سال کی عمر میں داغ جدائی دے گیا - ہونہار بچہ ، گلستان بوستاں پڑھتا تھا اور اپنے حیرت انگیز حافظہ و قابلیت سے تفتہ کا محبوب بیٹا تھا ، اس کی موت نے تفتہ کو بے حد متاثر کیا ، اس تاثر کی یادگار تضمین گلستاں ہے ، وہ کہتے ہیں :

سخن رانم ز پیتمبر در آں جا		در افشانم ز چشم تر در آں جا

بہ گریم در سخن انزایم آبی		نویسم بعد ازاں نادر کتابی

لیت یہ تھی کہ آواگون کے پھیر میں لڑکا دوبارہ زندہ ہو اور ان کی شاعری دیکھے :

شود تا زندہ پیتمبر دگر بار		دھد ، داد مسیحائیم ہر بار

یہ ضخیم کتاب دو مہینے میں تیار ہوگئی :

غرض در ھفت یا در ھشت ھفتہ		رقم ایں نسخہ زد ، بے مایہ تفتہ

کتاب مکمل ہوئی تو اسے غالب اور ان کے متبنیٰ باقر علی خاں کے نام معنون کر دیا :

۱- ' ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ' مجلس ترقی ادب لاہور ، صفحہ ۲۲۱ پر تضمین گلستاں کو " انشائیہ " کتاب لکھا گیا ہے -

تضمین گلستاں کا ایک اشتہار پولیس گزٹ مجریہ پنج شنبہ ۱۹- اگست ۱۸۵۹ء ، نمبر ۵ جلد ۲ میں چھپا تھا ، اور ایک روپیہ آٹھ آنے قیمت بتائی گئی تھی -

نوشتم هر چه بپسندید هر یک
دگر از چشم حق بین دید، هر یک

خصوصاً میرزائے، نکتہ زائے
چمن طبعے، گل رنگیں ادائے

نیستان سخن را طرفہ شیرے
اسد، یعنی بہ هر میداں دلیرے

قصائد، زو چناں کش دید باید
گل از باغ غزل ها چید باید

رباعی، آں کہ شورش چار سو هست
وگر باور نہ داری، روبرو هست

مپرس، از قطعه اش، گردد زباں قطع
اگر گویم، بهشت آمد، بہ آں قطع

ز نثر او، ظهوری را جگر خوں
ابوالفضل است اندر خاک مدفوں

دگر انداز اخلاقش، کہ گوید
هماں داند کہ در راهش بہ پوید

هرانچہ از وے بود، قربان یاراں
بہ جان وی، دعائے می گساراں

وگر از سیم و زر کاصلا نہ دارد
وگر دارد، چو ابر از کیسہ بارد

نہ باشد صرفہ اش هرگز در اسراف
اگرچہ حرفها باشد بر اسراف

سخن این ست و بس من هیچ نبوم
بر آں نکتہ رس من هیچ نبوم

بود تا میرزا غالب ز من شاد
خراب من سراسر باشد آباد

فدائے میرزا غالب، دل و جاں
گدائے میرزا غالب، دل و جاں

چہ غالب، هم نوائے قیصر و جم
چہ غالب، میرزائے قیصر و جم

بہ اهل فارس غالب، غالب ما
بہ از عرفی و طالب، غالب ما

دری از درج توراں، چشم بددور
مگو از سایه، کاینجا سر بسر نور

دگر از هند گفتن، روسیاهی ست
گواه تفتہ، از مہ تا بہ ماهی ست

چہ گویم، تا چہ رحمت کرد بر من
وگرنہ کو جناب او، کجا من

رسد نازش چہا، بر فرق دانم
رسانید از زمیں بر آسمانم

بود هر ذرہ او آفتابی
درش را خواندہ ام، روشن کتابی

اگر صد دفتر از مدحش نگارم
یکے باشد یکے، از صد هزارم

الهی برسر من سایه اش باد
ز هر پایه، فزوں تر پایه اش باد

بماند تا ابد باقر علی خاں
کہ از پوران او، پورست خوش آں

کند عمر خضر ، حق روزی او بود با خیر ، خیر اندوزی او
چساں در شکر گویانش در آیم کجا از عہدہ' شکرش بر آیم

(تضمین گلستان ، طبع نول کشور پریس ، کانپور ۱۸۷۳ء ، ص ۹ - ۸)

قلم برداشتہ لکھنے کا یہ ملکہ تفتہ کو پختہ نہ کر سکا ، غالب کو یہ بسیار گوئی نا پسند بھی رہی۔ اسی وجہ سے مرزا نے ان کے پہلے دیوان کے بعد کسی کتاب پر تقریظ بھی نہیں لکھی - بلکہ سنبلستان چھپی تو یہ کہا :

" سنبلستان کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا تمھاری آبرو کا نگہبان رہے "۔ (اردوے معلیٰ ، طبع مجلس ، ص ۱۸۳)

اس کے باوجود تفتہ کی ناراضگی کا خیال رہا ، کسی عالم میں بھی ہوئے اصلاح ضرور دی - ایک مرتبہ تفتہ نے کوئی ایسا خط لکھا ، جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آپ ذوق شعر کی وجہ سے اصلاح دیتے ہیں ، تو جھلا کر کیا پیاری بات کہی :

" لاحول ولا قوۃ ، کس ملعون نے بہ سبب ذوق شعر ، اشعار کی اصلاح منظور رکھی ؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار " -

اس تمہید کے بعد وہ قیامت کا جملہ اور غضب کی بات یہ ہے :

" میں نے تو بہ طریق قہر درویش بہ جان درویش لکھا تھا - جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے ، میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے " -

اور یہ معاملہ اس طرح نباہ ہوگیا کہ اس کی مثالیں کم ملیں گی - تفتہ کو مرزا کے مرنے پر جو غم ہوا ہے ، اس کی داستان وہ ترجیع بند ہے جو " ماتم اسداللہ خاں مرحوم " میں قلم بند کیا تھا ، تین سو چھیاسی شعروں میں تفتہ نے دل کھول کے فریاد کی ہے اور سچے دل سے کہا ہے :

یک دل است و ہزار غم چہ کنم نہ کند رحم مرگ ہم ، چہ کنم

تفتہ نے کم و بیش پچاس ہزار شعر تو کہے ہوں گے - مدتوں غزل لکھی ، پھر مثنوی اور قصیدہ ، رباعی اور قطعہ جیسے اصناف سخن کی طرف مڑے تو دفتر بھر دیے ، بڑی بڑی غزلوں میں سے کچھ شعر ضیافت طبع کے لیے حاضر ہیں :

جلال اسیر کی غزل ہے :

کے دل ، کلید راز بہ دست زباں سپرد
بحر گہر ، بہ موج کجا می تواں سپرد

تفتہ نے تین غزلیں جواب میں لکھی ہیں، ان کے چونتیس شعروں میں سے دو شعر یہ ہیں :

هجران او دگر بہ کہ زیں ساں فغاں سپرد
گوئی بمن کلید در آسماں سپرد

آورد تفتہ را بہ در بو ظفر سپہر
گوئی ظہیر را بہ قزل ارسلاں سپرد

عرفی کے جواب میں دو غزلیں ہیں :

مائیم و ناامیدی و تنہا گریستن رنگیں بود حکایت ما با گریستن

بستن بروے خود در و تنہا گریستن بے خون دل حلال مبادا گریستن

بہ کوثر غوطہ ها زد ، هر کہ اندر خوں تپید ایں جا
محبت کربلائے هست ، باید شد شہید ایں جا

ذرا ان شعروں کی زبان اور انداز دیکھیے :

چہ باشد آدمی و چوں تواند آرمید ایں جا
تو گوئی عمر آخر شد ، نفس را تا کشید ایں جا

رہ عقبیٰ اگر جوئی ، پئے دنیا مرو چندیں
تواں گر آرمید ایں جا ، تواں از خود رمید ایں جا

ایک غزل میں فرماتے هیں :

ایں قدر باهم تغافل خوب نیست تا کجا آری بہ جاں ، آیینہ را
خود نہ گویم ایں کہ دارم دل چناں سینہ صافی ها عیاں آیینہ را

از خدا دیگر چہ ای صیاد ، می خواهیم ما
خانہ' صیاد خویش آباد می خواهیم ما

آخر میں یہ شعر بھی دیکھیے :

رهاند از چنیں بے دانشی هایت خدا ، اے دل
بدامش افتی و دیگر طمع داری رهائی را

حسرت هلاک بے کسی آں ، کہ بر درت
با جان خستہ آمد و با چشم تر گزشت

اے تماشا گاہ ایں دل روے تو
عالمے در دل تماشا کردہ ایم

تفتہ نے چوراسی برس کی عمر پائی اور استاد کے دس برس بعد ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۰ رمضان ۱۲۹۶ھ) میں رحلت کی ۔

❦❦❦❦
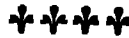
مطالعہ غالب اور اثر لکھنوی

نثار احمد فاروقی

نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم اس دور میں دبستان لکھنؤ کی آبرو تھے۔ پرگو اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ محاورات و مصطلحات پر ان کی عالمانہ نظر تھی۔ انھوں نے نظم و نثر میں مختلف اصناف اور موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ تنقید ادب و شعر کے موضوع پر ان کی مطبوعہ کتابوں میں ' اثر کے تنقیدی مضامین ' ' چھان بین ' ' مطالعۂ غالب ' اور ' انیس کی مرثیہ نگاری ' خاص وقعت و اہمیت رکھتی ہیں۔ فی الوقت ہمارا موضوع سخن حضرت اثر کی ناقدانہ حیثیت سے بحث کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب ' مطالعۂ غالب ' سے متعلق ان کی کچھ وضاحتیں پیش کرنا ہے، اس لیے غیر ضروری تمہید کو ترک کیا جاتا ہے۔

' مطالعہ غالب ' ایک مختصر سی کتاب ہے جو پہلی بار ۱۹۵۲ء میں دانش محل لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں حضرت اثر لکھنوی نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں غالب کے چیدہ چیدہ اشعار کی وضاحتیں پیش کی ہیں اور شارحین متقدمین سے اختلاف کرتے ہوئے وہ معانی بیان کیے ہیں جو حضرت اثر کے خیال میں زیادہ قابل قبول ہیں۔ اس مختصر کتابچے کی اہمیت سہ گونہ ہے۔ پہلی تو یہ کہ حضرت اثر جس نسل سے تعلق رکھتے تھے، اس میں غالب اتنا مقبول نہ تھا جتنا آج ہے، اور نظم طبا طبائی کی شرح چھپنے سے پہلے تو لکھنؤ والے بالعموم غالب کو ' مہمل گو ' سمجھتے تھے۔ ان کے مذاق سخن کی تربیت ناسخ، آتش، جلال، امیر، وزیر، رند، سحر، رشک، اسیر، مضطر وغیرہ کے رنگ کلام سے ہوئی تھی۔ دبستان دہلی کے شعرا میں میر، سودا اور درد تو خیر ابوالآباء تھے، عہد متوسطین میں شاہ نصیر اور ذوق

کی وقیہ پیمائیاں اہل لکھنؤ کو زیادہ متاثر کرتی تھیں ۔ اس لیے جب کبھی ایسا تفصیلی مطالعہ کیا جائے گا جس سے یہ ظاہر ہوسکے کہ غالب کی شاعری کا رد عمل اور اس کی پذیرائی یا تفہیم کن مدارج سے گزری ہے اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے تو دبستان لکھنؤ کا رد عمل اور غالب فہمی کی طرف رجعت کے سلسلے میں نظم طباطبائی کی شرح کے بعد دوسری مفید کتاب ' مطالعہ غالب ' ہی ہوگی ۔ حضرت اثر نے خود مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ :

> " مجھ میں تنقید کا ذوق میرے چچا صاحب مرحوم نواب دلاور حسین خان نے پیدا کیا ۔ وہ میری دادی کے بھائی کے فرزند تھے ۔ اس زمانے میں جس کو اب ساٹھ برس ہوئے ہوں گے ، غالب کی کوئی شرح شائع نہیں ہوئی تھی اور مہمل گو سمجھا جاتا تھا ۔ چچا صاحب مرحوم اس کے اشعار کے وہ وہ معنی بیان کرتے تھے کہ باید و شاید "۔ (مکتوب ۲۸ جون ۱۹۵۴ء)

دوسری اہمیت یہ ہے کہ حضرت اثر کی میر پرستی ضرب المثل کی طرح مشہور ہوگئی اور بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ وہ میر و غالب کا موازنہ کرتے ہوئے میر کی طرف داری کرتے ہیں ۔ اثر صاحب کی تحریروں میں ایسے متعدد مواقع آئے ہیں جہاں سخن گسترانہ پیرائے میں سہی ، انہوں نے میر و غالب کے ہم معنی اشعار کا موازنہ کیا ہے لیکن میر کا تفوق ثابت کرنے کے لیے کبھی ہٹ دھرمی یا غیر مناسب جنبہ داری کا مظاہرہ نہیں کیا ۔ اس کتاب میں جیسی دقت نظر اور ژرف بینی سے انہوں نے کلام غالب کے محاسن اجاگر کیے ہیں ، اس سے ایک طرف تو ان کی سخن فہمی اور نگاہ کی تہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے ، دوسری طرف غالب کی شاعری پر ان کی جچی تلی رائے بھی معلوم ہو جاتی ہے ۔ اور تیسری اہمیت یہ ہے کہ بعض اشعار میں انہوں نے واقعی ایسے پہلو تلاش کیے ہیں جن پر کسی شارح کی نگاہ نہیں پہنچی تھی ۔

میں نے حضرت اثر کی کتاب ' مطالعۂ غالب ' پڑھ کر ہی پہلا خط ان کی خدمت میں بھیجا تھا جس کا انہوں نے بڑی شفقت اور محبت اور عالی ظرفی سے جواب لکھا ۔ اس کے بعد یہ سلسلۂ مراسلت ان کے زمانۂ رحلت تک جاری رہا ۔ ان کے خطوط جو میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ، ہر لحاظ سے قابل قدر

ہیں ، توفیق ایزدی شامل رہی تو انہیں مقدمہ و حواشی کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کرنے کا ارادہ ہے ۔ یہاں صرف ان خطوط کے اقتباسات پیش کرتا ہوں جو ' مطالعہ غالب ' کے سلسلے میں لکھے گئے تا کہ ان وضاحتوں کی روشنی میں ' مطالعہ غالب ' کے بعض مطالب اور بھی روشن ہو جائیں ۔

[۱]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۸ ۔ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرم بندہ ، سلام شوق

خط ملا ۔ آپ کے استفسارات سے ناراض ہونا کیسا ' خوشی ہوئی ۔ ایسے مباحث میں اگر ذاتی پرخاش یا عناد کو راہ نہ ہو تو فائدہ ہی فائدہ ہے ۔ آپ کا خط خلوص کا آینہ دار ہے ۔ آمدم بر سر مطلب :

۱۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

حالی کے بیان کردہ مطالب پر دوبارہ غور کیجیے :

(الف) جس دشت میں ہم ہیں ، اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے ، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے ۔ آپ کے (اور اتنا اضافہ کرنے کی اجازت دیجیے کہ میرے) علی الرغم انہوں نے دشت کی ویرانی کو گھر کی ویرانی پر ترجیح دی ، دشت سے خائف ہونا اس کا غماز ہے ۔

(ب) ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی ، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے ۔ (کم سے کم گھر اور دشت مساوی درجے میں ویران ہیں ، گھر کی ویرانی کی دشت کی ویرانی پر افضلیت ثابت نہیں ہوئی اور اس کے بغیر شعر بلند نہیں ہوتا) ۔

ان مطالب پر میرا پہلا اعتراض یہ ہے کہ گھر کو چھوڑ کر دشت گردی اختیار کرنے کی توجیہ مفقود ہے ۔ میں نے اس کی وجہ بیان کی : " وحشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی جو گھر سے زیادہ ویران ہو ، لہذا دشت کا رخ کیا ، وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں، اس سے زیادہ تو خود میرا گھر ویران ہے " (اور گھر کی طرف مراجعت کی) ۔ بعد ازاں میں نے یہ استدلال کیا ہے : ' ویرانی سی ویرانی ' کے بیشتر لفظ

' کوئی ' نہ ہوتا تو شدید ویرانی کا مفہوم ادا ہوتا ۔ لفظ کوئی کے اضافے نے ویرانی' دشت کی تنکیر یا تنقیص کردی ۔ حاصل کلام ، مطلب وہی نکلا جو آپ نے بیان کیا ہے، یعنی غالب نے اپنے گھر کی ویرانی کا نقشا کھینچا ہے اور دشت کے بالمقابل (جو ویرانی کے لیے ضرب المثل ہے) اپنے گھر کو زیادہ ویران ثابت کیا ہے۔

۲۔ پھر مجھے دیدہ' تر یاد آیا		دل جگر تشنہ' فریاد آیا

آپ کا فرمانا بالکل درست ہے کہ جگر تشنہ (یا تشنہ جگر) اور تشنہ ہم معنی ہیں۔ مگر میں عرض کروں گا کہ ہر جگہ نہیں، مثلاً ' تشنہ' خون ' کے بجائے ' تشنہ جگر خون ' یا ' جگر تشنہ' خون ' لانا غلط ہوگا۔ تشنہ یا تشنہ جگر (جگر تشنہ ترکیب مقلوب) کے مجازی معنی کثرت سے آرزو مند ہوتا ہیں ۔ غالب نے صرف جگر تشنہ کو نہیں بلکہ جگر تشنہ' فریاد کو دل کی صفت قرار دیا ہے۔ جس کے معنی میری ناچیز رائے میں اس کے سوا نہیں ہو سکتے کہ " دل بذریعہ فریاد جگر کے خون ہونے کے در پے ہوا "۔

۳۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد		سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر پر آپ کا اعتراض آپ کی دقت نظر پر دلالت کرتا ہے، میں نے اس شعر کو کبھی وقعت نہیں دی مگر مجھے اعتراف ہے کہ جو اعتراض آپ نے وارد کیا ہے، کبھی نہیں سوجھا (۱) ۔ شعر میں کوئی نکتہ نہ پہلے پنہاں معلوم ہوا نہ اب معلوم ہوتا ہے، شاید ہے بھی نہیں ، صرف متناسب الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں ۔

مجھے سعادت علی امروہوی کے متعلق اتنی تحقیق بھی نہیں جتنی آپ کو ہے (۲) ۔		والسلام اثر

۱۔ میں نے شاید یہ لکھا تھا کہ لفظ ' لڑکپن ' کا استعمال درست نہیں ، یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں اتنی مآل اندیشی اور عاقبت بینی نہیں ہوتی جو شاعر کا مقصود ہے۔

۲۔ سید سعادت علی سعادت امروہوی جن کا حوالہ ' ذکر میر ' میں ملتا ہے اور میر نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے مجھے ریختہ موزوں کرنے کی ترغیب دی ۔ میں نے سعادت کے حالات اور کلام مختلف تذکروں سے فراہم کرکے ایک مضمون لکھا تھا جو دلی کالج میگزین کے میر نمبر میں شامل ہے۔

[۲]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۱۹ - ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی ، تسلیم - عنایت نامہ مل گیا ـ بہت بہت شکریہ -

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا   دل جگر تشنۂ فریاد آیا

میں نے آپ کے بیان کردہ مطلب پر غور کیا - میں بادب عرض کروں گا کہ میری شرح کا یہ جملہ اب بھی تشنۂ جواب ہے : " فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہو سکتی ہے" ؟ آپ کا فرمانا ہے کہ " دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کر رہا ہے اور مجھے اپنا دیدۂ تر یاد آرہا ہے ، وہ اس کی پیاس بجھائے " ـ فریاد کی شدید پیاس ہوئی فریاد کی شدید خواہش ، اس کی تسکین رونے سے کیوں کر ہو سکتی ہے ؟ فریاد کی خواہش فریاد کرنے سے پوری ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی امر مانع نہیں - مزید برآں کسی کی یاد آنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس وقت موجود نہیں - دیدۂ تر کا یاد آنا یہ ہوا کہ آنکھیں ہیں مگر آنسو نایاب ہیں - لفظ پھر سے اس طرف اشارہ ہے کہ آنکھیں پہلے ہی اتنا رو چکی ہیں کہ آنسو خشک ہو گئے ، اب آنسوؤں کا قحط ہے -

میری شرح میں آپ کے اس اعتراض کا جواب موجود ہے کہ " دل جگر کے خون ہونے پر آمادہ ہوگا تو دیدۂ تر کیا کریں گے" ؟ آنکھیں بجائے اشکوں کے جگر کا خون روئیں گی - شرح کے الفاظ یہ ہیں :

" دل جو بیتاب گریہ تھا ، مصر ہوا کہ آنکھ میں آنسو نہیں تو فریاد کر کے جگر کا خون کرو اور اس خون کے آنسو رؤو - میری تشنگیٔ شوق کی تسکین بہر صورت ہونا چاہیے " -

کیا غلط ہوگا اگر عرض کروں کہ میری شرح کا آخری جملہ کہ " فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہو سکتی ہے" ہنوز تشنۂ جواب ہے ؟ اور آپ کی مزید توجہ کا محتاج - یقین مانیے کہ یہ میری ہٹ دھرمی نہیں ہے بلکہ آپ کے فرمودات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد عرض کر رہا ہوں -

مجھے مسرت ہے کہ آپ میری پیش کردہ شرح اشعار غالب کا غائر مطالعہ فرما رہے ہیں اور اپنی مجموعی رائے سے مطلع کریں گے - آپ ان شاء اللہ

دیکھیں گے کہ اپنے تسامحات سے آگاہ ہونے پر ان کا فراخ دل سے اعتراف کروں گا ...		نیاز مند		اثر

[۳]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۲۴ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی ، تسلیم - گرامی نامہ وصول ہوا :

۱- ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

آپ کے دونوں بیان کردہ مطالب میں لبوں کو خوشامد طلب فرض کیا گیا ہے - یہ امر مستبعد ہے - لب خوشامدی ہو سکتے ہیں، خوشامد طلب نہیں ہو سکتے جس کا مطلب ہے خواہاں یا متوقع ہونا - لبوں کو گفتار سے تو ربط ہے مگر سخن سے طلب خوشامد کیوں کر کریں گے ؟ سخن کا لبوں سے آزردہ ہونا ، باہمی رشتہ منقطع ہو جاتا ہے جس کا مآل خاموشی ہے - چونکہ بت خاموش رہتے ہیں لہذا ان کی بزم اور ان کے تتبع میں سخن بھی لبوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے ، روٹھ جاتا ہے -

حسرت و میر کے اشعار کا مفہوم غالب سے بالکل مختلف ہے - (۱)

میر کہتے ہیں کہ معشوق کا سامنا بھی ہوتا تو کیا ہوتا ، منہ سے بات بھی نہ نکلتی - اس کا سبب رعب حسن ہو یا محویت دیدار یا افراط شوق یا شدت اضطراب یا ان سب کا مجموعی اثر -

حسرت کہتے ہیں کہ بر بنائے احتیاط اظہار مدعا نہ ہوا ، (مبادا معشوق ناراض ہو یا عشق کی تذلیل کرے ، مضحکہ اڑائے اور کہے یہ ' منہ اور خشکہ ' !) -

---

۱- میں نے یہ لکھا تھا کہ شعر میں ' خوشامد طلب ' صفت لبوں کی معلوم ہوتی ہے ، یعنی جب بزم بتاں میں پہنچے تو لب و سخن ایک دوسرے سے بیگانے ہو گئے اور سخن بار بار لب تک آنا چاہتا ہے ، مگر لب اسے قبول نہیں کرتے (گویا بولا نہیں جاتا) - حضرت اثر کا فرمانا تھا کہ ' بتاں ' کی صفت ہے - میں اس معاملے میں ابھی تک متامل ہوں -

گستاخی ضرور ہے مگر مفہوم سے ملتے جلتے اپنے چند شعر پیش کرنے کی جراٰت کرتا ہوں :

کبھی اظہار مدعا نہ ہوا ۔۔۔ عشق غیرت سے لب کشا نہ ہوا

جب کہا اس نے مدعا کہیے ۔۔۔ سوچتے رہ گئے کہ کیا کہیے

نظریں اٹھیں اور اٹھ کے جھکیں تمکنت کے ساتھ
گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا

وہ غور بات بات پہ وہ شک بھری نظر
یا رب نہ مجھ سے صاف ہو دل بدگمان کا

اس کا کہنا کہ جو کہنا ہے کہو جلد ، یہاں
بات کا طول کسی طرح گھٹائے نہ بنے

۲- میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

ورنہ کا لفظ بھرتی کا نہیں ہے بلکہ مخاطب کے خیال کی تردید کرتا ہے :
" اے غافل (رموز معرفت سے بیگانہ) تو سمجھتا ہے کہ میں معدوم ہوں ۔ نہیں ، میں اس سے بھی بالاتر منزل میں ہوں ، جہاں وجود و عدم کا فرق اور تضاد مٹ گیا ہے ۔ غالب کا شعر فلسفیانہ ہے ، اس کو مجازی عشق کے معاملات سے منسوب کرنا شاید درست نہ ہو ۔ اس میں غافل سے مراد معشوق نہیں ہے ، لہذا معشوق کا آہوں کی بے اثری پر طعنے دینے کی بھی گنجایش نہیں بلکہ ایسا شخص مخاطب ہے جو وجود و عدم کے صحیح مفہوم سے نا آشنا ہے ۔

جرات گفتار پر معافی کا خواستگار ہوں ۔

آپ (۱) کو یہ وہم کیوں کر ہوگیا کہ آپ بد خط ہیں ، آپ کے خط

۱- حضرت اثر کا خط بہت پاکیزہ اور صاف تھا ، معہذا اس میں یکسانی اور یکرنگی تھی ، اس اعتبار سے میرا خط یقیناً اچھا نہ تھا ۔ ان جملوں کو غیر متعلق سمجھ کر حذف کرنا چاہتا تھا لیکن طرز بیان کی جامعیت اور استدلال میں جو لطف ہے اس میں دوسروں کو شریک نہ کرنا خود غرضی معلوم ہوئی ۔

میں تو پختگی کے باوصف صفائی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صاحب علم و فضل ہوتے ہوئے بھی ملائیت سے کوسوں دور ہیں - ملائیت بیشتر نفاست سے دور ہوتی ہے ، یہی حال کم علمی کا بھی ہوتا ہے -

نیاز مند

اثر

[۳]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۲۵ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی ، تسلیم - عنایت نامے کا بہت بہت شکریہ -

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

میں اب تک یہ سمجھتا تھا کہ مفہوم داد خواہی کے لیے شور و غل مچانے ، دھائی دینے تک محدود ہے ، اسی سے میری مطبوعہ شرح کا آخری جملہ یہ تھا کہ '' فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہوسکتی ہے '' - اگر فریاد میں گریہ و زاری بھی شامل ہے تو آپ کے بیان کردہ مطلب کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہتا - مگر اطمینان کر لیجے - میں اس باب میں آپ سے متفق نہیں اور — مزید بحث کا بھی دم نہیں (۱) -

شاید میں اپنے پچھلے عریضے میں سہواً یہ لکھ گیا کہ '' دل خون جگر کو آنسو بنا کر بہانے پر مصر ہوا تا کہ اس کی تشنگیٔ ارباد فرو ہو سکے '' - (یہ عبارت آپ کے خط سے نقل کی ہے ، میرے پاس مسودہ محفوظ نہیں) - میرا منشا ابتدا سے یہ رہا ہے کہ دل فریاد کا نہیں بلکہ رونے کا مقتضی ہوا - مگر میں پہلے ہی اتنا رو چکا تھا کہ آنکھوں میں قحط اشک تھا ، یہ حالت دیکھ کر دل مصر ہوا کہ (نایابیٔ اشک پر) فریاد کرکے جگر کا خون کرو اور اسی خون کے آنسو رؤو - میری تشنگیٔ شوق (گریہ) کی تسکین بہر صورت ہونا چاہیے - اگر ' جگر تشنۂ فریاد ' سے یہ مراد ہے کہ دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کرنے لگا تو بھی آپ کا بیان کردہ مطلب درست ہے - خصوصاً

۱- اس جملے سے مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید حضرت اثر میرے کسی جملے سے ناراض ہوگئے - آیندہ خط نمبر ٦ میں اسی شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے -

جب دیدۂ تر کا یاد آنا ہر بنائے نایابیٔ اشک نہیں ہے بلکہ برائے تجدید گریہ ہے اور اس میں خشکیٔ اشک کا مفہوم مضمر نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ' جگر تشنۂ فریاد ' کو ایک لفظ تصور نہیں کرتا ، غالباً مجھ سے پھر ہنگام تحریر عریضۂ سابق لغزش ہوئی ورنہ مطبوعہ شرح میں یہ جملہ موجود ہے: '' جگر تشنۂ فریاد ترکیب مرکب ہے ''۔ فرق ہمارے مابین اس ترکیب کے مفہوم پر ہے۔ آپ اس سے دل کی شدید پیاس مراد لیتے ہیں اور میں دل کا بذریعۂ فریاد خون کرنے کا مطلب نکالتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اگر فریاد میں گریہ شامل ہے اور دیدۂ تر کے یاد آنے میں خشکیٔ اشک کی طرف لفظ ' پھر ' سے اشارہ نہیں ہے تو آپ کی شرح صرف صحیح نہیں بلکہ صاف اور میری شرح کی طرح پیچ در پیچ نہیں ہے۔

یہ گتھی یوں بھی سلجھ سکتی ہے کہ کچھ آپ سمجھیں ، کچھ میں سمجھوں ۔ آپ یہ مان لیں کہ دیدۂ تر کا یاد آنا یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو نہیں مگر رونے کی شدید خواہش ہے ۔ میں یہ مان لوں کہ اس نایابیٔ اشک پر دل شدت عطش سے فریاد کرنے لگا یعنی ' جگر تشنۂ فریاد ' کے وہی معنی ہیں جو آپ نے لیے ، فریاد کی خواہش یا پیاس ۔ کہیے یہ شرائط صلح آپ کو منظور ہیں ؟

... مومن کا جو شعر آپ نے نقل کیا ہے ، میں نے کبھی اس کی شرح کی تھی : '' مومن آج کل کے مولویانہ مذاق سخن رکھنے والوں میں اس شعر کی بنا پر بہت بدنام ہے۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی　　　تو مجھے آزمانے گا کب تک

یہ لوگ نہیں سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ شعر کا حاصل کیا ہے۔ کوئی بے غیرت سی بے غیرت بازاری عورت بھی اپنے چاہنے والے سے نہ کہے گی کہ آج شب وصل غیر ہے چلتے بنیے ۔ یہ صرف معشوق کی شوخی ہے کہ مومن کے آزمانے کو ایک جھوٹی اور فرضی بات کہتا ہے۔ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اگر اس کو در اصل مجھ سے محبت ہے تو سخت سے سخت آزمایش میں بھی پورا اترے گا اور اس سے زیادہ سخت آزمایش کیا ہوگی کہ وصل غیر کی طرف اشارہ کروں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے اور مومن دوسرے دن کہتا ہے کہ : لے شب وصلی غیر بھی کاٹی !

دوسرے مصرع میں لفظ 'آزمانے' سے جتا دیتا ہے کہ وصل غیر محض افسانہ تھا، میرے آزمانے کو ایک حیلہ تراشا گیا تھا: ہوا ہے نہ تو اور نہ ہوگا کسی کا۔ مگر ذرا باتوں باتوں میں کبھی غیر سے بھی کہہ دے کہ آج مومن کی شب وصل ہے، پھر دیکھ اس کا کیا حال ہوتا ہے، اگر امتحان میں ثابت قدم نکلے تو خط غلامی لکھتا ہوں۔" (۱)

بہت سمع خراشی کی، امیدوار عفو ہوں۔		اثر

[۵]

کشمیری محلہ، لکھنؤ۔

۲۹ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی، تسلیم

۲۶ ماہ حال کا گرامی نامہ ملا۔ جس خط کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا جواب ارسال کر چکا ہوں، امید کہ مل گیا ہوگا۔

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

بتاں بصیغہ' جمع اکثر شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ اس سے عموماً یہ مراد ہوتی ہے کہ جس خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب معشوقوں (بتوں) میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً میر کے یہ اشعار:

لطف اگر یہ ہے بتاں صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرہ' نورانی کا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

غالب کے شعر میں 'بزم بتاں' سے یہ مطلب نکلا کہ ہر بت (معشوق) کی بزم میں یہ عام دستور ہے کہ سخن لبوں سے آزردہ رہتا ہے (لب آشنائے گفتار نہیں ہوتے) سخن کا لبوں سے آزردہ ہونا یہ ہے کہ سخن میں اور لبوں میں رابطہ نہیں رہتا۔ علاوہ بریں بعض مواقع پر کثرت کا اطلاق مجموعے کے ہر فرد پر ہوتا ہے۔ جمع سے واحد مراد لی جاتی ہے۔ کسی خط میں عرض

۱۔ میرا خیال ہے کہ مومن کے اس شعر کی ایسی شرح اور کسی نے بیان نہیں کی، اور یہ یقیناً قابل قبول ہے۔

کر چکا ہوں کہ خوشامد طلبوں سے بجائے معشوق کے لبوں سے مراد لینا میری طبیعت قبول نہیں کرتی ، لہذا Let us agree to differ -

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

آپ فرماتے ہیں کہ رموز معرفت کے آشنا (سالک و مجذوب) کو آہ آتشیں سے کیا علاقہ ۔ تصوف کا دار مدار عشق پر ہے ۔ (عشق حقیقی ، بندے کا عشق خدا سے) ۔ جب تک رنج مہجوری ہے ، آہ و زاری ہے ۔ غالب اس شخص کو جو حقیقت سے نا آشنا ہے اور ان کے ترک آہ و نالہ کو مایوسی اور بے تاثیری پر محول کرتا ہے ، مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اب میں اس منزل فنا میں ہوں جو عدم سے بھی ماورا ہے ۔ فنا کی ہوس بھی فنا ہوگئی ۔ جب منزل عدم میں تھا تو احساس دوری تھا اور آہ آہ کرتا تھا اور آہ میں اتنی تاثیر تھی کہ عنقا کے بال و پر جل جاتے تھے ۔ عدم کی منزل سے بالاتر ہو جانے کے بعد جب تفریق فنا و بقا مٹ گئی تو اب آہ کی کیا ضرورت رہی ۔ میں نہ تو سالک ہوں نہ مجذوب ، البتہ مسائل تصوف سے آگاہی کا شغف ہی نہیں رہا ہے بلکہ (باوجود شیعہ ہونے کے) اکثر حضرات صوفیائے کرام کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا ہے اور ان سے متمتع ہونے کے علاوہ کتب تصوف کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اس کے ' مقامات ' کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔ فنا و بقا کے متعلق صرف علامہ ہجویری (۱) علیہ الرحمہ کا قول نقل کرنا کافی ہوگا : " میری کل ہوا و ہوس کے گم ہوجانے سے میری فنا کی ہوس بھی فنا ہوگئی (یہ محبت اور حرص بھی کہ مر کر بہشت پاؤں ، میرے دل سے جاتی رہی) ۔ اب جملہ امور میں میری دلی خواہش صرف تیری محبت رہ گئی ہے ۔ یعنی جب آدمی اپنے اوصاف بشریت سے فنا ہو جاتا ہے (شہوات و لذات کو

۱- یہ حضرت شیخ علی الہجویری داتا گنج بخش لاہوری علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب " کشف المحجوب " کا اقتباس ہے ۔ تصوف کے مسائل کی اس بحث کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خیال رہے کہ اس زمانے میں (۱۹۰۳ء) میرا رجحان تصوف کے خلاف تھا اور یہ بعض ایسی کتابیں پڑھنے کا اثر تھا جو تصوف کے خلاف لکھی گئی ہیں ۔ لیکن آج (۱۹۶۹ء) میں صوفیائے کرام اور تصوف اسلامی کے بارے میں دوسری ہی رائے رکھتا ہوں (فاروقی) ۔

ترک کردیتا ہے) تو وہ پھر بقا کے معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ جب بندہ اپنی صفتوں کے وجود کی حالت میں صفتوں کی آفتوں سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ اپنی مراد کی فنا کے ساتھ اپنے مقصود کی بقا میں باقی ہو جاتا ہے، قرب و بعد کچھ نہیں رہتا ... "

میر کے متصوفانہ اشعار اور بعض دیگر خصوصیات شاعری پر ایک مختصر رسالہ ترتیب دیا ہے جو ان شاء اللہ عنقریب شائع ہوگا اور حاضر خدمت کروں گا۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

کیا ہے؟ استفہام انکاری ہے، یعنی جگر سوختہ کا کوئی نشان نہیں، خاکستر تک باقی نہیں۔ 'اے' کلمہ' خطاب ہے، میں نے اس کے یہی معنی لیے ہیں نہ کہ 'جز'۔ نالہ جگر کو جلا سکتا ہے، جگر کا نشان کیوں کر بن جائے گا، قصور معاف آپ کے بیان کردہ معنی میں 'کیا ہے' کا مفہوم آجاگر نہیں ہوتا۔ نالہ بے اثر بھی ہے اور جگر کو جلا بھی دیتا ہے، اس تضاد پر غور فرمائیے۔

آپ کو میرے اشعار پسند آئے: کلاہ گوشہ' دہقاں بآفتاب رسید۔ اب کی چند متصوفانہ اشعار حاضر ہیں بزرگی بعقل است نہ بسال'۔ کاش آپ سے 'نا اہل' اور 'نا لائق' حضرات اردو میں بکثرت پیدا پیدا ہو جائیں۔

مومن اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ اس کی شاعری چند موضوعات میں گھری ہوئی ہے۔ تصوف ہے نہ فلسفہ۔ خالص مجازی عشق کے معاملات و واردات۔ تاہم کلام میں بلاغت ہے، تنوع ہے، دل کشی ہے۔ غالب اس کا لوہا مانتے تھے اور مشہور ہے کہ اپنا پورا دیوان اس شعر کے معاوضے میں دینے کو تیار تھے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جتنی خوبصورت فارسی ترکیبیں مومن کے یہاں ہیں اور جس سلیقے سے استعمال ہوئی ہیں، غالب کے یہاں ہرگز نہیں۔ شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے کلام مومن کی ایک خصوصیت دریافت کی اور اس کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرف میرا دھیان خود اُس کے اس مقطع سے گیا:

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک 'معنی بند' ' مضمون یاب ' اپنا سا

حسن اتفاق سے آپ کے استفسار سے پیشتر اس کا ایک ایسا شعر ع
شرح پچھلے عریضے میں درج کر چکا ہوں ۔ نگار کے مومن نمبر میں ایک
مضمون میرا بھی شامل ہے ۔ غالباً سنہ ۲۹ء کی بات ہے ۔ افسوس کہ وہ
مضمون میرے پاس محفوظ نہیں ۔ غالب کی شاعرانہ عظمت سے نہ مجھے کبھی
انکار تھا نہ اب ہے ۔ مگر میر کی سی ہمہ گیری دل آویزی اور اثر اندازی ، اُسی
کے ساتھ انفرادی تیکھا پن کسی شاعر میں نہیں ۔

غالب کے موازنۂ ظہوری وغیرہ میں جن صاحب کی طرف اشارہ ہے وہ
پروفیسر بیخود موہانی مرحوم ہیں ۔ اُن کے اقوال اُن کی کتاب ' سرمایۂ
تحقیق ' سے اخذ کیے گئے ہیں ....
نیاز آ گیں اثر

[۶]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ
۳۰ ستمبر ۵۳ء

مکرمی ، تسلیم

۲۸ ستمبر کا نوازش نامہ مل گیا (آپ ۲۸ نومبر لکھ گئے !)
واللہ میں آپ سے ناراض نہیں ہوا ، نہ آپ کی تحریر کا کوئی جملہ خلاف
مزاج ہوا ۔ البتہ ' دیدۂ تر ' کی بحث سے اُکتا ضرور گیا تھا ۔ ممکن ہے کہ
میرے الفاظ نے اس کی غمازی کی ہو ۔ اگر میں آپ کی رائے کی قدر نہ
کرتا ہوتا اور وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تو آپ سے استدعا نہ کرتا کہ
میرا مضمون جو حامیان فراق کے جواب میں ہے ، پڑھ کر اپنی رائے سے مطلع
فرمائیے تاکہ مجھے مزید غور کا موقع ملے ۔ ابھی فراق موافقت میں جو
مضمون لکھا گیا ہے اس کی ایک قسط باقی ہے ، وہ دیکھ کر اپنا جواب مکمل کروں
کے بعد حاضر خدمت کروں گا ۔ کتابوں کے بھیجنے کا عن قریب انتظام کروں
گا ، ایک کتاب کا میرے پاس فاضل نسخہ نہیں ، ناشر سے منگا کر بھیجوں گا

آپ کے پچھلے خط کا جواب روانہ کر چکا ہوں ۔ یقین ہے کہ مل گیا
ہو ۔ وعدہ کیجیے کہ آپ آیندہ میرے خط کے الفاظ سے آزردگی کا پہلو
نکالیں گے ، ورنہ میری تحریر کی آزادی سلب ہو جائے گی اور ہر جملے پر سوچنا
پڑے گا کہ اس میں آزردگی کا پہلو تو نہیں نکلتا ۔ ' مطالعہ غالب ' کے متعلق

میں جہاں جہاں آپ کو اختلاف ہو ضرور تحریر فرمایے اور یہ بھی لکھیے کہ اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا اس سے آپ کا اطمینان ہوا کہ نہیں ، اختلافی امور میں عبدالشکور صاحب (۱) کو حکم بنائیے ۔ کیا عبدالشکور صاحب وہی بزرگ ہیں جو ایک زمانے میں ڈربن کالج (جنوبی افریقہ) میں پروفیسر تھے اور اُن کا ایک مضمون عرصہ ہوا کہ رسالہ زمانہ کانپور میں شائع ہوا تھا اور مضمون کے آغاز میں میرا یہ شعر درج کیا تھا :

جھلملا تے ہوئے تارے کیا ہیں ملگجے پھول ترے بستر کے

اور اس کو حقیت سے تعبیر کیا تھا ۔ اگر میرا قیاس صحیح ہو تو میری طرف سے اثر نوازی کا شکریہ ادا کر دیجیے ۔ اس کا مطلع بھی بے ساختہ نکل گیا تھا ۔

جان کو روگ میں دنیا بھر کے ہم تو پچھتائے محبت کر کے

نیاز مند ، اثر

[۷]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۰ اکتوبر ۵۳ء

مکرمی ، تسلیم ۔

یکم اکتوبر کا گرامی نامہ ملا ۔ بہت بہت شکریہ ۔

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

آپ نے میرے اس شبہے کو رفع نہیں کیا کہ لب ' خوشامدی ' ہوسکتے ہیں ' خوشامد طلب ' نہیں ہو سکتے ۔ یہ امر تو بدیہی ہے کہ آزردگی سخن لبوں سے ہے ۔ مگر یہاں آزردگی سے مراد خفا ہونا نہیں بلکہ اتحاد عمل قطع ہو جانا ہے ۔ سخن لبوں سے نا آشنا ہو گیا ہے ۔ باہم مغائرت ہو گئی ہے ۔ دوسرے مصرع میں ' ہم ' سے مراد عاشق ہے اور خوشامد طلب ہونٹ نہیں بت ہیں ، وہ بھی ایسے خوشامد طلب کہ خموشی کو انتہائے خوشامد سمجھتے ہیں ، کیونکہ بت ہیں (لفظ بت کے ایک معنی خاموش بھی ہیں) ۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اپ کا ہم نوا نہ ہو سکا ۔ مجبوری ہے ۔

۱۔ عبد الشکور صاحب ، مصنف ' تنقیدی سرمایہ ' و ' حسرت موہانی ' و غیرہ ۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بار ہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

آپ کے بیان کردہ مطلب کے متعلق تصوف کے ضمن میں عرض کروں گا ۔ یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ معشوق کو لفظ ' غافل ' سے مخاطب کرتے میں نے کسی شعر میں نہیں دیکھا ۔ معشوق کو غافل ، تغافل شعار ، تغافل پیشہ وغیرہ کہتے ہیں مگر اس سے خطاب بہ لفظ غافل (مثل ظالم ، کافر وغیرہ) میری نظر سے کہیں نہیں گزرا ۔ کیا آپ اپنے قول کی سند میں کوئی شعر پیش کر سکتے ہیں جس میں معشوق سے تخاطب لفظ غافل کے ساتھ ہو ؟

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

نالے نے قمری کو جلا کر کف خاکستر کر دیا ۔ بلبل کو قفس رنگ بنا دیا ۔ غالب کا جگر جلا دیا ۔ پھر بھی غالب نالے کی بے اثری کے شاکی ہیں ؟ جگر سوختہ ہو گیا تو پھر نشان چھوڑنا کیسا ؟ میری مطبوعہ شرح دوبارہ ملاحظہ فرمایے ۔ جلنے کے بعد صرف کثیف اجزا باقی رہ جاتے ہیں ۔ قمری اور بلبل کا کچھ نہ کچھ نشان باقی رہا ۔ جگر ایسا جلا کہ کوئی نشان نہ رہا ۔ یعنی غالب کے عشق میں کوئی جزو کثیف نہیں تھا ۔ آپ کی شرح سے قمری اور بلبل کے عشق پر انسان کے عشق کی افضلیت کا پہلو نہیں نکلتا ۔ ' کیا ہے ' سے ' نہیں ہے ' مراد لینے سے یہ بات پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ جب اشعار مبہم ہوں گے تو اختلاف آرا ناگزیر ہے ۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی　　　تو مجھے آزمائے گا کب تک

... صاحب کی خدمت میں مجھے بھی نیاز حاصل ہے ، گو سرسری ۔ اگر شعر کا وہی مطلب ہے جو انہوں نے بیان کیا تو وائے بر غیرت عشق جو معشوق کے وصل غیر سے راضی اور خوشنود ہے ۔ یہ امتحان عشق کی بے حیائی کا ہوا یا غیرت کا ؟

حضرت (۱) بابا فرید گنج بخش یعنی علامہ علی الہجویری علیہ الرحمہ آپ

---

۱ ۔ حضرت اثر نے دو ناموں کو مخلوط کردیا ہے ۔ شیخ علی الہجویری کا لقب داتا گنج بخش ہے اور حضرت بابا فرید ، گنج شکر کہلاتے ہیں ۔ میں نے غالباً یہ لکھا ہوگا کہ موخرالذکر میرے مورث اعلیٰ تھے ۔

کے جد اعلیٰ تھے مگر تصور معاف تصوف کو یونانی فلسفے سے قریب تر کہنے سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ نے ان کی نادرہ' روزگار تصنیف 'کشف المحجوب' کا مطالعہ نہیں کیا ۔ یہ تصوف پر ایسی مستند اور معیاری کتاب ہے کہ اکثر مغربی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے ۔ انھوں نے یونانیوں (سوفسطائی) کے فلسفہ' حیات کی سخت مذمت کی ہے اور مردود قرار دیا ہے ۔ کشف المحجوب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو شعار اسلام کے خلاف ہو ۔ کتاب میں فنا و بقا پر سیر حاصل بحث ہے ۔ چند اقتباسات حاضر ہیں :

" فنا اور بقا کے علم کا قاعدہ اخلاص اور وحدانیت پر ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کفر و زندقہ ہے ۔ جو فنا کو خدا کی ذات میں فنا ہو جانا یا بقا کو خدا کی ذات سے متحد ہوکر باقی رہنا جانتا ہے ، وہ غلطی پر ہے ... حادث قدیم اور قدیم حادث نہیں ہو سکتا ۔ ہماری بقا بھی ہماری صفت ہے اور ہماری فنا بھی ہماری صفت ہے ... فنا سے مراد غیر کے ذکر کی فنا ہے اور بقا سے مراد خدا کے ذکر کی بقا ہے ۔ جو اپنی مراد سے فانی ہے ، وہ خدا کی مراد سے باقی ہے " ۔

جب سرتاج انبیا ہمارے رسول کریم صلعم کو منزل تمکین و جمال (معراج) میں بھی ' قاب قوسین او ادنیٰ ' کا احساس رہا تو اور کسی کا ذکر کیا ۔ میں نے انھیں امور کو مد نظر رکھتے ہوئے غالب کے علی الرغم (عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا) کہا :

بحر سے مل کے بھی رہا ایک حجاب درمیاں
قطرہ فنا تو ہوگیا ترک بدن نہ ہو سکا

یا : قطرہ کنار بحر میں محو نمود و بود ہے
دیکھیے کیا نتیجہ ہو سرکشی' حباب کا

یا : ڈوب کر بحر میں بھی اپنی خودی ترک نہ کر
کہ یونھی قطرہ' ناچیز گہر ہوتا ہے

یا : آسودہ' فنا نہ ہو جان امیدوار آلودہ پیرہن ابھی گرد سفر میں ہے

یا : منزل قرب میں پہنچ کر بھی کچھ سکوت اور کچھ حجاب رہا

ذات مطلق سے کامل اتحاد (موکش یا نروان) ہندو فلسفہ ہے ، تصوف سے (اسلامی تصوف سے) اسے کوئی علاقہ نہیں ۔ وہ نظریۂ شہود ہے جس نے تصوف میں تفرقہ ڈالا اور جس کے بانی شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) ہیں جن کا انتقال سنہ ۱۰۳۴ھ میں ہوا ۔ حضرت علامہ ہجویری کا وصال سنہ ۴۶۴ھ میں ہوا ۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تصوف کے دلق پارسائی میں رخنے اڑتے گئے ، یہ بحث طویل ہے اور خط میں تفصیل کی گنجایش نہیں ۔
تصوف میں مسئلۂ وحدت الوجود کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے والے شیخ الاکبر حضرت محی الدین ابن العربی ہیں ۔ یہ اندلس کے رہنے والے تھے ۔ ان کا مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے ۔ یہ (غالباً غرناطہ کے) ایک امیر کبیر کی لڑکی پر جس کا نام ناظم تھا ، عاشق ہوگئے ۔ فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ جوش سرور و مستی میں اس کے حسن کی تعریف میں عشقیہ اشعار بر سر کوچہ و بازار پڑھتے پھرتے تھے ۔ لوگوں نے ملامت کی کہ ایک با عصمت و نا کتخدا لڑکی کو بدنام کرتے ہو ۔ انھوں نے فرمایا کہ عشق گناہ نہیں اور عشق کے سوا مجھے اس لڑکی سے کوئی سروکار نہیں ۔ لوگ ان کی جان کے درپے ہوگئے اور مجبوراً ترک وطن کرنا پڑا ۔ مکہ معظمہ پہنچ کر انھوں نے اپنی مشہور عالم کتابیں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ تصنیف کیں ۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ڈانٹے کی Divine Comedy کے اکثر مقامات فتوحات مکیہ سے مستعار ہیں ۔ میں نے ابن العربی کی ایک عشقیہ نظم کا انگریزی سے ترجمہ کیا ہے ۔ عربی میں خدا جانے کس قیامت کا زور ہوگا ۔ ترجمہ آپ کے ملاحظے کے لیے حاضر ہے ...

نیاز مند		اثر

[۸]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۲۹ نومبر ۴۳ء

پیارے نثار ۔ ۲۶ نومبر کا خط ملا ، مسرت ہوئی ۔ میر اسی قابل ہے کہ اس کا امعان نظر سے مطالعہ کیا جائے (۱) اور نشاط روح ا

۱۔ اس بحث کے بعد ہی میں نے میر کا مطالعہ امعان نظر سے کیا او اب مجھے اعتراف ہے کہ میر کی عظمت کو میں نے اس وقت اچھی طرح نہیں سمجھا تھا ۔ میر کے سلسلے میں حضرت اثر کے اور خطوط بھی ہیں جو یہاں غیر متعلق سمجھ کر نظر انداز کردیے گئے ہیں ۔

دماغ کا وسیلہ بنایا جائے ۔ میں نے اس کا یہ شعر ایک مرتبہ رات بھر گنگنایا ہے۔ تصویر ایک مادی پیکر کی ہے مگر ایک ایسے مادی پیکر کی ، گویا ایک تابندہ ستارہ مجسم ہوگیا ۔ سنو اور اپنے تاثرات بیان کرو :

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

غالب کا یہ شاہ پارہ بھی نہایت قابل قدر ہے :

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

اس میں سکون ہے ' میر کے شعر میں تڑپ ہے - (۱)

غالب کو اپنے اور میر کے درمیان حد فاصل بنا کر اپنا بھی ایک شعر سنانے کو دل چاہتا ہے ، نہ معلوم پہلے تمہیں لکھ چکا ہوں کہ نہیں :

اس کا عالم ؟ اس کا عالم ! تم نے دیکھا ہے کبھی
وہ ستارہ جو ' سحر افشاں ' سراپا ہوگیا

میر کے بعض اشعار پر اپنے تاثرات قلم بند کردو ، یہی مضمون ہوجائے گا - اس پر کتنا ہی لکھتے چلے جاؤ، معلوم ہوگا کہ کچھ نہیں لکھا .....

تمہارا اثر

[۹]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۱۳ جنوری ۱۹۵۳ء

پیارے بھائی فاروقی - ۱۲ جنوری کا محبت نامہ ملا ۔ میں نے آپ کی اصلاح بطیب خاطر قبول کرلی ۔

اور مصرع کو بیاض میں درست کرلیا :

محبت میں اب یوں بسر ہو رہی ہے
بجائے : محبت میں یوں بھی بسر ہو رہی ہے

۱- دونوں اشعار پر کتنا جامع تبصرہ ہے - یہ حضرت اثر ہی کا انداز ہے -

بہت بہت شکریہ۔ (۱)

زندگی ہے تو ۱۰ مارچ کو یا اس کے چند روز بعد دہلی کا قصد کروں گا...
اب میں سمجھا کہ شاعری میں آفاقیت سے آپ کی مراد کیا ہے۔ بلا مبالغہ میر کے سینکڑوں اشعار پیش کروں گا۔ فی الحال غالب کا نقل کردہ یہ مطلع لیجیے جو حسن اتفاق سے (آپ یقیناً سوء اتفاق کہیں گے) میر کے ایک مطلع کا دست نگر ہے۔

غالب : بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میر : ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

غالب نے شیخ علی حزیں کے ایک مطلع میں ایک ردیف کو بیکار قرار دیا تھا۔ اُن کے مطلع میں خیر سے دونوں ردیفیں بیکار ہیں۔ "دنیا بازیچۂ اطفال ہے، روز و شب تماشا ہوتا ہے" ۔ مطلب پورا ہی نہیں ہوگیا بلکہ 'مرے آگے' کا ٹکڑا قول کی آفاقیت میں هارج تھا، وہ نکل گیا۔ میر کا مطلع ان تمام اسقام سے پاک ہے۔ غور کرنے کے بعد اپنی رائے سے مطلع کیجیے۔

غالب کا دوسرا شعر ہے :

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

شعر کی خوبی میں کوئی شک نہیں۔ میر کا مقطع سنیے :

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر
جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

۱- اس سے حضرت اثر کی عالی نظری اور بلند ہمتی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک دبستان نشیں' کم سواد کی 'اصلاح' کو بہ طیب خاطر قبول کرلیا۔ اُن کی محبت اور شفقت نے مجھے اتنا ہی گستاخ کردیا تھا۔

غالب کے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کشاکش ہائے ہستی سے آزادی ممکن نہیں ۔ موج ہاتھ پاؤں مارتی ہے تو زنجیر اور زیادہ الجھتی ہے اور وہ زنجیر خود موج کی روانی یا سعی ہے (میرے نزدیک سعی آزادی سے جہد آزادی کہنا کہیں بہتر ہوتا ۔ سعی محض کوشش ہے اور جہد کوشش بسیار یا تگ و دو ہے ۔ خیر اسے جملہ معترضہ تصور کیجیے) ۔ میر کہتا ہے کہ خود جان وابستۂ زنجیر ہے ، لہذا ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہیں ہوسکتا ۔ ہر حال میں ناموس عشق کی نگہداشت لازم ہے ۔ آزادی تو اس وقت تک تھی کہ ' طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا ' ۔ (پورا شعر میر کا یہ ہے :

صد گلستاں نہ یک بال تھے اس کے جب تک
طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا)

آپ کا نقل کردہ تیسرا شعر غالب کا یہ ہے :

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

اس کی شرح ' جہاں بین ' یا ' تنقیدی مضامین ' میں کر چکا ہوں ۔ میر کا شعر مقابلے میں سنیے :

یاں جیسے شمع بزم اقامت نہ کر خیال
ہم 'دل کباب' پردے میں سرگرم راہ ہیں

وہی بظاہر اقامت مگر در پردہ طے منزل جو غالب کے شعر کا خلاصہ ہے ، وہی میر کے شعر کا ہے ۔ وہاں تکلف اور تصنع کے ساتھ شکوہ الفاظ ہے ' یہاں حقیقت کے ساتھ دست بدست ندرت ادا ہے ۔ آپ غالب کے اشعار لکھتے جائیے ' میں جواب میں میر کے اشعار پیش کرتا جاؤں گا - فیصلے کا انحصار آپ ہی پر رہے گا ۔ ان شاء اللہ آپ آفاقیت کے معاملے میں بھی میری طرح میر کے قائل ہو جائیں گے ۔ اس کے بعد میر کے فاضل اشعار جن میں آفاقیت ہے ، درج کر کے آپ سے استدعا کروں گا کہ ان کے جواب میں غالب کے اشعار ڈھونڈھیے ۔ اقبال اور میر کا کوئی موازنہ نہیں ، ایک قومی یا ملی شاعر ، ایک غزل گو ۔ ...

آپ کا اثر

[۱۰]

کشمیری محلہ ، لکھنؤ

۲۰ جنوری ۱۹۵۳ء

پیارے بھائی فاروقی - ۱۸ جنوری کا خط کل شام کو ملا ....
جان برادر، میر اور غالب کا موازنہ ہمیں کسی منزل تک پہنچاتا نظر نہیں آتا ، بلکہ نا گوار صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے - میر کہتا ہے :

دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

آپ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ جب غور سے دیکھا تو وہ تماشا بھی کچھ عجب تماشا ہے - حالانکہ جو کچھ غالب نے ' بازیچہ' اطفال ہے دنیا مرے آگے ' میں کہا میر نے ' دنیا عجب تماشا ' ہے میں کہہ دیا - عجب تماشا میں حیرت ہے ، استعجاب ہے ، تغیرات کے اہم ہونے کی طرف اشارہ ہے - بازیچہ' اطفال کہنے سے دنیا محض بچوں کا بے معنی گھروندا ہو کر رہ گئی - ' مرے آگے ' کے ٹکڑے نے قائل کے علاوہ ہر شخص کو بلا کسی استثنا کے طفل مکتب بنا دیا ' جو غالب کے سامنے اپنے طفلانہ کرتب دکھا رہا ہے - بحث آفاقیت یا عالمگیر حقائق سے شروع ہوئی تھی مگر رفعت و جزالت و مضمون آفرینی میں گھر گئی - آپ میر کی بزرگی کے بھی قائل ہیں مگر اس کے کلام میں مفکر کا دل نہیں جھلکتا - کیا آج تک کوئی ایسا صاحب عظمت و بلند مرتبت شاعر ہوا ہے جو مفکر نہ ہو ؟ کیا جو شاعر مفکر نہ ہو وہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے :

پھر فردوس ہو آدم کو الم کاہے کو
وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کاہے کو

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغ خیال
اک پرافشانی میں گزرے سر عالم سے بھی

دل نے ہم کو مثال آئینہ		ایک عالم کا روشناس کیا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرم روش ہیں کچھ اس بدگمان کے لوگ

ہر قطعہ پر چمن کے ٹک غور سے نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیسا ، موج کہاں ہے ، حباب کیا

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہم جانتے تھے تازہ بنائے جہاں کو لیک
یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

یہ دو ہی صورتیں ہیں ، یا منعکس ہے عالم
یا عالم آینہ ہے اس یار خود نما کا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا
صد گلستاں نہ یک بال تھے اس کے جب تک
طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا

غم فراق ہے دنبالہ گرد عیش وصال
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ ہے یہ جوش

اس آفتاب حسن کے ہم داغ شرم ہیں
اتنے ظہور پر بھی جو منھ کو چھپا رہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

یہ توہم کا کارخانہ ہے　　یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

آینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبا لب
راز نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقش پا کی طرح پایمال اپنا ہوں
اگرچہ نشہ ہوں سب میں خم جہاں میں میر
برنگ مے عرق انفعال اپنا ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ راز نہاں ہوں

وہم جس کو محیط سمجھا ہے　　دیکھیے تو سراب ہے وہ بھی

اور نہ معلوم کیا کیا ۔ رواروی میں جو اشعار یاد آئے درج کردیے ۔ کلام غالب کی طرح کلام میر کا بالاستیعاب مطالعہ کیجیے، پھر کوئی رائے قائم کیجیے ۔

دھلی آنے کی ایک صورت نکل آئی ہے ۔ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے Board of Scientific Terminology کا ممبر ہوں - اس کا جلسہ ۲۵ اور ۲۹ فروری کو ہونے والا ہے ۔ میں کئی جلسوں میں شریک نہیں ہوا ۔ اب شریک ہوں گا اور آپ سے ملاقات ہوگی ۔ ان شاءاللہ ۔

مصحفی کا ایک قلمی دیوان میرے پاس ہے (۱) اور جہاں تک علم ہے غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کے ملاحظے کے لیے لیتا آؤں گا۔ رسالہ تحریک دہلی میں کچھ دن ہوئے ایک مضمون بھیج چکا ہوں، عجب اتفاق ہے کہ اس میں مصحفی کے بھی بعض اشعار پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ شائع ہو تو دیکھیے ......

آپ کا، اثر

[۱۱]

کشمیری محلہ، لکھنؤ

۲ دسمبر ۱۹۵۵ء

پیارے نثار احمد۔ تمھارا خط باعث مسرت ہوا ...

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب نے اپنی رایگاں بندگی کو نمرود کی خدائی سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح نمرود نے گلزار ارم سجایا مگر اس سے فیض یاب نہ ہو سکا بلکہ اس کی تعمیر اس کی موت اور محرومی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اسی طرح بندگی اور طاعت میرے کام نہ آئی۔ سوالیہ طرز کلام نے یہ بلیغ اشارہ کیا کہ شاید میری بندگی میں نمرود کے دعویٰ الوہیت کی طرح غرور خود پسندی و خود نمائی شامل تھا (وہ نادانستہ سہی)۔

بہ قدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریاے مے ہے تو میں ہوں خمیازہ ساحل کا

علی سر ہندی کا شعر ہے:

تو چوں ساقی شوی درد تنک ظرفی نمی ماند
بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

۱۔ میں نے ۱۹۵۳ء میں مصحفی کا کلام ایڈٹ کرنے اور اس کی زندگی و شاعری پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ کتاب کا مسودہ تیار ہے اور اس کا پہلا باب ۱۹۵۸ء میں رسالہ برہان دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ کلیات کی ترتیب سے بھی خدا کے فضل و کرم سے فراغت ہوگئی اور اس کے پہلے دو حصے علمی مجلس دہلی نے ۱۹٦۸ء میں شائع کر دیے ہیں۔ باقی جلدیں زیر طبع ہیں۔ پورا منصوبہ غالباً ۱۲ جلدوں میں مکمل ہوگا۔

اس میں خاص بات یہ ہے کہ ساقی کی ایک نگاہ تنگ ظرف کو بھی عالی ظرف بنا دیتی ہے ۔ اس کو ایک برجستہ مثال سے ثابت کیا ہے :

بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

غالب کے شعر میں یہ نکتہ نہیں ۔ باقی وہی ہے جو علی سرھندی نے کہا ۔ اُن کا دعوی ہے کہ اے ساقی میں جس طرح پینے میں عالی ظرف تھا ، کتنی ہی چڑھا جاؤں بدمست نہیں ہوتا تھا ، ایسا ہی خوددار ھنگام تشنہ کامی بھی ہوں ۔ (شارحین نے ' بھی ' کی اھمیت کو نظر انداز کردیا اور بھک گئے) ۔ جب میرے ذوق مے کشی کی انتہا نہیں تھی ، اب خمار تشنہ کامی کی تھاہ نہیں ۔ جس حد کا ذوق مے کشی تھا ، اسی حد پر خمار تشنہ کامی بھی ہے ۔ یہ جملہ محذوف چھوڑ دیا ہے کہ اگر یقین نہ ہو تو پہلا کے دیکھ لے ، تیری دریا دلی کے ساتھ ساتھ میری تشنگی بڑھتی جائے گی ۔ ساحل دریا کے ساتھ ساتھ رھتا ہے مگر خشک ۔ اسی سے ساحل کی تشنہ لبی مسلمات شاعری میں سے ہے ۔

غور کرو اور لکھو کہ علی سرھندی اور غالب کے شعر میں تمھیں کون زیادہ پر مغز معلوم ہوتا ہے ۔ ...

تمھارا ، اثر

غالب کی صد سالہ برسی پر انجمن ترقی اردو کی ایک پیشکش

غالب نام آور

غالب کی شخصیت اور شاعری سے متعلق مضامین کا مجموعہ

سہ ماہی "اردو" میں گزشتہ نصف صدی میں غالب کے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں ، اس مجموعے میں ان مقالوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ اس میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق ، ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری ، ڈاکٹر محمد اشرف ، آل احمد سرور ، ہاشمی فرید آبادی ، مالک رام ، ڈاکٹر اختر اورینوی ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بہت سے دوسرے اہل علم کے مقالات شامل ہیں ۔

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی

غالب کی جمالیات

محمد علی صدیقی

غالب اسلامی برصغیر کے اس پر آشوب عہد میں تھے جب ٹیلیگراف، انفیلڈ اور دخانی جہازوں نے طاقت کا پانسہ یکسر مغرب کے حق میں پلٹ دیا تھا ۔ مغلوں کی حکومت تو ۱۸۰۱ء میں اسی وقت دم توڑ چکی تھی جب جنرل لیک کی فوجیں دھلی میں داخل ہوئی تھیں اور لال قلعے کے مکین مادھو لال سندھیا کے زیر نگیں تھے ۔ ویسے بھی آیندہ چند برسوں میں مغل بادشاہ کو صرف دو لاکھ سالانہ کا وظیفہ خوار بن کر رھنا تھا ۔

غالب صرف ایک عہد کے خاتم ھی نہیں بلکہ وہ ایک بالکل نئے عہد کے ایسے نقیب بن کر آئے جو اپنی تہذیبی کس مپرسی پر کڑھنا بھی جانتا ھو اور مغرب کے سلسلے میں نتائجی Pragmatic رویہ رکھنے کا جبر بھی سہتا ھو، وہ شخص جسے ھم صحیح معنوں میں عجمی و عربی تہذیب کا نمایندہ کہیں اور جو ایرانیوں کی طرح پورے ھندوستان میں صرف امیر خسرو ھی کو واحد فارسی شاعر مانے اور خود کو فارسی لب و لہجہ میں اس طرح ڈوبا ھوا محسوس کرے جیسے لوھے میں جوھر، فارسی سے وہ اردو کی طرف یوں ھی متوجہ نہ ھوسکا تھا ۔

غالب تو غالباً وہ آخری آدمی ھوئے جو اپنے اردو اشعار سے داد طلبی چاھتے، وہ تو اردو شعر بھی اس لیے کہہ لیتے تھے کہ اردو بہر حال مغلیہ زوال کے ساتھ ساتھ دربار میں در آئی تھی اور جب سے شاہ عالم نے اردو شاعری شروع کردی تھی، محلات شاھی میں بھی اردو ھی مستعمل تھی ۔ لیکن غالب کا خاندان ھندوستان میں شاہ عالم ھی کے زمانے میں آیا اور وہ بڑی حد تک نو وارد تھا ۔ اسی لیے مغلوں کے یہاں صدیوں کے بعد جو تہذیبی خلط ملط

رونما ہوا تھا ، وہ غالب کے لیے ابھی اس قدر طے شدہ مسئلہ نہیں تھا ۔ اس لیے انھیں اس پر بھی فخر ہے کہ ان کا استاد ملا عبدالصمد ہرمزد تھا جو پہلے زرتشت کا پیرو تھا ، غالب نے انھیں سے منطق و فلسفہ پڑھا تھا ۔ اپنے استاد کے بارے میں غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ '' ساسان پنجم کی نسل میں سے تھے ، معہذا منطق و فلسفے میں مولوی فضل حق مرحوم کی نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھے '' ۔ انھیں غالب نے جاماسپ عہد اور بزرجمہر دوراں کہا ہے ۔ ایک ایسے سماج میں جس کا عجمی و عربی ڈھانچہ میر تقی میر کے زمانے ہی میں متزلزل ہو چکا ہو اور اٹھارویں صدی کے آخر تک جنوب سے بڑھتے ہوئے انگریز بنگال ، بہار ، اڑیسہ اور مشرقی یو پی تک چھا چکے ہوں ، روھیلوں کی طاقت کو ختم کر دیا گیا ہو اور انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں سندھ ، بلوچستان ، پنجاب اور سرحد کا الحاق مکمل ہوچکا ہو ، اب امید کی کرن کہاں سے پھوٹے ۔ غدر سے ایک سال قبل اودھ کی اس حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا جس کے سربراہ کو ۱۸۱۹ء میں بادشاہت کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا ۔

غالب کے سامنے ایک طویل ڈرامے کا آخری سین کھیلا جانا تھا اور اور مرد بیمار کی آخری ھچکی ظہور میں آنے والی تھی ، لیکن غالب عنفوان شباب ہی سے واقف تھے کہ ۱۸۱۸ء میں مرھٹوں کے استیصال کے بعد اب صرف انگریز ہی سب سے بڑی طاقت ہیں ، اور جب وہ اپنے خطوط اور دیگر نگارشات میں انگریزوں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رہتی :

شاھد و مے ز میاں رفتہ و شادم بہ سخن
کشتہ ام بید دراں باغ کہ ویراں شدہ است

بلکہ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ مغربی تہذیب کی بالا دستی ان کے ذہن پر مرتسم ہونے لگی اور ۱۸۳۱ء میں لارڈ میکالے کی سفارشات کے نتیجے میں فارسی کا اردو کے حق میں معزول کیا جانا تو بہت ہی واضح اشارہ تھا ، غالب کو مندرجہ ذیل اشعار :

نیست نقصاں یک دو جز است ار سواد ریختہ
کاں دژم برگے زنخلستان فرھنگ من است

فارسی بیں تابہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ' اردو کہ بیرنگ من است

کی روشنی میں اپنے فارسی مجموعے کو الہامی صحیفہ سمجھنا سمجھ میں آتا ہے۔

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

لیکن کچھ ہی دن بعد وہ مندرجہ ذیل شعر کہنے پر مجبور ہو گئے :

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب کی اس نتائجی (Pragmatic) فکر نے انھیں ایک جمالیاتی نقطہ' نظر بھی دیا ۔ جمالیاتی نقطہ' نظر در حقیقت ادیب کا وہ واضح یا غیر واضح سیاسی و فکری ایقان ہوتا ہے جو فن میں در آتا ہے۔ جمالیات یا ذوقیات سے مراد ذوق کی نشو و نما نہیں، جس طرح ترقی پسندوں کی جمالیات ادب برائے زندگی کی کوکھ سے پھوٹتی ہے اور رجعت پسندوں کی ادب برائے ادب کے چسکے سے ، یا ان دو متضاد نظریوں کے درمیان نیم مذہبی و نیم روشن خیال (Formed Content) کے نظریے سے ۔ ہم تکی بندھی زبان میں کیوں گفتگو کریں بلکہ سیدھے سادے طریقے سے یہ کہیں کہ ہر فن پارہ اپنے خالق کی فکر کا عکس ہوتا ہے :

خوشت باد غالب بساز آمدن
نوا سنج قانون راز آمدن

اور اگر فن اور ذہن دو مختلف چیزیں ہو سکتی ہوں تو یہ الگ بات ہے لیکن غالب کی فکر تصوف اور معروضی نتائجیت کے درمیان آویزش کا ایک گراف ہے ، ایسا اس لیے ہے کہ مسلم ہندوستان کی فکر پر تو تصوف کا غلاف چڑھ چکا تھا اور اس دنیا کو وہم ، خیال ، التباس اور باطل سمجھنے کی فکری انفعالیت نے جینے کا حوصلہ چھین لیا تھا ۔ اس دنیا کو مسافر خانہ سمجھتے سمجھتے جو فکر پروان چڑھی ہو وہ جیتی جاگتی حقیقتوں کا کس طرح مقابلہ کرتی ، یا تو وہ بہادر شاہ ظفر کی طرح :

دنیا دارو دنیا چھوڑو دنیا میں بدنامی ہے
اس دنیا کے ترک کیے سے ہوتی نیک انجامی ہے

کی فکر میں رنگے ہوئے ملتا یا پھر حسرت تعمیر کا سہارا لیتا اور یہ ایک سچے صوفی کے لیے نشہ ہرن کرنے کے مصداق ہوتا ہے - غالب کی مثال اس شخص کی سی ہے جو تصوف کے بالائے زمین قہوہ خانے میں بھی چسکی لگا آتا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے سے ظاہر و موجود دنیا کی کاکل سنوارنے کی سعی کرتا ہے ، ایک ایسی سعی جو زرخیز مٹی میں گلاب اگائے اور ویران باغ میں کانٹے بھی - ایک تھکے ہوئے آدمی کی طرح وہ اس دنیا کو باطل سمجھ کر کبھی کبھی کد و کاوش سے بھاگنا چاہتے ہیں ، لیکن ہر جگہ ان کی زمینیت اور عقل پسندی آڑے آجاتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وہ سلطان سنجر اور بو علی سینا دونوں کے شکار تھے- اشراق و عقل دونوں ہی کسی تاریخی مبارزہ کے ناظر تھے اور بعد میں اشراق کے مقابلے میں عقل ہی کو اپنا رہبر بنا چکے تھے - یہ اور بات ہے کہ جب وہ تصوف کے سکون پرور اور جستجو بیزار رنگ میں بے پناہ قنوطیت اور علاحدگی پسندی کی طرف بھاگتے تھے تو ایسے اشعار بھی کہتے تھے :

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

اور کہیں وہ مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سایوں کو ایک ایسی رات سے تشبیہ دیتے ہیں جس سے خلاصی کی امید اگلی نسلوں کے حصے میں آئے گی - مغربی تہذیب اپنی زبان کی بے ساختگی ، اپنے احساس وقت ، سائنس کی اوائلی رومان پسندی اور قانون دیوانی و فوجداری کے پیچھے بھرپور طاقت لائی تھی- قانون کا احترام پچھلی ڈیڑھ سو سالہ ہندوستانی تاریخ میں مفقود سے مفقود تر ہوتا چلا جا رہا تھا- نادر شاہی یلغار ، مرہٹوں کی چھاپہ مار جنگیں ، پانی پت کی تیسری لڑائی ، اودھ اور روہیلکھنڈ کی کشمکش میں دہلی سے دور دراز علاقوں کے لیے ڈاک کا نظام تو کیا، خود دہلی کے مضافات میں بھی ناپید ہو کر رہ گیا تھا - اس لیے غالب جب ڈاک کے نظام کو تہذیب کی اساس سمجھتے ہیں اور غدر کی تباہ حالیوں میں سے سب سے زیادہ ڈاک کے نظام کو درہم برہم دیکھ کر کھولتے ہیں تو ہمیں بدیسی تہذیب کے بارے میں پہلا اثباتی رد عمل ملتا ہے - غالب نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے ہی انگریزوں کی بالادستی کو اسی

طرح تسلیم کر لیا تھا جس طرح کچھ حضرات نے اس ھنگامے کے بعد ۔ غالب انگریزوں کے خلاف بغاوت کو خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے ۔ بغاوت اپنی جگہ نیک جذبہ سہی لیکن اس زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے غالب کو زیادہ حقیقت پسند کہا جاسکتا ھے ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جو بہادر شاہ کو صحیح معنوں میں ایک فعال طاقت سمجھ سکتے تھے ، غالب کو ان کے ایک خط کی روشنی میں دیکھیے جو انھوں نے قاضی عبدالجمیل کو لکھا ھے :

" مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ھوتا ۔ قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ھو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ھیں، وھاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا ۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ھوں اور کبھی نہیں جاتا اور خود یہ صحبت چند روزہ ھے ، اس کو دوام کہاں ۔ کیا معلوم ھے اب نہ ھو ، اب کی ھو تو آیندہ نہ ھو ۔ (۱)

غالب ان لوگوں میں سے قطعاً نہیں ھیں جو سنہ ستاون کے ھنگامے کے دوران اپنے اپنے شہروں سے انگریزوں کو نکال کر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ جنگ جیت لی گئی ھے۔ قربانی کے جذبے کے ساتھ اگر کوئی تنظیم نہیں ھے تو نتیجے دور رس اور دیرپا نہیں رہ پاتے ۔ غالب ٹیلیگراف کو بدیسی حکمرانوں کی سب سے بڑی طاقت جانتے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ کلکتہ کی ایک فوجی بیرک میں پورے شمالی ھندوستان کی جنگ آزادی کی منٹ منٹ کی خبریں پہنچ رھی ھیں اور جنوب مغرب کے محفوظ علاقوں سے شمال و مشرق کی طرف کوچ کا نقارہ بج رہا ھے :

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

اور اسی لیے غالب اپنے خطوط میں جگہ جگہ اپنے زمانے کی بے ثباتی اور اپنے طاقت ور تہذیبی حریف کو بدیہی حقیقت کے طور پر مانتے ہوئے ملتے ھیں ۔ وہ اپنے طاقت ور حریف کا مقابلہ تصوف کی اس غیر حقیقت پسندانہ عافیت کوشی سے نہیں کرتے جو حال میں موجود دنیا سے احتراز کی صورت میں مضمر ھے ۔ بلکہ وہ زمان و مکان کی قید میں گرفتار اور اسی پرسراب (مایا والی) دنیا میں اپنے مسائل کا حل ڈھونڈھتے ھیں ۔ اگر غالب کی مذھبی شاعری کو

۱۔ ادبی خطوط غالب ، مرتبہ مرزا عسکری ، ص ۱۲۶ ۔

جو ان کی فارسی کلیات میں کثرت سے ملتی ہے، ہم پر تکلف سمجھ کر آگے بڑھ جائیں تو غالب کافی قابل فہم ہو جاتے ہیں۔

اس پس منظر میں ہم اگر غالب کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں غالب کے اشعار میں ایک خاص قسم کی متصوفانہ قنوطیت اور موت کی خواہش پر هردم غلبہ آور حقیقت پسندی سے واسطہ پڑتا ہے۔ غالب کی جمالیاتی اقدار سچ کو سچ ماننے پر اصرار کرتی ہیں، چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ میر مرہٹوں کے فتنوں کے گردباد کے اس پار دیکھنے پر مصر نہیں ہیں، لیکن غالب برقی تار کی موجودگی میں گھوڑوں کے ذریعے ترسیل کے نظام کو ہیچ گردانتے ہیں اور یہی وہ شعور ہے جو انہیں اپنے زمانے کے شعرا میں جدید تر بنا دیتا ہے۔ پس غالب ایک ایسے معاشرے کا ادراک رکھتے تھے جو ہمیں آج دو تین نسلوں بعد حاصل ہوا ہے۔ اس لیے بعض اوقات وہ اپنی نظری اور سریع الفہمی سے چڑھ اٹھتے ہیں اور یہ وہ چڑھ ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو ہم ان کی پگڑی اچھالتے کیونکہ ذہانت اور خاص کر ' غالبانہ ' ذہانت بہت جلد دشمن پیدا کر لیتی ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ان کی موت نے ہم سے ان کی معجزنما ذہانت کا لوہا منوالیا اور اب غالب پرستی اس حد تک بھی ریاضت کی طالب نہیں جتنی کہ تجریدی آرٹ کے شوقین اپنی آہ اور واہ کے نظام کو مرعوب کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں غالب کا تصور بہت کم ہے، اُن کی شاعری کی ہمہ گیری کا بہت زیادہ۔ غالب اب مسلمات کے ذیل میں آتے ہیں، انہیں نہ پڑھنے والا آدمی بھی نادانستہ طور پر ان کے بارے میں اتنا لکھ پڑھ اور سن چکا ہوتا ہے کہ غالب کے بارے میں صاحب الرائے ہونے کے شرف سے ہاتھ نہیں دھو سکتا۔

غالب نے انیسویں صدی کے اول نصف صدی کے ہندوستان میں فن کی سطح پر وہی کام کیا ہے جو امریکن فلسفی pierce نے پیورٹن زدہ امریکہ کو مذہب کے مقابل سائنس اور نشاط انگیزی کے چیلنج سے نمٹنے کے لیے کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب اس فلسفیانہ فکر کے داعی تھے جس کا pierce ناظم و مدون تھا۔ ان دونوں میں مماثلت واجبی سی ہی سہی لیکن pierce بھی امریکہ کی سماجی تاریخ کے دوراہے پر اسی طرح کھڑا ہوا ملتا ہے جس طرح غالب۔ غالب کی موت کے وقت وہ امریکی رسالوں میں فلسفیانہ بحثیں چھوڑ چکا تھا تھا۔ ادوار اور تاریخی محرکات کا فرق سر آنکھوں پر لیکن غالب کے سامنے بھی یہ سوال تھا کہ برطانوی قانون کے سامنے آئین اکبری کی

عملی منفعت کیا ہے۔ غالب نے آئین اکبری کے نسخے پر تقریظ لکھتے ہوئے جن شکوک کا اظہار کیا تھا، کچھ ہی سال بعد سرسید اس سلسلے میں بہت آگے نکل گئے اور انھوں نے پوری اسلامی فکر ہی کو معرض خطر میں ڈال دیا۔ ۱۸۷۲ء میں مسلمانان ہند کی ترقی تعلیمی سے متعلق ایک کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا:

" وقت اور اس کی روح، سائنسی علوم اور ان کے نتائج، سب تبدیل ہوگئے ہیں۔ قدیم اسلامی کتابیں اسلام کے پیروؤں کو حریت فکر اور سادگی کی تعلیم نہیں دیتیں اور نا ہی وہ عمومی طور پر حصول حق میں ان کی معاونت کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف وہ دھوکا دیتی ہیں اور لوگوں سے معنی پوشی کرتی ہیں اور اس کمزوری کو اس طرح پورا کرتی ہیں کہ وہ چیزوں کے بیان میں غلط بیانی اور غیرمتعلق اصطلاحات کو پرشکوہ الفاظ میں پیش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں غلامی کے احساس کو نافذ کر دیتی ہیں اور لوگوں کو غرور، تکبر غلط اعتمادی و خود فریبی میں مبتلا کرتی ہیں اور اپنے قارئین کو ان کے ساتھی انسانوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہیں۔ ان میں ہمدردی کا دور دور تک بھی کوئی شائبہ نہیں۔ ان میں غلو ہے۔ یہ کتابیں ماضی کی تاریخ کو مبہم اور حقایق کو داستانوں اور قصوں کی شکل دے دیتی ہیں "۔ (۱)

مجھے یقین ہے کہ غالب سرسید کے مقابلے میں اپنے تہذیبی سرمائے کی بابت اتنی سرد مہری نہیں دکھا سکتے تھے۔ وہ تو صرف اس سرمائے کی غور اطلاقی نوعیت سے نبرد آزما تھے اور آخر میں انھوں نے ہار مان لی تھی۔ برطانوی قانون کو آئین اکبری کے مقابلے میں ترجیح دے دی گئی تھی۔ کون چاہتا ہے کہ جو تہذیب ان کی گھٹی میں پڑی ہو نامساعد حالات کی کڑی دھوپ میں اسے ناکافی سمجھنے پر مجبور ہونا پڑے، ایسا سمجھنے سے آدمی کسی قدر بجھ جاتا ہے۔ غالب بھی ایسے ہی کرب سے گزرے تھے:

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

---

(1) Evolution of Indo - Pakistan, Select Documents, P 179.

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

غرض کہ غالب کے لیے '' غدر '' ۱۸۰۱ء ہی میں ہو چکا تھا۔ ان کے زمانے میں شاہ عبدالعزیز نے دھلی کالج میں مسلمان بچوں کی انگریزی میں تعلیم کو ۱۸۲۴ء میں جائز قرار دے دیا تھا۔ ان کے بادشاہ کے سکے ۱۸۲۵ء ہی میں چلنے بند ہوگئے تھے۔ جبھی تو وہ کہتے تھے:

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل

اور اسی لیے '' غدر '' جس طرح عوام کے لیے ایک تلخ حقیقت کے روپ میں ۱۸۵۷ء میں برپا ہوا، غالب کے گھر میں صف ماتم نہ جانے کب سے بچھ چکی تھی اور کب کا چہلم ہو چکا تھا۔ اس روشنی میں اگر ان کی کتاب ' دستنبو ' کو پڑھا جائے تو زیادہ چڑچڑاھٹ پیدا نہیں ہوتی۔

غالب کی فکر کو اگر تفصیل سے دیکھنا ہے اور جہاں وہ بین السطور رہنے کے تکلف سے مبرا و منزا ہو جاتے ہیں، وہ کلیات فارسی کی مثنویاں ہیں۔ مثلاً کلیات فارسی کی مثنوی دہم جو آئین اکبری مصححہ سید احمد خاں کی تقریظ کے طور پر ہے، اس میں وہ کھل کر مغلوں کے زوال پذیر سماج سے نالاں ہیں اور ان کے قانون کو ' آئین ربا ' تک کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے سر سید

احمد خان کو آئین اکبری کی تدوین نو کی کوشش کے سلسلے میں کس قدر لتاڑا ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار ہی سے ہو سکتا ہے :

ویں کہ درتصحیح آئیں رای اوست　　ننگ و عار همت والای اوست
من کہ آئین ریا را دشمنم　　در وفا اندازه دان خود منم
با بد آئیناں نمانم در سخن　　کس نه داند انچه دانم در سخن

اور اگر دستنبو کو کچھ حضرات مجبوری محض کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں تو اسی مثنوی کے مندرجہ ذیل اشعار سے کیا مترشح ہوتا ہے جو انھوں نے اس سر سید احمد خان کے لیے لکھے ہیں جو انگریزی سرکار کے مراد آباد میں صد الصدور ہیں اور اسباب بغاوت ہند کے مولف ہیں :

صاحبان انگلستان را نگر　　شیوه و انداز اینان را نگر
تا چه آئیں ها پدید آورده اند　　انچه هرگز کس ندید آورده اند
حق ایں قوم است آئیں داشتن　　کس نیارد ملک به زیں داشتن

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ غالب انگریزی سامراج کو مدافعت سے بلند و بالا حقیقت سمجھتے تھے - ان کا سماجی شعور قومیت کی اس ہوا سے کہاں منسلک و متحد ہو سکا تھا جو ان کے چند دوستوں کے لیے بالکل ممکن تھا ' اور یہ ہوا پورے یورپ اور خود مشرق وسطیٰ میں چل رہی تھی - غالب کا مثالی سماج تو وہی تھا جس میں داد و دانش باہم پیوستہ ہوں - اس لیے جب وہ اپنی معاصر تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں سوائے خلفشار ذہنی اور تاراجی سلطنت کے کچھ نظر نہیں آتا - چاروں طرف دھول اڑ رہی ہے اور : چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے ' کے مصداق مکمل بغاوت یا مکمل اطاعت ہی ان کے لیے دو راستے تھے اور انھوں نے دوسرے راستے کا انتخاب کر لیا تھا اور اب وہ اس کے لیے اپنی شکست خوردگی کے احساس کو مٹانے کے لیے عقلی توجیہیں ڈھونڈ رہے تھے - چنانچہ اب اسی مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

داد و دانش را بهم پیوسته اند　　هند را صد گونه آئیں بسته اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند　　ایں هنر منداں ز خس چوں آورند

تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بر آب		دود کشتی را ہمی راند در آب

نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند		حرف چوں طائر بپرواز آورند

مندرجہ بالا اشعار میں آپ غالب کو برطانوی آئین کا ثنا خواں دیکھ رہے ہیں اور پھر بجلی ، دخانی کشتی ، گراموفون ریکارڈ اور ٹیلیگراف جیسی دریافتوں اور ایجادوں کے مدح خواں دیکھتے ہیں اور انہیں مظاہر کو وہ حکمرانی کے لیے بطور اسناد سمجھتے ہیں ۔

یہ کسی حد تک غالب کی وہ سیاسی جمالیات ہے جو انہیں کسی صورت حال کے رد و قبول کے لیے کچھ مظاہر و اشیا کی موجودگی سے تجرید کی طرف لے جاتی ہے اور وہ اپنی پسند و نا پسند کے بڑے دائروں میں ہمیں سیاسی و سماجی فیصلے کرتے ہوئے ملتے ہیں تو ہم ان فیصلوں کو ان کا ذوق سمجھ کر (جو چہار مقالہ میں مندرج چھٹی حس بھی ہے) صرف ذات کی حد تک رکھتے ہیں اور انہیں ایک ایسا جبر نہیں ٹھہراتے جس کا زہر ذہین افراد بسر و چشم پی لیتے ہیں ۔

غالب کی جمالیات ان حالات میں پوشیدہ ہے جن سے وہ گزرے ۔ جمالیات ، خوشبو ، حسن ، موسم کی نیرنگیاں ، شراب پرنگیزی وغیرہ اس شعر میں نہ دیکھی جائیں :

ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرور و سور

پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

اس لیے کہ یہ تو غالب کا رویہ ہے اور رویہ فکر کا عکس ہوتا ہے ، فکر نہیں ہوتا ۔ ہم فکر کو ان بڑے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں جو بڑے اذہان سے موسوم کی جاتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ غالب بلا کے حسن پرست تھے ۔ تحریر میں ارژنگ مانی اور تصویر میں پری پیکر بہزاد کی طرف لپکنا تو کایستھوں کا شیوہ بھی بن چکا تھا ، لیکن غالب اور گہرائی میں جاکر : بوئے جوئے مولیاں آید ہمی ، اور حافظ و سعدی کی سر زمین کی علمی و فکری فضا میں رچے بسے تھے اور ان کے یہاں اشارے اور کنائے بھی ساسانی دور کے آجایا کرتے تھے ۔ اپنے استاد کو جاماسپ اور بزرجمہر کے حوالوں سے سمجھنے والا ذہن ، زرتشتی اور مجوسی فکر کے خیر و شر کی تکرار اور الوہیت کو بھی عقل کی سان پر سمجھنے والا دماغ تو رکھتا ہی تھا ، حالانکہ وہ

اس خطے سے تعلق رکھتے تھے جو جیحون و سیحون کی وادی کا تھا لیکن زرتشی اثرات نے جس ایرانیت کو جنم دیا تھا اس میں وہ خطے بھی شامل تھے۔

غالب کا جمالیاتی وجود ان کے رد عمل کے سلسلوں میں دیکھا جائے جو انھیں نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے پر اکساتا ہے - وہ انگریزی اثرات کو دیکھ کر وہی چیخ بلند کرتے ہیں جو عربوں کے مفتوح ایران نے بلند کی تھی اور پھر اس موڑ پر آجاتے ہیں جہاں عربوں سے مقابلہ انھی کی زبان اور بودو باش اپنا کر کیا جا سکتا ہے - میں اُن حضرات کے لیے جو جمالیات سے مراد صرف حسن پرستی لیتے ہیں ، یہ عرض کروں گا کہ غالب بلا کے حسن پرست تھے اور انھوں نے اپنے اشعار میں حسن کی جس ندرت جوئی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا عکس عبدالرحمن چغتائی کے مرقعوں میں کسی حد تک آ گیا ہے - عجمی فنون لطیفہ سے غالب کا گہرا ربط تھا اور حسن کو Transient دیکھ کر جو تاسف انھیں ہوتا تھا ، وہ غالباً عشق کی دوامی کیفیت سے پورا ہو جاتا تھا جسے وہ کائنات کی غایت سمجھتے تھے ، لیکن غالب کے یہاں عشق زیادہ تر مجازی اصطلاح کے طور پر آتا ہے :

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اور اگر ہم اسے حافظ کے اس شعر کی روشنی میں دیکھیں :

سعی سپہر و دور قمر را چہ اختیار
درگردش اند بر حسب اختیار دوست

اور پھر ان دو اشعار کے فوراً بعد یہ شعر پڑھیں :

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی تمام تر زمینیت کے باوجود بھی برکلے کے فلسفے سے کس قدر متاثر تھے - برکلے کا فلسفہ ممکن ہے کہ اُن تک ملتے جلتے عجمی و عربی فلسفے کی باز گشتوں کے ذریعے آیا ہو - کیونکہ برکلے کے یہاں کافی حد تک شیخ الاشراق اور عراقی کی فکر کا توارد ہے - غالب کے قریبی انگریز دوستوں کا حلقہ بھی مشرقی علوم سے بہت متاثر تھا - ہزلی اسٹیورٹ ریڈ ، ربٹگن اور ولیم فریزر سے غالب ، اردو فارسی ادب اور مغربی فکر ہی پر گفتگو کرتے ہوں گے -

غالب کی حسن پرستی انہیں باطنی اور ظاہری کثافتوں کی آرائشوں سے دور رکھنا چاہتی ہے اور یہ حکم ہم ان سب حضرات پر لگا سکتے ہیں جو ایک خاص فکری پس منظر سے رد و قبول کی منزل سے گزرتے ہوں۔ ایک عام آدمی کی حسن پرستی اور ایک صاحب فکر کی حسن پرستی میں سب سے بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ ذہین آدمی اپنی حسن پرستی کے با وصف اپنی آرا میں ایک خاص قسم کا ارتباط اور تعمیم پیدا کر لیتا ہے۔ وہ اپنے تجربے کو اگر سبھی کا تجربہ بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو کم از کم اپنے تجربے کو ایک خاص قسم کی قابل ادراک ذہنی رو ضرور بنا دیتا ہے۔ لیکن خالص فلسفیانہ اصطلاح کی روشنی میں حسن کا تغیراتی کردار اور عشق کی لازوال سعادت ایک ذہنی رویہ ہے جو اس بڑے دائرے سے تعلق رکھتا ہے جو انہیں اپنے مخصوص سماجی ڈھانچے کی زبوں حالی سے بھی ملا۔ مغلیہ حکومت ان کے سن بلوغ کو پہنچتے ہی ختم ہو چکی تھی۔ مرھٹوں اور سید احمد شہید کی تحریک کے زور کو توڑنے کے بعد اب انگریزوں کے لیے کوئی بیرونی خطرہ بھی نہیں رہا تھا، کیونکہ افغانستان اور ایران میں اب وہ دم خم کہاں رہا تھا کہ وہ دوبارہ سندھ پار کر سکیں۔ روس کی جانب سے بھی اب خطرہ اس لیے نہیں تھا کہ وسطی ایشیا میں روسی فتوحات کا سلسلہ ۱۸۶۵ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

پس غالب کسی بیرونی امداد کے منتظر بھی نہیں تھے۔ اس لیے ان کی شکست خوردگی مکمل تھی۔ ان کے لیے انگریزی سامراج ایک ایسی حقیقت تھا جس سے متصادم ہونا ہلاکت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن غالب نے ان شکستوں اور مضرتوں میں بھی پناہ کے گوشے تلاش کر لیے تھے اور وہ کافی صحت مند انداز کے ساتھ ردعمل دے رہے تھے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

بخشے ہے جلوهٔ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آیینۂ باد بہاری کا

غالب کے یہاں عقل پرستی جہاں خود ان کی اپنی ذہنی روایت نے پیدا کی ، وہیں بیرونی استعمار کی ٹیکنکی علامتیں اور خاص طور پر ٹیلیگراف کو بھی بہت دخل ہے ۔ یہ علامتیں بہت سے توہمات کو باطل کرنے کے لیے کافی تھیں اور عقل کو لازمی ضرورت بنانے پر دال ۔ غالب کی فکر میں ایک خاص قسم کی تانئجیت Pragmatism کا پیدا ہو جانا ایک ضروری امر تھا ۔ غالب کے یہاں تشکیک سے جو دائرہ بنا وہ سر سید کے یہاں بھرپور عقل پسندی اور اقبال کے یہاں اس پوری تحریک کے ردعمل کی صورت میں غیر عقلیت پسندی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے ۔ لیکن اس پورے فکری سلسلے کے دھانے پر غالب اپنی پرتگیزی دو آتشہ کو ساتھ لیے نظر آتے ہیں ۔

ہمیں غالب کو برصغیر کی تاریخ اور اپنی ہی فکری روایت میں رہ کر مطالعہ کرنا چاہیے ۔ ہمیں فوراً ہی نظر آتا ہے کہ غالب نے جس معاشرے میں جنم لیا تھا وہ عقیدہ پرستی کے بھیانک جمود میں گرفتار تھا اور اس صورت‌حال کے خاتمے کے لیے کسی اندرونی انقلاب یا کسی طاقت ور خارجی محرک کی ضرورت تھی ۔ اندرون معاشرہ تو ژولیدگی کا سرطان پھیل ہی رہا تھا اور کافی وقت گزرنے پر معلوم ہوا کہ ہزاروں میل دور سے آئے ہوئے تاجروں نے ہندوستان کی مارکیٹ کے ساتھ ساتھ ہندوستان پر بھی قبضہ کر لیا ہے ۔ فتح کی کنجی مشین ہے ۔ مشینی انقلاب اور اب اس مشینی انقلاب کے جلو میں وہ طاقتیں ابھریں گی جو مشین کی کوکھ سے پھوٹتی ہیں ۔ اس کے لیے تعلیم کے مروجہ طریقے میں تبدیلی اور زندگی گزارنے کے لیے بنیادی نقطۂ نظر میں تبدیلی لانی ضروری تھی ۔ غالب جدید مسلم ہند میں اس تبدیلی کے

غالباً پہلے خواہاں تھے - نہیں دوسرے پہلے شاہ عبد العزیز رحمہ تھے جنھوں نے سر سید سے پچاس سال پہلے یہ فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ دھلی کالج میں مسلمان بچے انگریزی تعلیم حاصل کریں - لیکن ادب و فکر کے میدان سے غالب کی آواز پہلی آواز تھی اور اُن کی سیاسی جمالیات کیا تھی :

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غالب کی صحیح تاریخ پیدایش

مذکورہ عنوان سے جو مقالہ زیر نظر شمارے میں شامل ہے، اس کے صفحہ ۱۰ کی سطر ۱۶، ۱۷ میں ایک جملہ اس صورت میں طبع ہوا ہے :
"حوت میں اوج اور سنبلہ میں حضیض واقع ہے"- یہ سہو طباعت ہے، اسے یوں پڑھا جائے : "سنبلہ میں اوج اور حوت میں حضیض واقع ہے" - (ادارہ)

کچھ تلامذہ غالب کے بارے میں

کلب علی خاں فائق

مالک رام کی تالیف ' تلامذہ غالب ' غالب کے شاگردوں کے سلسلے میں بہت اہم ہے ، لیکن ہر مصنف اور مولف کا کام حرف آخر نہیں ہوتا ہے ، اس لیے فاضل مولف کی نظر سے بعض شاگرد اوجھل رہ گئے ، اور بعض شاگردوں کے مکمل حالات فراہم نہ ہو سکے ۔ کچھ شاعروں کو غلط فہمی کے باعث بہ زمرہ شاگردان داخل کتاب کر لیا گیا ۔ یہ سرسری جائزہ اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ فاضل مولف آیندہ اڈیشن میں امور ذیل پر غور فرما سکیں ۔

مالک رام نے سید محمد سلطان تخلص عاقل کو تلامذہ غالب میں شمار کیا ہے ۔ ساتھ ہی شاگردی کے بارے میں شبہ بھی ظاہر کیا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

" غالب ۱۵- فروری سنہ ۱۸۶۹ء (۲- ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ) کو فوت ہوئے ہیں ، گویا اس وقت عاقل کی عمر عزیز پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی - اتنی کم عمری میں انھوں نے غالب سے کیا استفادہ کیا ہوگا ۔ ممکن ہے چند ابتدائی غزلیں دکھائی ہوں ، اگرچہ مرزا کی آخری ایام کی تندرستی کے پیش نظر یہ بھی محل نظر ہے " - [تلامذہ غالب ، ص ۲۲۷] -

اس صورت حال کے پیش نظر عاقل کو تلامذہ غالب میں شمار کرنا تعجب خیز ہے ۔ یادگار ضیغم کے مولف کے بیان سے قطعاً غالب کی شاگردی ظاہر نہیں ہوتی ۔ عبداللہ خاں ضیغم کا بیان ہے کہ :

" عاقل تخلص ، سید محمد سلطان نام ، یہ دھلی میں پیدا ہوئے اور وھیں نشو و نما پائی اور ہر قسم کے علم کی طرف توجہ کی ، کچھ روزوں مرزا

اسداللہ خاں غالب مرحوم دہلوی کی صحبت میں حاضر ہوتے رہے اور فن شعر کی طرف رغبت بڑھی۔ اسی اثنا میں بنارس آئے ... بنارس آتے ہی میر وزیر حسین مرحوم پھکیت سفید پوش کی دختر کے ساتھ شادی ہوگئی ، وہ ان کے خالو بھی ہوتے تھے - چونکہ دہلی ہی سے طبیعت میں مذاق سخن تھا ، فن شعر کی طرف زیادہ توجہ کی اور صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اب خود استاد ہیں۔ حیدرآباد دکن میں ایک مطبع جاری کر کے ' اخبار آصفی ' شائع کر رکھا ہے ، اکثر امرا اس ریاست میں ان کے شاگرد ہیں - طبیعت میں شوخی اور چستی بھری ہوئی ہے۔ عمر قریب چھتیس برس کے ہے "۔

[یادگار ضیغم ، عبداللہ خاں ضیغم ، ص ۲۳۸]

ضیغم نے عاقل کے حالات اس کی زندگی میں لکھے ہیں ، اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عاقل کے حالات سے با خبر ہے۔ عاقل اس وقت حیدرآباد دکن میں مقیم تھا اور ضیغم نے تذکرہ وہیں لکھا ہے۔ اگر عاقل نے غالب سے اصلاح لی ہوتی تو ضیغم اس کا ذکر تفصیلاً بیان کرتا - غالب کی خدمت میں حاضر ہونے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس نے مشورۂ سخن کیا ہو - قربان علی بیگ سالک کے ہمسائے میں غالب رہتے تھے - سالک کے غالب سے خصوصی تعلقات تھے ، وہ ان کے شاگرد بھی تھے - ان کا بھائی شمشاد علی بیگ رضوان بھی غالب کا شاگرد تھا - جب سالک ملازم ہوکر الور چلے گئے تو ان کے بیٹے مرزا محمد کا آنا جانا غالب کے یہاں رہتا تھا - اس کا ذکر غالب کے ایک خط میں ملتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مرزا محمد نے غالب سے بچپن میں اصلاح حاصل کی ہوگی ، کسی طرح درست نہ ہوگا - عاقل کا لڑکپن میں غالب کے یہاں آنا جانا بھی خصوصی تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے، شاگردی کا ثبوت نہیں - غالب سے اصلاح لینا چنداں مشکل نہ تھا - وہ ان کے یہاں آور و رفت رکھتا تھا اور غالب سے اس قدر قربت رکھتے ہوئے کسی وقت بھی اپنے کلام پر اصلاح لے سکتا تھا - بہت سے شعرا کے حالات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بارہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوتا اور اصلاح لینا اس عہد کا دستور تھا - داغ اور ظہیر دہلوی وغیرہ نے ذوق سے اسی عمر میں اصلاح لی ہے - ۱۸۶۵ء یا ۱۸۶۶ء میں عاقل کے لیے شعر کہنا اور اصلاح لینا آسان تھا ، لیکن جب عاقل نے شاگردی کا دعویٰ نہیں کیا ہے تو اسے کس طرح زمرۂ شاگردان غالب میں داخل کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح مالک رام صاحب کا عاقل کو تلامذۂ غالب میں داخل کرنا خود
ان کے قیاسات کی تردید ہے اور شواہد کے بھی خلاف ہے۔

اس مثال کے خلاف مالک رام نے بنواری لال شعلہ کا ذکر بال مکند
بے صبر کے شاگرد کی حیثیت سے کیا ہے، اور تلامذۂ غالب میں انہیں داخل
نہیں کیا ہے۔ ان کا بیان ہے:

"بے صبر، منشی بال مکند سکندر آبادی، ان کے بہت شاگرد
تھے جن میں بنواری لال شعلہ زیادہ مشہور ہوئے"۔

[تلامذہ غالب، ص ۵۴، ۵۵]

مولف یادگار ضیغم نے شعلہ کو بال مکند بے صبر اور غالب کا شاگرد
ظاہر کیا ہے۔ مالک رام کے پیش نظر تذکرۂ یادگار ضیغم ہے، انہوں نے ضیغم
کے بیان کی نہ تائید کی ہے نہ تردید، غالباً سہواً ضیغم کا بیان وہ نہیں دیکھ
سکے۔ ان کی نظر میں برق سیتا پوری مولف ' تذکرۂ بہار سخن ' کا بیان رہا۔
برق نے غالب کی شاگردی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ بشاش مولف تذکرۂ
' شعرائے ہنود ' نے غالب کی شاگردی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے
میں مولف تذکرۂ ضیغم کا بیان زیادہ معتبر ہے، وہ تحریر کرتا ہے:

"شعلہ تخلص، بنواری لال نام ابن منشی موتی لال مرحوم، وطن
اصلی فیروز حصار (کذا) ملک پنجاب ہے۔ ولادت ان کی مقام سہارن پور میں
ہوئی، اب چودہ برس سے علی گڑھ میں وکالت کرتے ہیں۔ عمر قریب اڑتیس
برس کے ہے۔ ابتدائے عمر سے شاعری کا شوق ہے۔ پہلے منشی بالمکن [کذا]
سے تلمذ تھا، بعدہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی مغفور کے شاگرد ہوئے۔ ایک
دیوان اور ایک مثنوی، ایک رسالۂ شطرنج ان کی تصنیف سے ہے۔ یہ کلام ہے:

ہجر میں اور بھی مشکل ہے نکلنا دم کا
میں اسی بات پہ مرتا تھا کہ آساں ہوگا

اک قدم چل کے دو عالم کو کروگے پامال
پاؤں رکھو گے جہاں گنج شہیداں ہوگا

شعلہ چھٹتا ہے کہیں شوق سخن تا دم زیست
رشتۂ عمر سے شیرازۂ دیواں ہوگا"

[یادگار ضیغم، عبداللہ خاں ضیغم، ص ۱۹۶ - ۱۹۵]

ضیغم نے معاصرین کے حالات بہت کاوش سے جمع کیے تھے ، تصانیف کا حوالہ اور شاگردی کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ شعلہ کے تحریر کردہ حالات بجنسہ داخل تذکرہ کر لیے گئے ہیں ۔ اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ شعلہ نے آغاز شاعری میں منشی بال مکند بے صبر سے مشورہ کیا اور اس کے بعد غالب کے تلامذہ میں داخل ہوگیا ۔ ' بہار سخن ' کے مولف نے شعلہ کا سال ولادت ۱۸۴۵ء اور سال وفات ۱۹۰۳ء (رام نومی کے دن) لکھا ہے ۔ اس طرح غالب کی وفات کے وقت ۱۸۶۹ء میں وہ چوبیس سالہ جوان تھا اور غالب سے مشق سخن اگر سولہ سال کی عمر میں بھی کی ہو تو سال اصلاح ۱۸۶۰ء متعین ہوتا ہے ۔

محمد عاشق حسین خاں عاشق اکبر آبادی کا حال مالک رام نے ' سخن شعرا ' سے لکھا ہے ۔ اس تذکرے میں عاشق کا ایک شعر دیا گیا ہے ۔ حالات کے ذیل میں ولدیت محمد مشتاق حسین خاں اور سکونت آگرہ لکھی ہے ۔ نساخ نے بارہ برس کی محنت کے بعد ۱۲۸۱ھ میں اپنا تذکرہ مرتب کیا تھا اور ۱۲۹۱ھ (اکتوبر ۱۸۷۴ء) میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے یہ تذکرہ چھپا تھا ۔ اس سے عاشق کے حالات واضح ہوتے ہیں ۔ میرے پیش نظر گلدستہ ' خیال یار ' آگرہ فروری سنہ ۱۸۹۱ء مرتبہ میر نثار علی کا اقتباس ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ عاشق ۱۸۹۱ء میں زندہ تھا اور ریاست اودے پور میں تھانے دار کی حیثیت سے ملازم تھا ۔ ذیل میں غزل اور عبارت مندرجہ گلدستہ ' خیال یار ' پیش کی جاتی ہے :

" عاشق ، عاشق حسین خاں شاگرد غالب مرحوم ، تھانہ دار قصبہ بھوڑا (کذا) علاقہ اودے پور:

اتنا دلچسپ نہ جنت کا گلستاں نکلا
جی بھانے کا محل کوچۂ جاناں نکلا
دیتی تکلیف بہت تیرگیٔ راہ عدم
داغ دل اپنا چراغ تہ داماں نکلا
ایک دل داغ ہزاروں یہ تری قدرت ہے
غنچہ سمجھا جسے یارب وہ گلستاں نکلا

کب ملا حسن میں تیرے لب و دنداں کا جواب
ماہ نو تاروں میں انگشت بدنداں نکلا
درد انگیز ہے واماندگیٔ اہل جہاں
جس کو راحت کا محل سمجھے تھے زنداں نکلا
ہاتھ میں زور جنوں مایۂ سودا سر میں
تیرے کوچے سے نہ میں بے سروساماں نکلا
ملتفت گر نہ ہوا یار کا شکوہ کیا ہے
یار آمادۂ صد پرسش پنہاں نکلا
منتوں کی میں کشاکش سے چھٹا شکر خدا
عشق تیرا بت کافر جز ایماں نکلا
نور خورشید سے عاشق ہے ضیا تاروں میں
چربہ غالب کے سخن کا ترا دیواں نکلا "

اب چند ایسے شاگرد پیش کیے جاتے ہیں جن کا ذکر 'تلامذہ غالب ' میں نہیں ہے۔

افضل علی ابر تخلص ، بلند شہر کے مدرسے میں ہیڈ مولوی تھے ۔ اردو میں شیفتہ سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور فارسی میں غالب سے اصلاح لیا کرتے تھے ۔ مولف ' یاد گار ضیغم ' نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

" ابر تخلص ، افضل علی نام ابن میر اکبر علی ، جد امجد ان کے موضع سیکری تحصیل جان سٹھ ضلع مظفر نگر میں رہتے تھے ۔ یہ مدت سے بلند شہر میں سکونت پذیر ہیں اور ہیڈ مولوی مدرسۂ بلند شہر ہیں ، عربی و فارسی میں تو لائق ہیں ، ریاضی میں خط نسخ اپنے ہم عصروں پر کھینچا ہے ۔ عمر اڑتالیس برس کی ہے ۔ فارسی میں اسد اللہ خان غالب مرحوم دہلوی کے شاگرد ہیں ۔ اردو میں مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم دہلوی سے جو مومن خاں کے ارشد تلامذہ سے تھے ، تلمذ ہے ۔ شوق شاعری ابتدائے عمر سے تا حال مساوی ہے "۔
[یادگار ضیغم ، صفحہ ۳۵]

محمد دلاور علی ثاقب تخلص کو بھی ضیغم نے شاگرد غالب لکھا ہے۔ ان کا ذکر بھی سہواً مالک رام سے رہ گیا ہے، ضیغم کا بیان ہے:

"ثاقب، محمد دلاور علی نام، سادات عظام سے ہیں۔ وطن اصلی ھاپوڑ ہے۔ فی الحال ریاست الور میں بہ عہدۂ تحصیل داری ملازم ہیں۔ شطرنج خوب کھیلتے ہیں، پتنگ خوب لڑاتے ہیں۔ فن شعر میں غالب مرحوم اور ہر گوپال تفتہ سکندر آبادی کے شاگرد ہیں۔ فارسی اکثر کہتے ہیں، اردو کے اشعار ہاتھ نہ آئے"۔

[تذکرہ یاد گار ضیغم، صفحات ۹۳، ۹۴]

فتح محمد تائب لکھنؤ سے ایک دہ روزہ اخبار 'انوار الاخبار' کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ اس کا ضمیمہ 'گلدستۂ شعرا' کے نام سے چھپتا تھا۔ یکم نومبر ۱۸۷۲ء کے پرچے کا اقتباس میرے پیش نظر ہے۔ انوارالاخبار جلد ۳، گلدستہ شعرا نمبر ۳۰ میں غالب کے ایک شاگرد کا کلام چھپا ہے۔ سلطان ٹیپو کی اسل سے ایک صاحب نواب محمد حسین علی سلطان، نسیم تخلص کرتے تھے۔ ان کا کلام شامل گلدستہ ہے۔ حالات کی سطر یہ ہے:

"نواب محمد حسین علی سلطان متخلص بہ نسیم، جاگیر دار، نبیرۂ ٹیپوسلطان، شاگرد غالب دھلوی از مدراس"۔

میرے منتخب دو شعر یہ ہیں:

پیام بر کا ہے رشتہ کسی پیمبر سے
ہے جبرئیل کو رشتہ ترے کبوتر سے
وہ آدمی ہے تو، دیکھیں جو تیری صورت کو
بلائیں لیں گے پری زاد پاؤں تک سر سے

گلدستۂ 'داغ جگر' کے نام سے مئی ۱۸۸۸ء میں محمد افتخارعلی تخلص جگر شاگرد داغ نے ضلع سیتاپور سے ایک گلدستہ نکالا تھا۔ اس کے تیسرے شمارے میں (جو ۲۰ نومبر ۱۸۸۸ء کو مطبع صبح صادق سیتاپور میں چھپا تھا) منشی تہورعلی شاگرد غالب کی غزل چھپی تھی۔ اس غزل کے تین شعر میری بیاض میں درج ہیں۔ گلدستے میں صرف اسی قدر حوالہ درج ہے:

"تہور، منشی تہور علی سابق منیجر گلدستۂ عطارد قنوج، شاگرد غالب"۔

تین شعر یہ ہیں :

گھر نہ کیوں غیرت گلشن ہو سراسر اپنا
آ کے مہماں ہوا وہ سرو سمن بر اپنا

خوف محشر کا نہ مے پینے سے دکھلا زاھد
ہے مددگار وہاں ساقیٔ کوثر اپنا

میں تہ بام ہوں وہ بام پہ جلوہ افگن
میں ہوں بالائے زمیں ، چرخ پہ اختر اپنا

راقم الحروف نے اسی ۱۹۳۹ء میں غالب کے ایک نام نہاد شاگرد سے رام پور میں ملاقات کی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں میری تحریک سے عتیق الرحمٰن خاں کلیم (مرحوم) شاگرد امیر اللہ تسلیم نے انتخاب یادگار (مولفہ منشی امیر احمد امیر مینائی) کا تتمہ لکھنا شروع کیا۔ کچھ تذکرے میں نے فراہم کیے نیز جو مواد میں اسی سلسلے میں جمع کرچکا تھا ، وہ کلیم کے حوالے کردیا۔ قائم چاندپوری مولد ، رامپوری مدفن ، کے حالات کے تجسس میں کلیم مراد آباد گئے۔ وہاں حکیم مسیح الزماں مغلوب مرادآبادی سے ملاقات ہوئی - مغلوب کی بہو قائم کی نسل سے تھی۔ مغلوب نے بتایا کہ وہ رام پور میں رہ چکے ہیں، اس لیے کلیم نے ان کے حالات اور اشعار لکھ لیے۔ مغلوب سے کہا کہ آپ رام پور آئیں۔ مغلوب رام پور آئے اور میں نے کلیم کے یہاں مغلوب کو دیکھا۔ خمیدہ کمر، منحنی الجثہ اور بہت ضعیف تھے۔ عمر سو کے قریب بتائی - میں نے پوچھا کس عمر میں آپ نے غالب کی شاگردی اختیار کی تھی ، جواب دیا کہ میں بارہ سال کا ہوں گا، مجھے شاعری کا شوق ہوا تو دھلی پہنچا۔ پہلے مومن خاں کے یہاں پہنچا ، وہ مکان پر نہیں تھے - پھر پتا پوچھ کر غالب کے یہاں گیا ، غالب نے مجھے بلا لیا اور شفقت سے پیش آئے اور میرے شوق کو دیکھ کر شاگرد کر لیا۔

میں نے مغلوب کے بیان کو اس وقت باور نہیں کیا تھا ، اس لیے کہ ۱۲۶۸ھ مومن خاں کا سال وفات ہے اور مومن خاں کی حیات میں دھلی جانے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کم سے کم ۱۲۵۰ھ کے قریب مغلوب دھلی پہنچے ہوں۔

کلیم کا تذکرہ " ریاض نامداراں " مکمل ہوچکا تھا لیکن ان کے انتقال کے باعث طبع نہ ہوسکا ۔ مغلوب کے تفصیلی حالات کلیم نے لکھے تھے۔ اگر مغلوب بیان کا اختلال حواس پر مبنی نہ ہو اور تخلص کی معنویت پر لحاظ کیا جائے تو غالب کے ایک اور شاگرد کا اضافہ ہو جاتا ہے ۔

سبد باغ دو در

۱۲۸۳ھ

مصنفہ

میرزا اسد اللہ خان غالب

تعارف ، تلخیص ، حواشی

امتیاز علی عرشی

فہرست

تعارف

میرزا غالب نے کلیات نظم فارسی کی طباعت کے بعد 'سبد چین' کے نام سے اپنے وہ شعر اکھٹے کیے تھے ، جو یا تو سہواً کلیات میں درج نہ ہو سکے ، یا اس کی طباعت کے بعد کہے تھے - خیال یہ تھا کہ یہ تتمہ ان کی آخری فارسی تالیف ہے - مگر سید وزیر الحسن عابدی صاحب کو 'باغ دو در' کے نام سے ایک ایسا مجموعہ دستیاب ہوا جو غالب کی کلیات نظم و نثر دونوں کا تتمہ کہا جا سکتا ہے -

موصوف الذکر نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ رسالہ 'آج کل' ۱۰ فروری ۱۹۶۷ء) میں تحریر فرمایا ہے :

> " میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت ، طباعت کی غرض سے مصنف (غالب) کی زندگی میں سنہ ۱۲۸۳ھ میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد ۷ ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ کو ختم ہوئی - مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی - 'سبد باغ دو در' غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغاز کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے - جیسا کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے ، کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کی فرمائش پر لکھا تھا - یہ منشی ہیرا سنگھ حوض قاضی کے قریب گندی گلی میں رہتے تھے - اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا " -

اس عبارت کے ایک حصے کی بنیاد دیباچے کے اس جملے پر ہے کہ :
" از انجا کہ سبد باغ دو در بیک ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ عدد دارد -

و از روی حسن اتفاق با آغاز نگارش این صحیفہ مطابق افتاد ، این نام لطفے دیگر دارد "۔

بقیہ معلومات اس خاتمہ' کاتب پر مبنی ہیں :

" آفریدگار مہر و ماہ را سپاس کہ دریں زمان فرخندہ توامان کتاب فیض انتساب سبد چین از تصنیف جناب والا شان شہنشاہ قلمرو سخن گستری ، یکہ تاز عرصہ' معنی پروری ، علامہ' عصر ، بانی مبانی نظم و نثر ، رشک عرفی و طالب، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب رحمتہ اللہ علیہ ، حسب فرمایش منشی هیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دهلی واقع کوچہ' گندھی گلی کہ یکی از شاگردان حضرت مصنف اند بخط بد نمط احقر العباد عنایت علی بتاریخ هفتم جولائی ۱۸۷۰ء روز پنجشنبہ صورت اختتام پزیرفت "۔

مجھے یہاں دو تین باتیں عرض کرنا ہیں ، پہلی یہ کہ 'سبد چین ' 'باغ دو در' سے پہلے کی تالیف معلوم ہوتی ہے ، کیونکہ باغ کے دیباچے میں اس کا ذکر ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا ہے حصہ' نظم (سبد چین) کی ترتیب کے بعد بعض دوست حصہ' نثر کا مواد لائے۔

دوسری یہ کہ ۱۲۸۳ھ کتابت کے آغاز کی نہیں ، بلکہ تالیف کے آغاز کی تاریخ ہے۔ کیونکہ یہ کتاب اتنی بڑی نہیں کہ اس کے لکھنے میں ایک سال ۴ مہینے اور ۲۲ دن صرف ہوتے۔ میری رائے میں باغ کے زیر نظر مخطوطے کی کتابت کا آغاز و انجام دونوں میرزا صاحب کی وفات کے بعد ہوا ہے۔ اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ' سبد چین ' ۱۲۸۳ سے پہلے کی تالیف ہے، اس لیے کہ یہ سنہ تو 'سبد باغ دو در' سے برآمد ہوتا ہے جو بعد کو اختیار کیا گیا ہے۔

تیسری بات یہ کہ کتاب کے آغاز میں ایک بادامی ورق چسپاں ہے، اس پر معمولی بلکہ برے اور کچے خط میں لکھا ہے :

" ایزد کارساز را سپاس کہ این کتاب مستطاب بقیہ' دیوان فارسی موسوم بہ سبد چین و بعد اضافہ' مطالب دیگر نثر دیباچہ و تقریظ و مکاتیات و یافتن خطاب ' سبد باغ دو در' از تصنیف

جناب معلی القاب، زبدۂ کملای اہل کمال، سخن سنج بے مثل و بے مثال، رشک عرفی و فخر طالب، جناب نجم الدولہ دبیرالملک مرزا اسد اللہ خاں غالب رحمتہ اللہ علیہ مشہور بہ مرزا نوشہ، حسب فرمایش منشی هیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دهلی واقعہ کوچۂ گندهی گلی بخط فقیر حقیر عنایت علی بتاریخ ...... ۱۸۷۴ھ صورت اختتام پزیرفت " -

اس تحریر کے اوپر لکھا ہے " خاتمہ از سرخی"۔ اس تحریر نیز تاریخ کی جگہ سادہ چھوڑنے اور صرف سنہ لکھ دینے سے میں قیاس کرتا هوں کہ هیرا سنگھ نے اس کاتب سے ۱۸۷۴ء میں پیش نظر نسخے کی نقل کرائی تھی اور مندرجۂ بالا عبارت اپنے قلم سے لکھ دی تھی تاکہ خاتمے میں سابق کی جگہ اسے درج کیا جائے۔

اس کتاب کا کاغذ ولایتی نیلا ہے۔ جدولیں سنہری هیں، اندرونی دو شنجرفی اور بیرونی لاجوردی۔ باریکا بھی لاجوردی ہے۔ اشعار کو باهم جدا کرنے والی لکیریں شنجرفی هیں۔ متن کتاب سیاہ بخط نستعلیق اور عنوانات اور نظم میں تخلص شنجرفی هیں، جگہ جگہ خطی اصلاحوں سے معلوم هوتا ہے کہ مقابلہ بھی کیا گیا ہے مگر پھر بھی اغلاط کتابت کہیں کہیں موجود هیں۔ مخطوطے میں کئی جگہ 'لا - الی' علامت حذف پائی جاتی ہے، جس کی نشان دهی حواشی میں کردی گئی ہے۔ بظاهر هیرا سنگھ نے دوسری نقل میں علامت زدہ عبارتوں کو حذف کر دینے کے لیے کاتب کی هدایت کے طور پر یہ علامت لکھ دی ہے۔ حصۂ مکاتیب کے آغاز میں بھی ایک جگہ لکھا ہے " ازیں جا باید نوشت " یہ بھی ناقل کے لیے هدایت ہے۔ ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ میرزا صاحب کے اصل نسخے سے زیر نظر نسخہ نقل هوا هو اور یہ ساری هدایات خود میرزا صاحب کی هوں مگر موجودہ نسخے میں یہ بالیقین میرزا صاحب کے قلم کی نہیں هیں۔

اوراق مکتوبہ کی تعداد ۹۹ ہے۔ فی صفحہ ۱۵ سطریں هیں اور تاپ فل سکیپ ہے۔ ترکیں موجود هیں۔ ورق ۱۱ ب کے حاشیے پر ۶ شعر اور ۲ الف کے حاشیے پر ۶ شعر کل ۱۲ شعر اس قطعے کے بڑھائے گئے هیں:

هر شب بقدح ریختمی بادۂ گلفام

اور اس پر ۳ کا ہندسہ ڈالا ہے اور ۱۲ الف کے آخر میں یہ دو قطعے اس طرح تھے -

پہلا : دوبارہٗ اسم و سال مولود سعید

اور دوسرا : اندازہٗ اسم و سال مولود

ان میں سے دوسرے پر ہندسہ (۱) اور پہلے پر (۲) ڈالا گیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ پہلا ، اندازہ الخ اور دوسرا ، درباره الخ اور تیسرا ، ہر شب الخ ہونا چاہیے -

موجودہ ترتیب میں اس کتاب کی تلخیص پیش کردی گئی ہے ، بایں صورت کہ 'باغ دو در' کا وہ کلام جو سبد چین کی اشاعت اول (ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ) مطبوعہ مطبع محمدی دہلی اور اسی کتاب کی اشاعت دوم (۱۹۳۸ء) مرتبہ جناب مالک رام، شایع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی میں شامل ہو چکا تھا ، اس کا صرف پہلا شعر حوالے کے لیے لے لیا گیا ہے اور دونوں اشاعتوں میں محولہ نظم کے اندراج کا حوالہ صفحہ نمبر اور تمام اشعار میں جو اختلاف یا سہو تھا ، حواشی میں ظاہر کردیا گیا ہے - حواشی میں سبدا سے اشاعت اول اور سبد ۲ سے اشاعت دوم مراد ہے -

لہذا ان حواشی سے فائدہ اٹھانے کے لیے سبد چین کی مذکورہ دونوں اشاعتیں یا کم از کم دوسری اشاعت سامنے ہونا چاہیے - ان دونوں اشاعتوں کے علاوہ بھی اگر وہ کسی مزید قابل ذکر جگہ شایع ہوا ہے تو اس کا سہو و اختلاف بھی درج کردیا ہے ، مثلاً باغ دو در کے قطعہ نمبری ۲۲ کا پہلا شعر :

گفتم بخرد بخلوت انس		کای شمع و چراغ ہفت ایواں

نقل کر کے حاشیے میں لکھا گیا :

" سبدا ص ۳۰ و سبد ۲ ص ۳۶ و انشای نور چشم ص ۳۸ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ " -

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قطعہ مندرجہ بالا حوالوں کے مذکورہ صفحات پر درج ہوا ہے -

پھر حاشیے میں لکھا گیا ہے " باغ میں شعر ۵ کے اندر ' زالسو ' بدون یا ہے اور انشای نور چشم میں شعر ۲۳ کے اندر 'خواہش' کی جگہ 'مشکل' ہے اور

آخری شعر میں 'توقیع' کے عوض 'تعجیل' ہے اور سبد ۲ میں آخری شعر کے اندر 'عطا و بذل احسان ' ہے '' :

اس قطعے کا شعر نمبر ی ہ یہ ہے :

این هر دو رسید و نیست پیدا　　زانسوی اثری بهیچ عنوان

اور شعر نمبر ی ۲۳ یہ ہے :

من نیز طلب کنم برایش　　این خواهش اگرچه نیست آسان

نیز آخری شعر یہ ہے :

توفیق جواب نامهٔ خویش　　توقیع عطا و بذل و احسان

ان اشعار کے پیش نظر ہونے کے بعد متعلقہ حاشیے کو سمجھنا دشوار نہ ہوگا ۔

باغ دودر کی زیر نظر تلخیص کے حواشی مکمل حصۂ نظم کو محیط ہیں۔ حصۂ نثر کے اختلاف نسخ و اغلاط کی نشاندہی اس وجہ سے چھوڑ دی گئی ہے کہ یہ تحریریں مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں جن کا فراہم کرنا قارئین کے لیے دشوار ہے ۔

باغ کا آخری حصہ مکاتیب پر مشتمل ہے جو بیشتر غیر معروف ہیں ، البتہ چند خطوط مطبوعہ بھی شامل ہو گئے ہیں ۔ یہ تمام خطوط حقیر عرشی کی مرتبہ آہنگ پنجم میں مع توضیحی حواشی کے شامل ہوں گے ۔ آہنگ پنجم کی مذکورہ ترتیب میں غالب کے تقریباً پانچ سو خطوط جو تاحال دریافت ہوسکے ہیں ، پیش کیے جا رہے ہیں ۔ لیکن اس غرض سے کہ باغ کی کیفیت بڑی حد تک قارئین کے سامنے رہے ، اس میں شریک خطوط کے مکتوب الیہم کے نام اور مکاتیب کا آغاز و انجام بھی نقل کردیا گیا ہے ۔

باغ دو در کی زیارت مجھے صدیق مکرم ڈاکٹر اظہر علی صاحب استاد تاریخ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی کے توسط سے ہوئی ۔ میں موصوف کا نیز مالک کتاب جناب سید وزیر الحسن عابدی صاحب کا ممنون و مشکور ہوں کہ مجھے اس نادر کتاب کو استعمال کرنے کا موقع عطا فرمایا ۔

کتاب خانۂ عالیہ ، رام پور　　امتیاز علی عرشی

پس نوشت :

سبد باغ دو در کی تلخیص و حواشی نگاری کا کام کیے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ یہ کام میں نے کیا تھا ۔ چونکہ مالک کتاب عابدی صاحب اسے شایع کرنا چاہتے تھے ، اس لیے میں نے اشاعت روک دی تھی ۔ اب جو عزیز مکرم مشفق خواجہ صاحب سلمہ کی فرمائش رسالہ' اردو کے غالب نمبر کے لیے آئی اور پے در پے تقاضے آئے تو اکبر سلمہ کو اس کا مسودہ یاد آیا ۔ انھوں نے میرے پرانے کاغذات سے اسے تلاش کیا اور اب غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ کئی سال ہوئے خود جناب عابدی نے بھی اس کتاب کا متن اورینٹل کالج میگزین میں شایع کر دیا ہے ۔ اس طرح میرے حواشی کو سمجھنے کے لیے سہولت پیدا ہو گئی ہے ۔ اب ڈاکٹر صاحب کے شایع کردہ متن کو بھی سبد چین طبع اول و دوم کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے ۔ افسوس یہ ہے کہ میری حالیہ علالت نے اس امر کا موقع نہ دیا کہ مطبوعہ باغ دو در کے حوالے درج کیے جاسکتے ۔

بسم الله الرحمن الرحیم

دیباچہ

دو در دارد ایں باغ آراستہ
دروبند از ہر دو برخاستہ

بنامیزد 'سبد چین' میوہ را گویند کہ پایان موسم بر شاخسار ماند ، و چون آن رابچینند ، شاخسار سراسر بی بار ماند ۔

ہر آینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد ، یا آنچہ ہنگام فراہم آوردن نگارش دست بہم نداده بود ، اینک در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد ، و ایں را 'سبد چین' نامیدہ آمد ۔

دانم کہ فراہم آوردن دہ ہزار بیت کلیات چہ کشود کہ ازیں ابیات کہ در شمار بہزار نتواند رسید ، خواہد کشود ۔ ناسور کہن را از تراوش گزیر نیست - تا باید زیست ، سخن باید گفت ۔ ناچار تا زندہ ام ، ایں مجموعۂ مقالات پریشان انتہا نخواہد پزیرفت ۔ چنانکہ در علم و عمل ناتمام میگزرم ، ایں نیز ناتمام خواہد ماند ۔

چون زنجیرۂ نظم گران پزیرفت ، ناگاہ یاران نثری چند درآوردند ۔ آن را نیز دریں مجموعہ گنجانیدم و 'باغ دو در' نامیدم ۔ از آنجا کہ 'سبد باغ دو در' یک ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ عدد دارد ، واز روی حسن

اتفاق با آغاز نگارش این صحیفه مطابق افتاد ، این نام لطفی دیگر دارد ۔ فقط ۔ (۱)

۱۔ اس دیباچے کا سر بیت اور ' نامور کہن را ' سے آخر تک کی عبارت خاص اس کتاب کے لیے لکھی گئی ہے ۔ پہلا پیرا وہی ہے جو ' سبد چین ' کے لیے لکھا گیا تھا اور مطبع محمدی دہلی کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے ۔ دوسرے پیرے میں پہلے جملے کے خاتمے کے بعد سے شروع کر کے آخر تک عبارت یوں ہے : " و آنچه یاران از دیرین مسودات داشتند و من ازان خبر نداشتم و اینک بمن رساندند ، در اوراق جداگانه ضبط کرده شد ، و آن را ' سبد چین ' نام نهاده آمد "۔ چوتھے پیراگراف کے ابتدائی جملے کے الفاظ میں معمولی تغیر کیا گیا ہے ، یعنی : " دانم که فراهم آوردن کلیات که ده هزار بیت دارد ، چه کشود که ازیں ابیات که در شمار بهزار بیت نتواند رسید ، خواهد کشود "۔ اور اس کے بعد یہ عبارت ہے جو باغ کے دیباچے میں محذوف ہے : "تفرقهٔ اقسام شعر و تقدیم و تاخیر و قید ردیف و سال بر نتافته ام۔ آنچه گفته ام و از دیگران یافته ام ، نگاشته ام ۔ و اکنون نامور کهن را تراوش نماند ، کلک از کف فروگزاشته‌ام ۔ سپس اگر سخنی در اندیشه خواهد گزشت ، روشناس صفحه نخواهد شد ، یارب ، گسستن پیوند جان و تن بر من آسان باد ، و دران دم جز حمد تو و نعت محمد علیه السلام در دل و بر زبان مگزراد " ۔

اس عبارت کے بدلے میں جو کچھ یہاں لکھا گیا ہے ، وہ گویا عملی تجربے کے بعد سابق کی تردید ہے ۔

پانچواں پیرا خاص ' باغ دو در ' کے لیے لکھا گیا ہے ، اور اس میں کتاب کا نام اور تاریخ تالیف کا ذکر ہے ۔

قطعـــات

۱- قطعه (۲ بیت)

غالب این رنگین کتاب 'گلشن بے خار' نام
روکش جنات تجری تحتها الانهار هست (۱)

۲- قطعه (۴ بیت)

احترام الدوله فرمان داد تا دل کشا گرمابهٔ انجام یافت (۲)

۳- قطعه (۵ بیت)

در هزار و دو صد و شصت و شش از دنیا گزشت
بانوی شاه اود مریم مکانی نام او (۳)

۴- قطعه (۱۰ بیت)

سپهر مرتبه، ای ویسرای کشور هند
کز التفات تو دل بشگفد چو گل ز نسیم (۴)

۵- قطعه (۱۲ بیت)

بزم نواب جم حشم مکلوڈ بوستانیست پر ز نعمت و ناز (۵)

۱- سبد ۱ ص ۲۴ و سبد ۲ ص ۳۵ و خاتمه گلشن بے خار ص ۳۶۵ طبع اول ۱۸۳۷ء و پنج آهنگ ص ۱۶۶ طبع ۱۸۵۳ء -

۲- سبد ۱ ص ۲۵ و سبد ۲ ص ۳۵ - ۳- ایضاً -

۴- مثنوی ابر گہر بار : ۳۸، اکمل المطابع دهلی ۱۲۸۰ھ و سبد ۱ ص ۲۵ و سبد ۲ ص ۳۶ -

۵- ایضاً ص ۲۶ و ایضاً ص ۳۷ -

۶- قطعہ (۱۴ بیت)

فلک مرتبت منٹ گمری بہادر   کہ در سروری میکنی بادشاہی (۱)

۷- قطعہ (۹ بیت)

در آخر دسمبر و آغاز جنوری   سال نوست و روزکلاں روزگار را (۲)

۸- قطعہ (۱۲ بیت)

نوروز و مہرگاں نبود در طریق ما
اما شگفتہ روئی گلہای تر خوش است (۳)

۹- قطعہ (۵ بیت)

دگر در سرستم کہ از روی مستی   شرابی بہ ساقی کوثر فرستم (۴)

۱۰- قطعہ (۲ بیت)

جاں عزیز است ، و اهل عزت را   عزت از جاں عزیز تر باشد (۵)

۱۱- قطعہ (۳ بیت)

ترا ، ای آفتاب عالم افروز   پس از نو روز سال نو مبارک (۶)

۱۲- قطعہ (۴ بیت)

میر سعادت علی کرد در اجمیر طرح
مسجد و چاهی کہ هست چشمۂ آب بقا (۷)

۱- ابر گہر بار : ۳۸ ، حاشیہ و سبد ۱ ص ۲۶ و سبد ۲ ص ۳۸ -
۲- سبدا ص ۲۷ و سبد ۲ ص ۳۹ -
۳- ایضاً -
۴- سبد ۱ ص ۲۸ و سبد ۲ ص ۴۰ -
۵- ایضاً و سبد ۲ ص ۴۱ -
۶- ایضاً -
۷- ابرگہر بار : ۳۹ - ایضاً - 'باغ' میں "بدل اجر آن" اور سبد ۱ میں "بذل" ہے -

۱۳- قطعہ (۴ بیت)

با خرد گفتم ، شہ فرزانہ فتح الملک را
خود چہ گویم ؟ گفت ، فخر دودۂ آدم بگو (۱)

۱۴- قطعہ (۲ بیت)

نہادہ بنا احسن اللہ خان　　سر رہ بدانسان در دلکشا (۲)

۱۵- قطعہ (۲ بیت)

تاریخ وفات ذوق ، غالب　　با خاطر دردمند مایوس (۳)

۱۶- قطعہ (۲ بیت)

با خرد گفتم ار تو فرمائی　　شویم از دل خیال بادۂ ناب (۴)

۱۷- قطعہ (۳ بیت)

گیر کہ در روز حشر چوں تو بیفتی
بر سر دوزخ نہند تیرہ نہنبن (۵)

۱۸- قطعہ (۲ بیت)

بمن ز مقدم فرزند میرزا باقر　　سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت (۶)

۱۹- قطعہ (۹ بیت)

صبحدم با ابوالبشر گفتم　　پارۂ زر بدہ کہ زر داری (۷)

۱- ایضاً و سبد ۲ ص ۴۲ -
۲- ایضاً -
۳- سبد ۱ ص ۹۲ و ایضاً - ۲ سبد میں " دردمند و مایوس " ہے -
۴- سبد ۱ ص ۹۲ و سبد ۲ ص ۴۳ -
۵- سبد ۱ ص ۹۲ و سبد ۲ ص ۴۳ - سبد ۱ میں پہلے شعر کے اندر ' نہیں ' ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے -
۶- ایضاً -
۷- ایضاً و سبد ۲ ص ۴۴ -

۲۰- قطعه (٥ بیت)

خواندی بنوبهار مرا جانب چمن
زیں برگہای سبز چه کرد آورم نوا (۱)

۲۱- قطعه (۹ بیت)

روزی ز ره ستم ظریفی بر لاشهٔ جعفر چهارم (۲)

۲۲- قطعه (۲۷ بیت)

گفتم بخرد بخلوت انس کای شمع و چراغ هفت ایوان (۳)

۲۳- قطعه (۱۰ بیت)

هزار و دو صد و هشتاد و دو شمار کنید بحسب ضابطه از هجرت رسول الله (۴)

۲۴- قطعه (۲ بیت)

خجسته جشن دبستان نشینی بیگم بفیض همت نواب و یمن اقبالش (۵)

۱- ایضاً -

۲- سبد ۱ ص ۳۰ و سبد ۲ ص ۴۵ -

۳- ایضاً و سبد ۲ ص ۴۶ - و انشای نور چشم ص ۴۸ ، مطبع نظامی کانپور سنه ۱۲۸۹ھ -

باغ میں شعر ٥ کے اندر ' زانسو ' بدون یا ہے۔ اور انشای نور چشم میں شعر ۲۳ کے اندر ' خواهش ' کی جگه ' مشکل ' ہے، اور آخری شعر میں ' توقیع ' کے عوض ' تعجیل ' ہے۔ سبد ۱ میں آخری شعر کے اندر ' بذل و احسان ' ہے۔

۴- سبد ۱ ص ۳۱ و سبد ۲ ص ۴۸ - شعر ۷ میں سبد ۱ و ۲ میں ' در ناگاه ' ہے۔ شعر ۱۰ کے پہلے مصرعے کا آخری لفظ سبد کے دونوں نسخوں کی طرح باغ میں بھی ' بگریز ' تھا مگر تصحیح کے وقت اسے چھیل کر '' بگزر '' بنایا گیا ہے، جو موزوں تر ہے۔

۵- سبد ۱ ص ۳۲ و سبد ۲ ص ۴۸ -

۲۵- قطعہ (۳ بیت)

چو نواب از پہر اجلاس کونسل به کلکته از رام پور آورد رخ (۱)

۲۶- قطعہ (۳۱ بیت)

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخهٔ
در خصوص گفتگوی پارس انشا کرده است (۲)

۲۷- قطعہ (٦ بیت)

لمایش گهی در خور شان خویش بر آراست نواب عالی جناب (۳)

۲۸- قطعہ (۲ بیت)

بحق باده چنیں حکم داده حاکم وقت
که نی برند ز شهر و نیاورند بشهر (۴)

۲۹- قطعہ (۲ بیت)

امروز شنیده ام که از مهر تقصیر پسر معاف کردی (۵)

۱- سبد ۱ ص ۳۲ و سبد ۲ ص ۹۴ و مکاتیب غالب ص ۸٦ طبع اول۔

۲- ایضاً و سبد ۲ ص ۳۳ - و مکاتیب غالب ص ۱۷ طبع اول۔
میرزا صاحب نے سب سے پہلے اسے یک رخه اشتہار کی طرح چھاپ کر شایع کیا تھا - اس کے بعد سبد ۱ میں چھپا - بعد ازاں جواب اور جواب الجواب وغیرہ کے ساتھ 'شمشیر تیز تر' کے شروع میں ۱۸٦۸ء میں چھاپا گیا - نیز ملاحظہ ہو مکاتیب غالب طبع اول ص ۱۷ - شعر ۱۰ میں 'باغ' کے اندر 'فرمود و در وی' ہے۔

۳- سبد ۱ ص ۳۷ و سبد ۲ ص ۵۱ و مکاتیب غالب ص ۹۳ طبع اول - سبد ۱ میں 'خدایا پسند و الخ' نہیں ہے۔

۴- سبد ۱ ص ۳۷ و سبد ۲ ص ۵۲ - ان میں 'حکم داد' ہے۔

۵- ایضاً - چوتھے مصرعے میں ان دونوں کے اندر 'کنم' کی جگہ 'نکنم' چھپ گیا ہے۔

۳۰- قطعه (۱۰ بیت)

از دوست بهر بنده زهی شیشه های می
از بنده سوی دوست بهر شیشه یک سلام (۱)

۳۱- قطعه (۱۷ بیت)

پس از ادای سپاس خدای عز و جل ثنای حضرت نواب میکنم انشا (۲)

۳۲- قطعه (۳ بیت)

الا ای شناسندهٔ هندسه نباید که موجود فهمی مرا (۳)

۳۳- قطعه (۳ بیت)

مفلس، اگرش مال نباشد، چه کم است این
کز هیچ کس اندیشهٔ آزار ندارد (۴)

۳۴- قطعه

کرنیل جارج ولیم هملٹن (۵) فرخنده حاکم، فرزانه داور

۱- ایضاً - سبد ۱ میں پہلے مصرعے میں ' زهی ' کی جگہ ' زهی ' ہے۔ سبد ۲ کے حاشیے میں رسالہ' رومان لاہور کے فروری سنہ ۱۷۳ء کے پرچے کے حوالے سے، جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ یہ قطعہ میرزا صاحب نے الگزنڈر اسکنر کے نام ان کے ایک منظوم خط کے جواب میں لکھا تھا، اس قطعے کے لیے سبد ۲ ص ۵۳ و ۵۴ کا حاشیہ دیکھیے - سبد ۲ میں شعر ۳ کے اندر ' آن شراب ' کی جگہ ' این شراب ' چھپ گیا ہے۔ اسی طرح سبد ۲، شعر ۱۰ میں ' پوٹ وین ' کی جگہ ' پوٹ وائن ' لکھا گیا ہے۔

۲- سبد ۱ ص ۳۹ و سبد ۲ ص ۵۵ -

۳- سبد ۱ ص ۳۹ و سبد ۲ ص ۵۶ - باغ میں شعر ۲ و ۳ میں ' ہا ' کی جگہ ' ہا ' اور شعر ۳ میں ' بشارات ' کے عوض ' اشارات ' ہے۔

۴- سبد ۱ ص ۲۰ و سبد ۲ ص ۵۶ - دوسرے شعر میں ' بردار د بدو ' کے معنی آٹھائی گیرا، اور ' کیسہ بر ' کے معنی گنٹھ کٹا ہیں -

۵- میرزا صاحب نے لفظ ' جارج ' کی رای ساکن کو عام ہندوستانی لہجے کے مطابق بالفتح نظم کیا ہے۔ اس سے بدیسی الفاظ کے دیسی بگڑے تلفظ کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے -

صبح طرب را مہر درخشاں　　شام شرف را ماہ منور
در باغ دانش، سر سبز گلشن　　در بحر بینش، یک دانہ گوہر
صیت کمالش در ہفت گردوں　　ذکر جمیلش در ہفت کشور
یا رب، بگیتی با فر و شوکت　　پیوستہ بادا ایں داد گستر (۱)

۳۵- قطعہ

کرم پیشہ ڈپٹی کمشنر بہادر (۲)　　کہ نقش نگین دل ماست نامش
دراں بزم ہمچوں منی را چہ یارا　　کہ خم گشتہ گردوں ز بہر سلامش

۳۶- قطعہ

گویند: رای چھج مل (۳) شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت ازیں تنگ نا، دریغ!
گفتم: کسی ز سال وفاتش نشاں دھد
غالب شنید و نفت، چہ گویم؟ "اسا دریغ" ۱۲۷۷ھ

۳۷- قطعہ

گویند: رفت ذوق ز دنیا، ستم بود
کاں گوہر گراں بہ تہ خشت و گل نہند (۴)

۱- یہ اور اگلے تین قطعے سبد میں نہیں ہیں۔

۲- اپنے موجودہ وسائل کے پیش نظر میرے لیے ان ڈپٹی کمشنر صاحب کی شخصیت کا تعین دشوار ہے۔ لیکن یہ گمان غالب ہے کہ اس سے مراد اوبرائن صاحب ہوں، جن کے سامنے میرزا صاحب کا دعویٰ ازالۂ حیثیت عرفی بنام مولوی امین الدین مولف قاطع القاطع پیش ہوا تھا۔

۳- رائے چھج مل، منشی جواھر سنگھ جوہر، شاگرد غالب کے والد تھے۔ ان کے نام غالب کے کئی فارسی خط شائع ہو چکے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان سے بڑی پرانی دوستی تھی۔ چھج مل کا سنہ وفات پہلی بار 'باغ دودر' کے اس قطعے سے معلوم ہوا ہے۔

۴- اس قطعے کے پہلے تین مصرعوں پر عربی حرف نفی 'لا' اور

[جاری]

تاریخ فوت شیخ بود ' ذوق جنتی ' ۱۲۶۹ھ
بر قول من رواست کہ احباب دل نہند

۳۸- قطعہ (۲ بیت)

فتح سید غلام بابا خان
خود نشان دوام اقبالست (۱)

۳۹- قطعہ

سہ تن ز پیمبران مرسل
گشتند بقرب حق مشرف
عیسیٰ ز صلیب و موسیٰ از طور
ختم الرسل از براق و رفرف (۲)

۴۰- قطعہ

تا بود چار عید در عالم
بر تو ، یا رب ، خجستہ باد و ھجیر
عید شوال و عید ذی الحجہ
عید بابا شجاع و عید غدیر (۳)

[جاری]

چوتھے مصرعے کے آخری کلمے کے اوپر عربی حرف جر ' الی ' لکھ دیا گیا ہے ، جو اس کی علامت ہے کہ یہ سارا قطعہ کالعدم قرار دے دیا گیا ۔ ذوق کا ایک قطعہ' تاریخ وفات اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو یہ دوسرا قطعہ پسند نہ تھا ، اس لیے ' باغ ' میں درج کرانے کے بعد پھر قلم زد کرا دیا ۔ مادہ' تاریخ ' ذوق جنتی ' سے ۱۲۶۹ھ نکلتے ہیں ۔

۱- اردوئے معلیٰ ، ص ۱۱ ، طبع اول ۱۸۶۹ء ۔ سبد ۲ ص ۵۷ ۔

۲- قطعات ۳۹ تا ۴۲ سبد میں نہیں ہیں ۔

۳- ان چاروں عیدوں میں سے دو عام اسلامی عیدیں اور دوسری دو صرف اہل تشیع کے ساتھ خاص ہیں ۔

۴۱- قطعہ

کرد چون ناظر وحیدالدین ز دنیا انتقال
گفتم ، آیا بر کدام آئین بود سال وفات ؟
گفت غالب کز سر زاری اگر نامش برآید
خود ہمین " ناظر وحیدالدین " بود سال وفات (۱)
۱۲۷۴ + ۷ = ۱۲۸۱ھ

۴۲- قطعہ

طراز انجمن طوی میرزا یوسف (۲)
قرار یافت درین مہ بحکم رب ودود
دو شنبہ بست و دویم روز از مہ شعبان
دمی کہ مہر نہد سوی قبلہ سر بسجود
کرم کنند و فزایند زیب بزم نشاط
بہ فر فرخ فرخندگی فزای ورود

[جاری]

۱- اس قطعے پر بھی ' لا ' اور ' الی ' لکھ کر کالعدم قرار دے دیا ہے - مادہ تاریخ ' ناظر وحیدالدین ' سے ۱۲۷۴ھ نکلتے ہیں - اس میں ' زاری ' کے ۷ عدد جمع کر دیے جائیں تو ۱۲۸۹ء ہو جاتے ہیں ، جو سال وفات ہے -

۲- یہ قطعہ میرزا صاحب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف خان کی شادی کا دعوت نامہ ہے - ان کی شادی کا سنہ معلوم نہ ہو سکا - از روے حساب ۱۲۲۷ھ ، ۱۲۳۲ھ ، ۱۲۴۰ھ ، یہ تین سال ایسے ہیں کہ ان میں شعبان کی ۲۲ تاریخ دو شنبے کو واقع ہوئی تھی - ان میں سے پہلے سنہ میں یوسف خان ۱۳ برس کے ، دوسرے میں ۱۸ برس کے اور تیسرے میں ۲۶ برس کے ہوتے ہیں - اگر یہ رسم ملحوظ رہے کہ ان کے خاندان میں ۱۳ ، ۱۴ برس کی عمر میں شادی ہوتی تھی ، جیسا کہ خود غالب کا واقعہ ہے ، تو پہلا ورنہ دوسرا سنہ تقریبی سال نکاح قرار پا سکتا ہے -

بسر برند شب اینجا کہ تاسفیدۂ صبح　　همیں نظارۂ رقص است و استماع سرود
سپیدہ دم کہ ز فیض شمول نکہت گل　　دم نسیم سحر مشکبار خواهد بود
شوند جانب کاشانۂ عروس رواں　　بہ شادمانی بخت مبارک و مسعود
سپس بہمرهی جمع وقت برگشتن　　سپاس بندہ نوازی همی تواں افزود

۴۳- قطعہ (۲ بیت)

اندازۂ اسم و سال مولود　　معلوم کن از خجستہ فرزند (۱)

۴۴ - قطعہ

در بارۂ اسم و سال مولود سعید
رفت است ز غالب سخنور توضیح
' ارشاد حسین خاں '، سنین هجریست
۱۲۸۵ھ
بنگر کہ ' خجستہ رخ ' بود سال مسیح (۲)
۱۸۶۸ء

۴۵ - قطعہ

هر شب بقدح ریختمی بادۂ گلفام
آری ، ز دو سی سال مرا قاعدہ ایں بود
شش روز شد اینک کہ بمے دسترسم نیست
شد (۳) غمزدہ تردل کہ ازیں پیش حزیں بود

۱- اردوی معلیٰ ، ص ۲۳۷ طبع اول اور سبد ۲ ص ۹۵ میں پہلا مصرع اس طرح ہے : ' غالب حال سنین هجری '

۲- یہ دونوں قطعات (۴۴ و ۴۵) بھی سبد میں لمہیں ہیں - یہ قطعہ بھی مثل قطعہ ما قبل نواب سید ابراهیم علی خاں بہادر کے فرزند کا سال ولادت بتاتا ہے - لیکن کسی وجہ سے میرزا صاحب نے نواب صاحب کے نام کے خط میں جو اردوی معلیٰ ، ص ۲۳۷ پر موجود اور قطعہ نمبری ۴۳ پر مشتمل ہے ، اس قطعے کا ذکر نہیں کیا ہے -

۳- باغ : شدہ -

امشب چہ سرایم کہ شب اول گور است
شش روز بہ بیتابی و تلواسہ جبیں بود
ناگاہ در آں وقت کہ در قطع رہ عمر
از من دو قدم تا بدم باز پسیں بود
یک رہ دو تن از شرب میم منع نوشتند
و آں منع نہ از بغض ، بل از غیرت دیں بود
ہر چند بداں منع ، من از مے نگزشتم
اما دم گیرای عزیزاں بکمیں بود
دانی کہ چہ شد ؟ چوں زر سوداگر صہبا
کش داد و ستد با من ویرانہ نشیں بود
بگزشت ز اندازۂ بایست ، بمن گفت
' دیگر ندہم بادہ کہ معمول نہ ایں بود '
با کاسۂ خالی چہ کند کیسۂ خالی
تا خواستہ در خواستہ دل صبر گزیں بود
گر زر بدی ، از جای دگر مے طلبیدم
کو نقد دراں دست کہ پشتش بزمیں بود
در غرۂ شعباں چو ز من بادہ گرفتند
خود " غالب پژمردہ " نشانی ز سنیں بود (۱)

۱۲۹۱ - ٦ = ۱۲۸۵ھ

۱۔ " غالب پژمردہ " کے ۱۲۹۱ عدد ہوتے ہیں ۔ ان میں ٦ منہا کر دیے جائیں تو ۱۲۸۵ رہ جاتے ہیں جو اس حادثے کا سنہ ہیں ۔ غالب کے سوانح نگاروں نے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ میرزا صاحب نے پانچویں شعر میں جن دو صاحبوں کو لکھا ہے کہ انھوں نے مجھے شراب سے روکنے کی تحریری کوشش کی تھی ، ان میں سے ایک غالباً مولانا حالی تھے ، کیونکہ انھوں نے خود یادگار غالب میں اسی قبیل کی اپنی ایک کوشش کا ذکر کیا ہے ۔

رو ، شش بدر آر از سہ شعبان کہ درینجا
مقصود من از تخرجہ البتہ ہمیں بود

۳۶ - ترکیب بند (۸۴ بیت)

خواہم از بند بزندان سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد ، فغاں ساز کنم (۱)

۳۷ - ترجیع بند (۳۰ بیت)

ورود سرور سلطاں نشاں مبارکباد
بہ شہر مقدم نوشیرواں مبارکباد (۲)

۳۸ - مثنوی (۹ بیت)

دریں سال نواب عالی جناب
بروی زمیں غیرت آفتاب (۳)

۱- سبد ۱ ص ۱۴ و سبد ۲ ص ۲۳ - سبد ۱ میں بند ٦ کے پہلے شعر میں ' زہرۂ ننگم ' چھپ گیا ہے ، اور آخری بند کے شعر ۵ کے پہلے مصرعے میں ' سود بیند ' اور دوسرے مصرعے میں ' جفا قالب ' ہے - سبد ۲ ص ۲٦ میں شعر ۳ کے آغاز میں ' خست تن ' بکسرۂ اضافت چھپا ہے جو درست نہیں ، کیونکہ ' خست ' یہاں فعل ماضی کا صیغہ واحد غائب ہے ، اور فعل مضاف نہیں ہوا کرتا - اسی طرح سبد ۲ ص ۲۸ کے آخری شعر میں ' از بعد ' غلط ہے ، درست ' ار بعد ' ہے جو ' اگر بعد ' کا مخفف ہے - صفحہ ۲۹ کے شعر ۳ میں ' خشنود ' کی جگہ ' خوشنود ' بھی میرزا صاحب کے املا کے خلاف ہے ، چنانچہ سبدا ص ۱۸ میں بے واو ہی چھپا ہے - نیز ص ۳۰ کے شعر اول کے پہلے مصرعے میں ' بند رقم ' باضافت درست نہیں -

۲- سبد ا ص ۱۹ و سبد ۲ ص ۳۱ - موخرالذکر میں بند ۲ کے آخری شعر میں ' آویز نغمہ ' باضافت غلط چھپ گیا ہے -

۳- سبدا ص ۳٦ و سبد ۲ ص ۳۳ - سبد ا میں ' روم روس ' بدون واو عطف غلط چھپا ہے -

۴۹ - مثنوی

وفا جوہرا (۱) ، از تو غم دور باد
دلت سرخوش بادہ' سور باد

رسید از تو الفت فزا نامہ'
روان تازہ کن دلکشا نامہ'

نخواہم کہ در عرصہ' روزگار
نشیند ترا بر دل از غم غبار

ز رنجوری من مخور غم کہ من
ندارم غم ہستی خویشتن

نہ جان از منست و نہ جسم آن من
خود از مردن من چہ نقصان من ؟

حدیثی است شایستہ و سودمند
ز شایستگی بودہ دانا پسند

گر از من نباشی نکوئی شنو
ازان کس کہ فرزند اوئی شنو

چنیں دادہ فرمان کہ در ساز راہ
نباشی بحیلت گری عذر خواہ

عزیزان رہرو گرامی کسند
بشادی دران ناحیت میرسند

بشادی بدین جمع انباز گرد
چہ گردند اینان ، توھم باز گرد

الا تا نسنجی کہ این زان بہ است
چنیں خواستہ است آن کہ فرماندہ است

مشو سخت کوش و مشو سخت گیر
دریں آمدن باش فرمان پزیر

بحکم پدر چوں گزیدی سفر
بگرد از سفر ہم بحکم پدر

دریں رفتن و آمدن شاد باش
بہ تبعیت از طعنہ آزاد باش

۱- یہ منشی جواہر سنگھ جوہر کی طرف اشارہ ہے ، اور یہ مثنوی منظوم خط ہے ، جو رائے چھج مل کے التماس پر میرزا صاحب نے جوہر کو لکھا تھا - مقصد یہ تھا کہ جوہر اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں آکر شرکت کریں - غالباً وہ کسی بات پر والدین سے روٹھے ہوئے تھے ، اور باپ کو ڈر تھا کہ میرے بلاوے پر نہ آئیں گے، اس لیے میرزا صاحب سے یہ سفارشی خط لکھوایا تھا - میرزا صاحب نے جوہر کے نام جو خط ۲۰ فروری سنہ ۱۸۴۹ء کو لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی اس تاریخ سے پہلے ہو چکی تھی ، مگر ھنوز برات امروہے سے واپس نہیں آئی تھی - اور اس سے یہ نتیجہ بھی لکلتا ہے کہ یہ منظوم خط آخر ۱۸۴۸ء یا آغاز ۱۸۴۹ء کا ہے -

زهجر تو مادر بتاب اندر است
گدازان چو شکر به آب اندر است

پدر نیز مشتاق دیدار تست
بصد گونه خواهش طلب گار تست

ترا خواهد، از بس که خواهد ترا
نخواهد گر او، پس که خواهد ترا؟

بیاو دو خونین جگر را به بین
بمادر نشین و پدر را به بین

دگر من چراغ سحرگاهیم
قدم نه براه، هواخواهیم

بیا، تا به بینی که چون می تپم
چسان دیده تا دل بخون می تپم

بیا، تا تنم غرق خون بنگری
درون مرا از برون بنگری

بیا، تا به بینی که از روزگار
کنونم بجائی رسید است کار

که می نوشم از خستگی، نز ورع
بجای می ناب، ماء القرع

بیا و بیا و بیا و بیا
سر آمد سخن، والدعا، والدعا

بخوان، چون بخوانی ورق را تمام
ز نیر سلام و ز عارف سلام

قصائد

۱ - قصیدہ (۳۱ بیت)

بیا کہ مدح خداوند دادگر گویم

از آنچہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم (۱)

۲ - قصیدہ (۳۸ بیت)

وقت آنست کہ خورشید فروزاں ہیکل

گردد آیندہ گر آیندہ بفرگاہ حمل (۲)

۱- ابر گہر بار: ۳۵، اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۰ھ سبد ا ص ۲ و سبد ۲ ص ۷ سبد ا شعر ۱۳ میں ' ہمزد و مژدہ دہی ' غلط چھپا ہے - سبد ۲ ص ۸ شعر ۱۲ میں ' براہ حدیث ' اضافت کے ساتھ درست نہیں ہے - اس طرح سبد ۲ ص ۹ شعر ۵ میں ' طراز دعا' ہونا چاہیے۔ سبد ا میں اس شعر کے اندر ' اینت ' کی جگہ ' اینست ' چھپ گیا ہے - یہ قصیدہ لارڈ الگن بہادر ویسرائے ہند کی مدح میں ہے۔

۲- ابر گہر بار : ۳۶ ' سبد ۱ ص ۴ و سبد ۲ ص ۹ - سبد ۱ شعر ۴ میں ' گداز' کی جگہ ' گراز ' چھپا ہے - اسی طرح شعر ۵ میں ' سیقل ' لکھ گیا ہے - سبد ۲ ص ۱۰ کے شعر ۶ میں ' کام ذوق ' باضافت درست نہیں ہے - سبد ۱ ص ۵ کے شعر ۷ میں ' گو ' کی جگہ ' گہر ' ہے - یہی لفظ ' باغ ' میں بھی تھا مگر تصحیح کے وقت اسے چھیل کر درست کردیا گیا ہے - سبد ۱ ص ۵ کے شعر ۸ میں ' باہ بہ شور ' غلط چھپ گیا

[جاری]

۳ - قصیدہ (۳۶ بیت)

تعظیم غسل صحت نواب کم مگیر زاں عید کاں مضاف بود جانب غدیر (۱)

۴ - قصیدہ (۳۵ بیت)

تجلی کہ ز موسیٰ ربود هوش بطور بشکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور (۲)

[جاری]

ہے ' ماہ بہ نور ' ہونا چاہیے ۔ اور شعر ۱۱ میں ' در ناصیہ ' میں ' در ' زائد ہے ۔ سبد ۲ ص ۱۱ کے شعر ۳ میں ' آہنگ ' پکسرہ توصیفی ہونا چاہیے ، اور چوتھے شعر میں " زمزمہ " کی ہمزہ نہ ہونا چاہیے ۔ سبد ۱ ص ۵ شعر ۷ میں قافیہ غلطی سے ' احول ' کی جگہ ' احوال ' چھپ گیا ہے ۔
یہ قصیدہ لارڈ جان لارنس بہادر ویسرائے ہند کی مدح میں ہے ۔

۱- سبد ۱ ص ۹ بعنوان قطعہ و سبد ۲ ص ۱۰ و مکاتیب غالب ص ۴۲ حاشیہ طبع اول و انتخاب یادگار ص ۲۵۰ - نواب سے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم تخلص مراد ہیں ۔ جن کے غسل صحت کی مبارکباد میں یہ قصیدہ لکھا گیا تھا ۔ انتخاب یادگار میں اس کے صرف ۶ شعر نقل کیے گئے ہیں ۔ سبد ۲ ص ۱۰ شعر ۶ میں ' حمام حوض ' ہے ۔ لیکن ' حمام خص ' ہونا چاہیے جو سبد ۱ اور باغ میں ہے ۔ سبد ۲ ص ۱۶ شعر ۳ میں ' ایام روشناس ' اور ' عمود عصا ' کو بدون کسرہ ہونا چاہیے ۔ سبد ۱ ص ۹ شعر ۱۳ و سبد ۲ ص ۱۶ شعر ۸ میں ' درد میر ' ہے ، لیکن باغ میں ' درد و سیر ' ہے اور یہی صحیح بھی ہے ۔ سبد ۱ ص ۹ شعر ۱۸ میں قافیہ غلطی سے ' ایسر ' چھپ گیا ہے ۔ ' اسیر ' ہونا چاہیے ۔ سبد ۱ ص ۱۰ شعر ۳ میں ' رز خم ' اور شعر ۶ کا قافیہ ' غذیر ' غلط چھپ گیا ہے ۔ یہ علی الترتیب ' ززخم ' اور ' غدیر ' ہونا چاہیں ۔ سبد ۲ ص ۱۷ شعر ۱۲ میں ' ثنا می کنم ' ہونا چاہیے ۔

۲- سبد ۱ ص ۷ و سبد ۲ ص ۱۳ و مکاتیب غالب ص ۵۰ طبع اول حاشیہ ۔ سبد ۲ ص ۱۳ شعر ۷ میں ' حروف سطور ' ہونا چاہیے ، جب کہ ' حروف طور ' چھپ گیا ہے ۔ سبد ۱ ص ۸ شعر ۱۳ میں ' تہی ' کتابت سے رہ گیا ہے ۔ سبد ۱ ص ۸ شعر ۱۰ میں ' خشکی ' بجائے ' خستگی ' لکھ گیا ہے ۔ اور مصرع ۲ میں ' است ' غائب ہے ۔ اور شعر ۱۷ میں ' آئین ' کی ' آهن ' اور ' نے ' کی جگہ ' لے ' چھپ گیا ہے ۔

۵- قصیدہ (۱۵ بیت)

زہی دو چشم تو در معرض سیہ کاری
چو بختیارک و بختک بمردم آزاری (۱)

۶- قصیدہ (۳۰ بیت)

تا چہ نیرنگ است ایں کاندر جہاں آوردہ اند
نوبہاری طرفہ در فصل خزاں آوردہ اند (۲)

۷- قصیدہ

حیدرآباد دکن روضۂ رضواں شدہ است
ساز و برگ طرب و عیش فراواں شدہ است

۱- سبد ۱ ص ۱۰ و سبد ۲ ص ۱۸ و مکاتیب غالب ص ۹۵ طبع اول - باغ اور سبد ۱ ص ۱۱ شعر ۱۱ میں ' آنچوب ' ہے - نیز شعر ۱۲ میں ' غیبی ' کی جگہ ' غشی ' ہے - اور شعر ۱۴ میں '' ارسائیس '' ہے - اور شعر ۱۵ میں ' نبود ' ہے - سبد ۲ ص ۱۹ شعر آخر میں ' آب گہر ' کی جگہ ' آب کہر ' کتابت کی غلطی ہے ' اور ص ۲۰ شعر ۱ میں 'در کشیدہ ' کی جگہ ' در کشید ' ہے - سبد ۱ ص ۱۲ شعر ۳ میں ' بدام دام ' بدال ہے ' اور اسی طرح باغ میں بھی ہے ' مگر یہ ہے غلط - صحیح وام (بواو) بمعنی قرض ہے - مکاتیب غالب طبع اول ص ۹۵ و سبد ۲ ص ۲۰ شعر ۲ میں ' لقا ' کی جگہ ' بقا ' چھپ گیا ہے - باغ اور سبد ۱ ص ۱۲ شعر ۵ میں ' آدم ادباری ' ہے - اور شعر ۱۴ میں ' قندز ' ہے - یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے اور مرزا صاحب نے اپنے مکتوب بنام ممدوح مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۶۵ء کے ساتھ بھیجا تھا ' ملاحظہ ہو مکاتیب غالب متن ص ۴۲ طبع چہارم -

۲- سبد ۱ ص ۱۳ و سبد ۲ ص ۲۱ - سبد ۱ شعر ۴ میں 'گز ' چھپ گیا ہے - سبد ۲ ص ۲۲ شعر ۹ میں ' آوردہ ' کی جگہ ' آوردد ' ہونا چاہیے - اسی طرح شعر ۶ میں ' انگلنڈ ' مناسب ہے جو سبد ۱ میں پایا جاتا ہے - سبد ۱ ص ۱۴ شعر ۱۱ میں ' ہم زوری ' غلط ہے - یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں بہادر والی رامپور کی تعریف اور تہنیت میں لکھا ہے ' جب کہ گورنمنٹ کی طرف سے دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء میں انہیں خلعت مسند نشینی عطا ہوا تھا - ملاحظہ ہو مکاتیب غالب دیباچہ ص ۱۲۰ و ۱۲۱ و متن ص ۴۳ طبع چہارم -

والی شہر کہ جاوید بماناد بدہر
بود وی آصف و امروز سلیمان شدہ است
افضل الدولہ (۱) بہادر کہ ز فر رخ او
بارگہ مطلع خورشید درخشاں شدہ است
آں کہ در عہد وی از کثرت ایثار و عطا
خلق را یافتن کام دل آساں شدہ است
مردہ را زندہ کند جنبش کلکش، گوئی
کلک او موجۂ سر چشمۂ حیواں شدہ است
فر و فرہنگ فریدوں کہ نہاں داشت سپہر
اینک از پردہ دگر بار نمایاں شدہ است
بہ دکن آی و بہ بیں ریزش دست کرمش
کہ زمیں ز آب گہر غرقۂ طوفاں شدہ است
تا شود روشنیٔ چشم خلایق افزوں
گرد در رہگزرش کحل صفاہاں شدہ است
نہ ہمیں نیک بود نظم امور دنیا
کار دیں نیز دریں وقت بساماں شدہ است

۱۔ افضل الدولہ بہادر سے آصف جاہ پنجم نواب میر تہنیت علی خان بہادر مراد ہیں، جو ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۹ مئی سنہ ۱۸۵۷ء کو تخت نشین ہوئے۔ نہایت پرہیزگار، خدا ترس، درویش دوست، سخی، اور علم و ہنر کے سرپرست تھے۔ ۱۲ سال ایک ماہ ۲۰ دن کی حکومت کے بعد ۴۲ سال کی عمر میں ۱۳ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء کو جمعے کے دن انتقال کیا۔ نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف جاہ ششم آپ کے اکلوتے فرزند آپ کے جانشین ہوئے۔ ملاحظہ ہو ' افضل الدولہ ' از سید مراد علی طالع، طبع حیدرآباد، سنہ ۱۹۴۳ء۔
غالب کے سوانح نگاروں کو ابھی تک اس کا علم نہیں ہے کہ غالب نے نواب افضل الدولہ بہادر سے بھی مداحی کا علاقہ پیدا کیا تھا۔ اس حیثیت سے یہ قصیدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

نفس آمارہ کہ خود کافر و کافر گر بود
از لہیب شہ دیندار مسلماں شدہ است

می تراشند ز اعضای بتاں اجزا را
کفر در راستہ بازیچۂ طفلاں شدہ است

رفت توقیع بآتش کہ نسوزد جاندار
ھیزم و خار و خسش راتبۂ خواں شدہ است

لاجرم از رہ اخلاص پر پروانہ
شمع را از ضرر باد نگہباں شدہ است

روزگاریست گراں مایہ و فرخ کہ جہاں
ہم بداں گونہ کہ بایست ہمانساں شدہ است

شاہ فرخندہ فرا ، خسرو والا گہرا
چشم بد دور کہ آدم بتو نازاں شدہ است

قدر آدم بدلش از تو چناں جای گرفت
کہ عزازیل ز انکار پشیماں شدہ است

سنگ فرساست چناں نعل سمندت کہ براہ
ہر کجا آمدہ ، کہسار بیاباں شدہ است

ابر ، رخشی است کہ در زیر تو جولاں دارد
برق، تیغی است کہ در دست تو عریاں شدہ است

رند (۱) روشن نفسی ہست ز آل سلجوق
اوں کہ بر مائدۂ فیض تو مہماں شدہ است

---

(۱) ' رند روشن نفس ' سے اپنی ذات مراد لی ہے۔ سلجوقی بادشاہ بھی ترک نسلاً کے تھے ، اور میرزا صاحب بھی اسی قوم کے نام لیوا تھے ، اس لیے اپنے آپ کو ' آل سلجوق ' کہا ہے، ورنہ کوئی ایسا رشتہ ان کے اور سلجوق کے درمیان نہ تھا ، جس کے باعث وہ اپنے آپ کو اس کی اولاد کہہ سکتے ۔

تو چناں داں که غریبی ز دیار دهلی
به دکن نامده از دور ثنا خواں شده است

تیغ تیز است ثنا گوی تو، لیکن دانی
جوهر تیغ ته مورچه پنهاں شده است

نیست جز گرد و غبار آنچه بهر سو نگرم
خواب در دیدهٔ من بس که پریشاں شده است

غنچهٔ هست دل من ز شگفتن نومید
خوں شود سینه ازاں غنچه که پیکاں شده است

بدم گرم خودم زنده و بیدل زانم
که دل از فرط ریاضت خورش جاں شده است

غالب غمزده درویش و تو درویش نواز
بحلش باد، اگر طالب احساں شده است

صله گر می نفرستی، بستایش بنواز
کایں کلامی است که داغ دل حساں شده است (۱)

سخن این است که قطع نظر از حسن کلام
وایه جوئی به سخن سلسله جنباں شده است

چشم بر لطف و کرم دوختهٔ را درباب
که ز کاهش بدنش صورت مژگاں شده است

ایں کهن پیر، به آوازهٔ شیئاً لله
گدیه گر بر در آں قبلهٔ گیهاں شده است

در ثنای تو چه گفتم، که گر آیم بدعا
ایں بدل می سپرم، گر بزباں آں شده است

باد جاوید گلستاں ترا فصل بهار
ای که از فیض تو آفاق گلستاں شده است (۲)

۱۔ حضرت حسان بن ثابت رض مراد هیں، جو مداح رسول ص تھے۔
۲۔ یه قصیده سبد میں شامل نہیں ہے۔

غزلیات

۱ - غزل (۹ بیت)

ای خداوند خردمند جہاں داور دانا (۱)
وی بہ نیروی خرد بر ہمہ کردار توانا

۲ - غزل (۸ بیت)

جز دفع غم ز بادہ نبود است کام ما
گوئی چراغ روز سیاہست جام ما (۲)

۳ - غزل (۱۶ بیت)

منع ز صہبا چرا ؟ بادہ رواں پرور است (۳)
خوف زعصیاں عبث ، خواجہ شفاعت گر است

۱- سبدا ص ۲۰ و سبد ۲ ص ۶۶ و مکاتیب غالب ص ۶۹ طبع اول -
شعر ۲ میں مکاتیب کے اندر ' بزبانی ' ہے -

۲- سبدا ص ۲۱ و سبد ۲ ص ۶۶ - مطبوعہ میں یہ شعر زائد ہے :

مقصود مازدہر ہر آئینہ دوستی است
یارب کہ ہیچ دوست مبادا بکام ما

۳- سبداص ۲۱ و سبد ۲ ص ۶۷ - اس غزل کے شعرہ کا دوسرا مصرع
یوں پڑھا جائے گا : '' ورنہ بود گل ، زگل مہمل گل خوشتراست '' اور مطلب
یہ ہے کہ اگر موسم برشگال میں گل یعنی کیچڑ نہ ہو ، تو گل کا بگڑا ہوا لفظ
گل یعنی پھول اور بھی زیادہ بھلا لگتا ہے - سبد ا و ۲ میں شعر ۱۱ کے اندر
مصرع ۱ میں ' برو ' بصیغۂ امر ہے ، حالانکہ ہونا چاہیے ' برد ' فعل
مضارع از مصدر بردن -

۴ - غزل (۱۰ بیت)

خوشم که چرخ بکوی توام ز پا انداخت　　　(۱)
که هم زمن پی من خلد را بنا انداخت

۵ - غزل (۱۰ بیت)

هم ' انا الله ' خوان درختی را بگفتار آورد　　　(۲)
هم ' انا الحق ' گوی مردی را سردار آورد

۶ - غزل

عجب که مژده دهان رو بسوی ما آرند　　　(۳)
کدام مژده ، که آرند ، و از کجا آرند
ز دوستان نبود خوشنما درین هنگام
که دایه بهر گدای شکسته پا آرند
ز غم چنان شده ام مضمحل که اعدا را
سزد که گنج گهر بهر رونما آرند
نه روی خواستن از حق بود جز آنان را
که بنده وار همی طاعتش بجا آرند
نه بیرضای خدا کارها روان گردد
سپهر و انجم اگر ساز مدعا آرند
نماند ساز مرا هیچ نغمه ، همنفسان
جز آن که بر شکنندش ، چو در نوا آرند
نخست عمر دگر خواهد از خدا غالب
اگر نوید پذیرائی دعا آرند

۱- سبد ا ص ۳۸ و سبد ۲ ص ۷۱ -
۲- سبد ا ص ۲۲ و سبد ۲ ص ۶۸ -
۳- یہ غزل سبد میں نہیں ہے

۷ - غزل (۱۳ بیت)

بمقصدی کہ سرآن را رہ خدا گویند

برو، برو کہ ازاں سو ' بیا، بیا، گویند (۱)

۸ - غزل (۹ بیت)

درد ناساز است و درماں نیز ہم

دھر بی پروا و یزداں نیز ہم (۲)

۹ - غزل (۱۰ بیت)

آسمان بلند را میرم ابر کحلی پرند را میرم (۳)

۱۰- غزل (۱۱ بیت)

ھلہ، من عاشق ذاتم، تنہ نا ھا یا ھو

ناظر حسن صفاتم، تنہ نا ھا یا ھو (۴)

۱۱- غزل (۷ بیت)

از جسم بجاں نقاب تا کے ایں گنج دریں خراب تا کے (۵)

۱- یہ غزل سبد ۱ میں نہیں تھی۔ یادگار غالب ص ۴۰ طبع نامی پریس ۱۸۹۷ء میں پہلی بار شایع ھوئی جس سے نقل کر کے سبد ۲ ص ۷۲ میں بھی درج کردی گئی - سبد ۲ ص ۷۳ کے شعر ۴ میں ' باغ ' کے اندر ' وجود زما ' ھے نیز اس شعر کے مصرع دوم اور مقطع میں ' کوئی ' غلط چھپا ھے ' گوی ' ھونا چاھیے جو باغ میں ھے۔

۲- سبد ۱ ص ۲۲ و سبد ۲ ص ۶۹ - سبد ۱ شعر ۴ میں ' خمیر ' کی جگہ ' خمر ' چھپ گیا ھے -

۳- سبد ۱ ص ۴۰ و سبد ۲ ص ۷۲ -

۴- سبد ۱ ص ۴۲ و ایضاً ص ۶۹ - سبد ۱ شعر ۲ میں ' موسی و خضر ' ھے۔ سبد ۲ شعر ۳ میں ' میلاد وفاتم ' غلط چھپ گیا ھے۔ ' میلاد و وفاتم ' ھونا چاھیے۔

۵- سبد ۱ ص ۲۳ و سبد ۲ ص ۷۰ -

فردیات(۱)

۱- نازم آں فتنہ ، الخ

۲- ورود سرور سلطان، الخ

۳- اینک ہزار و ہشتصد ، الخ

۴- نواب نامدار بدھلی، الخ

۵- مرحبا ویسرای، الخ

۶- بیا کہ دادہ بدھلی ، الخ

۷- زہی لاڑد لارنس ، الخ (۲)

۸- ملکہ آں کہ بریں ، الخ (۳)

۹- زہی ز شملہ، الخ

۱۰- مرحبا لشکر نواب ، الخ

۱۱- در تن مردم ایں ، الخ

۱- یہ عنوان میں نے قرار دیا ہے۔ خود ہاغ میں ہر شعر سے پہلے لفظ ' فرد ' لکھا گیا ہے۔ سبد ۱ ص ۳۲ اور سبد ۲ ص ۴۷ میں یہ سب شعر موجود ہیں ۔ صرف شعر ۲ و ۱۲ سبد ۲ میں نہیں ، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دونوں شعر ترجیع بند کے ہیں ، پھر تکرار سے کیا فائدہ ۔

۲- سبد ۲ میں ' لارڈ ' لکھا گیا ہے، جو میرزا صاحب کے املا کے خلاف ہے، وہ ہمیشہ ایسے ' لاڑد ' لکھا کرتے تھے ۔

۳- سبد ۲ میں ' چرخ سرپرش ' سہواً چھپ گیا ہے۔ بدون اضافت ہونا چاہیے ۔

۱۲- ذریعہ' شرف و عز ، الخ

۱۳- عیاں بود ز ، الخ

۱۴- دو روز دیر کن ، الخ (۱)

۱۵- عبودیت نکنند ، الخ (۲)

۱۶- ہو کہ بہنجار نو زخمہ ز تار آوری
کن فیکون دگر بر سر کار آوری (۳)

۱- سبد ۲ میں ' وایہ ' کی جگہ ' وابہ' ' ہونا چاہیے -

۲- سبد ۱ میں مصرع ۲ میں ' دعای ' غلط چھپ گیا ہے-

۳- یہ شعر سبد ۲ میں نہیں ہے-

خمسه

بر غزل مولانا قدسی قدس‌الله سره

کیستم تا بخروش آوردم بی ادبی (۱)
قدسیان پیش تو در موقف حاجت طلبی
رفته از خویش بدیں زمزمهٔ زیر لبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چه عجب خوش لقبی

اے که روے تو دهد روشنی ایمانم
کافرم کافر، اگر مهر منیرش خوانم
صورت خویش کشید است مصور دانم
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
الله، الله چه جمالست بدیں بوالعجبی

اے گل تازه که زیب چمنی آدم را
باعث رابطهٔ جان و تنی آدم را
کرده دریوزهٔ فیض تو غنی آدم را
نسبتی نیست بذات تو بنی آدم را

۱۔ یه خمسه سید ۱ و ۲ دونوں میں نہیں ہے۔ خود باغ کے اندر بھی اسے 'لا ۔ الیٰ' لکھ کر خارج قرار دیا ہے ۔ مگر عرصه ہوا که اسی غزل پر دوسرے بہت سے خمسوں کے ساتھ ایک مجموعے 'حدیث قدسی' میں چھپ کر شایع ہو چکا ہے ۔

بر تر از عالم و آدم، تو چه عالی نسبی

ای ابت را بسوی خلق ز خالق پیغام
روح را لطف کلام تو کند شیریں کام
ابر فیضی که بود از اثر رحمت عام
نخل بستان مدینه ز تو سر سبز مدام
زاں شده شهرهٔ آفاق بشیریں رطبی

خواست چوں ایزد دانا که بساطی از نور
گسترد در همه آفاق چه نزدیک چه دور
حکم اصدار تو در ارض و سما یافت صدور
ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظهور
زاں سبب آمده قرآں بزبان عربی

وصف رخش تو اگر در دل ادراک گزشت
نه همین است که از دائرهٔ خاک گزشت
همچو آں شعله که گرم از خس و خاشاک گزشت
شب معراج عروج تو ز افلاک گزشت
بمقامیکه رسیدی نرسد هیچ نبی

چه کنم چاره که پیوند خجالت گسلم
من که جز چشمهٔ حیواں نبود آب و گلم
من که چوں مهر درخشاں بدمد نور دلم
نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکه نسبت بسگ کوی تو شد بی ادبی

دل ز غم مردہ و غم بردہ ز ما صبر و ثبات
غمگساری کن و بنمای بما راہ نجات
داد سوز جگر ما کہ دہد نیل و فرات
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما کہ ز حد میگزرد تشنہ لبی

غالب غمزدہ را نیست دریں غمزدگی
جز بامید ولای تو تمنای دگی
از تب و تاب دل سوختہ غافل نشوی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمادہ سوے تو قدسی ای درماں طلبی

رباعیات(۱)

۱- بخشید به ثاقب سخنور یزدان
۲- امروز که روز عید و نوروز بود
۳- نازم به نشاط این چنین برگشتن (۲)
۴- خواندیم سخنهای محبت بسیار
۵- ای روی تو همچو مهر گیتی افروز
۶- ای آنکه بدهر نام شاه رخ است
۷- ای داده بباد عمر در لهو و فسوس (۳)
۸- جائی که ستاره شوخ چشمی ورزد
۹- در کالبد شهر روان باز آمد
۱۰- از دهر دلم وایه مهر در می جست
۱۱- زینسان که همیشه در روانی سائیم

۱- یہ عنوان میں نے قرار دیدیا ہے۔ باغ میں اس کی جگہ ہر رباعی سے پہلے لفظ 'رباعی' لکھا ہوا ہے۔ نیز یہ سب رباعیاں ابر گہر بار، اور سبد ۱ و ۲ میں بھی موجود ہیں، بجز ان کے، جو میں نے اوپر پوری نقل کی ہیں۔

۲- سبد ۲ مصرع ۴ کے اندر بجائے 'این' کے سہواً 'اند رین' چھپ گیا ہے۔

۳- باغ میں اس رباعی پر 'لا - الی' لکھ کر خارج قرار دیدیا ہے۔

۱۲- گویند جہانیان دو رویند، مگوی (۱)

۱۳- ہر روز تنم ز سایہ لرزاں گردد (۲)

۱۴- ای پایہ بلند ساز والا جاہی

۱۵- نام اب و جد و ہم نگیرند این قوم
فیض از دم مادراں پزیرند این قوم
از مادر و از مادر مادر گویند
کس در کس، امیر ابن امیر اند این قوم (۳)

۱۶- یارب، تو کجائی کہ بما زر ندہی

۱۷- آن کیست کہ جسم ملک را جاں باشد (۴)

۱۸- در دیدہٴ آن کہ محو رنج و یاس است
خاک است، اگر لعل و گر الماس است
آن دل کہ ز دہر بود آزاد، کنون
در بند محبت نراین داس است

۱۹- ہر چند خرد ز تاب می پست شود
وز ضعف خرد، روہم قوی دست شود
ہر کس کہ خرد دارد، ازیں جوہر ناب
آن مایہ چرا خورد کہ بدمست شود

۱- سبد ۲ میں 'مگوی' کو 'مگو' چھاپا گیا ہے۔

۲- سبد ۲ میں مصرع ۳ 'خواہم کہ ز لطف' کی جگہ بدون 'کہ' چھپ گیا ہے۔

۳- یہ رباعی سبد ۲ میں نہیں پائی جاتی، اس لیے یہاں مکمل نقل کی جاتی ہے۔

۴- یہ رباعی مکاتیب غالب : ۹۶ طبع اول نیز بعد کی اشاعتوں میں شامل ہے۔

۲۰۔ حق دادہ بہ سید از پی انعامش
فرخ پسری کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بی کم و بیش
' ارشاد حسین خان ' کہ باشد نامش (۱)
۱۲۸۰ھ

ΛΛΛΛ

۱۔ باغ میں اس رباعی پر بھی ' لا ۔ الیٰ ' لکھ کر خارج قرار دے دیا ہے ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی ' ارشاد حسین خان ' کی ولادت کا قطعہ تاریخ میرزا صاحب کہہ چکے تھے ، جو قطعات میں ۴۴ ویں نمبر پر درج ہو چکا ہے ۔ اس کے مقابلے میں یہ رباعی قدرے پست تھی ، اس بنا پر اس کا خارج کر دینا مناسب معلوم ہوا ۔

منثورات(۱)

۱- عبارتی که در رامپور رقم فرموده اند :
"کمال کلام وابسته به افتتاح باب کلام" الخ (۲)

۲- عبارتی که در تهنیت جشن در رامپور رقم کرده اند :
" جهان خدای را سپاس و جهانیان را نوید" الخ (۳)

۳- عبارت در صنعت مقطع الحروف در رامپور رقم کرده به نواب کلب علی خان بهادر در داده اند :
" داور دارا در ، آن زور آور اژدر" الخ (۴)

۴- دیباچهٔ قاطع برهان : " یزدان دانش بخش داد پسند می پناهم" الخ (۵)

۱- یہ عنوان میں نے قرار دے لیا ہے۔ اصل نسخے میں بغیر کسی اشارے کے نثریں شروع کردی گئی ہیں ۔

۲- کلیات نثر : ۹۰ ، مطبع نولکشور ۱۸۷۱ء میں بغیر تمہیدی عبارت کے چھپ چکی ہے ۔ اصل میں اس پر اور نمبر ۳ و ۴ پر ' لا۔ الیٰ ' بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کلیات نثر میں شائع ہوچکی ہیں ۔

۳- یہ بھی کلیات مذکور کے ص ۹۱ پر بے تمہید شائع ہوچکی ہے۔

۴- ایضاً : ۸۱ ، بدون تمہید ۔

۵- دیباچہ قاطع برہان ، مطبع نولکشور ۱۲۷۸ھ کے ص ۲۷۲ میں ملاحظہ ہو ۔

۵۔ دیباچہٗ ثانی جدید : " اللہ اللہ ، غالب خاکسار هرزه کار را از آسمان بزمین فرستادند " الخ (۱)

٦۔ تقریظ قاطع برهان: "از من بمن سلام و هم از من بمن پیام" الخ (۲)

۷۔ دیباچہٗ مثنوی ابر گهر بار: " بنامیزد سخن در سپاسگزاری مبداٗ فیاض است " الخ (۳)

۸۔ تقریظ مثنوی ابر گہربار: " در انجام این نظم نظامی نظام " الخ (۴)

۹۔ تقریظ فرهنگ دساتیر تصنیف مولوی نجف علی صاحب : " اللہ اللہ، هفتاد سال کو ، ده سال ازاں میان بشمار دانش اندوزی " الخ (۵)

۱۰۔ تقریظی که بر کتاب دری کشا تصنیف مولوی نجف علی خان صاحب نگاشته اند : " یزدان روان بخرد فروز " الخ (٦)

۱۱۔ تقریظ تذکرهٗ اردو تالیف مولوی محمد ظہور علی صاحب : " خدایا چه گویم که شاهی تراست " الخ (۷)

۱۔ یه دیباچه درفش کاویانی ، مطبع اکمل المطابع دهلی ۱۲۸۲ھ کے ص ۴ تا ۷ پر دیباچہٗ اول کے بعد چھپا ہے۔

۲۔ یه تقریظ نسخهٗ مذکور کے ص ۹۷ پر چھپی ہے۔

۳ ، ۴۔ یه دیباچه مثنوی مذکور ، اکمل المطابع دهلی ۱۲۸۰ھ کے ص ۲ تا ۴ پر ، اور اس کی تقریظ اسی ایڈیشن کے ص ۴۰ پر چھپی ہے۔

۵۔ یه تقریظ فرهنگ ، مطبع سراجی ۱۲۸۰ھ کے ص ۱۹۴ کے بعد چھپی ہے۔

٦۔ یه تقریظ دری کشا ، اکمل المطابع دهلی ۱۲۸۰ھ کے آخری صفحے (نمبری ٦٦) پر چھپی ہے۔

۷۔ اس تقریظ پر اصل میں ' لا ۔ الی ' کا نشان بنا ہوا ہے جس کی وجه یه ہے که میرزا صاحب اسے کلیات نثر میں شائع کرا چکے تھے ۔ ملاحظه هو کلیات ص ۴۹ ۔ اس تذکرهٗ اردو کے متعلق کچھ پتا نہیں چلتا که یه شائع هوا یا نہیں ۔ اگر کسی اهل ذوق کو کچھ معلوم هو تو بغرض افادهٗ عام شائع فرمائیں ۔

خطوط

[۱] بنام منشی جواہر سنگھ

۱- امروز خونگرمی مہر ورگی را، الخ (۱)

۲- ایضاً : چشم و چراغ دودہٗ مردمی ، الخ

۳- ایضاً : جان من نامہٗ شما دیر است ، الخ

۴- ایضاً : بنام جواہر سنگھ جوہر سعادت و اقبال نشانا ، ہم بخت خود را آفریں گویم ، الخ (۲)

۵- ایضاً : سعادت و اقبال نشان رای جواہر سنگھ جوہر از عمر و دولت برخوردار باشند ، الخ

۶- ایضاً : سعادت و اقبال نشان رای جواہر سنگھ را چرخ یاور و بخت فرمانبر باد ، الخ

۷- ایضاً : جان من و جانان من ، روزی بود کہ نامہ بمن رسید، الخ

۸- ایضاً : اقبال نشانا ، نامہ نگاشتہٗ دواز دہم فروری رسید ، الخ

۹- ایضاً : سعادت نشانا ، نامہ رقمزدہٗ بستم فروری و نامہ نگاشتہٗ ۲۵ فروری ہی ہم رسید ، الخ

۱- حصہ مکاتیب کا آغاز منشی جواہر سنگھ جوہر کے خطوط سے ہوتا ہے مگر آغاز کے تین خط پنج آہنگ میں شامل ہو چکے تھے، اس سے ان تینوں پرعلامت حذف 'لا - الیٰ' پائی جاتی ہے۔

۲- انھیں کے نام چوتھے خط کے حاشیے پر لکھا ہے 'ازیں جا باید نوشت' یعنی ناقل چوتھے خط سے نقل شروع کرے ، پہلے کے تینوں خط حذف کردے ۔

۱۰- ایضاً : سعادت و اقبال نشانا جانا ، نامہ شما و منشور عطوفت مولانا در نورد آن بمن رسید ، الخ

۱۱- ایضاً : اقبال نشانا ، مسرت افزا نامہ نگاشتہ ۱۳ دسمبر بورود خویش خوشنودم کرد ، الخ

۱۲- ایضاً : نوردیدہ و سرور سینہ غالب منشی جواہر سنگھ از عمر دولت برخواناد ، الخ

۱۳- ایضاً : سعادت و اقبال نشانا منشی جواہر سنگھ از عمر و دولت برخوردار باشند ، الخ

۱۴- ایضاً : جان من ما در آن ہنگام سرگرانی از اندازہ گزشت ، الخ

۱۵- ایضاً : از اسد اللہ دعا خوانند ، الخ

۱۶- ایضاً : کامگار سعادت آثار اقبال نشان منشی جواہر سنگھ جوہر دعا خوانند ، الخ

[۲] بنام رای چھج مل کھتری

مہاراج با چون منی کہ جز محبت کیش دیگر ندارم ، الخ

[۳] در سفارش منشی جواہر سنگھ بہ محمد فضل اللہ خان دیوان راج الور

مخلص نواز ، غمزدگان را بمہر اندوہ گدازا ، الخ

[۴] بنام منشی نبی بخش مرحوم

صبح است و پردہ ہای ایوان فروہشتہ ، الخ

[۵] نامہ بنام نواب علاء الدین احمد خان بہادر

۱- جانشین غالب را از غالب دعا ، الخ

۲- ایضاً : دانشہای سزا و اندیشہ ہای رسا را بہ فرگاہ تنگبار والا یزدان بار ندادہ اند ، الخ (۱)

۱- یہ فارسی جانشینی کی سند ہے جو مرزا صاحب نے علائی کو عطا کی تھی ۔ خود مرزا صاحب کے ہاتھ کی لکھی اس تحریر کا عکس مولانا مہر نے اپنی کتاب " غالب " کی اشاعت اول میں چھاپ دیا ہے ۔ ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ان تمام خطوط پر یہی علامت " لا ۔ الیا ، پائی جاتی ہے اس لیے کہ یہ سب پنج آہنگ میں شامل ہو چکے ہیں ۔

[۶] خط بنام جان جاکوب صاحب

فرخنده خوی سرورا، الخ

[۷] از اسداللہ گم کرده راه معروض بخدمت میر ولایت علی صاحب المخاطب بمشرف الدولہ بہادر

نفرین خدای بر من، الخ

[۸] بنام دوتن از فرزانگان پنجاب

آن یکی سپر مردمی را مہر، الخ

[۹] بنام آغا محمد حسین ناخدای شیرازی

نظم نجلیند صدیقه تحقیق، الخ

[۱۰] بنام مولوی رجب علی خان

۱- سپاسی کزان نامه نامی شود، الخ

۲- بنام مولوی رجب علی خان بہادر ارسطو جاها، سکندر سپاها، الخ

[۱۱] عرض داشت بنام نامی نواب مختار الملک نائب والی حیدرآباد

بعز عرض حضرت فلک رفعت، الخ

[۱۲] عرضداشت باسم سامی اشرف شاهزادگان میسوریه

رباعی - سبحان اللہ شان اعلیٰ حضرت -

[۱۳] خطوط بنام خطوط تفضل حسین خانصاحب مرحوم

۱- حضرت سلامت، رافت نامه که از جے پور، الخ

۲- ایضاً: بخدمت وافر المسرت حضرت اخوان پناهی، الخ

۳- ایضاً: قبله جان و دل سلامت، الخ

۴- ایضاً: داغم ز سوز غم که خجل داردم ز خلق، الخ

۵- ایضاً: یا رب این فردوسی نسیم، الخ

۶- ایضاً: روان پرور صاحبا، الخ

۷- ایضاً: ای بفروغ فرهنگ و فرخی، الخ

[۱۴] خطوط بنام منشی هر گوپال تفته

۱- مشفق من لاله هرگوپال تفته از جانب اسد اللہ، الخ

۲- ایضاً: والا جاها خاقانی دستگاها، الخ

۳- ایضاً : مخلص نوازا ، دہر است کہ ، الخ
۴- ایضاً : خامہ دو زبان ، الخ
۵- ایضاً : ہان وہان ، الخ
۶- ایضاً : جان من ، نامۂ شما کہ بنام منشی ہرگوبند سنگھ ، الخ
۷- ایضاً : اگر جان بے وفا نبودی ، الخ
۸- ایضاً : جان من اوراق اشعار ، الخ
۹- ایضاً : صاحب من ، الخ
۱۰- ایضاً : فرزانہ مہرورز آزرم گستر را ، الخ
۱۱- بنام منشی ہرگوپال تفتہ ، غالب از خود رفتہ ، الخ

[۱۵] خط بنام جانی بانکے لال وکیل راج بھرت‌پور

یزدان کہ دریا آفرید ، الخ

[۱۶] بنام میر احمد حسین المتخلص بہ میکش

۱- برخوردار اقبال نشان میر احمد حسین ، الخ
۲- ایضاً : عزیز تر از جان ، الخ
۳- ایضاً : نور دیدۂ غالب ، الخ
۴- ایضاً : اقبال نشانا ، الخ
۵- ایضاً : دل و جان من فدای تو باد ، الخ
۶- ایضاً : سعادت نشانا ، الخ
۷- ایضاً : جانا فرہنگ دانا ، الخ
۸- ایضاً : اقبال نشانا ، بحساب متعارفہ رسمیہ ، الخ
۹- ایضاً : نامۂ شما رسید ، الخ
۱۰- ایضاً : صاحب من ، الخ
۱۱- ایضاً : با آن کہ ہیچ مطلب ، الخ
۱۲- ایضاً : جانا سعادت نشانا ، الخ

۱۳- ایضاً : سعادت نشان بشنوید ، الخ

[۱۷] نامہ بنام نامی قطب الدولہ بہادر

۱- بہ ہمایون خدمت جناب ، الخ

۲- نامہ بنام نامی نواب ایضاً : بخدمت و افرالمسرت ، الخ

[۱۸] نامہ بنام نامی شاہ صاحب

اگرچہ نیک نیم ، الخ

[۱۹] نامہ بنام نامی نوروز علی خاں بہادر

عالی جاها ، الخ

[۲۰] بنام دوستی

خامہ کہ گویای خموش است ، الخ

[۲۱] نامہ بنام منشی احمد صاحب

شفیقی خلیلی ، الخ (۱)

[۲۲] بنام منشی هیرا سنگھ صاحب

سعادت و اقبال نشان منشی هیرا سنگھ صاحب ، الخ

[۲۳] ترقیمہ (۲)

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۱- اس خط پر بھی مخطوطے میں 'لا - الی ' علامت حذف موجود ہے مگر اس هدایت کی وجہ کیا ہے، نہیں کہا جاسکتا - اس لیے کہ یہ خط پنج آهنگ میں موجود نہیں ہے۔

۲- ترقیمے کی عبارت تعارف میں نقل ہو چکی ہے۔

کوشش پیہم...!

نہ بڑائی کی تمنا... نہ برتری کے خواب... نہ صفِ اوّل میں آنے کا شوق۔ ہماری
منزل تو کچھ اور ہے — ہماری تمام تر کوششیں اپنی خدمات کو بہتر سے بہتر بنانے
کے لئے ہیں۔ ہماری یہ جدوجہد، یہ سعیِ مسلسل ہر روز کامیابی اور ترقی کے نئے
زاویے پیش کرتی ہے۔ نئی راہیں دکھاتی ہیں۔ بہت نئی تجاویز اور نئے منصوبے ابھرتے ہیں۔
ہم اپنے کرم فرماؤں کے لئے بہتر خدمت اور موزوں مواقع فراہم کرنے کے لئے
کوشاں رہتے ہیں۔

ملک ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ ترقی کے اس دور میں بینکاری
کی ضروریات لامحدود ہیں — ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ اس میدان میں
ہم نے ابھی صرف ابتدائی مراحل طے کئے ہیں۔

ہمیں اور بہت کچھ حاصل کرنا ہے جس کے لئے ہماری کوششِ پیہم جاری ہے۔

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

سو فیصد
پاکستانی
کمپنی

SERVING
ALL...

پی این او پاکستان کی قومی امنگوں کی آئینہ دار ہے۔
پی این او ایک آزاد اور خود مختار قوم کی اپنی تیل کمپنی ہے۔
اس لئے پی این او پاکستانی قوم کی خدمت کرنا فخر سمجھتی ہے۔
کیونکہ قومی خدمت سے بڑھ کر کوئی خدمت نہیں۔

پاکستان نیشنل آئل لمیٹڈ

نزلہ، زکام، کھانسی اور فلو کا مؤثر علاج

ان علامات پر نظر رکھئے: یکایک چھینکیں آنا۔ ناک بند ہونا یا بہنا۔ گلے کی خراش
کھانسی، سینے کی جکڑن، اعضاء شکنی، بدن میں کپکپی اور آنکھوں سے پانی بہنا وغیرہ
ان کے ظاہر ہوتے ہی جوشاندہ استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔

جوشاندہ

جڑی بوٹیوں کا یہ قدیم اور مؤثر مرکب
مرض بڑھنے سے پہلے ہی اس کی روک تھام کر دیتا ہے
اب جوشاندہ ایک مکمل اور تیار خوراک کی شکل میں بھی دستیاب ہے
اسے گرم پانی میں گھول کر فوری طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ

۵۰ ہزار روپے یکمشت
اور
۱۲۵۰ روپے ماہانہ پنشن
بیمۂ زندگی کا نیا اور بے مثال منصوبہ
فیملی پنشن پلان

تفصیلات کے لئے ہمارے نمائندے کو طلب کیجئے۔ وہ آپ کو صحیح مشورہ دے گا اور بالکل مفت یا ہمارے کسی دفتر کو براہِ راست خط لکھ دیجئے۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر ۵۰۰ کراچی　پوسٹ بکس نمبر ۳۵۲ لاہور　پوسٹ بکس نمبر ۲۳۸ راولپنڈی　پوسٹ بکس نمبر ۲۴ ڈھاکہ

پاکستان کا تجارتی بیڑہ اِس وقت ۶۶ سمندری جہازوں پر مشتمل ہے جن میں سے
۳۹ جہاز نجی شعبے میں اور ۲۴ جہاز پبلک شعبے میں ہیں جن کا مجموعی وزن ۶ لاکھ ٹن سے زائد ہے
انشاء اللہ تیسرے پنجسالہ منصوبے کے آخر تک ہمارے بیڑے میں اس حد تک توسیع ہو جائے گی کہ وہ غیر
ممالک کے ساتھ ہماری بڑھتی ہوئی تجارتی ضروریات کو کسی حد تک پورا کر سکے گا۔

ہمارے جہازراں ادارے لائق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے پاکستان کے اہم ذرائع حمل و
نقل کو نہ صرف بحسن و خوبی قائم رکھا ہے بلکہ بین الاقوامی تجارت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ہمارے
جہاز سبز پرچم کو لے کر دنیا کی متعدد بندرگاہوں اور مختلف تجارتی سمندری راستوں پر جاتے
ہیں اور اپنی شاندار دوستانہ اور ماہرانہ خدمات سے اپنے وطن کا نام بلند کرتے ہیں۔

ممبران

دی پان اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لیمیٹڈ
چٹاگانگ اسٹیم شپ کارپوریشن لیمیٹڈ
کریسنٹ شپنگ لائنز لیمیٹڈ
ایسٹ اینڈ ویسٹ اسٹیم شپ کمپنی
ایسٹ بنگال اسٹیم شپ کمپنی لیمیٹڈ
گلف اسٹیم شپ کمپنی لیمیٹڈ
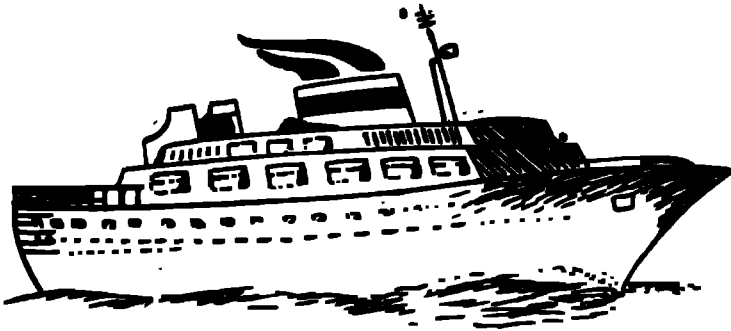
پاکستان اسٹیم نیوی گیشن کمپنی لیمیٹڈ
کراچی اسٹیم نیوی گیشن کمپنی لیمیٹڈ
محمدی اسٹیم شپ کمپنی لیمیٹڈ
پاکستان شپنگ لائین لیمیٹڈ
ٹرانس اوشنک اسٹیم شپ کمپنی لیمیٹڈ
یونائیٹڈ اورینٹل اسٹیم شپ کمپنی

پاکستان شپ اونرز ایسوسی ایشن
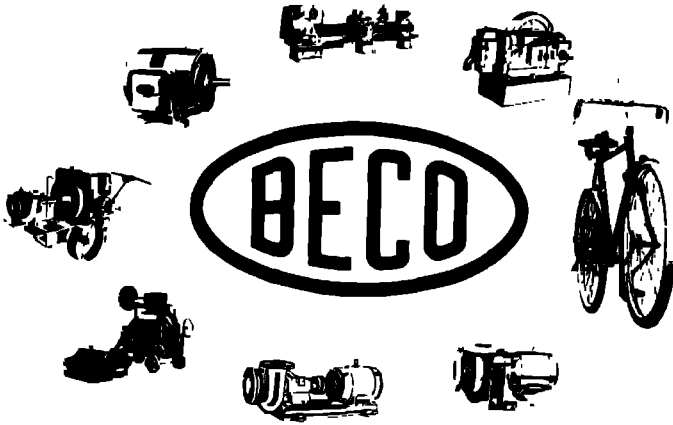
قابلِ اعتماد مصنوعات
بنانے والے ادارے
بیکو
کی قابلِ اعتماد مصنوعات

دی بٹالہ انجنیئرنگ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ

لاہور - کراچی - حیدرآباد - ملتان - راولپنڈی - ڈھاکہ - چاٹگام - لندن

SHIP & TRAVEL
BY
PAN ISLAMIC VESSELS

PAKISTAN/USA (OUTWARD): CARGO SERVICE
USA/PAKISTAN (RCD ROUTES): CARGO SERVICE
KARACHI/CHITTAGONG/KARACHI : PASSENGER-CUM-CARGO SCHEDULED SERVICE
PAKISTAN SAUDI ARABIA : PILGRIM SERVICE

FOR PASSAGES & CARGO BOOKINGS

PLEASE CONTACT :

The Pan-Islamic Steamship Co. Ltd.

Writers' Chambers, Dunolly Road,
KARACHI—2.

Cables : "ALSADIQ"
Telex : ALSADIQ-KR-851.
Telephones : 228691 (4 Lines).

چراغ لیکے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟

زندگی میں طوفان بھی آتے ہیں، لغزشیاں بھی۔ جب بڑھاپا آپہنچے گا اور آپ کمانے کے لائق نہ رہیں گے تو بیماریاں پھر کہاں ہوگی بیشمار ضرورتیں۔ بیمہ انشورنس کا تقاضہ ہے کہ آپ بیمہ کرا کے اپنی اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کریں۔

خیبر انشورنس آپ کی ضروریات کے مطابق مختلف اور مفید منصوبے پیش کرتی ہے جو روشن آئندہ مستقبل کے ضامن اور سکون دسترس کا پیش خیمہ ہیں۔

خیبر انشورنس آپ کے مستقبل کی محافظ ہے

خیبر انشورنس کمپنی لمیٹڈ

صدر دفتر، میکلوڈ روڈ، کراچی — شاخیں پاکستان کے ہر حصہ میں موجود ہیں

انجمن کی چند زیرِ طبع کتابیں

- مقاماتِ ناصری — میر ناصر علی مرحوم۔ مرتبہ: انصار ناصری
- اردو کی منظوم داستانیں — ڈاکٹر فرمان فتح پوری
- لغاتِ کبیر (حصہ اول) — بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم
- اردو کی نثری داستانیں — ڈاکٹر گیان چند
- دیوان قاسم دکنی — مرتبہ: سخاوت مرزا
- ہمیشہ بہار — مصنفہ: کشن چند اخلاص، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی
- انتخاب جدید (نیا ایڈیشن) — آل احمد سرور - عزیز احمد
- قطعۂ منتخب — مصنفہ: عبدالغفور نساخ، مرتبہ: ڈاکٹر انصاراللہ نظر
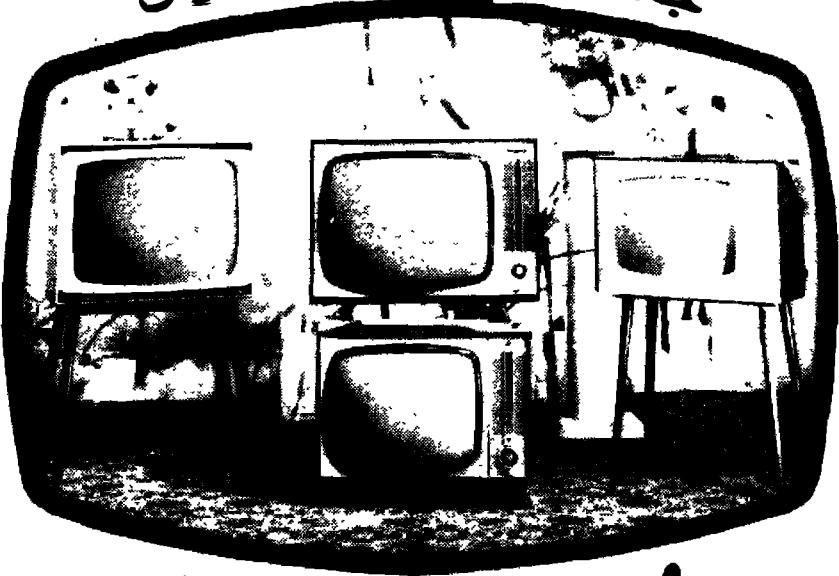
غالب کی صد سالہ برسی پر

انجمن کی مطبوعات

• فلسفۂ کلام غالب	ڈاکٹر شوکت سبزواری	بارہ روپے
• غالب، ایک مطالعہ	پروفیسر ممتاز حسین	سات روپے
• مہر نیمروز (اردو ترجمہ)	پروفیسر سید عبدالرشید فاضل	بارہ روپے
• ہنگامۂ دل آشوب	مرتبہ سید قدرت نقوی	سات روپے
• غالب نام آور	سہ ماہی "اردو" میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کا انتخاب	پندرہ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

قومی زبان

شمارۂ خصوصی بیادِ غالب

قیمت: ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

نیشنل بینک آف پاکستان بلڈنگ
میکلوڈ روڈ، کراچی (فون : ۹۵—۲۳۹۲۹۱)

دفاتر : ڈھاکہ، چٹاگانگ، کھلنا
لاہور، راولپنڈی اور پشاور۔

Vol. 45 1969 No. 1

THE QUARTERLY

Urdu

GHALIB CENTENARY
SPECIAL ISSUE

Published By

THE ANJUMAN TARAQQI-E-URDU

BABA-E-URDU ROAD, KARACHI-1

(PAKISTAN)

Rs. 8.00 Per Copy